دل گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں

ماہنامہ

کراچی

سچی کہانیاں

June 2015

25 سے زیادہ سچی کہانیاں اس شمارے میں موجود ہیں

☆ "مسئلہ یہ ہے" قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

☆ ایم اے راحت اور کاشی چوہان کے تہلکہ خیز ناول

ماہنامہ
سچی کہانیاں
کراچی

E-mail: pearl_publication@hotmail.com

بانی سہام مرزا



مدیرہ اعلیٰ : منزہ سہام

مدیر : کاشی چوہان/دانیال شمسی

نیجر مارکیٹنگ
زین العابدین

نیجر ایڈمن اینڈ سرکولیشن
محمد اقبال زمان

انکم ٹیکس ایڈوائزر
مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

خط و کتابت کا پتا: 88-C II فرسٹ فلور خیابانِ جامی کمرشل ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

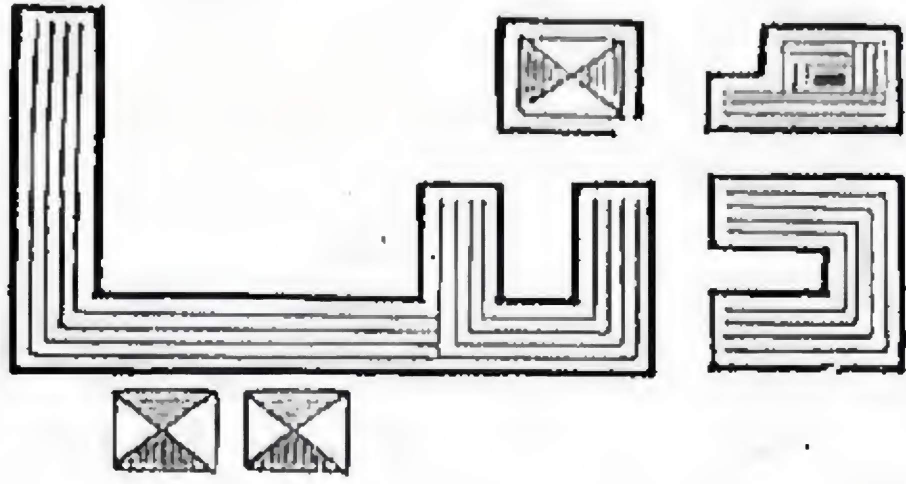
فون نمبرز:
021-35893121
021-35893122

قیمت فی شمارہ: 60 روپے ❋ جلد: 32 ۔ شمارہ: 06 ❋ جون: 2015ء

ایڈیٹر پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

فون: 35893122-35893121-021 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس، OB-7 تالپور روڈ، کراچی

زرسالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 890 روپے/افریقہ 65 ڈالر/کینیڈا/آسٹریلیا 65 ڈالر/ایشیا/یورپ 55 ڈالر/قانونی مشیر جی ایم بھٹو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ



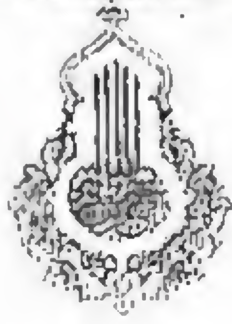
دنیا میں کس جگہ

سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

اِس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے، دیکھتے، محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافات، جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ



چلّو بھر پانی

پانی کی بوند بوند کو ترستے انسان، جن پر غذا اور بجلی کا حصول تو پہلے ہی مشکل تھا اب پانی بھی خواب ہوا...... لمبی لمبی قطاروں میں کھڑے مرد، عورتیں اور بچے جو پینے کے لیے پانی کو ترس رہے ہیں...... اوپر سے مئی کی گرمی...... چلچلاتی دھوپ میں گھنٹوں، دو گھونٹ پانی کے لیے تڑپتے انسان، اپنے انسان ہونے پر ہی شرمندہ ہونے لگے ہیں......

جو منظر کشی اوپر کی گئی، وہ کسی جنگ زدہ علاقے کی نہیں، وہ دجلہ کے کنارے خیمہ زن مسلمانوں کی بھی نہیں...... یہ حالت تو بحیرۂ عرب کے ساحلوں پر بسنے والی آبادی کی ہے۔ وہ شہر جو کبھی پورے پاکستان سے آنے والوں کے لیے روزگار فراہم کرتا تھا...... آج وہاں کے رہنے والے پانی کے ایک ایک قطرے کو ترس رہے ہیں۔ میری التجا ہے اربابِ اختیار سے کہ اِس شہر کے بسنے والوں کو زیادہ نہیں بس ایک چلّو ہی مفت میں دے دیں کیوں کہ ایسے سیاست دانوں کو، جو پانی بھی مہیا نہ کرسکیں ووٹ دے کر لانے والوں کا انجام چلّو بھر ہی ہوتا ہے۔

منزہ سہام

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

پیارے ساتھیو!

ماہِ جون پوری تمازت کے ساتھ ہمارے روبرو ہے۔ ایسی جھلساتی دوپہروں اور ٹھنڈی ٹھنڈی شاموں میں خدا کی قدرت پر قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔ اور خدا کی قدرت تو ہر گھر میں رحمت کی صورت نازل ہے۔ 'بیٹی' خدا کی سب سے بڑی رحمت ہے۔ مجھے بیٹیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ معصوم، تقدس میں لپٹی یہ حوریں 'خدا' کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ میں خوش نصیب ہوں مجھے خدا نے بہنیں دیں، پھوپیوں اور خالاؤں سے نوازا۔ میں سب کا لاڈلا رہا ہوں مجھے اپنی شمیم پھوپو سے بہت محبت ہے۔ مجھے آج بھی یاد ہے جب پھوپو ہمارے یہاں رہنے آتی تھیں تو وقت جیسے ہوا میں غائب ہو جاتا تھا اور جب الطاف پھوپا لینے آتے تھے تو میں دہلیز پر بیٹھ جایا کرتا تھا کہ میں اپنی پھوپو کو جانے نہیں دوں گا۔ ہائے وہ بچپن کے دن...... وقت گزر گیا، محبتوں کو مصلحتوں اور خود غرضی کی نظر لگ گئی۔ خونی رشتے سراب بن گئے۔ مگر...... میں خوش نصیب ہوں کہ مجھے میرے تمام رشتوں کی محبتیں ملیں۔ آج بند الماری کے شیشوں سے جھانکتی محبتیں بڑی حسرت سے تکتی ہیں۔ مہینوں اب ملاقاتیں نہیں ہو پاتیں۔ ان ہی اوراق سے مجھے آپ کے روبرو کرتی، کمپیوٹر کے پردوں سے سب کچھ عیاں کرتی، محبتیں بڑی بے چین رہا کرتی ہیں۔ محبتیں لائف ٹائم بیٹری اپنے اندر save رکھتی ہیں۔ ان کی چارجنگ اگر کبھی کم ہونے لگتی ہے تو اک ملاقات پھر سے چارجنگ فل کر دیتی ہے۔ اور اگر ملاقات کے راستے میں فاصلے آ جائیں تو صرف محبت کرنے والوں کے بارے میں سوچ کر ہی چارجنگ فل ہو جاتی ہے۔ خدا کی رحمت کی قدر کریں بھلے سے وہ کسی بھی روپ میں ہو۔

ساتھیو! آیئے اب ہم اپنی محبتوں کو Refresh کرتے ہوئے احوال کا آغاز کرتے ہیں۔

✉ پشاور سے ہمارے ننھے دوست ساتھی جواد احمد اپنی محبتوں کو لیے احوال میں حاضر ہیں۔ لکھتے ہیں

حیران ہوتا ہوں کاشی بھائی اللہ نے آپ کو کتنی ہمت دی ہے؟ اللہ آپ کو خوش و خرم رکھیں۔ آپ سے ملنے کا دل کرتا ہے پر کیا کروں فرصت ہی نہیں ملتی۔ ایک دن ضرور آؤں گا آپ سے ملنے۔ مارچ کا شمارہ ملا پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ احوال میں بھی سب نے بہت اچھا لکھا۔ اب کہانیوں کی طرف آتا ہوں۔ سب سے بیسٹ کہانی جو تھی وہ مجید احمد جائی صاحب کی زبردست تحریر 'فرض نبھاتا ہوں' تھی اس کے بعد جو بہترین کہانی تھی وہ ممتاز احمد کی تحریر 'ملے کیوں جب بچھڑنا تھا' تھی اور باقی سب نے بھی بہت اچھا لکھا' داد دیتا ہوں۔ آپ سب لوگ اسی طرح 'سچی کہانیاں' میں شامل ہوتے رہیے گا۔ مجھے بہت پیار ہو گیا ہے 'سچی کہانیاں' سے اور سوچ رہا ہوں کہ میں بھی ایک کہانی لکھ کر 'سچی کہانیاں' کا حصہ بن جاؤں۔ آخر میں ایک بار پھر کاشی بھائی آپ کا بہت بہت شکریہ آپ نے رسالے کو چار چاند لگا دیے ہیں اور آپ سے مل کے رہوں گا ضرور۔ میرے اس خط کو احوال میں ضرور شامل کیجیے گا۔ آپ سب لوگوں کو سلام' دعا میں اور اگر زندگی نے وفا کی تو پھر احوال میں ملیں گے۔

☆ اچھے جواد! تمہاری آمد نے ہمیں بہت محظوظ کیا۔ جلدی سے یہ بتاؤ تم ہم سے ملنے کے لیے اجازت لے رہے ہو یا ہمیں دھمکی دے رہے ہو۔ 'سچی کہانیاں' کے دروازے تمہارے لیے ہر وقت کھلے ہیں۔ جب بھی کراچی آؤ ضرور ملنا۔ ہم تمہارے منتظر ہیں۔

✉ نواب شاہ سے یہ آمد ہے ہمارے بہت عزیز ساتھی محمد اسماعیل بروہی کی۔ عرض کرتے سر کاشی چوہان آپ کیسے ہو؟ (اللہ کا شکر ہے ہم ٹھیک ٹھاک ہیں) پرچہ وقت پر نہیں ملتا۔ کیا پڑھوں' کیا کہانیوں پر تبصرہ کروں۔ میں نے سالانہ خریداری کے لیے منی آرڈر بھیجا۔ پتا نہیں آپ ملا یا نہیں؟ مارچ کا شمارہ مجھے نہیں ملا اور سر میں آپ کے 'زہرِ عشق' کی پہلی قسط پڑھنے سے محروم رہ گیا۔ پلیز سر مجھے مارچ کا شمارہ روانہ کریں۔ اپریل میں 'زہرِ عشق' کی دوسری قسط پڑھی اور جیسے میں کہانی کے سحر میں کھو گیا۔ ویلڈن کاشی جی! چار بار آپ کا ناول پڑھ کر بھی میرا دل نہیں بھرا۔ سر کاشی میری کہانیوں کا کیا بنا؟ منزہ سہام اور کاشی جی آپ سے گزارش ہے کہ سب رائٹرز کو 'سچی کہانیاں' میں شائع ضرور کریں۔ 'سچی کہانیاں' سب کا ہے۔ سہام انکل سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتے تھے۔ بڑے رائٹرز اور چھوٹے رائٹرز' سب کی کہانیوں کو باری باری شامل کرتے تھے۔ ہم احوال میں تین ماہ سے حاضر نہیں ہوئے۔ لیکن کسی احوالی نے ہمیں یاد نہیں کیا۔ تحسین جونیجو بہن آپ کیسی ہو؟ مجید جائی' سدرہ انور جی آپ نے بھی ہمیں یاد نہیں کیا۔ فیصل ندیم آپ کیسے ہو۔ مسز نوید ہاشمی ہم بھی آپ کے بھائیوں جیسے ہی ہیں۔ نئے دوست سلمان' یاسر علی' ارم ناز' نوشین آراء' بتول خان نیازی اور ایم یعقوب کو دل سے خوش آمدید کہتے ہیں اور آخر میں خنا بشریٰ' ملک صفدر عباس' فرح انیس اور منشی محمد عزیز مئے کو سلام اور خدا حافظ۔

☆ اسماعیل! تم نے یہ کس طرح جان لیا کہ ہم رائٹرز کے درمیان کوئی تفرقہ رکھتے ہیں۔ 'سچی کہانیاں' سہام مرزا صاحب کا وہ پرچہ ہے جسے 'رائٹرز بورن پرچہ' کہا جاتا ہے۔ تمہاری کہانی اسی ماہ شاملِ اشاعت ہے۔ امید ہے دل برا نہ کرو گے اور ہاں! 'زہرِ عشق' بطورِ خاص آپ لوگوں کے لیے دل سے لکھا ہے۔ آپ کو پسند آیا ہماری محنت وصول ہو گئی۔

✉ ایم اے شکیل' ڈیرہ اللہ یار' بلوچستان سے اپنی عقیدت کے ساتھ شاملِ احوال ہے۔ لکھتے ہیں قابلِ احترام کاشی چوہان صاحب! آپ کی رنگا رنگ بزم ادب میں ایک بار پھر لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ امید ہے قریبی اشاعت میں جگہ دے کر ادب دوستی کا ثبوت دیں گے۔ 'پراسرار کہانی' میری زندگی کی پہلی تخلیق ہے۔ ویسے تو ادب کی دنیا میں گزرتے ہوئے عرصہ دس سال ہوئے ہیں مگر خوف ناک کہانی کبھی بھی نہیں لکھی اگر حوصلہ افزائی ہوئی تو آئندہ بھی لکھتا رہوں گا۔ ورنہ یہ سوچ کر لکھنا چھوڑ دوں گا کہ 'سچی

مبارک باد



پیارے قارئین! ہم آپ کے مشکور ہیں۔ آپ کی دعاؤں سے، رخسانہ سہام مرزا کی صحت میں بتدریج بہتری آ رہی ہے۔ زیر نظر تازہ تصویر اپنے قارئین کی نذر



ہماری پیاری بہن تابندہ سہام کو نئی زندگی میں قدم رکھنے پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد
بیٹے وقار تقریب سہام مرزا کی بڑی صاحبزادی رعنا سہام کے گھر ڈیلاس، امریکہ میں انجام پائی

کہانیاں' میں لکھنا میرے بس کی بات نہیں۔ آپ کی کہانی 'زہرِ عشق' زبردست چل رہی ہے۔ کیوں کہ آپ خود ایک ادب دوست ہیں۔

☆ اچھے شکیل! یہ تو بتاؤ کہ آپ ہی آپ یہ نتیجہ کیسے نکال لیا کہ 'سچی کہانیاں' میں لکھنا تمہارے بس کی بات نہیں۔ اچھی تحریر اپنی جگہ خود بنا لیتی ہے۔ ہم سب کے دوست ہیں اور جو ادب دوست 'ادب' کے نام پر کھلواڑ کرتے ہیں وہ اپنی موت آپ ہی مر چکے ہیں۔

✉ احوال میں یہ پہلی بار آمد ہے۔ نوشہرہ فیروز' خیبر پختونخوا سے ہماری قاری' ساتھی سنبل ناہید کی۔ لکھتی ہیں۔ میرا نام سنبل ناہید ہے اور میں نوشہرہ فیروز' خیبر پختونخوا کی رہنے والی ہوں۔ میں کئی سالوں سے 'سچی کہانیاں' پڑھتی ہوں میں اور میری امی اس کی دیوانی ہیں۔ مجھے لکھنے کا بہت زیادہ شوق ہے۔ اس سے پہلے کبھی کچھ لکھا نہیں بس 'سچی کہانیاں' سے بہت محبت ہے۔ اس لیے اِس کے لیے ایک کہانی لکھی ہے اگر میری کہانی کو آپ نے 'سچی کہانیاں' میں شائع کیا تو میں بہت فخر محسوس کروں گی۔ خوش رہیں' شاد رہیں اور کامیاب رہیں۔ میری دعائیں ہمیشہ 'سچی کہانیاں' کے ساتھ ہیں۔

☆ بہت اچھی سنبل! یقین مانو 'سچی کہانیاں' سے آپ کی دیوانگی کا پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ آپ کی کہانی کے بارے میں ان ہی صفحات پر مطلع کر دیا جائے گا۔

✉ نگین افضل وڑائچ' گجرات سے پہلی بار احوال کا حصہ بن رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ کسی بھی رسالے میں یہ میرا پہلا خط ہے۔ امید کرتی ہوں خوش آمدید کہا جائے گا۔ خط لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ 'سچی کہانیاں' بہت زبردست پرچہ ہے۔ آپ لوگ بہت اچھے ہیں۔ میں نے ایک غزل بھیجی تھی۔ جو فوری طور پر شاملِ اشاعت ہوگئی تھی۔ تب سے میں 'سچی کہانیاں' کی دیوانی ہوں۔ عائشہ نور عاشا میری بہن ہے۔ اب اجازت چاہوں گی۔

☆ پیاری نگین! جس طرح عائشہ اور آپ کی ہم نے حوصلہ افزائی کی۔ اسی طرح ہم اپنے تمام پیاروں کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ اگلے ماہ آپ کا تبصرہ ہم تک ضرور پہنچے۔

✉ ہماری شاعرہ ساتھی عائشہ نور عاشا' گجرات سے احوال کا حصہ بن رہی ہیں۔ لکھتی ہیں 'سچی کہانیاں' ماشاءاللہ سے اپنا معیار برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اللہ اسے ہمیشہ عروج عطا فرمائے۔ میرے امتحانات قریب ہیں۔ پلیز دعا کریں کہ میرے امتحانات اچھے ہو جائیں پھر کہانیاں کیا' شاعری کیا' احوال کیا' بھئی ہم ہر جگہ پائے جائیں گے۔ آپ کو کہانی اور شاعری ارسال کر رہی ہوں۔ پلیز جلد از جلد شمارے میں جگہ دے کر مجھے بھی شکریہ کا موقع فراہم کیجیے۔ اُف اللہ! لگتا کچھ بور ہو رہے ہیں آپ لوگ میری باتوں سے۔ اس لیے اللہ حافظ زندگی رہی تو پھر نصف ملاقات ہوگی۔

☆ عائشہ! ہماری دعا ہے کہ تم امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کرو اور پھر اپنا وعدہ ضرور پورا کرنا۔ احوال' کہانی اور شاعری...... ہم تمہارے منتظر ہیں۔

✉ راشد لطیف صبرے والا سے رقم طراز ہیں۔ ماہ اپریل کا 'سچی کہانیاں' بھائی شاہد رفیق سہو نے گفٹ کیا۔ ان کی کہانی 'پردیس مت جیئو' بہت پسند آئی۔ اس کے بعد 'زہرِ عشق' کاشی چوہان ان کی اسٹوری بہت اچھی تھی ان کے قلم میں جادو ہے۔ اس کے بعد 'فرض نبھاتا ہوں' مجید احمد جائی اچھی کہانی تھی۔ 'ٹکے کی ہانڈی' ایم یعقوب 'دنیا اک رنگا بھگت' اقرا سیف 'عجب ملن' فیصل ندیم بھٹی 'ہم شکل' ایم اے راحت 'ڈھونڈوں کہاں' سب کچھ مایا' پیر جی! مسئلہ یہ ہے' ہائیڈ پارک' تیر نیم کش' بہت ہی اچھے سلسلے ہیں۔ احوال میں سب دوست اچھا تبصرہ کر رہے تھے۔ 'سچی کہانیاں' کے لیے دعا گو ہوں۔

خواتین کی محبوب قلم کار

'رفعت سراج' کا تازہ ترین شاہکار 'دامِ دل'

رفعت سراج کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔
معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں جو قارئین کی دھڑکنیں بے ترتیب کر رہی ہیں۔

''ایمن'' ایک ایسی بہو کی کہانی، جسے دو بیٹیاں پیدا کرنے کے جرم میں ہر لمحہ ساس، سسر کے طنز اور طعنوں کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔

تازہ ترین قسط سے کچھ لائنیں

اے ہاں اپنے ان تحفوں کو اوپر ہی رکھا کرو۔ وہ تو شکل ہی دوسری ہوتی ہے جو چاند سا پوتا کھلنے کو دیتی ہے۔ مشکل سے پچاس ہزار کا جہیز لائی ہوں گی۔ پانچ لاکھ کے خرچے ڈال دیے ہم پر۔'' فردوس کی بڑبڑاہٹ زہر کی کڑواہٹ کے برابر تھی۔

''ارے پانچ لاکھ کہاں! جب تک یہ شادی کی عمر کو پہنچیں گی۔ ایک کی شادی پندرہ لاکھ میں پڑے گی۔'' حامد حسین نے لقمہ دیا۔

''پ...... پ...... پندرہ لاکھ......'' فردوس نے دھپ سے سینے پر ہاتھ مارا اور صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئیں۔ یوں گویا کوئی ان پر بندوق تانے کھڑا ہو اور کہہ رہا ہو۔ نکالو پندرہ لاکھ۔

''ارے کہاں سے لائے گا ہمارا بچہ تیس لاکھ؟'' وہ گویا پچھاڑیں کھانے لگیں۔

''آ سرا رکھو، دو تین اور ہو گئیں تو کروڑ کا بندوبست کرنا ہوگا۔'' حامد حسین نے زینہ چڑھتی ایمن کی پشت پر تاک کر نیا تیر چھوڑا۔ ایمن کو پاؤں اٹھانا دوبھر ہو گیا۔

جی تو چاہا پلٹ کر کہہ دے کہ جس نے انہیں ماں کے پیٹ کی اندھیری کوٹھڑی میں رزق دیا۔ آگے بھی وہی ذمہ دار ہے۔ جسے رب العالمین کہتے ہیں۔ جو ہماری تقدیر لکھتا ہے۔ جس کے لکھے کو نہ کوئی مٹا سکتا ہے نہ تبدیل کر سکتا ہے۔ مگر جی کی جی میں رہی۔ کچھ کہنے کا مطلب تھا کم از کم پندرہ دن کی جنگ تو چھڑ گئی۔ وہ شوہر کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ کو بھی ترس جائے گی۔ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔''

آج کے جدید دور میں بھی ایسے کردار ہر دوسرے گھر میں موجود ہیں۔ رفعت سراج عام بات کو خاص بنانا جانتی ہیں۔

'دامِ دل' ہر ماہ دوشیزہ ڈائجسٹ میں مسلسل شائع ہو رہا ہے۔

☆ راشد! ہم آپ کے لیے دعا گو ہیں کہ خدا آپ کو ہر ماہ احوال کا حصہ بنائے۔ شاہد رفیق آپ کا شکریہ کہ آپ کے پیارے دوست 'سچی کہانیاں' پڑھ رہے ہیں۔

✉ جھمرہ سٹی سے اے آر راحیلہ منظر پہلی بار شاملِ احوال ہیں۔ لکھتی ہیں سب سے پہلے 'سچی کہانیاں' رسالے کی تعریف کرنا چاہتی ہوں۔ ماشاء اللہ بہت اچھا رسالہ ہے۔ جتنی تعریف کی جائے کم ہے اور اس میں شائع ہونے والی سبھی کہانیاں تعریف کے قابل ہوتی ہیں۔ پیارے کاشی چوہان جی! کچھ ماہ پہلے مجھے یہ رسالہ پڑھنے کا اتفاق ہوا مجھے کسی دوست نے گفٹ کیا تھا۔ پڑھ کر بہت اچھا لگا تھا۔ اس کے بعد میں یہ رسالہ پڑھ نہ پائی کیونکہ ہمارے شہر میں یہ رسالہ نہیں ملتا۔ کاشی جی میں نے تب لکھنے کا سوچا تھا لیکن پھر لکھتے لکھتے رہ گئی۔ کچھ گھر کی مصروفیات اور کچھ زندگی کے حالات ایسے ہوئے کہ میں چاہ کر بھی قلم نہ اٹھا سکی۔ اب حالات کچھ بہتر ہوئے تو سوچا کچھ لکھ کے بھیجوں۔ آپ کے رسالے کے بہت ہی قابل رائٹر سردر شاذ صاحب سے اتفاقاً رابطہ ہوا۔ میں نے ان کی کہانی 'قتل' کی پہلی قسط پڑھی تھی۔ دوسری قسط رسالہ نہ ملنے کے سبب پڑھ نہیں سکی۔ اب انھوں نے مجھے اس رسالے میں لکھنے کو کہا ہے۔ کاشی جی انھوں نے کہا ہے آپ نئے لکھنے والوں کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ امید کرتی ہوں آپ میری بھی حوصلہ افزائی کریں گے۔ ایک چھوٹی سی تحریر بھیج رہی ہوں۔ اُمید ہے آپ میری غلطیاں درست کر کے اسے اپنے رسالے میں جگہ دے کر مجھے شکریے کا موقع دیں گے۔ آخر میں رسالے کی ترقی کے لیے دعا گو ہوں۔

☆ اچھی راحیلہ! خوش آمدید۔ آپ کے شہر میں رسالے کا نہ ملنا تشویش ناک بات ہے۔ خیر ہم پتا کرتے ہیں۔ باقی پرچے کی پسندیدگی پر شکریہ۔ آپ کی تحریر پڑھ کر جلد ان ہی صفحات پر مطلع کر دیا جائے گا۔

✉ ایم یعقوب ڈیرہ غازی خان سے احوال کا حصہ بن رہے ہیں۔ لکھتے ہیں...... چھوٹے تبصرے کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ کاشی بھائی جی میں بہت بہت شکر گزار ہوں۔ بڑے طویل انتظار کے بعد بندہ ناچیز کی اسٹوری کو جگہ ملی، تھینکس مجھے اس وقت پتا چلا جب ساہیوال سے ندیم عباس ڈھکو۔ شاہد رفیق سہو۔ معاویہ عنبر اور میرے معزز دوست راشد لطیف نے کال کر کے مبارکباد دی۔ 'سچی کہانیاں' لیا اور گھر آ کر پڑھا تو اور بھی مزہ آ گیا۔ جس کی وجہ سے میرے قابل دوست تھے۔ عبدالغفار عابد بڑے بھائی جی۔ مجید احمد جائی صاحب 'عجب ملن'، 'کل کس نے دیکھا گڈ' اور شاہد رفیق سہو صاحب ویری گڈ۔ حمیرا راحت، بابر نایاب، اسماء اعوان، اقراء سیف، م ص ایمن جی۔ بہت دیر کر دی۔ 'میں بانجھ ہوں' ایم اے راحت صاحب، ممتاز احمد، صائمہ نفیس اور جناب کاشی جی 'زہرِ عشق' ویلڈن بہت خوب۔ آپ سب کو مبارکباد اچھا لکھنے پر۔ او کے جی میری طرف سے کاشی جی محبت بھرا اسلام اور ڈی جی خان والوں آپ سب کو 'سچی کہانیاں' میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ کاشی بھائی میرے گھر میں اس وقت سب بیمار پڑے ہوئے ہیں۔ پلیز صحت یابی کے لیے دعا کیجیے گا۔

☆ پیارے یعقوب! خدا تم سب کو شفا عطا کرے۔ تبصرہ پڑھ کر ہمیں مزہ نہیں آیا۔ 'سچی کہانیاں' اتنا مختصر تو نہیں کہ اس پر چند سطریں لکھ کر ہاتھ کھینچ لیا جائے۔ امید ہے آئندہ خیال رکھو گے۔

✉ کبیر والا سے ہمارے ساتھی شاہد رفیق سہو احوال میں شریک ہیں۔ لکھتے ہیں...... 'سچی کہانیاں' بڑی بے تابی کے بعد ملا۔ ٹائٹل میں لڑکی بہت اداس تھی۔ خیر اس کو کوئی اپنی پریشانی ہوگی۔ اس کے بعد بڑا دہشت گرد کون تھا؟ کیا بات ہے منزہ سہام جی احوال میں ارم خان ڈی جی خان، شازیہ گل مانسہرہ، سدرہ انور علی جھنگ، منشی محمد عزیز اور بھائی مقصود احمد بلوچ میاں چنوں کا تبصرہ اچھا لگا۔ بھائی مجید احمد جائی میں کب آپ سے ناراض ہوں۔ ایم یعقوب آپ کا احوال تبصرہ اچھا رہا اور کہانیوں میں 'زہرِ عشق'

کی کیا بات ہے۔ میری طرف سے کاشی چوہان آپ کو بہت مبارک باد۔ آپ کی اسٹوری قابلِ تعریف ہے۔ اس کے بعد 'دنیا اِک اُجڑا بھگت' اقراء سیف۔ 'فرض نبھاتا ہوں' مجید احمد جائی 'ٹکے کی ہانڈی' ایم یعقوب 'کل کس نے دیکھا' معاویہ عنبر وٹو 'میری دلہن تم ہو' اسماء اعوان، پیر جی اقبال بانو 'کرچیاں' صائمہ نفیس کی کہانیاں زبردست تھیں۔ 'ناگن' اعجاز نواب اچھا ہوا اس کا اختتام ہوا۔ مسئلہ یہ ہے بابا جی لوگوں کے خوب مسائل حل کر رہے ہیں۔ تیر نیم کش میں سدرہ انور علی، منشی محمد عزیز دونوں چھا گئے۔ ہائیڈ پارک بھی اپنی مثال آپ ہیں اور آخر میں ایک بار پھر مبارک باد دیتا ہوں 'زہرِ عشق' کاشی چوہان 'قیامت سے پہلے' رضوانہ پرنس آپ دونوں کی کیا بات ہے۔

☆ شاہد پیارے! تبصرہ 'خونِ جگر' سے نہ لکھا کرو۔ ہمیں گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ تمہارے لیے، تمہاری محبت کے لیے بہت سی دعائیں۔ خوش رہو۔ (خط نیلے یا کالے پین سے لکھا کرو، سرخ پین استعمال مت کیا کرو)

✉ چوہدری پرویز کی احوال میں پہلی آمد ہے خانیوال سے۔ عرض کرتے ہیں ماہ اپریل کا شمارہ بھائی شاہد رفیق کے کہنے پر خانیوال سے خریدا۔ بہت ہی اچھا ڈائجسٹ ہے۔ 'بڑا دہشت گرد کون' میڈم منزہ سہام بہت اچھا لکھا۔ اس کے بعد احوال میں سب دوستوں نے اچھا تبصرہ کیا۔ کہانیوں میں سب کی بہترین کہانیاں تھیں۔ سب سے بیسٹ اسٹوریاں 'زہرِ عشق' کاشی چوہان صاحب' کیا کمال کی اسٹوری ہے۔ زندگی میں پہلی بار ایسی اسٹوری پڑھنے کو ملی۔ دوسرے نمبر پر شاہد رفیق سہو کی کہانی 'پردیس مت جیو' زبردست تھی۔ اب میں ہر ماہ 'سچی کہانیاں' پڑھوں گا۔ کیوں کہ اس میں شائع ہونے والی کہانیوں کا ہر موضوع بہت منفرد ہوتا ہے۔ کاشی بھائی آپ خوب محنت کر رہے ہیں۔ اگلے ماہ تک اجازت۔

☆ بھائی پرویز! خوش آمدید۔ خدا کرے ہر ماہ آپ کا تبصرہ ہمارے ہاتھوں میں ہو۔ اب آپ ہر ماہ پرچہ پڑھ کر ہماری کارگزاری پر ہمیں تنقید اور تعریف سے نوازتے رہیں گے۔

✉ فلک زاہد، لاہور سے۔ پہلی بار احوال میں حاضر ہو رہی ہیں لکھتی ہیں۔ اسلام علیکم...... سچی کہانیاں کی محفل میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں۔ اگر حوصلہ افزائی ہوئی تو آئندہ بھی حاضر ہوتی رہوں گی۔ پہلی بار 'سچی کہانیاں' دسمبر 2014ء کا پراسرار نمبر پڑھا جو بہت ہی پسند آیا، تب سے ہی یہ پراسرار نمبر میرا پسندیدہ بن گیا ہے۔ میری عمر سترہ سال ہے۔ تقریباً بارہ سال کی عمر سے میں نے لکھنا شروع کیا اور اب تک کئی ڈائجسٹوں میں لکھ چکی ہوں۔ پہلی بار 'سچی کہانیاں' کے لیے قلم اٹھایا ہے وہ بھی صرف اور صرف پیارے بھائی معاویہ عنبر وٹو کے حوصلہ دینے پر۔ کاشی بھائی امید ہے آپ کو میری کہانی مایوس نہیں کرے گی۔ اب اجازت دیجیے۔ اللہ حافظ۔

☆ پیاری فلک! خوش آمدید! سچی کہانیاں آپ کا اپنا پرچہ ہے۔ انشاء اللہ آپ کی کہانی معیاری ہوئی تو ہم اس کی نوک پلک سنوار کر جلد شائع کرنے کی کوشش کریں گے ورنہ...... اور ہاں...... گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں۔ تبصرہ ہر ماہ آنا چاہیے۔

✉ کراچی سے ہماری بہت پیاری احوالی ساتھی فرح انیس عرض کرتی ہیں۔ کاشی بھیا (سب بھیا کہتے ہیں تو میں بھی بھیا کہہ سکتی ہوں نا؟)۔ اپریل کا شمارہ قدرے تاخیر سے ملا اس لیے تبصرہ کرنے سے قاصر رہی۔ احوال میں سب ہی کے تبصرے اچھے ہوتے ہیں۔ تحریریں بھی سب زبردست تھیں۔ مئی کا شمارہ 30 تاریخ کو مل گیا تھا۔ احوال میں سب کی آمد ہمیشہ کی طرح خوب تر رہی۔ سب کے خطوط

زبردست ہیں۔ منعم اصغر آپ کے شکریہ کا ایک بار پھر شکریہ ہاہاہا۔ ارم ناز، عروج فاطمہ، الماس فاطمہ ارمان، بتول خان نیازی، کاشف عبید سب ہی کی تحریریں اچھی رہیں۔ محمد یوسف لغاری کی تحریر زبردست تھی۔ ویلڈن! جناب خدا کرے آپ کی اس تحریر سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو سیدھی راہ مل جائے (آمین)۔ سائرہ فاطمہ کی تحریر پڑھ کر بے ساختہ آنکھیں نم ہوگئیں۔ بیٹیاں بہت پیاری ہوتی ہیں۔ کاش لوگ اس بات کو سمجھ لیں۔ منعم اصغر کی تحریر بہت اچھی تھی۔ ظالم کا ظلم سہنا بھی گناہ ہے۔ تین مرد تین کہانیاں میں مجید احمد جائی کی آپ بیتی بہت اچھی تھی۔ عادل حسین کی تحریر بھی اچھی تھی۔ عالیہ حرا کی تحریر دل کو دکھی کر گئی۔ مہنگائی مہنگائی ہے۔ یہ عفریت کی طرح لوگوں کو کھا رہی ہے۔

زہر عشق کی ہر قسط نہایت دلچسپ اور تجسس آمیز ہوتی ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ نیر نیم کش میں سب کے اشعار زبردست تھے۔ باقی شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ کچھ تحریریں ابھی پڑھی نہیں مگر امید ہے وہ تحریریں بھی زبردست ہوں گی۔

☆ فرح! تبصرہ اچھا کیا۔ اور رہی بات قینچی کی تو...... اگر قینچی چلے گی تو...... سب کا بھلا ہوگا...... سلامت رہو۔

✉ یہ آمد ہے سرگودھا سے ہمارے بہت پیارے لکھاری دوست ممتاز احمد کی، لکھتے ہیں۔ بخشش ومغفرت کی نوید سناتا، لاکھوں برکتیں، رحمتیں اور بیش بہا قیمتی ساعتیں لے کر رمضان المبارک کا مہینہ آرہا ہے تو سب کی خدمت میں ایڈوانس مبارکباد پیش کرتا ہوں اور رب کریم کی بارگاہ میں التجاء اور دعا ہے کہ ہم سب کو اس ماہ مقدس کی برکتیں سمیٹنے، اس مہینے کا ادب واحترام اور عبادات کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ کاشی بھائی میں بہت سخت ناراض ہوں۔ ظلم کی انتہا دیکھو میرے پورے کے پورے دو عدد خطوط، تازہ تصویر، اشعار مسلسل غائب ہیں۔ کیوں جی......؟ میرے خطوط آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔ جناب میں روزانہ اڑھائی سو کلومیٹر کا سفر اپنی سرکاری ڈیوٹی کے سلسلہ میں کرتا ہوں۔ صبح ساڑھے چھ بجے گھر سے نکلتا ہوں اور شام سات بجے تھکن سے چور گھر لوٹتا ہوں اور پھر رات ایک سے دو بجے تک جاگ کر 'سچی کہانیوں' کے لیے کہانیاں لکھتا ہوں۔ تو جناب اتنی محنت اور خلوص سے لکھے ہوئے میرے خطوط اور دیگر تخلیقات آخر کہاں گئیں؟ بس میں ناراض ہوں اور بطور احتجاج کسی کہانی پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ اور ہاں آپ کی کچھ اپنی باتیں اس بار بھی غائب ہیں؟ لگتا ہے 'سچی کہانیاں' کے دفتر کے سامنے دھرنا دینا پڑے گا۔ بہرحال میری طرف سے احتجاج...... احتجاج...... احتجاج...... جب تک کاشی چوہان کی کچھ اپنی باتیں 'سچی کہانیاں' کے صفحات کی زینت نہیں بنیں گی۔ احتجاج جاری رہے گا۔ پلیز میرے خطوط کا کھوج بھی لگائیں۔

☆ ممتاز بھائی! یقین کرلیں ہمیں خود آپ کے تبصروں کا انتہائی افسوس رہا مگر یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ آپ کے خطوط مع تصویر کہاں گئے۔ کچھ اپنی باتیں...... ہم آپ سے کر تو رہے ہیں۔ اپنا خیال رکھیں۔ آج کل کس کی صحبت میں بیٹھ رہے ہیں۔ آپ کی طرف سے کہانیاں بہت زبردست آرہی ہیں۔

✉ افتخار بھٹی، ڈسٹرکٹ جیل ملیر، کراچی سے ہمارے نئے احوالی کے ساتھی ہیں۔ لکھتے ہیں۔ میں افتخار بھٹی ڈسٹرکٹ جیل ملیر لانڈھی سے ایک چھوٹی سی کہانی لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ اگر یہ آپ کو مل جاتی ہے تو برائے مہربانی ایک قیدی کی یہ کہانی لازی شائع کرنا۔ آپ یہ سوچنا میں نے جیل میں کاغذ قلم کا کس طرح انتظام کیا ہوگا۔ پھر ٹائم نکال کر آپ کو لکھا۔ میری کہانی لکھاریوں والی نہیں ہے کیوں کہ میں پہلی بار لکھ رہا ہوں۔ میں جیل میں ہر ماہ پابندی سے 'سچی کہانیاں' منگوا کر پڑھتا ہوں۔ اگر میری لکھی ہوئی کہانی آپ نے مئی کے

پراسرار کہانی نمبر 2

Email : pearlpublications@hotmail.com

پراسرار نمبر 1 کی پذیرائی کے بعد پراسرار نمبر 2

ایک ایسا شاہکار شمارہ جس میں دل دہلا دینے والی وہ سچ بیانیاں شامل ہیں جو آپ کو چونکنے پر مجبور کر دیں گی۔

آپ کے اُن پسندیدہ رائٹرز کے قلم سے، جو آپ کی نبض شناس ہیں۔

جن کی کہانیوں کا آپ کو انتظار رہتا ہے۔

جنوں، بھوتوں اور ارواحِ خبیثہ کی ایسی کہانیاں جو واقعی آپ کو خوف میں مبتلا کر دیں گی۔

ہمارا دعویٰ ہے!

اس سے پہلے......

ایسی ناقابلِ یقین، دہشت انگیز اور خوفناک کہانیاں شاید ہی آپ نے پڑھی ہوں۔

آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال پر اپنی کاپی مختص کرا لیں۔

سچی کہانیاں کا ماہِ اگست کا شمارہ، پراسرار نمبر 2 ہوگا۔

نوٹ: پراسرار نمبر 2 کے لیے کہانیاں بھیجنے کی آخری تاریخ 5 جون ہے۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرما لیں۔

شمارے میں چھاپ دی تو انشاء اللہ میری اگلی کہانی اس سے زیادہ اچھی ہوگی اور میں باقاعدہ جیل کا احوال لکھتا رہوں گا۔ آپ کی دعاؤں کا طلب گار۔

☆☆ افتخار بھٹی! خدا آپ کو قید و بند کی صعوبتوں سے نجات دلائے۔ آپ کی آمد ہمارے لیے بہت خوشگوار ہے۔ ہمیں ہر ماہ آپ کے تبصرے اور جیل کے احوال کا انتظار رہے گا۔ آپ کی کہانی اس ماہ شاملِ اشاعت ہے۔

✉ یہ آمد ہے سرگودھا سے ہماری بہت اچھی صائمہ بشیر کی۔ لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! مئی کا شمارہ بذریعہ ڈاک تیس اپریل کو موصول ہوا۔ اس قدر خوبصورت ٹائٹل واہ۔ ماڈل کی سج دھج دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ اداریہ بعنوان 'ہم کون لوگ ہیں' میں منزہ سہام نے سلگتا سوال کیا ہے۔ اور جواب مانگا ہے تو بات یہ ہے کہ ہمارے آباؤاجداد تو ایسے ہرگز نہ تھے، بس بے حسی اور خودغرضی شاید خون میں رچ بس گئی ہے۔ احوال میں اپنا خط دیکھ کر ایک خوشگوار احساس ہوا کہ کاشی نے چھوٹا بھائی ہونے کا حق ادا کردیا۔ احوال حسبِ معمول احوالیوں کے خوبصورت خطوط اور تبصروں سے جگمگا رہا تھا۔ عظمیٰ شکور یہ کیا؟ سرگودھا چھوڑ کر اسلام آباد کیوں چلی گئیں؟ سب بہن بھائیوں کے خطوط اور تبصرے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ مسز نوید ہاشمی حسبِ معمول خوبصورت اور بہترین تبصرے کے ساتھ احوال میں موجود تھیں۔ بھائی منشی عبدالعزیز مئے، بھائی عبدالغفار عابد اور منائل زہرہ کے تبصرے بہت عمدہ اور شاندار تھے۔ رضوانہ کوثر کا خط اور شاعری بہت منفرد لگی، بہت پسند آئی۔ ابھی شمارہ پڑھنا شروع کیا ہے، صرف چند ایک کہانیوں کا مطالعہ ہی کرسکی ہوں۔ چھوٹے بھائی ممتاز احمد کی کہانی 'تاوان زندگی کا' نے دل موہ لیا بہت زبردست کہانی تھی۔ عروج فاطمہ کی 'معجزے اب بھی ہوتے ہیں' ایک اچھی کاوش تھی۔ ارم ناز کی 'کچرا سارا میرا ہے' سچی محبت کی بہترین کہانی تھی۔ بھائی مجید احمد جائی اس بار ایک خوبصورت تخلیق 'وہ میرا طبیب خاص' کے ساتھ موجود تھے۔ بھائی عادل حسین کی 'غلام مصطفیٰ' دل کو چھو گئی۔ اب تک اتنا ہی پڑھ سکی ہوں۔ انشاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی۔ تب تک کے لیے اللہ نگہبان۔ تمام قارئین کرام کو صائمہ آپی کا سلام اور ماہ رمضان المبارک کی ایڈوانس ڈھیروں مبارکباد۔

☆ صائمہ آپی! تبصرے کا دل سے شکریہ۔ آپ کی کہانی کا انتظار ہے۔

✉ کراچی سے ہماری بہت عزیز لکھاری ساتھی سیمیں غزالہ نیہاں عرض گزار ہیں۔ طویل انتظار کے بعد مجھے احوال میں جواب ملا کہ میری کہانی 'نور ہدایت' آپ تک پہنچی ہی نہیں۔ حالانکہ میں ارجنٹ پوسٹ کرتی ہوں۔ اب میں نے اپنی یادداشت پر زور دے کر دوبارہ کہانی لکھی ہے۔ پلاٹ تو سچ پر مبنی ہے کیونکہ یہ میری ساتھی ٹیچر کا واقعہ ہے۔ لیکن الفاظ تو دوبارہ یاد نہیں آتے اور میں اپنے پاس ریکارڈ نہیں رکھتی۔ اب رکھوں گی۔ احوال میں تو ہر مہینے شرکت کے لیے تیار ہوں مگر اتنے سارے احوالیوں میں میرا نمبر لگے گا؟ وہ پرانے لکھاری کہاں چلے گئے...... جو بہترین کہانیاں تخلیق کرتے تھے۔ اب بہت کم نظر آرہے ہیں۔ اس ماہ میں منزہ صاحبہ کا اداریہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ واقعی ایسا لگتا ہے ہم بے حس ہوگئے ہیں۔ اصل میں ہم دوسروں سے بہت مرعوب ہیں اور امریکی مقولہ ہے کہ 'زندگی گزارنے کے لیے بے حسی بڑی نعمت ہے۔' 'تھری جی' لمحہ فکریہ ہے۔ 'کچرا سارا میرا ہے' بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ خاندانی فطرت خون میں شامل ہوتی ہے...... 'پرندہ راستہ بھولا ہوا تھا' بہترین کہانی ہے مگر ناقابلِ یقین...... لوگ تو اپنی غلطی ہی تسلیم نہیں کرتے ہیں...... مگر حماد نے سحرش کو اس کی غلطیوں کے باوجود اپنا کر فرشتہ ہونے کا ثبوت دیا...... 'ہوا کا رخ بدلنا چاہتی ہوں' منعم اصغر نے بہترین تخلیق

کیا...... مگر چٹان جیسی سخت اور فولاد جیسی مضبوط صائمہ آخری لمحات میں اپنی فطرت کے مطابق پگھل گئی...... عورت اگر باہمت ہو ہی گئی ہو تو ہمت ہارنی نہیں چاہیے...... اس کو عارف کو قبول نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مرد ظلم بھی کریں اور مظلوم بھی بن جائیں۔ صائمہ نے عارف کو قبول کر کے ناقص العقل ہونے کا ثبوت دے دیا۔ موتیا کے آپریشن نے جہاں دور کی خراب نظر صحیح کر دی وہیں قریب کی صحیح نظر بہت کمزور ہو گئی۔ اس لیے پڑھتے ہی تکلیف ہوتی ہے۔ باقی کہانیاں آہستہ آہستہ پڑھوں گی۔

☆ اچھی غزالہ جی! انشاء اللہ بہت جلد آپ کی کہانی بھی شمارے کا حصہ ہو گی۔ احوال میں آپ کا نمبر ہر ماہ آئے گا بس تبصرہ بھیجنا شرط ہے۔

✉ سدرہ انور علی جھنگ صدر سے۔ احوال کا حصہ بن رہی ہیں لکھتی ہے۔ عزیز از جان بھیا کاشی چوہان! ڈیئر سسٹرز، برادرز، اینڈ آل اسٹاف اسلام علیکم! میں آپ سب لوگوں کی خیریت وعافیت اور سلامتی ایمان کے لیے دعا گو ہوں۔ صائمہ بشیر، ثمینہ فرخ، محمد ندیم عباس، یاسر وکی، مناہل زہرہ کو احوال میں خوش آمدید۔ شائستہ جمال، ملکہ احوال تحسین جونیجو اور سسٹر زرینہ آپی، کنول عمران، فریدہ فری یوسف کی غیر حاضری سے ذرا مزہ نہیں آیا قسم سے۔ ڈیئر ثمینہ فرح آنٹی جان اسلام علیکم! کہانی اور تبصرے کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے، مگر تیری محفل میں ہم نہیں ہوں گے۔ پتا ہے کب؟ جب ہم مر جائیں گے اس سے پہلے 'سچی کہانیاں' کو چھوڑ نہیں سکتے۔ کیونکہ 'سچی کہانیاں' ہمارے پل پل کا ساتھی ہے۔ ایسا ابتداء سے ہی ہوتا ہے ہم سے پہلے اور لوگ 'سچی کہانیاں' کی رونق ہوا کرتے تھے، وہ چلے گئے پھر ہم آ گئے۔ ایک دن آئے گا جب ہم بھی چلے جائیں گے۔ پھر نئے لوگ ہوں گے۔ نئے چہرے ہوں گے جو سچی کہانیاں کو آباد کریں گے۔ مور شاہد حسین بھیا، میں اپنے بھائی کو کیسے بھول سکتی ہوں بھلا۔ سلامت رہیے۔ منعم اصغر، شاہد رفیق، محمد یعقوب تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ فیصل ندیم اسلام علیکم کیسے ہو آپ؟ ملکہ احوال جی لگتا ہے پھر کوئی مصروفیت آڑے آ گئی۔ جہاں رہے خوش و آباد رہیں۔ منزہ آنٹی کے ادارہ 'ہم لوگ کون ہیں' میں جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اسماء اعوان کی 'لائف بوائے ایک سچا ساتھ' بہت کامیاب کمرشل اور اچھی تحریر پیش کی۔ ویلڈن اسماء نمایاں شخصیت میں احمد سجاد، باہر مونیکا لیونسکی کی داستان لے کر آئے، کوئی انسان شاطر نہیں ہوتا بس۔ وقت اور حالات اس کو ایسا کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے۔ جو سنتا ہے اسی کی داستان معلوم ہوتی ہے۔ سلیم اختر انکل کی 'ادھورے لوگ'۔ ارشد علی کی 'صنم تیرے لیے چلے آئے' ہم 'معجزے اب بھی ہوتے ہیں'۔ منعم اصغر کی 'ہوا کا رخ بدلنا چاہتی ہوں' اس کے علاوہ کاشف عبید کی 'محبت مر گئی' مومنہ بتول کی 'ٹشو پیپر پہ لکھے دکھ' سائرہ فاطمہ کی 'بھلا میں کون ہوں؟' محمد یوسف کی 'تھری جی' دستگیر شہزاد کی 'گرد صحراہوں میں' احمد علی کی 'پرندہ راستہ بھولا ہوا تھا' رئیسہ خالد کی 'چراغ وفا جلاؤں' اس شمارے کی بہترین اور سبق آموز تحریریں تھیں۔ جاوید راہی کی 'کس جرم کی پائی ہے سزا' ایسا اکثر ہوتا ہے ہم بے گناہ ہوتے ہیں پھر بھی جیلوں میں آتے ہیں۔ تین مرد تین کہانیاں۔ مجید احمد جائی کی، 'وہ میرا طبیب خاص' عادل حسین کی 'غلام مصطفیٰ' عالیہ حرا کی 'مردم گزیدہ' تینوں تحریریں پسند آئیں۔ کاشی بھیا کی 'زہر عشق' بہت ہی ناقابل فراموش لاجواب ہے۔ ہائیڈ پارک میں سبھی کے انتخاب بہترین تھے۔ 'ترنم کش' میں سبھی کے اشعار پسند آئے۔ ماہ مئی کا پورا پرچہ ہی لاجواب

لگا اور اس سب کا کریڈٹ کاشی بھیا آپ کو ہی جاتا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے آپ سے اجازت لینے کا اس بات کے ساتھ کہ ایک دوسرے کو دعاؤں میں یاد رکھا کیجیے۔

☆ اچھی سدرہ! گڑیا تمہارا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ بیٹا تمہاری کہانی ہمیں مل نہ سکی۔ دوبارہ بھیجو۔

✉ پتوکی سے یہ آمد ہے ہمارے حافظ دوست محمد ندیم عباس میوانی کی لکھتے ہیں۔ اللہ رب العزت کے فضل و کرم سے بالکل خیر و عافیت سے ہوں اور فضل ربی کے طفیل امید رکھتا ہوں کہ آپ اور آپ کے اہل خانہ بھی خیر و عافیت سے ہوں گے۔ موسم گرما سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔ اوہ ارے سوری بھائی جان گرمی آپ کے پاس کہاں! گرمی میں جلنے کے لیے تو ہم پنجاب والے ہیں نا۔ آپ کے ہاں تو ہر وقت سمندر کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔ چلو آم کا موسم تو آ ہی گیا۔ نا خوب مزے سے خود کھانا اور اپنے اہل خانہ کو کھلانا۔ بھائی جان! آپ نے مجھے عزت دی حوصلہ افزائی کی۔ اس پر میں آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ مجھے آپ سے بات کر کے بہت ہی اچھا فیل ہوتا ہے۔ میرے دل میں آپ کی بہت قدر ہے۔ میں اس دن کا بے چینی سے منتظر ہوں جس دن آپ سے ملاقات ہو گی اور آپ پنجاب آؤ گے۔ میں اپنے بارے میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں حافظ قرآن ہوں۔ اب عالم کا کورس کر رہا ہوں اور ساتھ میں ایف اے بھی کر رہا ہوں۔ وقت کی قلت اور تبصرہ اچانک لکھ رہا ہوں اس لیے آپ شان کے مطابق تو کچھ بھی نہ لکھ پایا۔ آپ بہت اعلیٰ انسان ہے۔ میرے 7 مئی کو ایف اے کے پیپر ہیں جو کہ 22 مئی تک جائیں گے اور عالم کورس کے 16 مئی سے 21 تک ہیں۔ ہے نا چھوٹی سی جان پر ظلم۔ اس لیے آپ سے دعاؤں کی اپیل ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی غلطیاں ہوں گی کیونکہ ٹائم کم ہے

جلدی میں لکھا ہے۔ پلیز درست کر کے پڑھ لینا۔ (ہاہاہا)

☆ اچھے میوانی ندیم! کبھی آؤ نہ گرمیوں کے مزے لینے کراچی۔ تبصرہ کہاں ہے۔ اس بار تو معاف کیا مگر امتحانات سے فارغ ہو کر آپ کو معافی نہیں ملے گی۔ یہ لو ایک بڑی لہر آئی سمندر کی اور ہم اب تمہارے اگلے تبصرے کے انتظار تک سمندر میں ڈبکی مار کر آتے ہیں۔

✉ مجید احمد جائی۔ ملتان شریف سے احوال میں حاضر ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ماہ مئی کا 'سچی کہانیاں' پوری آب و تاب کے ساتھ ملا احوال میں 29 لیٹرز شامل حال تھے۔ چند پرانے لوگوں کے ساتھ ساتھ باقی نئے لوگ تھے۔ ہم ویلکم کرتے ہیں لیکن پرانے کہاں کھو گئے۔ جن سے محفلیں سجتی تھیں۔ جن سے بہاریں تھیں۔ ممتاز احمد سرگودھا، مبارک علی شمسی، صفدر علی حیدری، رانا شاہد، محمد سلیم اختر، شعبان کھوسہ اور نی میل سبھی پرانے پلیز لوٹ آ ئیں۔ لوٹ آئیں۔ لوٹ آئیں۔ بندہ ناچیز نے برقی احوال بھیجا تھا۔ غائب ہی ہوگا۔ ایسا نہ کیجیے جی۔ ناقابلِ اشاعت کی لسٹ لگا کر دل جیت لیا۔ اس سے انتظار کی لذت سے چھٹکارا مل جائے گا۔ میں دیکھ رہا ہوں کئی اپنوں کے روپ میں دشمن شامل ہو گئے ہیں۔ حاسدین حسد کی انتہا کر رہے ہیں۔ تنقید کرو برائے اصلاح، جس سے لکھنے والے مزید بہتری لاسکیں۔ ماہ اپریل کے احوال پر بہت سے کالز آئیں۔ جس میں مجھے کاشی چوہان کا چمچہ کہا گیا۔ چاپلوسی کرنے والا کہا گیا۔ کاشی بھائی، خود ہی بتا دیجیے۔ میں چاپلوسی کرتا ہوں۔ چمچہ گیری کرتا ہوں۔ محبت، چاہت، پیار کا نام چاپلوسی ہے تو ہزاروں سلام ہیں۔ ہم 'سچی کہانیاں' سے لوٹ جاتے ہیں۔ نہ میری ایڈیٹر حضرات سے دشمنی ہے نہ لکھاریوں سے، لیکن ان سے کہہ دیں خدارا! حسد سے کام مت لیں۔ یہ زہر ہے۔ جو رگوں میں پھیل کر محبت ناپید کرتا ہے۔ کاشی بھائی۔ دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ احوال لکھتے ہوئے۔ کہانیوں میں تاوان زندگی کا ممتاز احمد نے کمال کر دیا۔ پلیٹ فارم پر خوشیاں اور غم ملے۔ آصف نے ایمانداری سے مقام پایا لیکن اس کا بھائی غلط راہ اپنا کر موت کے حوالے ہو گیا۔ ویلڈن ممتاز احمد صاحب۔ 'وہ مرا طبیب خاص' میراز الٰہی سچائی پر مبنی کہانی لگا کر مقروض کر دیا۔ آپ کا شکریہ۔ غلام مصطفیٰ، پرندہ راستہ بھولا، تھر کی جی۔ کر دھرا ہوں بس۔ ادھورے لوگ۔ لائف بوائے اور تیرا عکس شاندار رہیں۔ باقی زیر مطالعہ ہیں۔ لکھاریوں سے معذرت۔ 'زہرِ عشق' کاشی بھائی خوب قلم کے ساتھ انصاف فرما رہے ہیں۔ برطانیہ میں خزاں چوتھا حصہ خوب رہا۔ ہم مفت کی سیاحت کے مزے لیتے رہے۔ نیویارک، تیرہم کشش شاندار ہے۔ غزلیات کا کالم ہونا چاہیے۔ کس جرم کی سزا زبردست رہی۔ 'سچی کہانیاں' لکھاریوں، دوستوں، دشمنوں، حاسدین کے لیے ہمہ تن دعا گو ہوں۔ جہاں رہیں سلامت رہیں۔ محبتیں عام کریں۔ نفرت کو موت دیں۔

☆ پیارے مجید! سلامت رہو! اپنا کام کرتے رہو۔ محبت سب سے بڑی ڈھال اور سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اُمید ہے دل چھوٹا نہیں کرو گے۔

✉ ہمارے بہت پیارے مور شاہد دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد احوال میں تشریف لائے ہیں۔ عرض کرتے ہیں۔ ان گنت دعاؤں نیک تمناؤں اور پرخلوص جذبوں کے ساتھ الفت بھرا سلام قبول ہو۔ مئی کا شمارہ خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ موصول ہوا۔ محترمہ کے بال ہمیں اپنی شہزادی کی یاد دلا گئے۔ خیر اگلے اشتہارات نظر انداز کر دیے۔ منزہ سہام باجی کے اداریہ 'ہم کون لوگ ہیں' نے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ بے تابی سے ہم نے محفلِ احوال میں قدم رکھا۔ ہمیشہ کی طرح آپ احوال میں رونق بکھیر رہے تھے۔ سب سے پہلے عمر گولہ سے ملاقات ہوئی۔ عظمیٰ شکور، عادل حسین، شی محمد عزیز، ایم یعقوب بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ علی سنین بھیا خدا آپ کے والد

صاحب کو مکمل صحت دے۔ ندیم عباس میواتی ہمیں بھی سرخ گلابوں کا گلدستہ بھیجو نا۔ صائمہ بشیر، ثمینہ فرح، یاسر وکی، مناہل زہرہ، احسن عمرانی، محفل اُحوال میں بھلی کر لے آیا (خوش آمدید) فیصل ندیم بھٹی بھیا گڑیا رانی، سندرہ انور و اسلام سدا خوش سلامت رہو۔ ملکہ احوال ادی تحسین جونیجو آپ کے بغیر محفل کی رونق پھیکی پھیکی لگ رہی ہے۔ عبدالغفار عابد بھیا ہم آ گئے ہیں۔ مسز نوید ہاشمی آپی بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر رب سائیں آپ کو بے شمار خوشیوں سے نوازے۔ امجد علی بھیا و یلکم بیک گلے لگ جاؤ۔ مجید احمد بھیا، صفدر علی بھیا، آپی زرینہ جونیجو، محمد اسماعیل بروہی آپ کی شدت سے کمی محسوس ہوئی۔ کاشی بھیا آپ نے خوبصورت نظم کے ساتھ محفل اختتام کی۔ سمندر کو کوزے میں بند کرنا کوئی آپ سے سیکھے۔ اسماء اعوان اس بار لائف بوائے لائیں زبردست۔ احمد سجاد بابر نے مونیکا لیونسکی کی بپتا بیان کر کے کمال ہی کر دیا۔ 'ادھورے لوگ'، کچرا سارا میرا ہے، دل کو چھو گئیں۔ معجزے اب بھی ہوتے ہیں۔ تیرا ہی عکس ہے۔ منتظر سویرا ہے۔ ہوا کا رخ بدلنا چاہتی ہوں۔ عمدگی سے پیش کی گئی کہانی میں محبت مر گئی ہے۔ ٹشو پیپر پر لکھے دکھ اچھی تھی۔ میں بھلا کون ہوں آپ بیتی لکھی خدا ان کو خوشیاں دے۔ محمد یوسف لغاری ٹھری جی بہترین درس دیا۔ ایم اے راحت ہم شکل، شہد کی مٹھاس، لبوں کی کھٹاس معلوم ہوتی ہے۔ دستگیر شہزاد کی گردِ صحرا ہوں بس، احمد علی عاقل، پرندہ راستہ بھولا ہوا تھا، رئیسہ خالد چراغ وفا جلاؤں کہاں زبردست تھیں۔ محمود شام برطانیہ میں خزاں یوں محسوس ہوا جسے پڑھتے ہوئے ہم ان کے ساتھ تھے۔ جرم کہانی جاوید راہی کس جرم کی پائی ہے سزا بڑی انوکھی ثابت ہوئی۔ ممتاز احمد تاوان زندگی کا لے دل کو چھو لیا۔ مرد کہانی مجید احمد جائی وہ میر اطبیب خاص عادل حسین، غلام مصطفیٰ، عالیہ حرا، مردم گزیدہ ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ کاشی چوہان زہرِ عشق، قاری پوری طرح اس کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش دلچسپ سلسلہ ہیں۔

☆ پیارے مور! تمہاری احوال سے غیر حاضری ہمیں بالکل اچھی نہیں لگ رہی۔ پلیز اب تھوڑا مصروفیات میں سے وقت نکال کر پرچے کو دو۔

✉ یہ احوال میں بڑے دنوں بعد آمد ہو رہی ہے۔ ہماری بہت معصوم سی شاعرہ اور لکھاری دوست فریدہ فری کی لاہور سے۔ لکھتی ہیں۔ 'سچی کہانیاں' اپنے دلفریب ٹائٹل کے ساتھ 4 تاریخ کو ملا۔ ہم ابھی پنڈی میں ہی تھے کیونکہ 25 اپریل کو ہم ایوارڈ لینے اسلام آباد گئے تھے۔ کاشی بھائی ہمارا آٹھواں ایوارڈ ہے۔ کاشی بھائی آپ واپس آ گئے بے حد خوشی ہوئی۔ مگر یہ سخن آباد کا سلسلہ کیوں بند کر دیا۔ ہم جیسے تو بس شاعری ہی کر سکتے ہیں۔ اسٹوریاں تو بہت ہیں مگر تھوڑی سستی ہے۔ سب نے بہت اچھا لکھا کہانیاں بے حد پسند آئیں مگر اگلے ماہ پھر پراسرار کہانی نمبر ہوگا۔ پراسرار کہانیاں ہمیں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ آپ کا ناول 'زہرِ عشق' بہت ہی اچھا لگا۔ پڑھ کر مزہ آ گیا مبارک ہو۔ کہانیوں میں مومنہ بتول کی کہانی 'ٹھری'، سلیم اختر کی کہانی 'ادھورے لوگ' ایم اے راحت صاحب کی 'ہم شکل' تو بے حد اچھی لگتی ہے۔ غلام مصطفیٰ بھی ٹھیک تھے۔ ابھی اتنی کہانیاں ہی پڑھی ہیں۔ ہمیں گرمی بہت زیادہ لگتی ہے اور ہم بے حد بیمار ہیں۔ بس اتنا ہی لکھا جا رہا ہے۔ منزہ سہام کو بے حد سلام دعا تمام رائٹرز۔ قارئین کو بے حد سلام اور دعائیں۔

☆ پیاری فریدہ آپی! آپ کا اتنا لکھنا ہی ہمارے لیے خوشیوں کے دیپ جلا دیتا ہے۔ خدا آپ کو تندرستی عطا کرے۔

✉ منعم اصغر، ڈیرہ غازی خان سے احوال کی رونق بڑھا رہے ہیں۔ اس بار 'سچی کہانیاں' چار کو ملا۔ سب سے پہلے منزہ سہام کی باتیں پڑھیں۔ بالکل ٹھیک لکھا تھا آپی آپ نے۔ پڑھ کر دکھ ہوا۔ پھر احوال کا رخ کیا۔ احوال میں اس بار بہت خوب تبصرے تھے۔ بہت خوشی ہوئی۔ عظمیٰ شکور، شاعر عادل حسین، مور شاہد حسین، صائمہ بشیر، شاہد رفیق، ثمینہ فرخ، محمد یوسف لغاری، محمد ندیم عباس، جاوید راہی، فیصل ندیم بھٹی، منشی محمد عزیز، مسز نوید ہاشمی، ایم یعقوب، شاہانہ احمد خان، اسامہ ندیم، رضوانہ کوثر کے بھرپور خطوط بہت اچھے لگے۔ سندرہ انور علی نے بھی بہت اچھا لکھا تھا۔ واقعی سسٹر آپ بہت اچھی ہیں محبت کرنے والی پتا نہیں چاپلوسی کا نام کیوں دے دیا جاتا ہے محبت کو۔ ویسے کاشی بھائی آپ نے یہ بہت اچھا کیا کہ ناقابلِ اشاعت کہانیوں کے نام لکھ دیے۔ اس طرح انتظار ختم ہو جاتا ہے۔ مگر میری کہانیا ناجائز بھی ناقابلِ اشاعت؟ خیر وہ شاید طریقہ ٹھیک نہیں تھا۔ اس کے بعد کہانیوں میں آئے تو اپنا نام دیکھا۔ کتنی ہی دیر تو یقین نہ آیا کہ میری تحریر شائع ہوئی، تھینک یو سو مچ، دل جیت لیا آپ نے۔ خیر اتنا بھی کافی ہے کہ آپ نے مجھے جگہ دی جہاں اتنا اچھا لکھنے والے ہوں وہاں جگہ پانا بھی اعزاز کی بات ہے۔ ویری ویری تھینکس دعا ہے کہ قارئین کو بھی پسند آئے۔ اب سلسلے وار ناول میں ہم شکل مجھے پسند نہیں اور صرف زہرِ عشق پڑھتا ہوں یہ قسط بھی لاجواب تھی۔ کوئی اور سلسلے وار شروع کریں نا اچھا سا ناول۔ آپ لوگ اسماء اعوان آپی سے لکھوائیں۔ کہانیوں میں ادھورے لوگ اچھی تھی۔ پھر اسارا میرا ہے میری سمجھ نہیں آئی۔ معجزے اب بھی، تیرا عکس ہے۔ کہانی میں محبت، ٹشو پیپر لکھے دکھ، میں بھلا کون ہوں' چراغِ وفا جلاؤں کہاں، غلام مصطفیٰ، مردم گزیدہ، تھری جی بہت اچھی تحریریں تھیں۔ لائف بوائے بھی ہلکی پھلکی سی تحریر تھی۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو آمین۔ اگلے ماہ ملتے ہیں۔

☆ پیارے منعم! اپنی آنکھ سے اپنی تحریر کو دیکھو گے تو مکمل لگے گی۔ مگر...... سمجھ گئے نا...... کہانیاں پوری جیوری منتخب کرتی ہے۔ پھر ان پر کام ہوتا ہے تب جا کر یہ پرچے کا حصہ بنتی ہیں۔

✉ تلہ گنگ سے یہ پہلی بار احوال میں آمد ہے ہمارے لیے ساتھی سلیمان شبیر کی۔ لکھتے ہیں۔ پیارے بھائی کاشی چوہان۔ اسلام علیکم! میں 'سچی کہانیاں' پچھلے نو سال سے مسلسل پڑھ رہا ہوں۔ لیکن احوال میں پہلی بار شرکت کر رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم رسالہ تھوڑا تھوڑا کر کے پڑھتے ہیں۔ جس میں کبھی کبھی دو دو ہفتے بھی لگ جاتے ہیں۔ اس لیے تبصرہ نہیں بھیج سکتے۔ لیکن اس دفعہ رسالہ 30 اپریل کو مل گیا تھا اور بھرپور کوشش کر کے تبصرہ لکھنے بیٹھ گئے ہیں۔ سب سے پہلے آنٹی منزہ سہام کا 'ہم کون لوگ ہیں' پڑھ کر اپنے آپ سے شرمندہ ہوئے کہ 'ہم کون لوگ ہیں' اس کے بعد احوال مکمل پڑھا۔ احوال میں، میں کبھی کوئی خط پڑھنا نہیں چھوڑتا کیونکہ خط پڑھنے کا ایک اپنا ہی مزہ ہے۔ اس کے بعد تمام کہانیاں پڑھیں۔ سب ہی لاجواب تھیں۔ لیکن اس ماہ تھری جی (محمد یوسف لغاری) اور غلام مصطفیٰ (عادل حسین) بہت زیادہ پسند آئیں۔ اور ہم شکل اور اس کے بعد زہرِ عشق کے تو کیا کہنے۔ یعنی کاشی بھیا آپ کی محبت واقعی رنگ لا رہی ہے اور رسالہ ہر دفعہ اچھے سے اچھا ہوتا ہے۔ اس کے لیے مبارکباد قبول کریں۔ میری طرف سے تمام احوالیوں اور تمام قارئین کو سلام۔ انشاء اللہ کوشش ہوگی کہ ہر مہینے باقاعدگی کے ساتھ احوال میں شامل ہوں۔ انشاء اللہ۔ اور ادارے کی خوشحالی و ترقی کے لیے دعا گو۔

☆ اچھے سلیمان! خوش آمدید! کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ تمہاری احوال میں آمد نے دل خوش کر دیا۔ پرچے کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ اب سستی نہ کرنا۔ ہر ماہ احوال میں حاضر ہونا ہے۔ اسے تم ہماری محبت سمجھو یا ہمارا حکم۔

ہماری بہت عزیز مسز نوید ہاشمی۔ نارتھ ناظم آباد کراچی سے احوال میں شامل ہیں۔ لکھتی ہیں۔ کچھ رشتوں کو محبت کے نام دینے کا مطلب ہوتا ہے وہ اپنا ہے اُسے عزت، احترام دینا محبت کو بڑھا دیتا ہے۔ پیار جو ایک خدا سے بھی کیا جاتا ہے۔ ماں باپ، بہن بھائی، اپنی اولاد، اپنے دوستوں، رشتے داروں، اپنے استاد سے احوال میں شرکت کرنے والے لوگ پیار و محبت کی زبان جانتے ہیں۔ عزت واحترام اور خیال کرتے ہیں۔ یہ ہمارے احوال کی قوت ہے طاقت ہے۔ کاشی چوہان نے آپا لفظ مجھے بخش کر جو محبت مان دیا ہے میں اُس کی شکر گزار ہوں۔ میں اپنے گھر بہن بھائیوں میں سب سے بڑی ہوں۔ سب مجھے باجی ہی کہتے ہیں مگر آپا میرا بھائی کاشی چوہان نے مجھے گفٹ کیا ہے۔ میرے بھائی ہمیشہ خوش رہو۔ تمھیں ہر وہ خوشی ملے جو تم طلب گار کرو۔ ہر پریشانی سے خدا ہمیشہ دور رکھے آمین۔ اپریل میں نیلسن منڈیلا پر احمد سجاد بابر کی تحریر پڑھی بے حد شاندار تھی۔ رضوانہ پرنس نے قیامت سے پہلے قیامت سچ بیانی جو 16 دسمبر پر پیش آیا تحریر کیا زخم تازہ ہو گئے۔ کون مانے گا میری م ص ایمن اور اقراء سیف کی تحریر پسند آئی، فرض نبھاتا ہوں، مجید احمد جائی اور ایم یعقوب کی ٹکے کی ہانڈی، فیصل ندیم بھٹی کی عجب ملن یہ ہمارا ہوا، عبدالغفار عابد کی زندگی صحرا نشین ہو۔ جیسے مجھے پسند آئی شاہد رفیق سہو کی پردیس مت جیو۔ سب سے شاندار تھی۔ حمیرا راحت نے میری دلہن تم ہو، لکن سچی ہو منزل آسان، خوبصورت تحریر تھی۔ محمد علی روشن شعلہ ساماں تحریر نے واقعی زخم ڈال دیے کہ سوچ سے بڑھ کر ظلم تھا۔ حمیرا خان نے وہ شعلہ تحریر پیش کی جو اپنوں کا دیا زخم تھا جس کا علاج مشکل ہے۔ محمود شام سفر نامہ بہت شاندار جا رہا ہے۔ لکھنے کے انداز نے اس تحریر میں جان ڈال دی ہے۔ جیسے ہم برطانیہ ہی کا ایک حصہ ہیں۔ جاوید راہی کی تحریر ہمیشہ سے پسند آتی ہے۔ ممتاز احمد کی 'ملے کیوں جب بچھڑنا تھا' اچھی لگی۔ پیر جی اقبال بانو کی تحریر بھی اچھی تھی۔ صائمہ نفیس کی کرچیاں سچی دل کو کرچی کرچی کر گئیں۔ ہائیڈ پارک ڈی خان نے بہت خوبصورتی سے سجایا ہے۔ منزہ سہام کی تحریر 'ہم کون لوگ ہیں' ہم ڈرے سہمے لوگ مرر ہے

ناقابلِ اشاعت تحریریں

آدھی ذبح بکری	محمد عمر گولہ
سفر	شاہد سلیم
تنہائی	شاہد سلیم
کیا میں بے گھر ہوں	شاہد سلیم
اندھا	مہر پرویز احمد دولو
چنگاری کوئی بھڑکے	پیر نوید شاہ
ایک گزارش	محمد اسلم آزاد
اپنی محبت کے ہاتھوں	محمد اسلم آزاد
ادھوری محبت	افشین راجپوت
وہ سترہ روز	عبدالرزاق تاج بلوچ
گڑیا	فلک زاہد

ہیں۔ مگر کیوں، کیسے میں خود حیران ہوں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ میرے بھائی یقین کریں آپ بھی اُن میں سے ایک ہیں۔ سوری اپنی بہن کو معاف کر دو۔ علی حسنین تابش آپ کے والد کی صحت کے لیے دعا گو ہوں۔ خدا انھیں صحت عطا فرمائیں۔ مورشاہد حسین، منعم اصغر، صائمہ بشیر، شاہد رفیق، ثمینہ فرح، سدرہ انور علی، ندیم عباس، منشی محمد عزیز ہے۔ ایم یعقوب کی شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھے کسی نہ کسی روپ میں یاد کیا۔ اسماء اعوان لائف بوائے ایک اچھی تحریر تھی۔ احمد سجاد بابراب مونیکا لیونسکی کے بارے میں تحریر لکھی پسند آئی۔ ارم ناز کی کچرا سارا میرا ہے۔ عروج فاطمہ معجزے اب بھی ہوتے ہیں۔ الماس فاطمہ ارمان تیرا ہی عکس ہے۔ بتول خان نیازی منتظر سویرا ہے بھی پسند آئی۔ منعم اصغر کی ہوا کا رخ بدلنا چاہتی ہوں اور کاشف عبید کہانی میں محبت رلاتی تحریر تھی جو دل کو زخم زخم کر گئی۔ سائرہ فاطمہ میں بھلا کون ہوں اور محمد یوسف لغاری تھری جی اچھی تحریر تھی۔ دستگیر شہزاد اور احمد علی عاقل کی تحریر بھی پسند آئی۔ رئیسہ خالد اچھی تحریر تھی۔ ممتاز احمد کی تاوان زندگی کا شاندار تحریر تھی۔ مجید احمد جائی وہ مراطبیب خاص، عادل حسین، غلام مصطفیٰ خوبصورت تحریر تھی۔ عالیہ حرا مہنگائی پر لکھی تحریر دل دماغ کو ہلا گئی۔

☆ اچھی آپا! محبت نے آپ کو دل سے قریب کیا ہے۔ تبصرے کا شکریہ اور کہانی زیرِ غور ہے۔ انشاء اللہ جلد شائع کر دی جائے گی۔

✉ یہ آمد ہے احوال میں ہمارے شاعر اور لکھاری ساتھی عادل حسین کی کراچی سے۔ لکھتے ہیں۔ مئی کا 'سچی کہانیاں' اپنی روایتی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ ٹائٹل پر اگر زیادہ واہ واہ کروں تو بیگم آنکھیں دکھانے لگتی ہیں۔ اس لیے بس اچھا تھا سے کام چلائیں۔ ہم کون لوگ ہیں؟ میں منزہ آپی نے بالکل ٹھیک لکھا ہے۔ ہمیں جواب تلاش کرنا چاہیے۔ احوال میں آپ کی باتیں پڑھیں، اچھی لگیں۔ محفل کو کیا کہنے۔ میری بہن مسز نوید ہاشمی نے لکھا ہے کہ ہم بھول گئے ہیں۔ ایسا نہیں ہیں آپی۔ نئی شادی ہے تو کچھ وقت دعوتوں کی نظر ہو جاتا ہے۔ آپ سمجھ سکتی ہیں۔ دعا پر شکریہ ادا کروں یہ اچھا نہیں لگتا۔ التجا ہے کہ آئندہ بھی اپنے بھائی کو دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ اللہ آپ پر بھی اپنا فضل و کرم نازل فرمائے۔ آپ کی نظم بھی خوبصورت تھی کاشی بھائی۔ لائف بوائے اچھا لگا۔ میرے بھائی احمد سجاد بابر کی کاوش بھی زبردست تھی۔ بہت معلوماتی۔ میری تحریر کو جگہ دینے پر شکریہ۔ ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ فرداً فرداً اس لیے نہیں لکھ رہا کہ خط طوالت پکڑ لے گا۔ لیکن یقین مانیے ہر ایک نے متاثر کیا ہے۔ پرانے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں نے بھی۔ میری کہانی پر آپ سب کی رائے کا انتظار رہے گا۔ محمود شام صاحب کا سفر نامہ پڑھ کر ہم برطانیہ پہنچ جاتے ہیں۔ ہم شکل بھی خوب چل رہا ہے اور زہرِ عشق کیچ میں رگوں میں اترنے لگا ہے۔ کیا خوب لکھ رہے ہیں کاشی بھائی آپ، ویلڈن! مسئلہ یہ ہے پر ہمیشہ کی طرح دعائیں۔ ہائیڈ پارک کو بہت خوبصورتی سے سجایا گیا ہے۔ تیرنیم کش کے اشعار بھی خوبصورت تھے۔ مگر غزلیات کا حصہ کیا ہوا بھائی؟ امید ہے غور فرمائیں گے۔ آخر میں اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گا کہ اللہ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معافی کا طلبگار ہوں۔

☆ بہت پیارے عادل! اگر تمہاری ذرا سی زیادہ تعریف کی تو بھی بھابی جان سوال جواب کریں گی۔ تبصرہ ہمیشہ کی طرح زبردست رہا۔ اور ہاں بھابی سے کہو قلم سنبھال لیں۔

انتباہ

صنم تیرے لیے چلے آئے ہم...... یہ کہانی ہماری ہردلعزیز لکھاری شیما عبدالقیوم کی ایوارڈ یافتہ کہانی کی لفظ بہ لفظ نقل کی گئی۔ اس لیے ارشد علی کوئٹہ کو اس سنگین جرم کی پاداش میں بین کیا جاتا ہے۔ کچھ دوست مسلسل 1960ء سے 1985ء تک کی کہانیوں پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں۔ جن میں خواتین اور مرد دونوں شامل ہیں۔ آئندہ ایسی حرکت کا مرتکب ہونے والے رائٹرز کے نام، نئی اور پرانی کہانی کے ساتھ شائع کردیے جائیں گے۔ 'سچی کہانیاں' اور 'دوشیزہ' لائبریری میں پاکستان اور ہندوستان کے ہر ڈائجسٹ کا نیا اور پرانا ریکارڈ موجود ہے۔ اس لیے رائٹرز کے اس فعل کے ارتکاب کے بعد انھیں ہمیشہ کے لیے 'بین' کر دیا جائے گا)

✉ احوال میں یہ پہلی بار آمد ہے کہ ندیم عباس ڈھکو کی۔ چک نمبر 79/52، ساہیوال سے۔ لکھتے ہیں۔ 'سچی کہانیاں' کا مطالعہ کافی عرصہ سے کر رہا ہوں۔ جو معاویہ عنبر وٹو بھائی کی مہربانی ہے کہ میری رہنمائی کرتے ہیں۔ اپنی تحریریں ارسال کر رہا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ مایوس نہیں کریں گے۔ 'سچی کہانیاں' کے رائٹرز میرے نام سے واقف ہیں۔ میری غزلیں رسائل میں شامل ہوتی رہتی ہیں۔ انشاء اللہ اب جب تک زندگی نے ساتھ دیا۔ 'سچی کہانیاں' میں حاضری دیتا رہوں گا اور اپنے دوستوں کو بھی اس کی طرف متوجہ کروں گا۔ میرے کچھ دوست تو مجھ سے بھی پہلے یہاں آگئے ہیں۔ باقی جو رہتے ہیں ان کو بھی انشاء اللہ جلد اس محفل میں لے کر آؤں گا۔ آخر میں سب قارئین اور دوستوں کو محبتوں چاہتوں بھرا اسلام قبول ہو۔

☆ ڈیئر ندیم عباس ڈھکو! سب سے پہلے تو خوش آمدید۔ تمہاری کہانیاں پڑھ کر رائے دی جاسکتی ہے۔ تبصرے کا انتظار رہے گا۔ جلد تم بھی کہانی کی صورت اِن ہی صفحات پر جگمگاؤ گے۔

✉ ڈیرہ اللہ یار سے ایم ایچ کاشف بہت محبت سے احوال کا حصہ بن رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ قابلِ احترام کاشی چوہان صاحب۔ اسلام علیکم! مئی کا تازہ شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ خوبصورت ٹائٹل اور شاندار احوال سے ہم لطف اندوز ہوئے۔ آپ کا ناول زہرِ عشق بہترین کرداروں کا مالک ہے۔ زہرِ عشق بھی بہت مقبول اور سچی کہانیاں کو رونق بخشتا جا رہا ہے۔ زہرِ عشق میں جو مرکزی کردار دیے گئے ہیں۔ جو میرے خیال میں وہ سسپنس میں رکھا جا رہا ہے۔ انکل سلیم اختر آپ کی کہانی بہترین کہانی ثابت ہوئی۔ سدرہ جی سدرہ کیسی ہیں آپ؟ منشی محمد عزیز آپ کا بہت بہت شکریہ۔ سخن آباد سلسلے کو دوبارہ شروع کریں۔ کیونکہ شاعری درس بھی دیتی ہے اور عورت کے پاس وفا بھی۔ تمام قارئین کرام اس سلسلے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ زندگی باقی رہی تو اگلے ماہ ملاقات ہوگی۔ انشاء اللہ۔

☆ اچھے ایم ایچ! سلامت رہو! پہلی آمد...... بہت اچھی لگی۔ بلوچستان ہمارا سب سے بڑا صوبہ ہے۔ چھوٹے بھائی!!! ارے یار تم تو ماشاء اللہ بہت اچھا لکھتے ہو۔ آج سے ہم تمھیں بڑے بھیا کہیں گے۔

✉ یہ احوال میں آمد ہے ہماری بہت پیاری لکھاری ساتھی عظمیٰ شکور کی اسلام آباد سے، لکھتی ہیں۔ 'سچی کہانیاں' کی آمد نے گرمی کے احساس کو کم کر کے فرحت بخشی۔ سرورق پہ ماڈل باقاعدہ ہنستی نظر آئی کہ جیسے کہہ رہی ہو زندگی خوبصورت ہے 'جی لو' اشتہارات کی بھرمار اور پھر منزہ سہام کہ کہے سچ پڑھے۔ ٹھیک ہی تو کہتی ہیں لوگ بے گناہ موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے ہیں مگر گناہ گار کون ہے۔ فیس بک پہ میں نے 'سچی کہانیاں' رسالے کی تصویر لگائی تھی۔ بہت سارے لوگ 'سچی کہانیاں' مانگ رہے تھے۔ زیادہ تر وہ جو پاکستان سے باہر ہیں ان سب نے اپنے ایڈریس بھی بھیجے اب آپ ہی بتایئے میں کیا کروں؟ (آپ انھیں سچی

کہانیاں کا ایڈریس دے دیں کہ آپ ہمارے سالانہ خریدار بن جائیں۔ آپ کو پرچہ بیرونِ ملک مل جایا کرے گا) جی تو کاشی چوہان صاحب آپ نے پوچھا کہ آپ پر یہ التفات کیوں؟ ارے آپ کی تعریف نہ کریں تو کس کی کریں۔ واسکوڈے گاما کی تعریف لکھ دوں یا ایڈیسن کی جس نے بلب ایجاد کیا۔ اب ظاہر ہے آپ ہمارے ایڈیٹر ہو، آپ ہی کی بات ہوگی نا!! سمجھ رہے ہیں نا آپ۔ (جی سب سمجھ رہے ہیں!!) احوال میں سب ساتھیوں کے خطوط اچھے تھے مزہ آیا پڑھ کر کہ ہم اکیلے نہیں اور بھی بہت سے دیوانے ہیں اِس رسالے کے۔ لو جی بہت ہو گئیں تعریفیں اس رسالے کی۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ یا اللہ میں کہاں جاؤں۔ کیسے کیسے رنگ ہیں اس دنیا کے، کیا کیا ہو رہا ہے معاشرے میں، کیسے کیسے بے ضمیر لوگ ہیں یہاں، اُف 'سچی کہانیاں' نہ ہوتا تو کیسے جان پاتے۔ سب سے پہلے جو اسٹوری پڑھی وہ بتول خان نیازی کی لکھی تھی۔ 'منتظر سویرا ہے'۔ شکر ہے بتول سویرا ہو گیا۔ اس اسٹوری پہ جو پکچر لگی تھی نا مجھے اچھی لگی پتا نہیں بس بہت اچھی لگی جس لڑکی نے تھوڑی پہ ہاتھ رکھا ہے۔ دوسری کہانی 'تیرا ہی عکس ہے' الماس فاطمہ ارمان اسٹوری خوب تھی۔ 'معجزے اب بھی ہوتے ہیں' عروج فاطمہ کے قلم کی نوک سے آزاد ہونے والے لفظ پر اثر تھے۔ 'کچرا سارا میرا ہے' ارم ناز جی کہاں سے لے آئیں یہ کہانی۔ کمال کر دیا۔ اس کہانی پہ آپ کو میری طرف سے فُل مارکس۔ '' کہانی میں محبت مر گئی ہے' کاشف عبید صاحب توڑ دیا نا دل۔ کیا تھا اس لڑکی کی گرا آپ شادی کرا دیتے۔ اب آتے ہیں ہائیڈ پارک میں! جی دیکھ لیا ایک نظر واپس چلتے ہیں، دھوپ بہت ہو رہی ہے پارک میں۔ تیرِ نیم کش بھی شعر اچھے لگے۔ او کے جی جاتی ہوں گرمی بہت ہے گرمی یہ داستان لکھ دو مگر ایڈیٹر صاحب سارے بیچ ردّی کی ٹوکری کو گفٹ کر دیتے ہیں۔ (کچھ کیسے ہیں۔ آخر اس کا بھی حق ہے کچھ!) گرمی میں گرم چائے کا مزہ ہی اور ہے۔ میں چائے پی لوں آپ تبصرہ پڑھیے او کے بائے۔

☆ بہت عزیز! کوشی جی! سچ مچ مزہ آگیا تبصرہ پڑھ کر۔ لگتا ہے اسلام آباد کا موسم آپ کو راس آگیا ہے۔ آپ خوش ہوتی ہیں تو اچھا لگتا ہے۔

✉ احوال میں یہ پہلی پہلی آمد ہے ساہیوال سے عارف تبسم کی۔ لکھتے ہیں۔ پیارے کاشی بھائی! ندیم عباس ڈھکو بھائی کی بدولت 'سچی کہانیاں' کی اتنی تعریف سنی کہ ماہِ مئی کا پرچہ خریدنے پر مجبور ہو گیا۔ واہ واہ! جیسا سنا تھا اُس سے بڑھ کر پایا۔ ٹائٹل لاجواب تھا اور پھر جب پرچے میں جمپ لگائی (بھائی آئندہ جمپ نہ لگانا، اکثر جمپیں کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہیں) اداریہ 'ہم کون لوگ ہیں' منزہ سہام نے کمال لکھا۔ اس کے بعد ہم نے احوال میں قدم رکھ دیے۔ احوال میں آپ کی تعریفیں میں نے بہت سارے دوستوں سے سنی تھیں لیکن جب احوال پڑھا تو آپ کی باتیں عش عش کرنے پر مجبور کر گئیں۔ آپ نے گریویٹی، مٹی اور پانی کا جوڑ محبت سے قائم کیا۔ کیا کہنے ہیں۔ احوال کے اختتام پر آپ کی تازہ نظم شاہ کار تھی۔ صحیح معنوں میں آپ نے ہمیں اپنا اسیر کر لیا۔ کاشی بھائی صرف آپ کی وجہ سے سالانہ خریدار بن رہا ہوں۔ (ہمیں انتظار ہے) اس کے بعد لائف بوائے ایک سچا ساتھ' اسماء اعوان صاحبہ نے خوب لکھی۔ احمد سجاد بابر نے 'مونیکا لیونسکی' کی شخصیت کے بارے میں کمال نقشہ کھینچا اور معلومات بہم پہنچائیں زبردست۔ اپنے دیس سے، اپنے شہروں سے، موصولہ سچ بیانیوں میں ادھورے لوگ' کچرا سارا میرا ہے'، 'ہوا کا رُخ بدلنا چاہتی ہوں'، 'ٹشو پیپر پہ لکھے دُکھ' اور 'تھری جی' بہت شاندار اور یادگار سچ بیانیاں رہیں۔ اس کے بعد ایم اے راحت صاحب کا 'ہم شکل' پڑھا۔ یہ تو آٹھویں قسط تھی۔ امید ہے سات قسطیں بھی ایسی ہی شاندار ہوں گی۔ شعلہ ساماں تحریروں میں دستگیر شہزاد کی 'گردِ صحرا ہوں بس'، احمد علی عاقل کی 'پرندہ راستہ بھولا' اور رئیسہ خالد کی 'چراغ

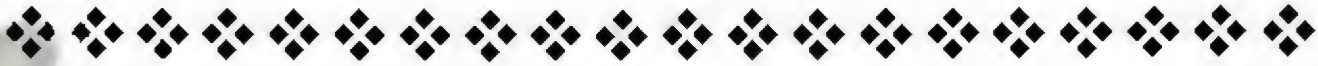
جون2015ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کررہا/کررہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام: --

مکمل پتا: --



جون2015ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کرلیں۔

عنوان کہانی: -------------------- تعداد صفحات: --------------

نام: --

مکمل پتا: --

فون/ سیل نمبر: --



جون2015ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان: -------------------- مصنف: --------------

دوم، عنوان: -------------------- مصنف: --------------

سوم، عنوان: -------------------- مصنف: --------------

نام: -------------------- شہر: --------------

وفا جلاؤں کہاں' نے سچ مچ چاروں طرف شعلے بھڑکا دیے۔ اور ہم سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اس دنیا میں یہ سب کچھ کتنا عام ہو گیا ہے۔ ارے واہ آگے بڑھے تو پاکستان کے نامور صحافی محمود شام کا سفرنامہ 'برطانیہ میں خزاں بھی' ہمارا منتظر تھا۔ پڑھ کر مزہ آ گیا اور آگے بڑھے تو جرم کہانی کے ایکسپرٹ جاوید راہی کی کہانی 'جس جرم کی پائی ہے سزا' کمال تھی۔ 'پلیٹ فارم' سچی کہانیاں کا ایک منفرد سلسلہ ہے۔ ممتاز احمد نے 'تاوان زندگی کا' لکھ کر ان کے ہاتھ چومنے پر مجبور کر دیا۔ کیا کمال کہانی لکھی ہے۔ تین مرو تین کہانیاں نے مجید احمد جائی، عادل حسین اور عالیہ حرا کس کی تعریف کروں۔ تینوں تحریریں زبردست ہیں۔ کاشی بھائی اس کے بعد آپ کا ناول 'زہرِ عشق' واہ واہ۔ آپ نے ہمیں احوال میں اسیر کیا اور 'زہرِ عشق' میں جکڑ لیا۔ اب تک شاید ہی کوئی دن ایسا گیا ہو جو میں نے اس ناول کی قسط نہ پڑھی ہو۔ ہر بار الگ ہی مزہ دیتا ہے۔ ویلڈن بھیا! مسئلہ یہ ہے' ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش' آپ کے مستقل سلسلے ہیں اور تینوں ہی سلسلے بھرپور ہیں۔ لیجیے میرا تبصرہ مکمل ہوا۔ یقین کر لیجیے مجھے سچی کہانیاں کے اگلے شمارے کا بے چینی سے انتظار ہے۔

☆ ارے عارف! ہم نے تمھیں اسیر کیا اور تمہارے تبصرے نے ہمیں تمہارا دیوانہ کر دیا۔ کیا خوبصورت تبصرہ کیا تم نے۔ اگلے ماہ تمہارے تبصرے کا شدت سے انتظار رہے گا۔

✉ احوال میں پہلی بار حاضر ہو رہے ہیں عابد علی انجم، دیپال پور سے۔ لکھتے ہیں پہلی بار اس دکھی نگری میں قدم رکھ رہا ہوں۔ اُمید ہے مایوس نہیں کریں گے۔ (دکھی نگری!! بھائی خیر تو ہے نا؟) سر میں دیپالپور کا رہائشی ہوں اور مجھے سچی کہانیاں ڈائجسٹ بڑا پسند ہے اور یاسر وکی صاحب نے مجھے احوالی بنایا ہے اور اگر میرا لیٹر اس بار آ گیا تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ بھائی جان میں ایک اسٹوری لکھ رہا ہوں آپ کو جلد ہی ارسال کر دوں گا اور یہ رسالہ سارے ناول وغیرہ کی وجہ سے بہت زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ آخر میں یاسر وکی، فخر حیات بھٹی، عنصر اقبال بھٹی' احمد شہزاد راؤ، صالحوال بھائی آپ بھی لکھو پلیز۔

☆ اچھے عابد! چلو ہماری محبت نہ سہی، کسی اور کی سہی آپ کو ہم تک کھینچ تو لائی۔ خوش آمدید۔ تمہاری تحریر کا انتظار رہے گا۔ تبصرہ تو کرتے بھائی......

✉ لڈن ضلع وہاڑی سے ہمارے عزیز ساتھی منشی محمد عزیز مے لکھتے ہیں اس مرتبہ جب تیس اپریل کو پوسٹ مین کا فون آیا کہ آپ کی رجسٹری آ چکی ہے تو دل کو خوشگوار قسم کی حیرت ہوئی۔ آفرین ہے بھیا جی آپ کی اس مستعدی پر۔ لیکن پلیز مجھے معاف کر دینا۔ وجہ ہے میری بے تحاشا مصروفیت، جس میں کچھ گھریلو اور زیادہ ملازمت سے متعلقہ ہے اور یہ میری زندگی کا پہلا چانس ہے کہ میں اتنی تاخیر سے یعنی آج آٹھ تاریخ کو تبصرہ لکھ رہا ہوں اور انشاء اللہ آج ہی پوسٹ بھی کر دوں گا رجسٹری سے۔ سرورق والی محترمہ بہت اچھی لگ رہی تھی ساری کی ساری۔ اُس کی ادائیں بھی خوب تھیں۔ (اور ہاں آپ کی بھابی کو اس بات کا پتا نہیں چلنا چاہیے) ایک سرسری نظر فہرست پر ڈالتے ہوئے اداریے تک جا پہنچے۔ منزہ باجی صد فیصد درست کہا آپ نے۔ عظمی شکور جی! خیر تو ہے۔ اسلام آباد جا پہنچے۔ ویسے اگر آپ کو میری کسی بات سے تکلیف پہنچی ہو تو میں دست بدستہ آپ سے معافی کا طلب گار ہوں۔ یہی بات میں گڑیا رانی سدرہ انور علی سے بھی کہنا چاہوں گا۔ سدرہ شاگرد بنانے والی بات میں نے واقعی دل سے کہی تھی کیونکہ میں تو خود محبت کا پجاری ہوں۔ طنز والی بات میں نے جان بوجھ کر محض شرارت کے طور پر لکھی تھی اور پھر آپ نے دیکھا ہوگا کہ بریکٹ میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ یہ بات غلط ہے۔ یہی طنز والی۔ صائمہ بشیر، ثمینہ فرخ، تسمیں غزالہ نہاں سمیت سبھی نیو کمرز کو ویلکم، دل کی گہرائیوں سے جی آیاں

نوں۔ ماشاء اللہ احوال کی رونق زبردست تھی لیکن کچھ دوستوں کی کمی محسوس ہوئی۔ مونیکا لیونسکی مجھے تو شاطر اور موقع پرست لگ رہی تھی۔ تاوان زندگی کا، ممتاز احمد بھائی کی کہانی اچھی تھی۔ لیکن گزشتہ کہانی کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ مجید احمد جائی صاحب اپنے ہی مرض لاعلاج سے متعلق بتا رہے تھے۔ غلام مصطفیٰ واقعی اسم بامسمیٰ تھی۔ یقیناً حج صرف بیت اللہ کے طواف کا نام نہیں ہے۔ سبحان اللہ بہت بڑا کام کیا تھا غلام مصطفیٰ نے۔ مردم گزیدہ میری نظر میں اس ماہ کی بہترین تحریر ہے۔ بہت ہی کاٹ دار تحریر تھی۔ دیگر تحریروں میں ارم ناز کی کچرا سارا میرا ہے، کاشف عبید، دستگیر شہزاد اور احمد علی عاقل کی تحریریں اچھی تھیں۔

☆ پیارے! منشی! عزیز! پرچہ بہت جلد ملنے کے باوجود تبصرہ بہت زیادہ لیٹ آیا۔ وجہ تو آپ بتا چکے ہیں لیکن اب لیٹ نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں آپ کے تبصرے کا انتظار رہتا ہے۔

✉ صالحوال دیپالپور سے یاسر کی احوال میں حاضر ہیں۔ لکھتے ہیں ماہ مئی کا شمارہ ملا پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ جناب کاشی بھائی آپ کا بہت شکریہ آپ نے ہمیں سچی کہانیاں میں لکھنے کے قابل سمجھا۔ خیر آتے ہیں خطوط کی جانب تو سب سے پہلے جو لیٹر میں نے پڑھا وہ تھا ندیم عباس میوانی کا جی ندیم عباس میوانی صاحب آپ بھی ہمارے پیچھے اس سچی کہانیاں میں چلے آئے ہو بڑی بات ہے یار۔ چلو خیر خوشی ہوئی پر لکھتے رہنا۔ پتوکی پورے پاکستان میں گلابوں کی وجہ سے مشہور ہے ہمیں بھی آپ کے گلابوں کا انتظار رہے گا۔ ایم یعقوب صاحب آپ کا لیٹر کمال تھا۔ سرگودھا سے ثمینہ فرخ کا تبصرہ بھی پسند آیا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف جن میں ایم اے راحت کی ہم شکل نے دل پر وار کیا۔ پرندہ راستہ بھولا ہوا تھا احمد علی عاقل کی اسٹوری بھی بہت اچھی تھی۔ کس جرم کی پائی ہے سزا جاوید راہی بہت کمال تھی۔ خیر باقی ابھی تک نہیں پڑھی۔ شمارہ بہت ہی کمال کا تھا۔

☆ پیارے یاسر! تمہیں ندیم میوانی تو جانے کب گلاب کے پھول بھیجے مگر ہم تمہیں اپنی محبت کی خوشبو سے منور کرتے رہیں گے۔ اپنا خط پڑھو اور محبت کی خوشبو کو محسوس کرو۔ کہانی پڑھ کر رائے دیں گے۔

✉ کراچی سے عقیل عادل زادہ پہلی بار شاملِ احوال ہیں۔ لکھتے ہیں۔ برخوردار! عزیزم کاشی چوہان کئی دنوں سے سوچ رہا تھا 'سچی کہانیاں' کی اس ہفت اقلیم زنبیل کو تھاموں اور اپنی چاہت کے تمام ترگل آج کے اس پاگل نوجوان کے اوپر نچھاور کردوں۔ ایک شعر یاد آ رہا ہے۔ 'ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے...... کہتے ہیں کہ غالب کا اندازِ بیاں اور' تو میرے پسر! تم بہت ہٹ کے اپنی ہی ہٹ میں آگے چلے جا رہے ہو۔ 'میٹر دو دن' پر تمہارا اندازِ بیاں اور خوش پوشی دیکھ کر دیدۂ حیرت میں ڈوب گیا۔ اس عمر میں آسمان کو چھونے کی تمنا...... خدا تمہاری عمر دراز کرے...... 'سچی کہانیاں' سہام مرزا کا خواب تھا اور انھوں نے برصغیر میں ایک اپنی ہی طرز کا میگزین متعارف کرایا۔ خدا کا شکر ہے 'سچی کہانیاں' کا تازہ شمارے دیکھ کر 80ء کی دہائی کے وسط کے شمارے یاد آ گئے۔ جیتے رہو اور اسی لگن سے کام کرتے رہو۔ انشاء اللہ اگلے ماہ تمہاری پیٹھ تھپکنے کو پھر ایک نامہ بھیجوں گا۔

☆ میں نے بچپن میں اپنے والدین سے ایک ہی بات سنی ہے۔ 'چھتنار درخت کی چھاؤں انسان کو جہاں چھایا دیتی ہے وہیں اس کے اندر صبر کی ٹھنڈک بھی سرائیت کر جاتی ہے۔ آپ کی محبت اور اپنایت نے میرے اندر جیسے توانائی سی بھر دی ہے۔ مجھے آپ کے تبصرے کا اور شفقت کا انتظار رہے گا۔

✉ شاہانہ احمد خان، کراچی سے لکھتی ہیں۔ ماہِ مئی کا شمارہ جلد مل گیا تھا۔ ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ ٹائٹل گرل تمام لوازمات کے ساتھ روشنیاں بکھیر رہی تھی۔ ارے مونیکا...... آپ کی کہانی پڑھنے کے

احوال میں شامل ہونے والے نئے احوالی


محمد عمر گولہ، لہڑی


ندیم عباس میواتی، پتوکی


شاہد رفیق سہو، کبیر والا


یاسر وکی، دیپال پور


جواد احمد، پشاور


ندیم عباس ڈھکو، ساہیوال

لیے تو میں بہت بے تاب تھی۔ احمد سجاد بابر صاحب آپ نے بہت خوب لکھا۔ لائف بوائے اسٹوری پڑھ کر مزہ آیا۔ محمد سلیم اختر، ارم ناز، عروج فاطمہ، بتول خان نیازی، سائرہ فاطمہ، کاشف عبید کی کہانیاں بہت زبردست تھیں۔ 'ہم شکل' مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ راحت صاحب زبردست تحریر کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ دستگیر شہزاد سے گزارش ہے بھائی ذرا ہاتھ ہلکا رکھا کرو کہانی پر۔ احمد علی عاقل آپ سے بھی یہی گزارش ہے۔ رئیسہ خالد کی کہانی دل کو چھو گئی۔ جاوید راہی اور ممتاز احمد اچھوتی کہانیاں لکھنے کے ماسٹر ہیں۔ عادل حسین اور عالیہ حرا کی 'مرد کہانیاں' یادگار رہیں۔ کاشی چوہان کی 'زہر عشق' آسمان چھو رہی ہے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ زندگی نے وفا کی تو پھر حاضری دوں گی۔

☆ شاہانہ جی! تبصرہ بہت دیر سے موصول ہوا۔ یقیناً مصروفیت وجہ ہو گی۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

✉ ثروت نشان، راولپنڈی سے لکھتی ہیں۔ پیارے کاشی بھائی! میں مارچ ۲۰۱۵ء سے آپ کا 'سچی کہانیاں' پڑھ رہی ہوں۔ اس سے پہلے میں دوسرے ڈائجسٹ (نام لکھنا نہیں چاہتی کہیں کسی کی دل آزاری ہو) پڑھتی تھی۔ مگر جب سے 'سچی کہانیاں' کو پڑھا تب سے کسی اور ڈائجسٹ کو پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔ پلیز اسے چاپلوسی کا نام مت دیجیے گا۔ میں نے سچ لکھا ہے۔ مئی کے شمارے میں منزہ سہام کا اداریہ 'ہم کون لوگ ہے' دل پر اثر کرتا ہے۔ آپ کا احوال تو 'سچی کہانیاں' کی جان ہے۔ اس کے بعد لائف بوائے اسٹوری، اسماء اعوان نے زبردست لکھی۔ مونیکا کی کہانی بہت اچھی لگی 'ادھورے لوگ'، 'وہ پانچ مئی'، 'کچرا سارا میرا ہے'، 'معجزے اب بھی ہوتے ہیں'، 'منتظر سویرا ہے'، 'میں بھلا کون ہوں'، 'ٹشو پیپر پہ لکھے دکھ' اور 'ٹھری جی' زبردست سچ بیانیاں رہیں۔ 'ہم شکل' اور 'زہر عشق' مجھے بہت پسند ہے اور میں ہر ماہ بے تابی سے ان ناولز کی قسطوں کا انتظار کرتی ہوں۔ 'زہر عشق' میں سلمان بلے کے روپ میں اور پھر اپنے ہم شکل کے روپ میں غضب ڈھا رہا ہے۔ تو دوسری جانب شاہ زیب اپنے ہم شکلوں کی تلاش میں سرگرداں ملک ملک کی خاک چھان رہا ہے۔ زبردست ناول ہے۔ بس اب اجازت چاہتی ہوں۔

☆ پیاری ثروت! ایک تو تمہارا نام اتنا پیارا دوسرا اندازِ تحریر پیارا۔ چندا تم ہمیں جلدی سے کوئی کہانی بھیجوں۔ کیوں کہ ہمیں تمہارے اندر ایک رائٹر چھپا نظر آ رہا ہے۔

✉ چیچہ وطنی سے عبدالغفار عابد لکھتے ہیں مئی کا شمارہ جلد موصول ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ لوگ دن رات ایک کر کے اپنا فرض نبھا رہے ہیں۔ (ہم نے تو فرض نبھا دیا لیکن آپ کیوں اتنا لیٹ تبصرہ بھیج رہے ہیں) ٹائٹل زبردست تھا۔ منزہ باجی کا اداریہ ہم کون لوگ ہیں اپنے اندر ایک سوال نہیں بہت سارے سوال رکھتا ہے۔ احوال میں آپ نے گریوٹی کی زنجیر کی جو مثال پیش کی وہ لاجواب تھی۔ عمر گولہ، عظمیٰ شکور، عادل

حسین، مورشاہد حسین، ظفر اللہ رند، لیلیٰ مردہ اقبال، منعم اصغر، علی حسنین تابش، ساغر، بشیر تبسم، غزالہ نیہاں، شاہد رفیق، امجد علی، ثمینہ فرخ، سدرہ انور علی، یوسف لغاری، ندیم عباس میوانی، جاوید راہی، یا سر ولکی، فیصل ندیم بھٹی، نشی عزیز مے، مسز نوید ہاشمی، ایم یعقوب، شاہانہ احمد خان، اُسامہ ندیم، احسن عمرانی، منال زہرہ، رضوانہ کوثر سب کے تبصرے لاجواب رہے۔ لائف بوائے کی کہانی اسماء اعوان نے جاندار لکھی۔ تو اند سجاد بابر نے بھی دینکا لیونسکی کے بارے میں سب کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا۔ سچ بیانیوں میں ادھورے لوگ، پُراسرار ابھرا ہے۔ اشو پیپر سے لکھے دکھ اور تھرکی جی نے بہت متاثر کیا۔ ایم اے راحت کی ہم شکل خوب اُڑان بھر رہی ہے تو کاشی چوہان کا زہر عشق بھی رگوں میں لہو کی جگہ دوڑنے لگا ہے۔ دونوں ناولز کے درمیان کانٹے کا مقابلہ ہے۔ دستگیر شہزاد اور انعم علی عاقل دونوں نے ایک ہی عنوان پر دو الگ الگ تحریریں کمال خوبصورتی سے بیان کیں۔ رئیسہ خالد کی شعلہ سامانی چراغ وفا جلاؤں کہاں بھی خوب تھی۔ محمود شام برطانیہ میں خزاں میں ہمیں بھی ساتھ ساتھ لیے چل رہے ہیں۔ جاوید راہی کی جرم کہانی اور ممتاز احمد کی پلیٹ فارم کہانی ہمیشہ کی طرح زبردست رہیں۔ تین مردتین کہانیوں میں اس بار عادل حسین کی غلام مصطفیٰ نمبر لے گئی۔ مسئلہ یہ ہے، ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش سب سلسلے اپنی جگہ فٹ ہیں۔ عوام کی بھلائی اور تفریح دونوں اس رسالے میں موجود ہیں۔ تبصرہ تمام ہوا۔ اگلے ماہ انشاء اللہ پھر سے حاضر ہوں گے۔

☆ غفار! آپ کا تبصرہ بہت تاخیر سے موصول ہوا۔ پھر بھی ہم نے لگا دیا ہے۔ اُمید ہے اگلے ماہ آپ کا تبصرہ سب سے پہلے موصول ہوگا۔ تبصرہ شاندار کیا، خوش رہو۔

ساتھیو! لیجیے اس ماہ تک ہماری آپ کی ملاقات اختتام کو پہنچی۔ ایک تازہ نظم آپ کی نذر کرتے ہیں۔

میڈیا چیخ رہا ہے پھر سے
آؤ ہم سب لڑیں جی بھر کے
صلیبِ یقیں کو گاڑ دیں پھر نقشے پر
44 برس ہم پیچھے چلیں
آؤ ہم سب لڑیں جی بھر کے
وقت اک آئینہ مثال یہاں
کچھ بھی اب 'خفیہ' نہیں رکھا ہوا
میڈیا چیخ رہا ہے پھر سے
بازی گرو! شعبدہ بازی سے کچھ نہیں حاصل
اک پشیمانی سے بہتر ہے کہ مل جاؤ سب
ورنہ اب وقت وہی آ پہنچا
ایک دوجے سے الگ ہونے کا
جسم (پاکستان) کو کاٹ کر پھر رونے کا

امید ہے حالات چاہے جس بھی نہج پر چلے جائیں، ہمیں اپنے پاکستانی ہونے کا فخر اپنے سینے پر سجائے رکھنا ہے۔

ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ محبتوں کے رشتے استوار رکھنا ہے۔ ایک دوسرے سے محبت کریں، ایک دوسرے کا احترام کریں۔ پاکستان کی حفاظت میرا، آپ کا، ہم سب کا فرض ہے۔

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

اپنے دیس سے، اپنے شہروں سے محبت، وہ سچی بیانیاں
جن کو پڑھ کر اپنائیت کی خوشبو آس پاس محسوس ہوتی ہے

پہلی سچ بیانی

قائد! میں شرمندہ ہوں

ریحانہ نسیم

کراچی سے، قائد اعظم کے اُس عاشق کی کہانی
جو قائد کی شان میں گستاخی پر قربان ہو گیا

"ارے مہرین بیٹا! دیکھو تمہارے ابا کیا کر رہے ہیں؟" تحسین آراء نے کچن سے آواز لگائی۔

مہرین نے اپنے ابو کے کمرے میں جھانکا اور باہر آ کر اپنی امی سے بولی۔ "امی آپ 13 اگست کو



نہ پوچھا کریں کہ ابو کیا کر رہے ہیں۔ وہی پرانی شیروانی کی جھاڑ پونچھ کر رہے ہیں کل پہنیں گے 14 اگست کو۔ امی پلیز ابو کو نئی شیروانی سلوا کر دیں اتنی پرانی اور بوسیدہ شیروانی جب یہ پہن کر جاتے ہیں تو مجھے بہت شرمندگی ہوتی ہے۔"

"اور نہیں تو کیا! آپیا ٹھیک کہہ رہی ہے۔ امی! میرے سارے دوست میرا مذاق اڑاتے ہیں کہ قائد اعظم کے زمانے کی شیروانی خود ان کو قائد اعظم دے کر گئے تھے کیا؟ امی ابو کے پاس اتنے سارے کپڑے ہیں تو وہ اس کی ہی مرمت کیوں کرتے رہتے ہیں؟ ہر سال 14 اگست کو ہی کیوں پہن کر قائد اعظم کے مزار پر جاتے ہیں۔ آخر اس میں ایسی کیا بات ہے؟" اذہان بھی باہر سے آ گیا تھا اور اب اپنی بہن کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔ تحسین آراء کچن سے باہر آ گئی تھیں اور اب اپنے دونوں بچوں کی باتیں سن کر مسکرا رہی تھیں۔

ان کے شوہر مہتاب علی، اندر اپنے کمرے میں گھسے اپنی شیروانی کی جھاڑ پونچھ کر رہے تھے۔ تحسین آراء نے اپنے بچوں کو پیار سے دیکھا اور بولیں۔

"بچو! تم کو معلوم ہے کہ تمہارے ابو یونیورسٹی میں سیاسیات کے پروفیسر ہیں اور وہاں ان کی بہت عزت ہے۔ ان کے سارے اسٹوڈنٹس بھی ان کو بہت پسند کرتے ہیں۔ رہا سوال اس شیروانی کا۔ تو جب تمہارے ابا خود کالج کے اسٹوڈنٹ تھے تو قائد اعظم نے وہاں تقریر بھی کی تھی۔ تمہارے ابو نے ان سے ہاتھ ملایا تھا اور قائد اعظم نے ان کا کندھا تھپکا تھا۔ تمہارے ابو ان کو بہت پسند کرتے تھے اور ان کو اپنا آئیڈیل مانتے تھے۔ ان کی بتائی ہوئی ہر بات پر عمل کرتے تھے۔ جب پاکستان بن گیا تو سب یہاں آ گئے تمہارے ابو نے بھی اپنی پڑھائی جاری رکھی اور اب وہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ مگر اب بھی ان کو اس شیروانی سے بہت زیادہ جذباتی لگاؤ ہے۔ وہ اس شیروانی میں قائد اعظم سے ملتے تھے۔ اس لیے ہر سال 14 اگست کو اسے پہن کر ان کے مزار پر جا کر سلام کرتے ہیں۔ یہ صرف ان کی قائد اعظم سے عقیدت اور محبت ہے اور کچھ نہیں۔ اور اذہان! اگر تمہارے دوست تمہارے ابا کا مذاق اڑاتے ہیں تو تم نے ان سے دوستی کیوں رکھی ہے؟ کیا تم بھی ان کے ابا یا ان کے کپڑوں کا مذاق اڑاتے ہو؟" اذہان شرمندہ کھڑا تھا۔ وہ بولیں۔

"انسان کپڑوں سے، دولت سے، بڑا یا عزت والا نہیں بنتا، بلکہ اپنی تعلیم اور اچھے برتاؤ سے بنتا ہے۔ اس محلے کے سارے لوگ تمہارے ابو کی بہت عزت کرتے ہیں، جھک کر سلام کرتے ہیں۔ صرف ان کی شرافت اور تعلیم کی وجہ سے۔ ان کے کپڑوں یا بنک بیلنس کی وجہ سے نہیں۔" مہرین اور اذہان اب اپنے ابا کے جذبات کو سمجھ گئے۔

تحسین آراء کو آج بھی اچھی طرح یاد تھا جب ان کی مہتاب علی سے شادی ہوئی تو وہ بیاہ کر نمائش کے علاقے میں اس چھوٹے سے گھر میں آئی تھیں۔ ان کی شادی غیروں میں ہوئی تھی۔ وہ اپنے شوہر کو نہیں جانتی تھیں۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ گھر کے برآمدے میں ہی قائد اعظم کی بڑی سی تصویر لگی ہوئی تھی۔ وہ تو حیران ہوئیں مگر کچھ نہیں بولیں۔ پھر وہ اپنے شوہر کی فرمابردار بیوی بن گئیں۔ ان کی ہر بات مانتی تھیں وہ بھی ان سے بہت محبت کرتے تھے۔

شادی کے بعد جب پہلی دفعہ 14 اگست آئی تو مہتاب علی نے ان سے کہا "چلو آج قائد اعظم کے مزار پر چلتے ہیں۔" وہ خوشی خوشی تیار ہو گئیں۔ دونوں وہاں گئے۔ مہتاب علی نے اندر قبر کے پاس کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی۔ جذبات کی شدت ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ انہوں نے اندھی سی آواز میں دعا مانگی۔ وہ حیرانی سے اپنے شوہر کو اور قائد سے ان کی محبت کو دیکھ رہی تھیں۔ پھر یہ ہر سال کا پروگرام بن گیا۔ وہ ہر سال یہی شیروانی نکال کر پہنتے۔ جب تک وہ شیروانی اچھی حالت میں رہی تب تک تحسین آراء کچھ نہ بولیں۔ پھر جب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کپڑا بوسیدہ اور پرانا ہوتا گیا تو انہوں نے ان کو ٹوکنا شروع کر دیا کہ اب یہ مت پہنا کریں۔ بہت خستہ حالت ہو گئی ہے اس کی۔ نئی سلوائیں۔" مگر وہ ناراض ہو جاتے اور اسے پہننا نا چھوڑا۔ البتہ تحسین آراء نے بچوں کی مصروفیات کی وجہ سے مزار پر جانا چھوڑ دیا۔

جب سے اب تک مہتاب علی روٹین پر عمل پیرا تھے۔

اب تحسین آراء کو یہ بات سمجھ آ گئی کہ انہوں نے اس علاقے میں گھر کیوں لیا۔ تاکہ وہ مزار قائد پر با آسانی نہ جا سکیں تو دور ہی سے دیکھ لیں۔

وہ اپنے قائد سے والہانہ عقیدت اور محبت کرتے تھے۔ اس لیے ان کے جذبات مجروح نہ ہوں، تحسین آراء نے ان کے اس کام میں بولنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر بچے اب بڑے ہو گئے تھے اور انہوں نے اس شیروانی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ اس سے پہلے یہ بات مہتاب علی تک پہنچتی اور وہ ناراض ہو جاتے تحسین آراء نے بڑی خوبصورتی سے اور پیار سے بچوں کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کر دیا۔ اور اب وہ دونوں اپنے کام میں مگن ہو گئے۔

☆......☆......☆

مہتاب علی کا شمار یونیورسٹی کے اچھے اور پسندیدہ پروفیسر میں ہوتا تھا۔ وہ اپنے قائد کی ہر بات اور فرمان پر عمل کرتے تھے۔ پھر جب پاکستان بن گیا سب یہاں آ گئے جب قائد اعظم فوت ہوئے تو مہتاب علی بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کو بھی گاہے بگاہے موقع دیکھ کر قائد اعظم کے بارے میں کوئی بات یا واقعہ اس طریقے سے سمجھاتے کہ وہ آؤٹ آف بیلنس ہوتے ہوئے بھی اسٹوڈنٹس کو سمجھ آ جاتی اور پسند بھی آتی۔ اس طرح وہ اپنے قائد کے پیغام کو جو خود انہوں نے اپنے تعلیمی دور میں حاصل کیا تھا، اپنے سنجیدہ اور پُر اثر انداز میں دوسرے بچوں میں منتقل کرتے تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ اپنی اس شیروانی کو چھوڑ نہیں پا رہے تھے۔ جو کہ اتنے سالوں میں کافی بوسیدہ ہو گئی تھی۔ اور اس کا رنگ بھی خراب ہو گیا تھا۔ تحسین آراء بھی کچھ کہتی بھی تھیں تو مہتاب علی بھڑک جاتے کہ تم بھی بچوں کی باتوں میں آ جاتی ہو۔ اس میں قائد اعظم کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ ان کے ہاتھوں کا لمس ہے، نئی شیروانی میں تم یہ چیز ڈال سکتی ہو؟'' وہ بیچاری چپ ہو جاتیں، کس کی سنتیں بچوں کی یا شوہر کی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ ٹھیک تھے۔

☆......☆......☆

اب کل پھر 14 اگست تھی اور مہتاب علی شیروانی تیار کر رہے تھے۔ کل مزار قائد پر جانا تھا صبح سے ہی مزار پر اہم شخصیات کی آمد و رفت شروع ہو جاتی ہے۔ بہت رش ہوتا۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح دھکے کھاتے، گرتے پڑتے، فاتحہ ضرور پڑھ کر آتے۔ حالانکہ اب وہ عمر کے اس حصے میں تھے کہ جہاں دھکم پیل اور رش والی جگہ با آسانی چلنا ان کے لیے ذرا دشوار ہو گیا تھا۔ مگر ان کا کہنا تھا کہ جب تک وہ زندہ ہیں، وہ اپنے قائد کو سلام ضرور کرنے جائیں گے۔

ان کے دو ہی بچے تھے۔ مہرین اور اذہان۔ مہرین بی اے کر کے اب اسکول میں جاب کر رہی تھی۔ اذہان اس سے دو سال چھوٹا تھا۔ اسے ڈاکٹر بننا تھا۔ مہتاب علی متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ویسے بھی تدریس کے شعبے میں ہمیشہ عزت ملتی ہے دولت نہیں۔ ان کو یونیورسٹی میں اکثر عجیب و غریب پیشکش ہوتی رہتیں۔ خاص کر امتحانوں کے دنوں میں جب پیپرز تیار ہو رہے ہوتے تھے۔ ایک پیپر کی جھلک دیکھنے کے لیے ایک بھاری رقم دی جاتی یا جب کاپیاں چیک ہو رہی ہوتیں تو ایک ایک رول نمبر کے ساتھ بڑی بڑی رقموں کے چیک آتے۔ اگر مہتاب علی چاہتے تو اپنے گھر کے حالات بدل سکتے تھے۔ مگر مہتاب علی ان کو صاف انکار کرتے بڑے پیار بھرے انداز میں۔ پھر ان کے والدین بھی گھر تشریف لے آتے، کیوں کہ یونیورسٹی میں کھل کر بات نہیں کر سکتے تھے۔ مہتاب علی ان کو بھی پیار سے سمجھا کر واپس کر دیتے کیوں کہ ان جیسے لوگوں سے لڑنا یا اکڑ کر بات کرنے کا زمانہ نہیں تھا۔ ایک جوان بچی کے باپ تھے۔ بچی گھر سے باہر جاتی تھی۔ جوان لڑکا تھا جو کالج جاتا تھا۔ بیوی گھر پر اکیلی رہتی تھی۔ شریف انسان کو تو اپنے آگے پیچھے دیکھ کر چلنا پڑتا ہے۔ حالانکہ جو رقوم ان کو پیش کی جاتیں وہ اتنی ہوتی تھیں کہ وہ ڈیفنس میں اپنے دو چار بنگلے بنا سکتے تھے۔ امپورٹڈ گاڑی خرید سکتے تھے مگر وہ تو قائد اعظم کے اسٹوڈنٹ تھے، جب ان کے قائد نے

ایمانداری سے کام لیا تو وہ کیسے اپنی قوم کے ساتھ بے ایمانی کرتے۔

لوگ ان سے مایوس ہوکر دوسرے پروفیسرز کے پاس چلے جاتے اور اپنے من کی مراد پاتے۔ مہتاب علی کے ساتھی لیکچررز کے بنگلے، گاڑیاں سب کچھ پلک جھپکتے میں ہو جاتے۔ مگر مہتاب علی اپنی موٹر سائیکل پر یونیورسٹی آتے۔ ان کا ذہن مطمئن اور ضمیر مطمئن ہوتا۔ وہ بچوں کو پڑھا کر خوشی خوشی گھر آتے اور سکون کی نیند سوتے تھے۔

ان کی بیگم گھر حالات سے تنگ آ کر کبھی ناراض بھی ہو جاتیں کہ جوان بیٹی کی شادی کی عمر ہے اور وہ اسکول میں نوکری کر رہی ہے۔ تمہاری تنخواہ تو گھر ہی میں لگ جاتی ہے۔ ایک پیسہ نہیں بچتا۔ وہ اپنا جہیز خود بنا رہی ہے۔ بیٹا ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ کیسے ہوں گے یہ سارے کام؟'' مگر وہ اطمینان سے جواب دیتے کہ۔

''بیگم فکر مت کرو، اللہ مالک ہے! میں اپنے گھر کے مسائل حل کرنے کے لیے کبھی کوئی ناجائز کام نہیں کروں گا۔ اور نا اپنا ضمیر بیچوں گا۔ میری بیٹی کا جہاں نصیب لکھا ہوگا رشتہ خود چل کر آ جائے گا۔ اور ہمارے مالی حالات کو نظر انداز کر کے بیٹی کو بیاہ کر لے جائے گا۔ تم فکر مت کرو۔ رہا بیٹے کی پڑھائی کا مسئلہ، تو میں اس کو ٹیوشن دلواؤں گا۔ وہ گھر پر ہی ٹیوشن پڑھا کر اپنی پڑھائی کا خرچہ نکالے گا۔

وہ بیچاری مطمئن ہو جاتیں۔ ان کو زیادہ فکر مہرین کی تھی کہ اس کی جلد از جلد شادی کر دیں۔ حالانکہ وہ ابھی صرف 23 سال کی تھی مگر وہ ماں تھیں فکر کرتی تھیں انہوں نے اپنے طور پر دو چار محلے کی عورتوں سے بول رکھا تھا کہ کوئی شریف گھرانے کا پڑھا لکھا لڑکا ہو تو دیکھنا۔ بس ہمارے جیسے سفید پوش لوگ ہوں۔ ہمیں دولت روپے کا کوئی لالچ نہیں ہے۔ لڑکا شریف اور کماتا ہو۔'' اس لیے اکثر ان کے گھر عورتوں کا آنا جانا لگا رہتا۔ مگر ابھی تک بات نہیں بنی تھی۔ اگر پیسے والی پارٹی ہوتی تو اس چھوٹے سے گھر کو دیکھ کر پلٹ جاتی اگر جاہل ٹائپ کے لوگ ہوتے تو تحسین آراء منع کر دیتیں۔ مہرین اکثر جل جاتی کہ امی آپ نے یہ کیا چکر چلایا ہوا ہے؟ ہر دس پندرہ دن کے بعد کوئی نہ کوئی آنے کی اطلاع بھجوا دیتا ہے۔ اگر اس کو ان لوگوں کے استقبال کے لیے تیار ہونا پڑتا ہے۔

اسکول سے آ کر وہ تھک جاتی تھی۔ صبح 6 بجے اٹھنا پڑتا 7 بجے اسکول کی گاڑی لینے آ جاتی پھر 2 بجے گھر واپسی ہوتی اور پھر جس دن گھر کسی کو آنا ہوتا تو وہ جل بھن کر راکھ ہو جاتی اور پاؤں پٹختی ہوئی کمرے میں چلی جاتی۔ تحسین آراء اس کو مسکرا کر دیکھتیں۔

آج بھی کوئی ایسا ہی پروگرام تھا آج خالہ نصیبن کسی کو لا رہی تھیں۔ عموماً دو خواتین ہوتیں اور مہرین ان کو چائے لا کر پیش کرتی۔ مہرین کو یہ بات بری لگتی کہ امی صبح سے ہی ان کے استقبال کے لیے تیاری کرتیں اور جب بات نہ بنتی تو ٹھنڈی آہیں بھرتیں۔ وہ تو اپنی امی کا ٹوٹتا ہوا دل بار بار نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ ناراض ہو جاتی۔

آج بھی اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ مگر پھر بھی اس نے نہا دھو کر شام کو لان کا گرین سوٹ پہنا، لمبے بالوں میں چوٹی بنائی اور بس..... اس کو میک اپ بالکل پسند نہیں تھا۔

ان لوگوں کو چار بجے آنا تھا۔ مگر اب پانچ بج چکے تھے۔ نا کوئی آیا نہ کوئی گیا۔ وہ اپنے اسکول کی کاپیاں لے کر باہر صحن میں بچھے ہوئے تخت پر آ کر بیٹھ گئی اور کاپیاں چیک کرنے لگی۔ اس کی امی عصر کی نماز پڑھنے کمرے میں چلی گئیں۔ اذہان باہر چلا گیا۔ مہتاب علی کسی کام سے گئے ہوئے تھے ابھی اس کو بیٹھے ہوئے دو ہی منٹ ہوئے تھے کہ دروازے پر بیل بجی۔ وہ وہ ناگواری سے اٹھی اور پھٹاک سے دروازہ کھول کر زور سے بولی۔'' کووون؟'' باہر کھڑا نوجوان ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اب اسے ہوش آیا، ارے یہ تو کوئی ہینڈسم، خوبصورت سا نوجوان کھڑا تھا۔ ساتھ میں ایک مسکراتی شکل کی ایک پڑھی لکھی خاتون بھی تھیں۔ مہرین منہ کھولے ان کو دیکھ رہی تھی وہ دونوں اجنبی تھے۔ مہرین ہوش میں آئی ان کو سلام کیا۔ انہوں

نے مسکرا کر جواب دیا۔ وہ خاتون بولیں۔

''بیٹا! پروفیسر مہتاب علی کا گھر یہی ہے؟'' مہرین بولی۔

''جی ہاں۔'' وہ خاتون بولیں۔

''ہمیں خالہ نصیبن نے بھیجا ہے۔'' مہرین پر گھڑوں پانی گر گیا۔ یہ تو وہ لوگ تھے جن کو آج آنا تھا۔ وہ خاتون پھر بولیں۔

''بیٹا! کیا ہم اندر آ سکتے ہیں؟'' اب مہرین نے اپنے اوپر غور کیا تو وہ دروازے میں ان کا راستہ روکے کھڑی تھی۔ وہ جھینپ کر ایک طرف ہوگئی۔ وہ لوگ اندر آ گئے نوجوان مستقل اسے دیکھ کر مسکرائے جا رہا تھا۔ مہرین کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے وہ اندر تخت سے جلدی سے اپنی بکھری ہوئی کاپیاں سمیٹنے لگی تاکہ ان کے بیٹھنے کی جگہ بن پائے۔

چھوٹا سا صحن مگر صاف ستھرا چاروں طرف کیاریاں ان میں لگے ہوئے پودے اور پھول۔ صحن پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ صاف ستھرا تخت گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں تخت پر بیٹھ گئے۔ مہرین جلدی سے کاپیاں سمیٹ رہی تھی۔ وہ خاتون اور نوجوان دونوں اس سادہ اور خوبصورت لڑکی کو گھبرائے ہوئے انداز میں کام کرتا دیکھ رہے تھے۔ مہرین دل ہی دل میں خالہ نصیبن کو گالیاں دے رہی تھی۔ ہر دفعہ وہ اپنا شٹل کاک برقعہ سنبھالے آگے آگے ہوتی تھیں مگر آج تو وہ تھیں نہیں ڈائریکٹ مہمان آ گئے تھے۔

اس عرصے میں تحسین بھی نماز پڑھ کر باہر آ گئیں۔ ان مہمانوں کو حیرانی سے دیکھا اور سلام کیا۔ مہرین تب اندر جا چکی تھی۔ خاتون بولیں ہمیں خالہ نصیبن نے بھیجا ہے وہ بھی ہمارے ساتھ آ رہی تھیں مگر عین وقت پر ان کے کسی عزیز کے انتقال کی خبر آ گئی تو وہ رُک گئیں اور آپ کا ایڈریس ہمیں لکھ کر دے دیا۔ ہم لوگ خود ہی آ گئے۔''

تحسین آراء بہت خوش ہوئی اور بولیں ''آپ کو گھر ڈھونڈنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوئی؟'' مہرین اندر کمرے میں حیران ہو رہی تھی کہ اس کی امی ہر اجنبی خاندان سے ایسے محبت سے ملتی ہیں کہ جیسے ان کو برسوں سے جانتی ہیں۔ خاتون بولیں ''یہ میرا بیٹا جنید ہے۔ میرا نام ندا ہے۔ جنید یونیورسٹی میں پروفیسر مہتاب علی کا اسٹوڈنٹ رہ چکا ہے، اور ان کو بہت پسند کرتا ہے۔ جب اس کو پتا چلا کہ ہم پروفیسر صاحب کے گھر جا رہے ہیں تو بہت خوش ہوا۔ میں اسی لیے آپ کی بیٹی کو دیکھنے آئی ہوں۔ میرا بیٹا بنک میں جاب کرتا ہے۔ ہمارا گھر بھی آپ کے گھر کی طرح چھوٹا سا ہے۔ مگر وہاں آپ کو تعلیم اور شرافت ضرور ملے گی۔'' تحسین آراء ان کو حیرانی سے دیکھ رہی تھیں اتنے میں مہتاب علی بھی آ گئے۔ جنید ان کو دیکھ کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ وہ اس نوجوان کو حیرت سے دیکھنے اور پہچاننے کی کوشش کرنے لگے۔

جنید نے آگے بڑھ کر ان سے ہاتھ ملایا اور بتایا کہ وہ کس سن میں ان کا اسٹوڈنٹ رہ چکا ہے۔ اور اب جاب کر رہا ہے مہتاب علی کو یاد آ گیا انہوں نے خوشی سے اسے گلے لگایا وہ ان کا لائق شاگرد تھا۔ مگر وہ اس کو اپنے گھر میں دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ تب تحسین آراء نے ان کو تمام تفصیل خالہ نصیبن کے حوالے سے بتائی۔ وہ اور زیادہ خوش ہو گئے۔ مہرین کو اندر کمرے میں ساری آوازیں آ رہی تھیں۔

باورچی خانے میں جانے کے لیے ان کے سامنے سے گزرنا پڑتا تو اندر ہی چھپ کر بیٹھی رہی۔ پھر ان کی آواز آئی۔ ''ارے بھئی اپنی بیٹی کو تو بلوائیں۔ تب تحسین آراء اندر آئی تو مہرین بولیں۔

''چلو بیٹا وہ باہر بلا رہی ہیں۔'' مگر اسے پتا لگ گیا تھا اس لڑکے کے لیے اسے دیکھنے آئی ہیں تو اس سے ہلا نہیں جا رہا تھا۔ اس نے تو اتنی بدتمیزی سے دروازہ کھولا تھا۔ وہ لوگ کیا سوچ رہے ہوں گے۔ اس کے بارے میں۔ یہ بات اس کو بہت پریشان کر رہی تھی۔ مگر دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اور اب تو ابو بھی آ گئے تھے۔ ناچار وہ سر پر دوپٹہ اوڑھ کر اپنی امی کے ساتھ باہر آ کر ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ تحسین آراء نے اسے اندر سے ڈرائینگ روم میں چلنے کو کہا مگر ان کو صحن میں اس تخت پر زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔ اس لیے تحسین آراء وہیں پر کرسیاں لے آئیں تاکہ سب آرام سے بیٹھ سکیں۔

ندا بیگم نے مہرین سے پوچھا کہ بیٹا آپ کیا کرتی ہیں؟" وہ ادب سے بولی۔

"جی میں نے بی اے کیا ہے اور اب میں اسکول میں جاب کر رہی ہوں۔ ندا بیگم نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ان کو یہ سیدھی سادی اور شریف لڑکی بہت پسند آئی تھی، ورنہ آج کل کی تو جاب کرنے والی لڑکیاں تو ساری تنخواہ اپنے لباس اور میک اپ پر لگاتی ہیں۔ مگر مہرین لان کے سوٹ میں نکھری نکھری بہت پیاری لگ رہی تھی۔ جنید بھی اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کی تپش مہرین اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی وہ جلد از جلد وہاں سے اٹھ جانا چاہتی تھی۔ ندا بیگم پھر بولیں" بھائی صاحب ہمیں تو آپ کی بیٹی بہت پسند آئی ہے۔ یہ میرا نالائق بیٹا آپ کے سامنے حاضر ہے۔ جتنا لمبا انٹرویو کرنا چاہیں کر لیں۔ ہمارے علاوہ اور کوئی نہیں ہے جو آپ لوگوں کو بار بار آ کر ڈسٹرب کرے۔ فیصلہ ہم ماں بیٹے کو ہی کرنا ہے ان کے والد صاحب تو عورتوں کے معاملے میں بولتے نہیں ہیں۔ ایک بیٹی ہے اجیاء جو جنید سے بڑی ہے۔ اس کی شادی کر دی ہے وہ دبئی میں ہے۔ اب اس نے کہا ہے آپ لوگ لڑکی پسند کر لیں اور مجھے بتا دیں تاکہ میں تیاری کر کے آ جاؤں۔ اب آپ لوگ میرے بیٹے کو دیکھ لیں مناسب لگے تو ہاں کر دیں۔ ورنہ کوئی زبردستی نہیں ہے۔ میرے شوہر عمران بنک میں تھے۔ اب وہ ریٹائرڈ ہو گئے ہیں اور جنید بنک میں ہے۔ میں اس کے سر پر سہرا دیکھنا چاہتی ہوں۔ اکیلے گھر میں پڑی رہتی ہوں۔ بہو آ جائے تو ذرا رونق ہو جائے گی۔ میری بہو میری پسند کی ہو گی اور کو تو دکھانا نہیں ہے ہاں البتہ آپ لوگوں نے کوئی اور لڑکا بھی دیکھ رکھا ہو تو بھی کوئی بات نہیں۔" انہوں نے ایک ہی سانس میں لمبی تقریر کر دی۔

مہتاب علی لیکچرار ہوتے ہوئے بھی ان کے آگے گنگ بنے منہ کھولے بیٹھے رہے۔ اور سوچ رہے تھے کہ یا تو وہ اس رشتے کے لیے پریشان بیٹھے تھے یا رشتہ گھر پر ہی آ رہا تھا۔ ان کا اتنا بڑا منہ کھلا دیکھ کر تحسین آراء نے ان کو کہنی سے ٹھوکا دیا تو وہ جیسے ہوش میں آ گئے۔ اور ناک پر آیا ہوا چشمہ ہاتھ سے اوپر کیا اور کھنکار کر بولے۔

"ارے بی بی آپ چائے وغیرہ تو پئیں، پھر بات بھی کر لیں گے! ارے مہرین بیٹا جاؤ! چائے وغیرہ تو لاؤ مہمانوں کے لیے۔" مہرین تو کب سے بھاگنے کے لیے تیار بیٹھی تھی فوراً کھڑی ہو گئی اور جھپاک سے کمرے میں غائب ہو گئی۔ اس کی تیزی دیکھ کر جنید دل میں بولا۔ 'وری کوئیک سروس'۔ تحسین آراء نے ندا بیگم کی شخصیت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بہن برا مت مانیے گا، آپ تو ماشاء اللہ سے خود کافی جوان ہیں اور بہو تو آپ کے ساتھ بیٹی لگے گی۔ آپ تو ساس بالکل نہیں لگیں گی۔"

ندا بیگم اپنی تعریف سن کر بہت خوش ہوئیں اور بولیں۔

"بس بہن میرے بی اے کرتے ہی فوراً شادی کر دی تھی۔ بیٹی بھی سال کے اندر ہو گئی تھی اگلے سال بیٹا ہو گیا۔ اس کے بعد اللہ نے تیسری اولاد نہیں دی تو ہم نے بھی صبر و شکر کیا۔ دو بچوں کا کام ہی کتنا ہوتا ہے یہ لوگ تھوڑے سے بڑے ہوئے تو میں نے ایک سوشل ورک تنظیم جوائن کر لی۔ گھر اور باہر دونوں جگہ انصاف کیا۔ اچھا رشتہ دیکھ کر بیٹی بھی جلدی بیاہ دی اب بیٹا شادی کے قابل ہو گیا ہے تو اب بھولا کر آرام کروں گی اب وہ تنظیم بھی چھوڑ دی ہے تو گھر میں اکیلے دل ہی نہیں لگتا۔ بہو کے آنے سے رونق ہو جائے گی۔"

مہرین نے اندر ڈرائینگ روم میں ناشتا لگا دیا تھا سب اندر کمرے میں آ گئے۔ سامنے ہی دیوار پر ایک قد آدم تصویر لگی ہوئی تھی۔ قائداعظم کی تھی۔ ندا بیگم اور جنید اس تصویر کو دیکھ کر بہت پریشان ہوئے۔ مہتاب علی نے ان کی حیرانی دور کر دی اور کہا کہ۔ میرے استاد ہیں یہ۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے ان کی تصویر لگائی ہے۔" اتنے میں اذہان بھی باہر سے آ گیا۔ اس نے سب کو ادب سے سلام کیا پھر سب نے بیٹھ کر چائے پی۔ مہرین دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔

ندا بیگم نے ان کو سوچنے سمجھنے اور جنید کی چھان بین کرنے کے لیے پورے ایک ہفتے کا ٹائم دیا تھا۔ اور کہا کہ آپ لوگ پورا اطمینان کر لیں انہوں نے اپنا فون نمبر اور گھر کا اور بنک کا ایڈریس اور برانچ نمبر بھی دیا اور وہ لوگ ہنسی خوشی چلے گئے۔

مہتاب علی کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ جس مسئلے کی وجہ سے وہ دن رات پریشان رہتے تھے۔ وہ یوں اچانک حل ہو جائے گا۔ انہوں نے اپنی بیگم سے کہا دیکھو بیگم میں نہ کہتا تھا کہ ہر کام اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ وہ جب چاہے پلک جھپکتے میں کیا سے کیا کر دے بس بندے کو اس کی ذات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔" تحسین بھی بہت خوش تھیں۔ اب ان کو اس بنک میں جا کر جنید کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھی لیکن ان کو خود جاتے ہوئے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے دوست لیکچرار رئیس صاحب سے اس سلسلے میں بات کی بنک کا نام اور برانچ بتائی اتفاق سے رئیس صاحب کا داماد طارق بھی اسی بنک میں جاب کرتا تھا یوں یہ مسئلہ باآسانی حل ہو گیا۔ طارق اور جنید گہرے دوست بھی تھے جب اس کو یہ سارا معاملہ پتا چلا تو اس نے جنید کو خوب تنگ کیا اور بڑی ٹریٹ مانگی اور دھمکی دی کہ اگر اس پر عمل نہیں کیا تو تیرے سسرال بری رپورٹ بھیجوں گا جنید بولا یار! رشتہ تو کراؤ پھر کھانا پینا بھی ہو جائے گا۔ تب جا کر وہ مانا اور اپنے سسر رئیس صاحب کو بتایا کہ جنید بہت اچھا، سلجھا ہوا اور شریف گھرانے کا لڑکا ہے۔ آپ اپنے دوست کو بتا دیں کہ بے فکر ہو کر رشتہ کریں۔ مہتاب علی مطمئن ہو گئے اور جنید کے گھر فون کر کے اتوار کو اپنے آنے کی اطلاع دے دی۔ تاکہ وہ لوگ بھی ان کا گھر دیکھ سکیں۔

☆......☆......☆

تحسین بہت خوش تھی مہرین اکیلے کیسے رہتی۔ لہٰذا اس نے اپنی دوست رعنا کو گھر بلا لیا۔ رعنا بھی اس کے ساتھ اسکول میں جاب کر لی تھی اور قریب ہی گھر تھا۔ وہ آ گئی۔ مہرین خوش تھی اس نے بھی لڑکے کو خود دیکھ لیا تھا۔ ورنہ تصویر اور حقیقت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

مہتاب علی اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ جنید کے گھر میں تھے۔ ناظم آباد میں اچھا خاصا بڑا مکان تھا۔ مہتاب علی کو اپنا گھر چھوٹا لگ رہا تھا مگر وہ خوش تھے ان کی بیٹی بیاہ کر اچھے گھر میں جا رہی ہے۔ جنید کے والد عمران صاحب اور والدہ ندا بیگم نے ان لوگوں کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ جنید بھی گھر پر ہی تھا۔ سب اندر گئے۔ عمران صاحب مہتاب علی سے باتیں کرنے لگے۔ عمران، مہتاب علی اور ان کے گفتگو کے انداز سے بہت متاثر ہوئے۔ قائد اعظم اور پاکستان سے ان کی محبت دیکھ کر اور خیالات سن کر وہ بہت خوش ہوئے۔ اس دور میں ان خیالات کا ہونا اور ان پر عمل کرنا بالکل نایاب سی بات تھی مگر مہتاب علی کا ایک زندہ مثال کی طرح ان کے سامنے موجود تھی۔ وہ بہت خوش تھے کہ ان کے بیٹے کو ایسے لائق استاد نے تعلیم دی ہے وہ بھی ہنسی خوشی اس رشتے کے لیے تیار ہو گئے۔

دوسرے کمرے میں تحسین آراء اور ندا بیگم باتیں کر رہی تھیں اور ساتھ میں مہنگائی کا رونا بھی ہو رہا تھا۔ البتہ اذہان جنید کی باتوں سے بہت خوش ہو رہا تھا۔ اس کا شفقت بھرا انداز اذہان کو بہت پسند آیا اتنے میں نوکر چائے لگنے کی اطلاع دے گیا۔ بڑی ہی ڈائنگ ٹیبل پر اچھا خاصا پر تکلف اہتمام کیا گیا تھا۔ وہ لوگ مالی اعتبار سے مہتاب علی سے کہیں آگے تھے۔ مگر انسانوں کی پہچان تھی ان کو۔ اس لیے مہتاب علی کی غربت کے باوجود ان میں چھپی شرافت اور سادگی کو وہ پہچان گئے تھے۔ اور مہتاب صاحب کو اپنا سمدھی بنانے پر تیار ہو گئے تھے۔ دونوں کے خاندان کے افراد بھی برابر تھے۔ دو بجے ادھر تھے تو اُدھر۔ چنانچہ اگلے مہینے کی □ 6 تاریخ کو منگنی کا دن طے کر دیا گیا۔ ندا بیگم بہت خوش تھیں۔ انہوں نے فوراً ہی دبئی فون کر کے اجیا کو سب باتیں بتا دیں۔ انہوں نے مہرین کی تصویر بھی ان لوگوں سے لے کر کمپیوٹر کے ذریعے اجیا کو بھجوا دی تھی۔ اجیاء کو بھی مہرین بہت پسند آئی۔ اجیاء نے مہرین کے لیے اپنی پسند کے کپڑے، جیولری، میک اپ، شوز، پوری لسٹ امی کو بتائی انہوں نے جنید کے ساتھ جا کر

ساری شاپنگ کی۔ آخر ایک ہی تو بہو آنی تھی ان کی۔ اپنے ملنے جلنے والوں کو بھی دکھانا تھا کہ ہماری بہو کتنی خوبصورت ہے۔

ادھر تحسین آراء نے بھی اپنی بساط سے بڑھ کر جنید کے لیے منگنی میں دینے کے لیے سامان خریدا۔ جوتے، کپڑے، شیونگ کا سامان، انگوٹھی، ہر چیز اچھی سے اچھی خریدی۔ ان کا بھی تو ایک ہی داماد آنا تھا۔ جنید کو بھی اپنے کپڑے وغیرہ بہت پسند آئے مہرین کا سامان بھی ایک دن پہلے دے دیا گیا تاکہ وہ فٹنگ وغیرہ کر لے۔ مہرین نے تو کبھی خواب میں بھی اتنے مہنگے کپڑے اور جوتوں کے بارے میں نہیں سوچا تھا اور اب حقیقت میں یہ ان سب اس کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ منگنی میں جب تیار ہوئی تو اس کی اسکول کی ٹیچرز بھی اسے دیکھ کر حیران ہو گئیں اتنے مہنگے سوٹ میں میک اپ اور جیولری پہنے وہ کوئی اور ہی لڑکی لگ رہی تھی۔

سب مہرین کی قسمت پر رشک کر رہی تھیں۔ جنید کو بھی وہیں بلوالیا گیا تھا تاکہ ایک ہی جگہ رسم ہو جائے۔ جنید اپنی مردانہ وجاہت کے ساتھ جلوہ گر ہوا تو ساری کنواری لڑکیوں کے دل دھڑکنا بھول گئے۔ جنید کے دوست مہرین کو دیکھ کر بہت مبارکباد دے رہے تھے۔ غرض کے دونوں کی چاند سورج کی جوڑی لگ رہی تھی۔ بہت اچھے ماحول میں رسم ادا کی گئی۔

☆......☆......☆

ندا بیگم نے اجیا کو بھجوانے کے لیے مہرین اور جنید کے کلوز اپ خاص طور پر بنوائے تھے۔ ویسے بھی مہرین تیار ہو کر جس روپ میں ان کے سامنے آئی تھی تو ان کی آنکھیں خیرہ ہوگئی تھیں۔ اتنے کم میک اپ اور ہلکی پھلکی جیولری میں اس کا حسن ایسے نکھر رہا تھا تو شادی میں تو سولہ سنگھار ہوں گے۔ تب کیا ہوگا؟ وہ اپنی پسند پر بہت خوش تھیں۔ اور بار بار اس کو پیار کر رہی تھیں کچھ کپڑوں کا شیڈ، کچھ شرم حیا، جنید کا برابر میں بیٹھنا، ساس کا واری صدقے جانا۔ شرم سے اس کے گال دہک رہے تھے۔ جنید کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی دو بول پڑھوا کر ساتھ ہی لے جائے۔ ہنسی

خوشی تمام کام انجام پائے۔ مہرین نے دو دن کی چھٹی لے رکھی تھی تاکہ اس کی امی پر اکیلے سارے کام کا بوجھ نہ پڑ جائے۔ ذرا سی تقریب میں بھی پورا گھر الٹ پلٹ ہو جاتا ہے۔ پھر اس کو سیٹ کرنے میں ٹائم لگتا ہے۔

اب تحسین آراء کو فکر لگ گئی شادی کے انتظامات کی، جہیز بنانے کی، زیور، فرنیچر، کپڑے، کراکری، مشینری غرض کہ ہر شے خریدنی تھی۔ بیٹی کو تو جتنا بھی دو کم ہے۔ مہتاب علی پھر ان کو تسلی دیتے کہ۔

''بھئی بیگم تم نے پھر پریشان ہونا شروع کر دیا۔ ابھی تو منگنی ہوئی ہے پورا سال پڑا ہے۔ ہو جائے گا انتظام بھی۔ جس اللہ نے یہاں تک پہنچایا ہے آگے بھی وہی کرے گا۔ میرے یا تمہارے پریشان ہونے سے کیا ہوگا۔

مہرین کے پاس تھوڑے بہت پیسے جمع ہو گئے تھے۔ اس نے امی سے کہا تھوڑی تھوڑی بہت شاپنگ شروع کر دیتے ہیں۔ پیسے آتے رہیں گے۔ سامان لاتے رہیں گے تاکہ آرام آرام سے کام ہوتا رہے گا۔ چنانچہ اس نے شاپنگ شروع کر دی۔ کبھی وہ اسکول کی دوست رعنا کے ساتھ چلی جاتی۔ کبھی امی کے ساتھ۔ اُدھر ندا بیگم بھی پُر جوش تھیں۔ ان کے ہاں تو پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ انہوں نے اجیاء سے کہا زیور پیسا اچھا ملتا ہے وہاں سے لیتی آنا۔ وہاں کے سامان کی تو بات ہی اور ہے۔ اجیاء دبئی میں اپنی بھابی کے لیے شاپنگ کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

مہتاب علی 3 بجے یونیورسٹی سے آتے تھے۔ مہرین 2 بجے آتی تھی جب اس کے ابو آ گئے تو سب نے مل کر کھانا کھایا، باورچی خانہ صاف ستھرا کر کے دونوں ماں بٹی بازار جانے کو تیار ہو گئیں۔ مہتاب علی تیاری دیکھ کر سمجھ گئے اور بولے۔

''کیا آج بھی بازار جانا ہے؟'' بیگم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اذہان بولا۔

''ابو مجھے ذرا اپنے دوست دانش کے پاس جانا ہے۔ ایڈمیشن کے سلسلے میں بات کرنی ہے میں 6 بجے تک واپس آ جاؤں گا۔'' اس کے ابو نے اسے

اجازت دے دی وہ چلا گیا۔ تحسین آراء اور مہرین بھی تیار ہوگئیں اور بولیں۔

"ہم لوگ بھی چھ یا سات بجے تک آجائیں گے۔ آپ گیٹ بند کر کے آرام سے سو جائیں۔" وہ بولے۔

"ٹھیک ہے تم لوگ جاؤ میں آرام کروں گا۔ پھر چائے پی کر ٹی وی دیکھوں گا۔" ان لوگوں نے اپنے پرس سنبھالے اور خدا حافظ کہہ کر نکل گئیں۔ مہتاب علی نے گیٹ بند کیا۔ تھکے ہوئے تھے فوراً ہی سو گئے۔ خالی گھر میں ان کے خراٹے گونج رہے تھے۔ پونے پانچ بجے ان کی آنکھ کھلی۔ ابھی خاصی شام ہو گئی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر اپنے لیے چائے بنائی اور ڈرائنگ روم میں آکر چائے پینے لگے۔ پھر فارغ ہو کر انہوں نے ٹی وی آن کیا۔

نیوز چینل ان کے پسندیدہ چینل تھے۔ وہ ریموٹ سے اِدھر اُدھر چیک کر رہے تھے کہاں سے خبریں آرہی ہیں۔ تب ہی ایک جگہ انہوں نے آواز بلند کی اور آرام سے میز پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئے اور خبریں سننے لگے۔ ایک کے بعد ایک خبر آتی رہی، پھر وہ منحوس خبر آئی جس کو سن کر مہتاب علی کے ہوش اڑ گئے۔

خبر کیا تھی ایک بم تھا۔ جو کہ ان کے دل و دماغ میں بلاسٹ ہوا تھا۔ قائداعظم کے مزار کے احاطے میں ایک گاؤں کی دوشیزہ جو پہلی بار کراچی گھومنے اور قائداعظم کے مزار پر حاضری دینے آئی تھی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اس کو وہیں مزار کے اہلکاروں نے اسی مزار کے احاطے میں بے آبرو کر دیا۔ خبر کیا تھی دھماکہ تھا۔ مہتاب علی بیٹھے سے کھڑے ہوگئے۔ اب اس لڑکی کا روتا ہوا چہرہ دوپٹے سے ڈھکا ہوا ٹی وی پر دکھایا جا رہا تھا۔ مہتاب علی دم بخود کھڑے اس خبر کو سن رہے تھے۔ وہ بڑبڑانے لگے۔

"میرے قائد کے مزار پر یہ مکروہ حرکت اور غلیظ حرکت۔ انہوں نے تو مسلمان عورتوں کی عزت و ناموس کی حفاظت کے لیے پاکستان بنایا تھا۔ اسی پاکستانی لڑکی کی عزت، ان ہی کے مزار پر، ان ہی پاکستانیوں نے، وہیں مزار کے اہلکاروں نے، روند ڈالی۔ نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ میرے قائداعظم کے مزار پہ یہ کام نہیں ہوسکتا۔ قائداعظم کیسے تڑپے ہوں گے۔ میرے قائداعظم نے پاکستان بنایا تھا، پاکستانیوں کے لیے۔ آزادی کے لیے، یہاں سب آزاد ہیں، یہاں سب کی عزت محفوظ ہے۔ یہ مزار قائد نہیں بلکہ ایک چراغ ہیں۔ یہاں روشنی ہے، نور ہے، اس چراغ کی روشنی پورے پاکستان کو روشن کر رہی ہے یہاں اس چراغ تلے اتنا اندھیرا نہیں ہوسکتا۔ یہاں صرف روشنی ہے، میرے قائد کی روشنی ہے۔ پورا کراچی اس مزار کی وجہ سے روشن ہے یہ روشنیوں کا شہر ہے اسی قائد کی وجہ سے ہے۔ اس مزار کی وجہ سے ہے یہ اندھیر نگری نہیں ہے۔ یہاں اندھیرا کس نے پھیلایا تھا۔ یہ غلاظت اس پاکیزہ جگہ پر کس نے پھیلائی؟ میرے قائد کو بے آبرو کس نے کیا۔"

وہ ہذیانی انداز میں بولے جا رہے تھے ان کو خود اپنی آواز نہیں آرہی تھی۔ کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ٹی وی پر اب کوئی دوسری خبر چل رہی تھی، مہتاب علی کے دل و دماغ میں تو آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ ان کو گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔ دل گھبرانے لگا۔ آنکھیں پتھرانے لگیں۔ تب ہی ان کی نگاہ سامنے قائد کی تصویر پر پڑی۔ ان کانوں میں قائد کی آواز آرہی تھی۔

"میرے نوجوانو! یہ ملک آپ ہے۔ آپ کو آگے چل کر اس کی باگ دوڑ سنبھالنی ہے۔ اس کی عزت و ناموس کی حفاظت کرنی ہے۔"

ان کی آنکھیں خلا میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ وہ اپنی کالی شیروانی پہنے قائداعظم سے ہاتھ ملا رہے تھے اور قائد ان کا کندھا تھپتھپا رہا تھا۔

"ہاں میں کروں گا پاکستان کی حفاظت، ہاں میں آپ کا پیغام دوسروں تک پہنچاؤں گا۔ وہ خود کلامی میں مبتلا تھے۔

"میرے قائد میں اپنے مشن میں ناکام رہا۔ پاکستان کی حفاظت نہ کر سکا۔ میں اپنی بہن بیٹی کی ناموس نہ بچا سکا۔ میں ناکام ہوگیا۔" وہ زمین پر گرتے چلے گئے۔ اتنی بڑی اور منحوس خبر کو اس کے اس دل نے، جس میں صرف قائد اور ان کی محبت تھی،

اس دل نے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے مزار پر یہ غلیظ اور ناپاک حرکت کی گئی تھی۔ لٹنے والی پاکستانی، لوٹنے والے پاکستانی۔

''نہیں یہ میرے قائد کا پاکستان نہیں ہے۔'' وہ اپنا دل پکڑے زمین پر گر گئے۔ ان کی زبان پر صرف ''میرے قائد میرے قائد'' کے الفاظ تھے۔ آنکھوں میں غنودگی اترتی جارہی تھی۔

گھر میں کوئی نہیں تھا جو کہ ان کی یہ حالت دیکھتا۔ ٹی وی آواز میں ان کی بڑبڑاہٹ کسی کو سنائی نہیں دے رہی تھی۔ نہ جانے کتنے لوگوں نے اس خبر کو سنا ہوگا۔ کسی نے افسوس کیا ہوگا کسی نے نظر انداز کیا ہوگا۔ مگر مہتاب علی تو زندہ ہی اپنے قائد کی وجہ سے تھے۔ ان کے قائد کی روح بھی ایسے ہی تڑپی ہوگی جیسے مہتاب علی تڑپ رہے تھے۔ وہ زمین پر پڑے تھے، دل ودماغ میں جنگ جاری تھی دل کہہ رہا تھا کہ تو بھی اس خبر کو سن کر خاموش ہو جا۔ تجھے اس دنیا میں دھڑکنے کا اب کوئی حق نہیں۔

دل نیچے ہی نیچے بیٹھا جا رہا تھا دماغ میں قائد کی آواز گونج رہی تھی کانوں میں ٹی وی کی آواز آ رہی تھی۔ نہ وہ زندوں میں تھے نہ مردوں میں۔ میں اپنے قائد کو کیا جواب دوں گا۔'' دماغ اب بھی سوچ رہا تھا۔ دل بند ہوتا جا رہا تھا۔ آنکھیں حلقوں سے باہر آرہی تھیں۔ چشمہ صوفے کے نیچے جا گرا تھا۔ ٹی وی پر اب کوئی ملی نغمہ آرہا تھا۔ مہتاب علی اب بھی سن رہے تھے۔

اے روح قائد آج کے دن
ہم تجھ سے وعدہ کرتے ہیں

انہوں نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو زبردستی کھولنے کی کوشش کی۔ وہ کسی کو دیکھنا چاہ رہے تھے تحسین آراء، مہرین کو یا اذہان کو مگر اب کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ روشنیوں کا شہر اندھیرے میں ڈوب چکا تھا۔ قائد کی روح بھی اپنا منہ چھپا کر کہیں بادلوں میں چلی گئی تھی۔ مہتاب علی کا جسم اب ساکت ہوتا جا رہا تھا ہونٹ آہستہ آہستہ بند ہوتے چلے گئے۔ وہ آنکھیں بند ہوگئیں جو قائد کے مزار پر احترام سے جھکتی تھیں، اب شرم سے بند ہوگئی تھیں۔ دل بند ہوگیا ایک سچا پاکستانی اپنے قائد کی عزت پر قربان ہو گیا تھا۔ ان کا جسم تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ اذہان کب آیا کیسے آیا؟؟ دروازہ توڑ کر آیا یا دیوار پھلانگی؟ کب تحسین آراء اور مہرین آئیں؟ وہ ان سب باتوں سے بے نیاز اپنے قائد کے پاس چلے گئے تھے۔ مہرین کی شادی اب کیسے ہوگی؟ اذہان ڈاکٹر کیسے بنے گا؟ تحسین آراء یہ سب کچھ کیسے اکیلے کر پائیں گی؟

کسی کو ان کی موت کی اصل وجہ سمجھ نہیں آئی۔ سب ہارٹ اٹیک سمجھا رہے تھے۔ ان کو ہسپتال لے جایا گیا۔ مگر ڈاکٹر نے ان کی موت کی تصدیق کر دی تھی اور کہا کہ اچانک صدمے سے ان کا ہارٹ فیل ہوا ہے۔ تحسین، مہرین اور اذہان کا رو رو کر برا حال تھا۔ اذہان نے بہت بیل بجائی جب گیٹ نہ کھلا تو دیوار پھلانگ کر اندر آیا۔ ٹی وی آن تھا۔ فرش پر اس کے ابو ٹھنڈے پڑے تھے۔ وہ ان کو ہلا جلا کر دیکھ رہا تھا کہ مہرین اور تحسین آراء بھی آگئیں۔ گھر میں ایک دم کہرام مچ گیا پورا محلّہ جمع ہوگیا۔ رشتے داروں کو بھی خبر ہوگئی۔ مہرین کے سسرال والے بھی آگئے۔ ان کو ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا گیا۔

سب حیران تھے کہ ان کو کون سا صدمہ ملا ہے۔ ابھی تو بیٹی کی منگنی اتنی اچھی جگہ کی ہے۔ گھر میں یا یونیورسٹی میں بھی کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا پھر کیا ہوا؟

ٹی وی اذہان نے بند کیا۔ جب سے اب تک وہ بند ہی پڑا تھا۔ سب رو دھو کر خاموش ہو گئے تھے۔ اپنے مسئلے اپنے کام سب اپنی جگہ چلتے رہے۔ ہاں البتہ یونیورسٹی میں ان کے انتقال کی وجہ سے ڈیپارٹمنٹ کے نوٹس بورڈ پر یہ نوٹس لگا دیا گیا تھا کہ ''ہمارے پیارے پروفیسر مہتاب علی کے انتقال کی وجہ سے تین دن کلاسز نہیں ہوں گی۔'' اور سارے اسٹوڈنٹس افسوس کر کے اب اچانک ملنے والی خوشی اور چھٹی کو انجوائے کرنے کے لیے کینٹین کی طرف چل پڑے تھے۔

☆......☆......☆

تقدیر نے لوٹا ہے مجھے

گڈی آپا

لاہور سے ایک ممتا کی ماری کی روح جھنجوڑتی کتھا، گڈی آپا کے قلم سے





مریم نے میٹرک میں شاندار کامیابی حاصل کر کے ماں کی لاج رکھ لی تھی، ورنہ باپ تو اس کا پانچویں جماعت پاس کرنے کے بعد ہی اسکول سے ہٹانے پہ تلا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تعلیم عورت کو بے حیا اور خودسر بنا

دیتی ہے۔ اگر باپ اپنے ارادے میں کامیاب ہو جاتا تو مریم آج دو تین بچوں کی ماں ہوتی اور شاید غریبی کے اندھیروں میں بان کی چارپائی پر پڑی بخار میں تپ رہی ہوتی۔ نہ اسے روٹی ملتی نہ ہی دوائی اور شام کو کسی نہ کسی معمولی بات پر شوہر سے لاتیں کھا کر اپنے نصیبوں کو کوس رہی ہوتی۔ لیکن یہ تو شکر ہوا جو ماں درمیان میں آہنی دیوار بن کر کھڑی ہو گئی تھی کہ وہ اپنی اکلوتی بچی کو کسی 'مقام' پر دیکھنا چاہتی تھی۔ کسی امیر خاندان میں، ایک بڑے شاندار بنگلے میں کیونکہ مریم حسین ہی اس قدر تھی، ماں ہر وقت اس کے اچھے نصیبوں کی دعا کرتی تھی۔

''اے خدایا جو مجھ کو نہیں ملا وہ سب کچھ میری مریم بیٹی کو عطا کر۔ اس کے نصیب اتنے ہی حسین کر دے جتنا اسے حسین بنایا ہے۔''

☆......☆......☆

وہ سردیوں کے دن تھے اس روز مریم کے ماں باپ بہت ہی زیادہ خوش تھے۔ ان کے پاؤں زمین پہ نہ ٹک رہے تھے۔ مریم اپنی کامیابی پر محلے بھر میں لڈو بانٹ رہی تھی۔ سارے ہمسائے اس سے محبت اور عزت کرتے تھے۔ کیوں کہ وہ بہت حسین ہی نہیں، نہایت خوش مزاج بھی تھی۔ سب کی عزت کرتی تھی اور سب سے دعائیں لیتی تھی۔

''مریم کے ابا ذرا ہو مجھے بھی بیٹھنے کو جگہ دو۔'' بصری بی بی نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اپنے شوہر کے قریب جا کر کہا تھا۔

''لے بیٹھ جا۔'' کریم بخش نے مسکراتے ہوئے حقہ ایک طرف کرتے ہوئے چارپائی پر بیوی کے لیے جگہ بنائی تھی۔

''تجھے تیری رانی بیٹی مریم کی دسویں جماعت پر کامیابی پر ایک بار پھر ڈھیروں مبارک باد۔ دیکھ لے ہماری بچی نے کامیاب ہو کر ہمارا شملہ اونچا کر دیا ہے۔ ہمارے سارے محلے میں کوئی لڑکی میٹرک پاس نہیں ہے اور پھر مریم نے اتنے اچھے نمبر لیے ہیں۔'' شوہر سے یہ سب کہتے ہوئے بصری بی بی کے لہجے میں فخر ہی فخر تھا۔

''ہاں ہاں بھئی! بصری تجھے بھی مبارک ہو اور سچ بات یہ ہے کہ یہ سب تیری کوششوں اور دعاؤں ہی کا نتیجہ ہے۔ بس اب تو میری یہی دعا ہے کہ ہماری بیٹی کا رشتہ کسی اچھی جگہ ہو جائے۔''

''ناں بابا ناں۔'' بصری بی بی نے فوراً ہی شوہر کی بات کاٹی تھی۔ ''ابھی تو مریم کی شادی کے خواب دیکھنا چھوڑ دے۔ اب تو میں اسے کالج میں داخل کرواؤں گی۔ وہ کہتی ہے ای اس میں خرچہ ہو گا۔ مجھے وظیفہ مل جائے گا اگر نہ بھی ملا تو میں سارا خرچہ خود اٹھاؤں گی۔ بہت پیاری ذہین اور نیک ہے۔ بس اپنے کام سے کام رکھتی ہے۔ نہ کوئی سہیلی اور نہ ہی کوئی باہر آنا جانا...... ایسی بچیاں تو خدائے پاک سب کو دے۔ عزت کی ساتھی، خدمت گزار، پڑھائی کے ساتھ گھر کے کاموں میں بھی میرا ہاتھ بٹاتی ہے۔ اور قرآن بھی پڑھتی ہے۔ ایسی بیٹی ماں سے دعا میں نہ لے گی تو اور کیا لے گی۔''

''بصری بیگم! ذرا بریک تو لگا، دم تو لے۔ ذرا یہ تو سوچ اگر میں مریم کو آگے پڑھانے سے منع کر دوں؟'' کریم بخش نے حقے کا گہرا کش لے کر کہا۔

''ناں تو تُو پہلے بھی کہتا رہا ہے۔ آج ہاں کہہ دے تو تیرا کیا جائے گا۔ تیری بچی اور بیوی یہی تو تیری کائنات ہیں...... نہ بھائی، نہ ہی ماں، نہ کوئی اور۔ اکیلا تُو ہے۔ ایک تیری بچی ہی تیرے نام کو بلند کرے گی۔ اسے کالج میں داخل کروا دے۔ کیوں اس کے راستے میں روڑے اٹکاتا ہے۔'' بصری بہت لجاجت سے بولی تھی۔

''ہر بار تُو ایسی ہی باتیں کر کے مجھے ہرا دیتی ہے۔ اب میں نہ ہاروں گا۔ چاہے تُو جتنا زور لگا لے۔''

''کریم بخش! بھلا میں کیا تجھ سے جیت سکتی ہوں؟ یہ تو تیری مہربانی کی بات ہے۔ جو تُو میری بات مان جاتا ہے۔ ورنہ بھلا میں کوئی زبردستی کر سکتی ہوں؟'' بصری نے کریم بخش کی پنڈلیاں دباتے ہوئے کہا تھا۔

''چل چل اب زیادہ باتیں مت بنا۔ تُو بھی کیا یاد کرے گی۔ میں کل ہی رانی کے ساتھ اسے کالج میں داخل کروا آؤں گا۔ اب تو تو خوش ہے ناں۔'' کریم بخش نے مسکراتے ہوئے بیوی کا کندھا تھپکا۔

''اللہ تیرا بھلا کرے کریم بخش، تو نے مجھے خوش کر دیا۔ بصری خوشی سے سرشار لہجے میں ہاتھ اٹھا کر دعائیں دیتے ہوئے بولی تھی۔

☆......☆......☆

کالج کے گیٹ پر مردوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ تو بچیوں کو داخل کروانے آئے ہوئے تھے اور کچھ ویسے ہی دل پشوری کرنے کے لیے کالج سے بھاگ کر نئے چاند چہروں کی تلاش میں آ گئے تھے۔ کالج کے لڑکوں کی اکثریت ساری رات اسی تیاری میں گزر رہی کہ وہ خوب سے خوب نظر آئیں۔

کوئی کہتا۔ ''جا آج تو تیرا بیڑا ہی پار ہے...... آج تو آئیڈیل مل ہی جائے گا...... یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے جو ہم شہزادوں پہ کسی کی نظر نہ پڑے اور کسی کی نظر نہ جمے۔ کچھ من چلے تو ماں سے نظر اتارنے تک کو کہہ جاتے۔

اُدھر مریم سفید چادر میں لپٹی، سہمی ہوئی ہرنی کی طرح منہ میں کلمے کا ورد کرتی ہوئی جو اس کے باپ نے بچپن ہی میں پڑھنے کی عادت ڈال دی تھی، باپ کے ساتھ ساتھ چلی جا رہی تھی۔

چاروں دوست اِس انمول ہیرے کو دیکھتے ہی ساکت رہ گئے تھے۔

بُت بن کر آنکھ کو جھپکے بنا دیکھے ہی جا رہے تھے۔ جیسے ہی مریم گیٹ کے اندر داخل ہوئی تو کامران بولا۔

''چلو یارو! چھٹی۔ The End ہو گیا...... اب اس کے بعد کسی اور کو دیکھنا ایسا ہے جیسے تلی ہوئی گرم مچھلی کھانے کے بعد بدذائقہ چائے کا پینا۔''

عمران بولا ''سچ کہا یار...... چلو چلو پیریڈ بھی شروع ہونے والا ہے اور نعمان بھی ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔ اسے بھی یہاں کی رپورٹ دینا ہے کہ ایک چاند چہرہ دریافت ہو گیا ہے۔ سرکار آیئے دیدار کیجیے اور صبح عید منایئے۔''

''ہاں! ہاں! بالکل درست...... چلیے۔'' تیسرے دوست نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

اگلے روز صرف نعمان اور کامران کالج کے لگنے سے پہلے گیٹ پہ موٹر سائیکلوں پر موجود تھے۔ انتظار کی گھڑیاں کاٹے نہیں کٹ رہی تھیں۔ وقت کو جیسے ایلفی لگ گئی تھی۔ جہاں تھا وہیں رُکا ہوا تھا۔

''کامران کے بچے اگر رپورٹ غلط نکلی تو اتنا ماروں گا کہ نانی یاد آ جائے گی۔ تمہارے اس قدر اشتیاق دلانے کی وجہ سے یہاں پر آ گیا ہوں۔ ورنہ لڑکیوں کا پیچھا کرنا مجھے پسند نہیں۔ یہ تو ویسے ہی تم لوگوں کے ساتھ کبھی کبھار کمپنی دینے آ جاتا ہوں۔''

چلو یار! مہربانی ہے آپ کی کہ آپ ہماری خاطر ہی سہی ہماری بات تو لیتے ہیں۔ نہ مانے تو تم روٹھ جاؤ گے...... اور روٹھوں کو منانا بہت مشکل کام ہے۔ ہمارے بس کا کام نہیں۔'' کامران نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ارے کامران! وہ دیکھو! یار ہرنی آ رہی ہے لیکن آنکھیں کبھی اوپر نہیں ہوتیں اور نہ ہی تم کبھی دیکھ سکو گے۔'' عمران نے جلدی سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس کا رنگ کیسا ہے؟''

''یار ہے بڑی شے۔ ذرا غور تو کر۔'' کامران نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ کوئی بکواس نہ سنوں اس کے بارے میں، جو کہنا ہے محتاط ہو کر کہنا۔'' نعمان نے انتباہ کرتے ہوئے کہا۔

''بس یار ایک بات...... ہمارا شہزادہ بھی تو کسی سے کم نہیں ہے۔ کالی پینٹ اور بوسکی قمیض، نہ کسی کو اتنی جچتی ہے نہ جچے گی۔'' کامران نے نعمان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''بس...... بس زیادہ مسکا نہ لگا۔ جھوٹ بولنا کوئی تم پر فرض تو نہیں۔ کیوں کہ

ہیں اور بھی ستم گر بہت اچھے
کہتے ہیں کہ حوروں کا ہے انداز بیاں اور

''ارے واہ استاد! کیا تمہارا ہے۔'' عمران نے اچھلتے ہوئے کہا۔

نعمان کو ایسے لگا جیسے جوئی فرشتہ اس کے بدن سے چھو گیا ہو۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یقیناً یہی وقت قبولیت کا تھا۔ اسے ایک دم خیال آیا اور زیرِ لب بڑبڑایا، الٰہی مجھے اور کچھ دے نہ دے لیکن یہ حسین حور ضرور دینا۔ اے خدا تو میری دنیا کو جنت بنا دے۔ میں اسے بہت سنبھال کر رکھوں گا۔ اس کا احترام کروں گا۔ بالکل اسی طرح رکھوں گا جس طرح بیوی کو رکھنے کا حکم اسلام دیتا ہے۔ بس اس کا دل بھی نہ ملول نہ گا۔ اس کے جذبوں کی قدر کروں گا۔ یا الٰہی مجھے تو بس اب یہی حور چاہیے۔ اور یہ مجھے عطا ہو اسی جہاں میں۔'' نعمان نے ہاتھ اٹھا کر ایک طویل دعا اپنے رب سے مانگی جب اس کی پہلی نظر مریم کے حسین و جمیل چہرے پر پڑی۔

''چل یار...... کامران...... اب آئندہ کے لیے حکم یہ ہے کہ اس کالج کے گیٹ پر دوبارہ کچھ بن کر ہی آؤں گا۔ میں سوچوں گا اب میں نے اسے حاصل کیسے کرنا ہے اور سنو آج کے بعد کوئی فالتو لڑکا بھی گیٹ پر نظر نہ آئے۔ سوائے گارڈ کے...... تم لوگوں کو اگر مجھ سے ملنا ہے تو میرے گھر کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔'' نعمان نے اپنے دوستوں کو سختی سے ہدایت کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر دونوں وہاں سے غائب ہو گئے۔

☆......☆......☆

اس بات کو کئی سال گزر گئے۔ مریم نے MA انگلش کرلیا اور نعمان نے MBA۔

کمرے کی حالت بدتر ہو چکی تھی۔ مزید نفاست اور پھولوں کی سجاوٹ کا اضافہ ہو چکا تھا۔ موتیے اور گلاب کے پھول گملوں میں بہاروں کا سماں پیش کر رہے تھے۔ محلے کی کئی لڑکیاں کسی نہ کسی کے نام سے بدنام ہو کر شادیاں کہیں اور کر کے کئی بچوں کی مائیں بن چکی تھیں۔ لیکن مریم شمع کی طرح جل کر کمرے میں دودھیا روشنی میں نہا رہی تھی۔ کمرے میں نئے پلنگ اور ڈریسنگ ٹیبل میز اور کرسی کا اضافہ ہو چکا تھا۔

جس پر کروشیے کی بیلیں ماں نے بنا کر پلنگ پوش اور میز پوش میز پر ڈال کر رکھے تھے۔ کچن اور کمرے میں لیمپ کی جگہ بجلی نے لے لی تھی۔ سرخ فرش روزانہ ڈھل ڈھل کر اور بھی سرخ ہو چکا تھا۔

اتوار کا دن تھا مریم نہا دھو کر لیٹی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اُس نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو ایک خاتون چادر اوڑھے دروازے پر کھڑی تھی۔ اور سڑک پار ایک پجارو کھڑی تھی۔ جسے سب لوگ مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''بی بی کس سے ملنا ہے؟''

''مجھے کریم بخش کے گھر جانا ہے۔''

''ہاں! یہی تو گھر ہے اوپر چلی جایئے۔''

''السلام علیکم! آیئے آیئے...... بیٹھیے۔''

بصری نے خاتون کی شخصیت سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ ''کہیے آپ کیسی ہیں۔''

''الحمد اللہ میں بالکل ٹھیک اور بخیریت ہوں۔'' خاتون نے انتہائی شفقت سے جواب دیا، پھر گویا ہوئی۔

''غالباً یہی آپ کی اکلوتی بیٹی مریم ہے اور یہ ان کے والد کریم بخش ہیں؟''

'جی! جی، بصری نے حیرانی سے سوچا کہ بھلا یہ اتنا زیادہ ہمیں کیسے جانتی ہے۔'

''مریم بیٹی جاؤ اور اپنی خالہ کے لیے اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔'' بصری بیگم نے مریم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی اچھا!'' مریم نے بڑی نرمی سے جواب دیا اور کچن میں چل دی۔

''آپ کی حیرانی کو میں خوب بھانپ رہی ہوں۔ اس لیے اسے جلد ہی ختم کر دینا چاہتی ہوں۔ میں دراصل......'' خاتون کہتے کہتے ایک دم سوچ میں رُک گئیں۔

''جی بلا جھجک کہیے۔'' بصری بیگم نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''دراصل میں آپ کی بیٹی کے رشتے کے لیے آئی ہوں۔'' خاتون نے بڑی مشقت سے جملہ پورا کیا۔

''بہن اس سے اچھا ہمدرد اور کون ہو سکتا ہے۔ آپ نے ہمیں اس قابل سمجھا۔ نصیب تو قدرت والے نے آسمانوں پہ لکھے ہوتے ہیں اگر لکھا ہوا تو ضرور ہو جائے گا۔ جہاں بیریاں ہوں وہاں پتھر تو ضرور آتے ہیں۔ ایک مثال ہے بزرگوں کی۔ ایک بیٹی کی ماں تو ہر وقت ایسے الفاظ سننے کو تیار رہتی ہے۔'' بصری بیگم نے خاتون کو کچھ اور حوصلہ دیا اور خود کو بھی جملوں میں سنبھالنا چاہا۔

''آپ اکیلی آئی ہیں؟''

''نہیں باہر میرا بیٹا بھی گاڑی میں بیٹھا ہے۔'' خاتون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا...... کریم بخش آپ جائیں اور بیٹے کو اندر لے آئیں۔ کتنی بری بات ہے باہر بیٹھا رہے۔'' بصری بیگم نے اخلاق کا انتہائی مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر بعد کریم بخش نعمان کو اندر لے آیا۔

''ہاں بیٹا آپ کیسے ہیں...... اور کیا کر رہے ہیں۔'' کریم بخش نے نعمان کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''جی میں نے پچھلے سال انجینئرنگ کی ہے۔''

''ماشاء اللہ، اللہ نظر بد سے بچائے کہاں رہتے ہیں آپ؟''

''ڈیفنس میں۔''

''تایا جان جب آپ کا آنا ہو تو مجھے ضرور بتایئے گا، میں خود آپ کو لے کر جاؤں گا۔'' نعمان نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''اچھا بیٹا بنائیں گے پروگرام۔''

صفیہ کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ جس سے بچی کے سلیقہ شعار ہونے کا اندازہ ہو رہا تھا۔ نہ کہیں گرد نہ کوئی تنکا۔ سفید پھولوں سے بیل اٹی پڑی تھی۔ اس کی خوشبو نے چارسو پھیل کر خوابیدہ ماحول بنا دیا تھا۔

بصری باورچی خانے میں بیٹی سے بغل گیر ہوتے ہوئے بولی۔

''تمہارے رشتے کے لیے آئے ہیں۔ کیا نصیبوں والی ہے تو میری لاڈلی، تجھے تو گھر بیٹھے بٹھائے اتنے امیر لوگوں کے اکلوتے بیٹے کا رشتہ آ گیا۔ بصری بیگم نے مارے خوشی کے مریم کا چہرہ چوم لیا اور چٹا چٹ اس کے گالوں کے بوسے لے ڈالے۔

''ماں رہنے دو اتنے امیر لوگوں میں میں نے نہیں کرنی شادی۔ ساری عمر ان کے نیچے دبی رہوں گی۔'' مریم نے دوپٹے کا پلو مروڑتے اور ناک سکیڑتے ہوئے کہا۔

''ہے نا جھلی کی جھلی۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ کر دوں گی۔ اب اور دیر لگانی بھی کیوں ہے۔ تمہاری تعلیم مکمل ہو چکی ہے اور ساتھ ہی جہیز بھی میں نے تیار کر لیا ہے۔ فرنیچر وغیرہ کی تو مجھ میں گنجائش نہیں۔ تمہیں نوکری مل جاتی تو کچھ نہ کچھ ہو سکتا تھا۔'' بصری بیگم نے کھڑے کھڑے سارا فیصلہ سنا دیا۔

''بس کراماں۔ آپ نے تو ایک منٹ میں سب کچھ سوچ لیا۔ پہلے دیکھ تو لیں کیسے لوگ ہیں؟ کہاں رہتے ہیں، ذات کیا ہے، کشمیری ہیں بھی یا نہیں۔ سب کچھ اچھی طرح دیکھ بھال لینا، لڑکا پہلے سے شادی شدہ نہ ہو۔'' مریم نے ماں کے سامنے اپنے تحفظات بیان کیے۔

''ارے بیٹی سب کچھ دیکھ لیں گے گھر کی بنی ہوئی املی کی چٹنی ہے، پکوڑوں کے ساتھ ضرور رکھ دینا۔ اور نیچے کالے کو پیسے دے کر بسکٹ بھی منگوالو۔''

''آپ جائیں اماں میں سب کچھ تیار کر کے دروازہ کھٹکھٹاؤں گی۔ بصری بیگم کمرے میں داخل ہو گئیں۔

''نعمان اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ خالہ جان السلام وعلیکم۔''

''وعلیکم جیتے رہو۔'' تابعدار، سرخ و سفید لڑکے کو دیکھ کر بصری کا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ اور بڑی ہی محبت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیر دیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ مریم نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ بصری نے لپک کر ٹرے پکڑ کر ٹیبل پر رکھ دی جس پر خوبصورت ٹیبل لیمپ پڑا ہوا تھا۔ نعمان کا دل مریم کو قریب سے دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ مگر ابھی اور انتظار باقی تھا۔...... قریب آنے کا پہلا قدم اس کی ماں نے بیٹے کی خوشی کو مد نظر رکھتے ہوئے بڑھا دیا تھا۔

آج وہ بہت خوش تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اپنی ماں کے ہاتھ چوم لے، ماتھا چوم لے، جس نے اتنی بڑی خوشی سے اسے دوچار کیا تھا۔ کمرے کی نفاست سے اس کا ذوق قابلِ ستائش تھا۔

''بہن واہ! کیا مزے کے پکوڑے اور فنگر چپس بنائے ہیں مریم بیٹی نے...... بھئی سچ میں مزہ آ گیا۔ خاتون نے چٹخارے لیتے ہوئے کہا۔

''چٹنی بھی اسی نے بنائی ہے۔'' بصری بیگم نے جلدی سے لقمہ دیا۔

''اچھا؟''

''یہ تو بازار کی چٹنی سے بھی زیادہ مزیدار ہے۔ بیٹی آپ کی ماشاءاللہ علم و حسن کے علاوہ خانہ داری میں بھی ماہر ہے۔ بڑے ہی نصیب والے وہ ہوں گے وہ لوگ جن کے گھر یہ چاند چمکے گا۔'' خاتون نے کشادہ دلی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''بھئی میں تو سیدھی سادی عورت ہوں۔ سیدھی بات کرتی ہوں۔ یقیناً بڑے ہی نصیب والی ہو گی وہ بچی، جس کے نصیب میں آپ کا بیٹا ہو گا۔'' بصری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو بس ہو گئی بات پکی؟'' خاتون نے بڑے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''نہیں نہیں ابھی کہاں۔ ابھی تو آپ کا گھر دیکھنا ہمارا فرض بنتا ہے۔ ذرا مشورہ کر کے، سوچ سمجھ کر سارے قدم بڑھائیں گے۔'' بصری بیگم نے متانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''ضرور ضرور، کیوں نہیں۔ ابھی میرے ساتھ

چلیے۔'' خاتون نے پُر جوش ہو کر پیش کش کی۔
''نہیں نہیں اتنی بھی جلدی کیا ہے۔ عنقریب ہم ضرور آئیں گے۔ آپ تسلی رکھیے۔''
''بیٹا گاڑی سے مٹھائی لے کر نہیں آئے۔'' خاتون نے یاد دلایا۔
''ابھی لایا ای جان! میں جلدی میں بھول گیا تھا۔''
اور یوں انتظار میں ہر دن عید اور ہر رات شب رات بن کر گزرنے لگا۔

☆......☆......☆

اور پھر وہ رات بھی آ پہنچی جب سفید لہنگا، سفید سچے موتیوں کا زیور پہنے، وہ ایک حسین حور لگ رہی تھی۔ ماں نے بیسیوں سوٹوں کے جتنے پیسے اس لہنگے پر خرچ کر دیے تھے۔ نعمان کے گھر کے چاروں طرف سبز گھاس بچھی ہوئی تھی۔ پچھلے لان کے بڑے بڑے درختوں پر پرندوں کے لیے مٹی کے کوزے لٹک رہے تھے تاکہ وہ اپنے گھونسلے بنا سکیں۔ دیواروں پہ مختلف رنگ کی بوگن ویلیا کی بیلیں چڑھی ہوئی تھی۔ جھمکہ بیل، عشق پیچاں، سفید اور پنک کلر کے گلابوں کے بوٹے اپنی گود میں انگنت پھول لیے خوشی سے لہک رہے تھے جگہ جگہ رات کی رانی اور موتیے کی بیلیں خوشبو مہکا رہی تھیں۔ ایک کونے میں بچوں کے کھیلنے کے لیے بار جھولے۔

Sea Saw، مصنوعی پھولوں میں لائٹ اور اوپر سے کرٹن بیل گرتی ہوئی ماحول کو بہت خوبصورت بنا رہی تھی۔ جھرنے سے گرتا ہوا پانی قدرتی گرد بناتا ہوا سارے لان میں گھوم رہا تھا۔ بڑے بڑے درختوں کے نیچے چیئر اور میز پڑے تھے، جن پہ بیٹھ کر گھنٹوں محو نظارہ رہا جا سکتا تھا۔

اگلے لان میں بھی سفید فوارہ، فروٹ کے درخت، دیواروں کے ساتھ بیلیں، کیاریوں میں پھول بڑے بڑے پلروں کو رنگین لائٹس سے سجا دیا گیا تھا۔ نیچے ڈرائنگ روم، ٹی وی لاؤنج، کچن اور دو بیڈ روم تھے۔ کچن کے ساتھ ایک بہت بڑا مچھلیوں کا ایکوریم دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ جس میں ملٹی کلر کی مچھلیاں مرکری لائٹ میں تیر رہی تھیں۔

گھر کا اوپری حصہ بھی مکمل سیٹ تھا۔ جس کے کمروں میں بڑے بڑے شیشے لگے ہوئے تھے۔ جس میں باہر کا تمام منظر نظر آتا تھا۔ سارے گھر کو رنگا رنگ روشنیوں نے بقعہ نور بنا کر رکھا تھا۔

مریم نے جیسے ہی گھر میں پہلا قدم رکھا۔ اس قدر خوبصورت شیش محل کو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ ایسا گھر تو اس نے خواب میں بھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ حیرت سے آنکھیں کھول کر بند کر رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی حور راستہ بھول گئی ہو۔ اور اس حسین گھر کو دیکھنے کے لیے اتر آئی ہو۔ مریم گھر کی سجاوٹ اور اس کی خوبصورتی میں گم پلکیں جھپکائے بغیر اسے تکے جا رہی تھے۔ اور اس کے حسن میں کھوئے ہوئے تھے۔ ایسی حسین دلہن انہوں نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ سب ہی لوگ نعمان کے مقدر پر عش عش کر رہے تھے۔ کہ کیا حسین جوڑی خدا نے ملائی ہے۔

نعمان نے کریم کلر کی شیروانی کے ساتھ تنگ پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ سر پر کریم کلر کا کلاہ تھا۔ پاؤں میں سلیم شاہی کھسہ مغلیہ دور کے شہنشاہوں کا زمانہ یاد دلا رہا تھا۔

دونوں خوبصورت دیوان پر خوبصورت پھولوں کی چادروں سے جھانکتے ہوئے بہت حسین لگ رہے تھے۔ نعمان کے پاؤں زمین پہ نہ ٹک رہے تھے۔ جی چاہ رہا تھا کہ یہ لمحے یہیں پر رک جائیں۔ جھرنوں کی آوازیں آتی رہیں۔ گھڑیوں ہی روشنیوں سے دمکتا رہے۔ یہ زندگی کے لمحے کس قدر طویل انتظار کے بعد آئے تھے۔ ان کو لانے میں اس کی انتھک محنت، لگن اور سچی محبت کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ اللہ کی مہربانی کا شامل حال ہونا تھا۔ چودھویں کا چاند کبھی نہ ڈھلے، نیلگوں آسمان پہ سفید سفید بادلوں کے ٹکڑے یوں ہی آوارہ پھرتے رہیں۔ مریم شمع بن کر جان محفل بنی رہے۔

اور میں پروانہ وار اس پر جان نچھاور کرتا رہوں۔ کئی بار جلوں اور کئی بار پھر سے زندہ ہوں۔ لیکن وقت امرین قطرہ قطرہ بہا چلا جا رہا تھا اور وہ حسین رات نہ چاہتے ہوئے بھی گزر ہی گئی۔ یوں اُس نے گھونگھٹ اٹھانے کے بعد ہمیشہ رہنے والے عشق کا آغاز کیا۔ جسے دنیا کے ہر غم، ہر آزمائش میں پورا اترنے کی پوری صلاحیت تھی۔ نعمان نے اپنے جذبات کو پاکیزہ رکھا تھا۔ اپنی پاکیزہ محبوبہ کے لیے۔

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کی زندگی کے پانچ انمول سال بھی گزر گئے۔ لیکن ابھی تک مریم کی گود خالی

تھی۔ زینب بی بی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تھا۔ وہ خدا سے دعائیں مانگ مانگ کر تھک گئی تھی۔ مریم کے دل سے اک دکھ بھری آہ ابھرتی۔ اسے اپنا حسن، دولت، گھر، یہاں تک کہ نعمان کی سچی محبت بھی اپنی خالی جھولی کے آگے بے معنی سی لگتی۔ حالانکہ نعمان اسے ہر گھڑی باور کراتا تھا کہ میاں بیوی کی محبت میں اولاد رکاوٹ ڈالتی ہے۔ دوری پیدا کرتی ہے اور کامیاب ازدواجی زندگی کے لیے اولاد کا ہونا ضروری نہیں۔ میں نے ایسے ہزاروں جوڑے دیکھے ہیں جو بن اولاد کے خوش ہیں اور ایسے ہزار جوڑے دیکھے ہیں جو اولاد ہونے کے باوجود دن رات بے سکون زندگی بسر کرتے ہیں۔''

مریم نعمان کے سامنے تو ہوں ہاں کرتی رہتی مگر اندر سے یوں کٹتی رہی جیسے اسے کوئی تیز دھار چاقو سے کاٹ رہا ہو۔

ایک روز اس کی ماں بولی۔

''نعمان تو مریم کو لانے میں کامیاب ہوگیا اب بیٹا پیدا ہوگا تو دیکھوں گی۔''

یہ طنز مریم سے برداشت نہ ہوسکا۔ اور وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ اپنے بیڈ روم کو اندر سے لاک کر کے پلنگ پہ اوندھے منہ لیٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مغرب کی اذان ہوئی تو مغرب کی نماز پڑھنے لگی۔ نماز پڑھنے کے بعد سجدے میں سر رکھ کر اس قدر روئی کہ جائے نماز آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ اب اکثر وقت اس کا عبادت میں گزرنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

آخر وہ دن بھی آ گیا جب نعمان نے اپنی ماں کی جھولی میں بیٹا ڈالتے ہوئے بولا۔

''امی جی یہ لیں آپ کا پوتا۔ مریم کی گود کیا ہری ہوئی کہ زندگی میں بہار آ گئی۔ شب و روز خوشی سے گزرنے لگے اور اس کا جھکا ہوا سر فخر سے بلند ہوگیا......

آج اس کے قدموں تلے جنت آ گئی تھی۔ خدا کبھی کسی کو محروم نہیں رکھتا۔ بے شک اس کی ذات بہت قدر کرنے والی ہے۔ اگر ماں بچے کو جنم دے کر پرورش کر کے مصیبتیں اٹھاتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے قدموں تلے جنت دے کر اس کی دن رات کی محنت سے زیادہ انعام دے کر اسے سربلند کر دیا ہے۔

مریم دن رات بچے کی خدمت کر کے خوش رہتی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے قدرت نے خون کی بوتلیں چڑھا دی ہوں۔ جس سے وہ انجانی سی راحت اور طاقت محسوس کرتی۔ ایک انجانی ممتا کی خوشی میں سرشار رہتی۔ ساری دنیا اُسے بھول گئی تھی۔ وہ تھی یا اس کا بیٹا ایشان جو ہو بہو اپنے باپ پر گیا تھا۔ کبھی نعمان کی گود میں کبھی دادی کی گود میں۔

جب تک بچہ ان کے پاس رہتا مریم دل ہی دل میں جلدی بچہ واپس ملنے کی دعائیں کرتی۔ جو وہ اسے واپس دے دیتے تو اسے یوں چومتی جیسے صدیوں بعد ملا ہو۔ وہ ابھی دو ماہ کا ہی ہوا تھا اس کے کمرے میں واکر، جھولا، چار پہیوں والی سائیکل اور پھر دو پہیوں والی سائیکل تک موجود تھی۔

بیٹے کی پیدائش کے بعد تو ایک نہ ختم ہونے والا پیار اس کے تن من میں ابھر آیا تھا۔

مریم کو کبھی ایشان، نعمان، ماں بصری، اور بابا پگڑی والا اس کا باپ ایک ہی لائن میں کھڑے نظر آتے تھے۔ کوئی بھی کسی سے کم نہ لگتا تھا۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا تھا کہ قطرہ قطرہ برسنے کے بجائے کیوں نہ ان پر موسلا دھار بارش بن کر برس جاؤں۔ مگر اگر ایک ہی بار برس گئی تو بعد میں کیا کروں گی۔ صحرائی حور کی طرح۔ ایک خشک بادل کی طرح...... نہیں نہیں...... قطر قطرہ زندگی بھر ملنا مناسب ہے تاکہ ساری زندگی محبت کی سیر رہوں۔

شاید یہ نعمان ہی کی محبت تھی جو بانٹتے بانٹتے ختم نہ ہو رہی تھی۔ اسی کے خیالوں میں شب و روز گزر رہے تھے۔ جب نعمان آفس سے آ جاتا تو وہ اپنے گھر کو حسین سے حسین تر بنانے کے منصوبے بناتی رہتی۔

اس کا دل چاہتا نعمان جیسے ہی گھر کی دہلیز کے اندر پاؤں رکھے تو اسے صاف محسوس ہو جیسے وہ اپنی پُرسکون جنت میں واپس لوٹ آیا ہے۔ جگہ جگہ پھولوں کی مہکتی خوشبو، چمکتے ہوئے فرش پر سجے ہوئے فرنیچر نے بھی مریم کے آنے سے ایک نئی سج دھج اپنائی تھی۔ ہر چیز پُرکشش اپنی کھینچتی محسوس ہوتی تھی۔ دوپہر میں لذیذ کھانے نے بھوک بڑھا دی تھی۔ نعمان کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہلکی پھلکی موسیقی میں صرف میوزک بج رہا تھا۔ چاروں کونوں میں جلتے ہوئے لیمپ سٹینڈ ماحول کو

رومینٹک بنانے میں بڑا کردار ادا کر رہے تھے۔
ایشان خوبصورت کاٹ میں پرسکون نیند سو رہا تھا۔ مریم نے اپنے بیڈروم کے پردے کھینچ دیے تھے۔ مریم نہا کر ہلکے گلابی رنگ کے سوٹ میں جس پہ گہری آتشی کلر کی کڑھائی کی ہوئی تھی پہن کر بالوں کو ہیئر ڈرائیر سے ڈرائی کر رہی تھی کہ نعمان اچانک کمرے میں گلدستہ لیے حاضر ہوا۔
''نعمان صرف آپ کی ہی کمی تھی۔ پھول تو پہلے ہی سے بے شمار ہیں۔'' مریم نے چہکتے ہوئے کہا۔
''مریم مجھے معلوم ہے تمہیں پھول بہت پسند ہیں۔ میرا بس چلے تو میں ہر روز تمہیں پھولوں کے بیڈ پر سلاؤں۔'' نعمان نے اپنے مضبوط بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔
''اس میں تمہیں کوئی شک ہے۔
''میں اپنے خالق کا جس قدر شکر ادا کروں کم ہے خدا میری اس چھوٹی سی جنت کو نظر بد سے بچائے رکھے۔ مجھے کسی چیز کی کمی نہیں۔ مریم نے Air Spray کمرے میں پھیلاتے ہوئے کہا۔'' چلیے چلیے اٹھیے کھانا کھائیے۔ آپ کا انتظار کر رہا ہے کھانا اگر نہ کھایا تو فرشتہ لے اڑے گا آپ کی پسند کا قیمہ مٹر۔'' میں نے آپ کے لیے روغنی نان، گاجر کا حلوہ بنا دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی تھوڑی سی چکن بریانی بنائی ہے۔''
بھئی واہ یہ ہوئی نہ بات جادو ہے ہماری بیوی کے ہاتھوں میں۔''

☆......☆......☆

رات کے دو بج چکے تھے۔ نعمان کی اچانک آنکھ کھلی تو پلنگ کو ٹٹولتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔
''مریم...... مریم...... مریم تم کہاں ہو، سوئی نہیں۔'' نعمان مریم کو بیڈ پر نہ پا کر ہڑبڑا رہا تھا۔
''نہیں۔'' صوفے پر بیٹھی مریم نے جواب دیا۔
''یہاں کیوں بیٹھی ہوئی ہو۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''
میری طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے آپ کا ایشان ٹھیک نہیں ہے۔ بے کل اور بے چین ہے۔ شاید اس کے پیٹ میں درد ہے۔
گرائپ واٹر بھی دیا ہے۔ نہ دودھ پی رہا ہوں اور نہ ہی لیٹ رہا ہے۔ کسی کروٹ بھی اسے چین نہیں۔ کندھے سے لگائے بیٹھی ہوں۔ ابھی ابھی آنکھ لگی ہے۔'' مریم نے پریشان کن لہجے میں کہا۔
''تو اسے لٹا دو۔'' نعمان نے گھبراتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔
''نہیں لٹانے سے اس کی آنکھ کھل جائے گی۔ مجھے بیٹھے رہنے دیں آپ سو جائیں۔ صبح ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں گے۔ یا اسے گھر بلائیں گے۔'' مریم نے کہا۔
''اچھا اللہ خیر کرے بچے تو بیمار ہو ہی جایا کرتے ہیں۔ اتنی بھی فکر والی بات نہیں ہے۔'' اور اس کے قریب ہی تکیہ رکھ کر سو گیا۔

☆......☆......☆

صبح عید تھی مریم نے سب سے پہلے ایشان کو نہلا کر نئے کپڑے پہنا دیے۔ اور نعمان کے حوالے کر دیا۔ نعمان کو بے بی جانسن صابن کی اور پاؤڈر کی خوشبو بہت اچھی لگتی تھی۔ نرم و نازک بدن سے اٹھتی ہوئی بھینی بھینی خوشبو اس کے جسم سے ہو کر روح کے اندر اتر رہی تھی۔ نعمان نے آہستگی سے ایشان کو اپنے چوڑے سینے پر لٹا دیا۔ اتنی شدت سے اسے ایشان پہلے کبھی اپنا نہ لگا تھا۔ چند لمحوں کے لیے اس نے آنکھیں موند لیں۔ ایشان باپ کے سینے سے لگ کر خود کو مطمئن سا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے اسے قرار سا آ گیا ہو۔
''سبحان اللہ تیری قدرت۔ کیا خون کے رشتے بنائے ہیں، بالکل امی سے محبت جیسا محسوس کر رہا ہوں۔ ظاہر ہے ہماری امی جی بھی ہم سے اتنا پیار کرتی ہوں گی۔ اسی طرح ہمیں پالا ہوگا۔ امی سچ ہی تو کہتی تھیں خود ماں باپ بنو گے تو ہماری محبت کا اندازہ لگا سکو گے۔ پھر ممی کی طرح اپنے سینے پر چلانے کی کوشش کرنے لگا۔ مریم نے دیکھا تو فوراً چیخی۔
''اتنے چھوٹے بچے کو چلا رہے ہو۔ اس طرح بچوں کی ٹانگیں ٹیڑھی ہو جاتی ہیں۔''
''کچھ نہیں ہوتا۔'' صرف تم ہی اس کی ماں نہیں میں بھی اس کا باپ ہوں۔'' نعمان نے ہنستے ہوئے کہا۔
''ہم نے مانا آپ اس کے باپ ہیں لیکن خدا کے واسطے ایسا مت کیجیے۔ پہلے ہی اس کی طبیعت خراب ہے اور پھر زبردستی نعمان سے لے کر بستر پر لٹا دیا۔ ایشان

چاق و چوبند نئے لباس میں بہت پیارا لگ رہا تھا۔ اور پھر ہر کوئی بڑی آسانی سے اپنی گود میں بھر رہا تھا۔ ایک کھلونا تھا جس سے سب باری باری کھیل رہے تھے۔ رات کی بے قراری سے اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

مریم نے پنک فرل والے کاٹ میں اسے ڈال دیا۔ لیٹتے ہی وہ پریوں کے دیس میں چلا گیا۔ اٹھا تو پیٹ میں اینٹھن محسوس کرنے لگا۔ نعمان کے ابو بولے۔

''دیکھو مریم! آج تم نے کوئی بھی کام نہیں کرنا۔ یہ میرا حکم ہے۔ یہ سارے نوکر کس لیے ہیں۔ کھانا بھی بے شک بازار سے بنا بنایا منگوا لینا لیکن بچے کی طرف توجہ رکھنا۔ ایسا نہ ہو پچھتانا پڑے۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئے۔

مریم کے ابو جیسے ہی گھر میں داخل ہوئے تو ان کی نظر ایشان پر پڑی تو وہ ایکدم ٹھٹھک گئے اور بولے تم لوگوں نے بدلتے ہوئے موسم میں اسے ضرور باہر لے کر جانا تھا۔ بچوں میں پہلی گرمی اور پہلی سردی میں بڑی احتیاط کرنی ہوتی ہے۔ لاکھ کہا ہے دعوت قبول نہ کرو۔ مگر تم کو کیا فکر اللہ نے نہیں دیا تھا تو مرے جاتے تھے۔ دے دیا ہے تو بے قدری کر رہے ہو۔''

''نہیں نہیں ابو جی ایسی کوئی بات نہیں۔ اللہ خیر کرے گا۔'' مریم نے گھبراہٹ میں کہا۔

''عمر میں بڑا تجربہ کار ہونے کی وجہ سے بتاتا ہوں کہ اس کے آثار اچھے نہیں ہیں۔'' مریم نے ابو نے ایشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی مریم کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ بس تو پھر کیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی مریم نے ایشان کو خود سے جدا نہ کیا۔ ڈاکٹر سے دوا بھی لے آئے۔

''او آر ایس پینے کو دیا تھا، ساتھ میں سرخ پتھر دمائی سین کی بوتل بھی دے دی تھی۔ وہ ایشان کو گود میں ڈال کر گوشت بھون رہی تھی۔ ابھی بھی ایشان ہلکی آواز میں کراہ رہا تھا۔ اس نے نہ دودھ پیا، نہ ہی او آر ایس دوا کی بوتل کو وہ ہاتھوں سے پرے دھکیل دیتا۔ بڑھتے ہوئے سایوں کے ساتھ ساتھ اس کا دل بھی اداس ہو رہا تھا۔ مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا۔ اس نے ایشان کو تھوڑی دیر کے لیے پلنگ پر ڈال دیا۔ وہ چپ چاپ ماں کو دیکھ رہا تھا۔ مریم نے سمجھا ابھی تو ایشان کی طبیعت بہتر ہو گئی ہے۔ اسے کیا خبر تھی کہ ننھی جان میں اب کراہنے کی ہمت بھی نہ رہی ہے۔ وہ روشن دان کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ نماز پڑھنے کے فوراً بعد مریم نے ایشان کو اٹھا لیا۔

''نعمان میں کہتی ہوں ایشان کی طبیعت بہتر نہیں۔ اتنی سی عمر میں اسے پانی پینا ہی نہیں آتا وہ تو صرف میرا دودھ پیتا تھا جس کے پینے سے اس کے پیٹ میں درد اور گیس ہو گئی تھی۔ دو دن سے اس نے نہ کچھ پیا تو نقاہت تو ہونا لازمی تھی۔'' مریم تشویش ناک انداز میں بولی۔ ''ٹھیک ہو جائے گا ایشان۔ ایشان سے تو زیادہ تم تھکی ہوئی اور پیلی پیلی لگ رہی ہو۔ اور فکر مند علیحدہ۔'' نعمان نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''فکر نہ کروں، اس پھول سی جان کا سوچو چند چمچوں کے سوا اس کے حلق سے کچھ نہیں اترا۔ آخر ہو گا کیا۔'' مریم بہت زیادہ پریشان ہو رہی تھی۔

''کچھ نہیں ہو گا جس نے دیا ہے وہ صحت بھی دے گا۔''

مریم اور نعمان کے سارے گھر والوں نے کھانا زہر مار کیا۔ سیرپ پلایا تو پرسکون نظر آیا۔ مریم اُسے کاٹ میں ڈال کر ساتھ ہی لگے ہوئے پلنگ پر لیٹ گئی۔ اور ذرا کمر سیدھی کرنے لگی۔ اور مریم نے اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیا۔ تاکہ اسے تنہائی کا احساس نہ ہو۔ لیٹتے ہی مریم کی آنکھ لگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہڑبڑا کر اٹھ گئی اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ایشان کو دیکھا اسے کچھ ساکت سا محسوس ہوا۔ اس نے اپنا شک مٹانے کے لیے اس کا جسم ٹٹولا۔ ناک اور منہ سے سانس کی جو نہ آ رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ ایشان ماں کی گود چھوڑ کر اللہ کے پاس چلا گیا ہے۔ پھر بھی اسے یہ بات منہ سے نکالتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے نعمان کو سوتے ہوئے اٹھایا۔

''اٹھیے دیکھیے ایشان کی طبیعت خراب ہے۔'' وہ آہستہ آہستہ اٹھا رہی تھی مبادا زور سے اٹھانے سے اس کی طبیعت خراب نہ ہو جائے۔ نعمان اٹھا۔ بچے کو ٹٹولا پھر ہڑبڑا کر اسے گود میں لیا اور مایوس ہو کر بستر پر لٹا دیا۔ دوائی جو سونے سے بیشتر پہلے پلائی تھی اس کے ہونٹوں کے کنارے سے بہہ نکلی تھی اسے اندر جانے کا حکم نہ ہوا تھا۔

نعمان بولا۔ ''دیکھو مریم میرا بیٹا کس قدر پیارا لگ رہا ہے جیسے سرخی لگا رکھی ہو۔'' اور پیار سے اس کے ہاتھ سے کھیلنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر آیا اس نے سینے سے سانس چیک کی اور پھر بولا۔ Sorry Your Baby Is expire۔

بس پھر کیا تھا۔ فلک شگاف چیخیں...... ''اے موت تم نے میرے ہاتھوں سے میرا بچہ چھین لیا۔ میں نے تو اس پر بازو رکھا ہوا تھا کہ کہیں وہ ڈر نہ جائے۔ یقیناً وہ معصوم تھا پاک تھا، گلاب کا پھول تھا۔ تم نے اسے اپنے بازوؤں میں بھی گلاب کے پھول کی طرح لیا ہوگا۔ گلاب کا پھول سنگھا کر اس کی جان لی ہوگی۔ کیوں اجاڑ دی میری دنیا، میری دولت، میرا سب کچھ لے لیتی میرے بیٹے کو نہ لیتی۔ تمہیں میری ممتا پر رحم نہ آیا۔ میں نے کون سا ایسا گناہ کیا تھا جو اتنی بڑی سزا دی۔ کیوں اجاڑا مجھے ابھی تو اس نے سارے نئے کپڑے بھی نہیں پہنے تھے۔ سارے کھلونوں سے بھی نہ کھیلا تھا۔ میں نے تو اس کی جوانی کے خواب دیکھے تھے۔ پاؤں پاؤں چلتے بھی نہ دیکھا تھا۔

میں ایشان کے بنا کیسے جیوں گی۔ اسے میرے بنا کہاں چین آئے گا۔ اس نے پرسوں سے دودھ بھی نہ پیا تھا...... کیوں اجاڑا مجھے تم نے۔ میرا آسیانہ، کیوں برباد کیا۔'' وہ بین کرنے کو برا جانتے ہوئے بھی ایک لمحے کو منہ میں زبان نہ ڈال سکی۔ مسلسل آنسو بہہ رہے تھے نہ ختم ہونے والا طوفان آنکھوں سے بہہ نکلا تھا۔ اس کے بین سن کر بادل بھی امڈ آئے تھے۔

نعمان کا دل مریم کو دیکھ دیکھ کر کٹ رہا تھا۔ مردوں والا بھرم ضبط ٹوٹ چکا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے، گریبان کھلا ہوا تھا۔ بس ایشان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا چلا جارہا تھا۔

''مریم یہ کیا ہوا۔ یہ کیوں ہوا۔ مجھے بتاؤ ہمارا بیٹا۔ کھلونا کیوں چھینا گیا۔'' سب لوگ ان کو دیکھ کر رو رہے تھے سارے گھر میں ویرانی سی چھا گئی تھی۔ ہو کا عالم تھا اور کبھی کبھی اٹھتی ہوئی چیخ سارے گھر کو سوگوار کر دیتی تھی۔ ایشان کے لیے اس کا ایک ایک کھلونا رو رہا تھا۔ یکدم سب کچھ بدل گیا تھا۔ جس کے زیر اثر گھر کا ذرہ ذرہ آ گیا۔

اور پھر ایشان کو کفنا کر قبرستان لے جایا جانے لگا تھا۔ مریم کرلائی۔

''نعمان اسے کہاں لے جارہے ہو، مجھ سے چھین کر۔ تم مجھے اتنا بڑا دکھ کیوں دے رہے ہو۔ تم نے مجھے کبھی کانٹا تک چبھنے نہ دیا تھا۔'' مریم بیٹے کی ڈولی جاتے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور دہائی دے رہی تھی۔ ''یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے۔''

''مریم میں خدا کی رضا کے آگے بے بس ہوں۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو کبھی تمہارے دل کے ٹکڑے کو جانے نہ دیتا تم بس اب چپ ہو جاؤ، ایک آواز نہ نکالنا بہت رولیا تم نے۔ اب صبر کرو ایشان تمہیں جنت میں لے جائے گا۔ نعمان نے مریم کو سینے سے لگا کر تسلی دی۔

''اتنی بڑی آزمائش؟ میرے خدا میں تو مطمئن ہو گئی تھی۔ زندگی میں سب ہی کچھ تو مل گیا تھا اور اب سب کچھ چھن گیا ہے۔'' مریم ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

''خاموش !!!'' نعمان نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مریم کو چپ ہونے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مریم جنازے کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور ڈاکٹر نے اسے بے ہوشی کا ٹیکہ لگا دیا کیوں کہ اس سے زیادہ وہ جدائی برداشت نہیں کر سکتی تھی وہ خود سے بیگانہ ہوگئی۔ جنازہ دفنا کر آئے تو آدھی رات کو شدید بارش ہونے لگی۔ خزاں کا موسم شروع ہوگیا تھا۔ پتے درختوں سے الگ ہو کر ادھر اُدھر بے چینی سے تڑپ رہے تھے۔ ان کی آہٹ میں ایک سوگ کا روگ تھا۔ کوئل کی ہوک تھی۔ آسمان بھی مسلسل آنسو بہا رہا تھا۔

ہائے نی مائیں میرا پھل گلاب وا
تینوں اتے پانڈلٹی پھٹا ملیا

وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ خاموشی سے اپنے چاروں طرف جائزہ لے رہی تھی۔ روشنیاں کیوں گل ہیں۔ روشنیاں کر دو۔ میرا ایشان ڈر جائے گا۔'' وہ لانڈری کے پاس آ گئی جہاں اس کے کپڑے دھوئے جاتے تھے۔ ساتھ چارپائی اس کا بستر پڑا ہوا تھا بولی۔

''ایشان آؤ۔'' اور جھٹ سے گول تکیہ اٹھا کر سینے سے لگایا اور پاگلوں کی طرح لپیٹے لپیٹے پھرنے لگی اور پھر درختوں کے نیچے آن بیٹھی۔ نعمان میرے ہوش ٹھکانے

آ گئے ہیں۔ میں ہوش میں ہوں۔ میرا دماغ بالکل صحیح کام کر رہا ہے۔ میں یہی سوچ رہی ہوں۔ میں اللہ کے نظام کو سمجھ رہی ہوں۔ میں اس کی مرضی کی تابع ہوں۔ میں مسلمان ہوں خالقِ حقیقی کی ایک ادنیٰ تخلیق۔ الحمدللہ مجھے اشرف المخلوقات بنایا ہے، ورنہ ایک بلی کی بھی تو وہی ضرورت ہے جو ایک انسان کی ہے۔ وہ جانور کس قدر بے یارو مددگار ہے، اپنی ضرورتیں کیسے پوری کرتا ہے۔ کتنا تڑپتا ہے اور تکلیف سہتا ہے کتنی گرمی کتنی سردی، نہ کوئی پانی کا پتا نہ کوئی خوراک کا بس اللہ کا کمال ہے پھر بھی وہ زندہ رہتی ہے۔ دکھ سہتی ہے۔ کھانا تلاش کرتی ہے۔ پانی تلاش کرتی ہے، سایا تلاش کرتی ہے، سردی میں چھپتی رہتی ہے، سردی سے ٹھٹھرتی رہتی ہے، کسی انسان کے دل میں اس کے لیے درد نہیں جاگتا۔ ہمیں ہمارا خالق کس قدر آسانیوں اور گھروں سے نوازتا ہے ہمیں ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اس کی رضا کے ساتھ راضی ہونا ہی ہماری عین عبادت ہے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں نا۔ ٹھیک بات ہے نا۔'' مریم کی ذہنی کیفیت ایک دم بدل گئی اور تنہائی ہی میں باتیں کرنے لگی۔

''ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ شاباش تم کتنی سمجھدار ہو اور ہاں تعلیم انسان کے راستے روشن کر دیتی ہے۔ جس کی تم ماسٹر ہو۔'' نعمان نے اسے سینے میں چھپا لیا اور خوب پیار کیا لیکن مریم کا دل ان سب باتوں سے اچاٹ ہو چکا تھا۔

''مگر تم میری ایک بات سنو۔ تم ماں کے جذبوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ یہ خالقِ حقیقی ہی جانتا ہے کہ میں کس تکلیف میں مبتلا ہوں۔ تم بس مجھ پر جبر نہ کرنا...... مجھے میرے حال میں رہنے دینا۔ میں خود ہی آہستہ آہستہ نارمل زندگی گزارنے لگوں گی۔ نہ ہی تم مجھ سے تنگ ہونا بلکہ مجھ پر رحم کھانا کہ میں رحم کھانے کے قابل دکھی ماں ہوں۔'' مریم ہاتھ جوڑے نعمان کے آگے اس کی منت کر رہی تھی۔ اور نعمان خاموشی سے کھڑا مریم کی حالت پر آنسو بہا رہا تھا۔ اسے مریم کی حالت پر بڑا ترس آ رہا تھا لیکن وہ کیا کرتا۔ مرضی و منشائے رب کے آگے وہ بھی بے بس تھا۔ اب تو اسے کسی بھی صورت مریم کو نارمل زندگی میں واپس لانا تھا۔ ورنہ اس کی اپنی زندگی بھی برباد ہونے کا خدشہ تھا۔

☆☆......☆☆

تیسری سچ بیانی

مانجھی ساتھ نبھانا رے

قیصر شاہد

قسمت محبت کرنے والوں کو ملانا چاہے تو اسباب خود پیدا کر دیتی ہے

زندگی خدا کا ایک خوبصورت تحفہ ہے۔ میری زندگی بھی خوشیوں سے بھرپور تھی، مگر ایک طوفان آیا اور مجھ سے میری ذات کا اعتبار لے گیا۔ لیکن خدا کی حکمت دیکھیے میں ٹوٹی ضرور مگر بکھری نہیں۔

☆......☆......☆

''ہائے ڈیئر ہاؤ آر یو... کیا سوچ رہی ہو......''

''آ آہاں...... کچھ نہیں۔''

''تو پھر چلو آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔ جاؤ جلدی سے فریش ہو جاؤ۔''

''نہیں شایان! ابھی میرا موڈ نہیں ہے۔'' میں نے ہمیشہ کی طرح اسے منع کر دیا۔

''میں نے پوچھا کیوں آپ کا موڈ نہیں ہے۔''

''بس میرا موڈ نہیں ہے۔''

''لیکن تمہیں میرے لیے چلنا ہوگا۔ بس اس کے آگے اور کچھ نہیں سنوں گا۔''

میں جو دوبارہ منع کرنے والی تھی، لیکن اس نے کسی بڑے بزرگ کی طرح حکم صادر کر دیا اور اس کے اس انداز پر بے ساختہ میری ہنسی چھوٹ گئی۔

''یہ ہوئی نہ بات۔ بس اسی طرح ہمیشہ خوش رہا کرو اور ہنستی رہا کرو...... چلو اب کپڑے بدلو۔ اچھی بھلی ہو خوبصورت ہو، خوبرو جوان ہو پھر بھی کام والی ماسی بنی بیٹھی ہو۔'' اس نے میرے شکن زدہ سوٹ، بکھرے بالوں اور آزردہ چہرے کو دیکھ کر چوٹ کی۔

''او کے باس۔'' میں نے حکم کی تعمیل میں سر ہلایا۔

''میں باہر کھڑا ہوں پانچ منٹ میں تم بھی وہاں آ جاؤ۔'' صاحب حکم دے کر وہ باہر کی طرف چل دیے۔

''عریشہ کہاں ہے شایان بھائی؟؟؟''

فی الحال تو کمرے میں ہے لیکن میرے ساتھ جا رہی ہے۔'' شایان نے صدف کو جواب دیا۔

''تھینک گاڈ آپ نے اسے راضی کر لیا، ورنہ پتا ہے تین دن سے کام کر کے کمرے کے اندر بند ہیں موصوفہ۔'' صدف نے شایان کو رپورٹ دی۔

''ڈونٹ وری بہت جلد تمہاری پرانی بہن تمہیں واپس مل جائے گی۔''

''اگر ایسا ہو گیا تو جو آپ کہیں گے میں وہ کروں گی۔ کیوں کہ ہم سب کو ہماری پرانی عریشہ واپس چاہیے۔ جو اس گھٹیا انسان کی وجہ سے گم ہو گئی ہے۔''

''سب سے زیادہ مجھے میری عریشہ واپس چاہیے۔'' اس نے دل میں سوچا۔

''چلو بھئی میں تیار ہوں۔'' وہ پنک کلر کی شرٹ وائٹ

ٹراؤزر اور شانوں پر دوپٹہ پھیلائے ایک معصوم سی پری لگ رہی تھی۔

''ہیلو مسٹر کہاں گم ہیں آپ۔'' میں جو اس کی خوبصورتی میں گم ہوگیا تھا اس کے بلانے پر نارمل انداز میں واپس آیا۔

''عریشہ بھئی! میں کہتی ہوں اپنے ساتھ چلنے کو تو تم منع کر دیتی ہو، اب شایان بھائی کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئیں۔'' وہ منہ بگاڑ کے کہتی ہوئی بڑی اچھی لگ رہی تھی۔

''کیوں کہ یہ میری بات ٹال نہیں سکتی.....'' شایان نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''جی بالکل..... کیوں کہ آپ پوچھنے کے بجائے حکم دیتے ہیں اور ہم سر خم تسلیم کر دیتے ہیں۔''

اچھا ہم جا رہے ہیں تم نانا ابو کو بتا دینا۔ میں گیا تھا مگر وہ سو رہے تھے۔ ''او کے بھائی.....!!''

''کاش میری بہن کے نصیب میں شایان بھائی ہوں۔ تو ان کی تمام تکالیف دور ہو جائیں گی۔''

☆.....☆.....☆

صدیق ہاؤس، جہاں بابا اور میری آنی میری پھوپو نے اپنا بچپن گزارا اور ان کے بعد میں نے اور صدف نے اپنی زندگی کا ہر خوبصورت لمحہ گزارا۔ دادا جی جو میرے آئیڈیل ہیں جب بھی میں انہیں ہینڈسم کہتی ہوں تو کہتے ہیں آخر دادا کس کا ہوں۔''

''پھوپو شادی ہو کے سعودیہ چلی گئیں، کیوں کہ وہاں منصور پھوپا کی جاب تھی۔ ان کا ایک بیٹا شایان اور ایک بیٹی رابعہ ہے۔ شایان کو سعودیہ کچھ خاص پسند نہیں آیا اور وہ پاکستان واپس آ گئے ہیں۔ وہ صدف کے بھائی بن گئے۔ اور مجھے ایک اچھا دوست مل گیا۔

جب میں میٹرک میں تھی تو پتا چلا کہ آنی ہمیشہ کے لیے پاکستان شفٹ ہو رہی ہیں۔ میری خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ میں نے شایان کے ساتھ مل کر پورا گھر سجایا جو اس نے اپنے لیے خریدا تھا، مگر آنی کے آنے سے پہلے بابا کے کوئی دوست آ گئے جو امریکہ میں قیام پذیر تھے۔ ان دنوں شایان کسی ضروری کام سے لندن گئے ہوئے تھے اور انہوں نے آناً فاناً میرا رشتہ مانگا اور نکاح طے کروا کے دم لیا۔ بڑوں کی رضامندی سے میرا نکاح ان کے بیٹے اسفر سے ہوگیا۔ اس شخص کو پہلی اور آخری بار نکاح کے بعد اپنے گھر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور آئندہ زندگی [illegible]



دیکھنے کی تمنا بھی نہیں کروں گی۔

ایک سال بعد میری رخصتی طے ہوگئی۔ مگر ایک مہینے بعد انکل کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ جس میں وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور وہ شخص اپنے باپ کی میت کو کندھا دے کر اور میری ذات کا تماشا بنا کر چلا گیا۔ کیوں کہ وہ پہلے سے ہی شادی شدہ تھا اور مجھ میں کوئی انٹرسٹ نہیں رکھتا تھا۔ مگر اپنے باپ کی تمام دولت کے لیے اس نے یہ نکاح کیا تھا اور ان کے جانے کے بعد مجھے بھی آزاد کر گیا۔ مگر در حقیقت وہ مجھے ساری زندگی کے لیے ایک سزا دے گیا۔ طلاق یافتہ ہونے کی سزا۔ میں پیا گھر جانے سے پہلے ہی طلاق کا تمغہ اپنے سینے پر سجا چکی تھی۔ حالانکہ ان معاملات میں میں بالکل بے قصور تھی۔ میں ایک کنواری طلاق یافتہ تھی۔ لیکن پھر بھی معاشرہ مجھے اس نظر سے دیکھ رہا تھا کہ میں ایک طلاق یافتہ عورت ہوں۔

☆ ☆ ☆

دادا جی بھی خاموش ہوگئے تھے۔ بابا اپنے آپ کو اس معاملے میں مجرم مانتے تھے۔ اور صدف تو جیسے بولنا ہی بھول گئی تھی۔ مجھ سے دو سال چھوٹی ہے مگر ہم برابر کے ہی لگتے ہیں اور یہ سب ہماری محبت کی بدولت ہے۔

میں نے کچھ دن بعد ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا آنی بھی آ گئیں تھیں مگر شایان لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ جب کہ اس نے رابعہ آپی کی شادی پر آنے کا وعدہ کیا تھا۔

اسی طرح دن گزرتے رہے۔ رابعہ آپی کی شادی کے دن بھی قریب آ گئے۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا، مگر لوگوں کا سامنا کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ لوگوں کی جانچتی نظریں مجھے اندر تک کاٹ دیتی تھیں۔ نجانے کیوں لوگ مجھے کاٹ نظروں سے دیکھتے تھے۔

''ابو میں عریشہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔ رابعہ کی شادی ہے اور یہ دونوں اس کی بہنیں تھیں۔ مگر گھر آپ کا خالی ہو جائے گا۔ اس لیے عریشہ کو لے جا رہی ہوں۔''

''بھئی عریشہ سے پوچھ لو...... کیوں ایاز؟''

''عریشہ اپنی آنی کے ساتھ جائے گی نا، انہوں نے اتنے مان سے کہا کہ میں چاہ کر بھی منع نہیں کر پائی۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' میں مرتی کیا نہ کرتی ہاں کر بیٹھی۔

''یہ ہوئی ناں بات۔ اب جاؤ اپنا سامان لے آؤ۔'' اور اس طرح میں رابعہ آپی کی شادی تک آنی کے گھر آ گئی۔

☆ ☆ ☆

شام کو شایان بھی آ گئے۔ وہ دادا جی سے ملنے کے بعد گھر آئے تو میں لان میں بیٹھی سوچوں میں گم تھی کہ ان کے آنے کا احساس تک نہیں ہوا۔

''ہائے ڈیئر کیسی ہو۔'' انہوں نے میرے قریب آ کے چٹکی بجائی تو میں ہوش کی دنیا میں لوٹ آئی۔

''زندہ ہوں۔ جینے اور خوش رہنے کی کوشش کر رہی ہوں۔''

''وہ تو تمہیں کرنی چاہیے، مگر اداس رہو گی تو اپنی ہی کوشش ناکام کر دو گی۔'' شایان دانش مند بن گیا تھا۔

''ناکام تو میں ہو گئی ہوں۔ دیکھو ناں میں اپنے ماں باپ پر بوجھ بن گئی ہوں۔ ان کے دن کا سکھ اور رات کی نیند میری وجہ سے چھن گئی ہے۔ میں تو ایک قیدی کی طرح ہوں جو کال کوٹھری میں قید، جینے والوں میں شمار ہوتا ہے نہ مرنے والوں میں۔''

''بری بات ایسا نہیں کہتے۔ ہمیں تو اپنی پرانی عریشہ واپس چاہیے سمجھیں......!!''

''میں تو کیا اب شاید ہی اسے کوئی واپس لا سکے۔'' میرا لہجہ انتہائی مایوس کن تھا۔

''کیوں؟'' شایان وہ کافی سنجیدہ تھے۔

''یہ دنیا بہت بڑی دیوار ہے، جو کبھی بھی پرانی عریشہ کو لوٹنے نہیں دے گی شایان۔'' یہ کہتے ہوئے میرا گلا رندھ گیا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے، تم منفی سوچیں نکال دو اپنے ذہن سے۔'' وہ شاید مجھے سمجھانا چاہ رہے تھے۔

''آپ تو ابھی آئے ہیں نا، خیر کوئی بات نہیں۔ آپ خود ہی بہت جلد دیکھ لیں گے کہ کیوں پرانی عریشہ واپس نہیں لوٹ سکتی۔'' وہ عریشہ جو شوخ و چنچل تھی، ہر طرف خوشیاں دیکھنا چاہتی تھی مگر اس کے مقدر میں غم تھے اور اگر وہ غم بھولنے کی کوشش کرے تو لوگ اسے دوبارہ یاد دلاتے ہیں کہ اس کے نصیب میں صرف دکھ اور کرب ہی تو ہیں۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی بھی مگر اس کی مسکان میں ایک ایسا کرب پوشیدہ تھا جس میں اذیت نمایاں تھی۔

''سو جائیے...... بہت رات ہو چکی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اپنے فیصلے پر مہر لگا دی۔

☆......☆......☆

اگلے دن رابعہ کی مہندی تھی۔ اس نے پیلے رنگ کا چوڑی دار پاجامہ اور لال رنگ کی شرٹ پہنی ہوئی تھی اور

اس کے بال اسٹائلش چوٹی کے انداز میں بنے ہوئے تھے، مگر چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ آنکھوں میں کرب اور دکھ نمایاں تھے۔

میں عورتوں کے درمیان سے گزر رہا تھا، تب عریشہ کے نام پر ٹھٹھک گیا۔

''ارے یہ لال کپڑے والی فرحین کی بھتیجی ہے نا۔''

ہاں ہاں وہی تو ہے عریشہ۔ اس کی تو ایک مہینے کے اندر طلاق ہوگئی تھی۔ سنا ہے لڑکا رضامند نہیں تھا، باپ نے زبردستی شادی کی تھی۔ ہمیں کیا پتا کیا سچ ہے۔ کیا پتا لڑکی میں ہی کوئی کھوٹ ہو۔'' اور مجھے عریشہ کی باتیں اب سمجھ آئیں کہ کیوں اندر ہی اندر وہ گھٹ رہی تھی میں سر جھٹک کے آگے بڑھ گیا۔

رابعہ کی بارات والے دن میں نے اسے کہیں نہیں دیکھا، پھر رات کو وہ مجھے پنک کلر کے شرارے میں نظر آئی۔ وہ نانا ابو کے پاس بیٹھی تھی اور ان سے کوئی بات رازداری سے کر رہی تھی۔

''آج تو گھر چلنا تمہارے بنا مزہ نہیں آتا مجھے۔''

ان کے قریب جانے پر مجھے نانا ابو کا یہ جملہ سنائی دیا۔

''کبھی یہ جملہ مجھے بھی بول دیا کریں۔''

کیوں آپ کو کیوں...... آپ تھوڑی بچپن سے ان کے ساتھ ہیں۔'' وہ لڑنے کے انداز میں بولی۔

''ہاں بھئی شایان یہ بات تو ٹھیک ہے کہ یہ میری بولتی مینا ہے۔'' نانا ابو بولے اور وہ صدف کے بلانے پر وہاں سے اٹھ کے چلی گئی۔

''نانا ابو کیسی طبیعت ہے آپ کی؟''

بس بیٹا جی رہا ہوں۔ میری بولتی مینا کو نظر لگ گئی ہے، دیکھو کیسی خاموش ہوگئی ہے۔ ورنہ اس کی چنچل آواز سے میرا آنگن گونجتا تھا اور میں ہر وقت اس کی خوشیوں کی دعا کرتا تھا مگر شاید میری دعا میں اثر نہیں تھا، اس لیے اس کی خوشیاں ختم ہوگئیں۔

خیر دعا فیت کہ ساتھ رابعہ اپنے گھر کی ہو جائے گی آج۔ اللہ تعالیٰ میری دونوں پوتیوں کے نصیب اچھے کرے، مجھے اور کچھ نہیں چاہیے اس رب سے۔'' نانا ابو ہاتھ اٹھاتے نم آنکھوں سے دعا کر رہے تھے۔

''آپ پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ اوپر بیٹھا ہے ناں وہ دُکھ دیتا ہے، تو خوشی بھی دیتا ہے۔'' میری بات پر وہ مسکرا دیے۔

☆ ☆ ☆

ہم گھر پہنچے تو ہمارے ساتھ مام کی دوستیں اور سب رشتے دار بھی گھر آ گئے تھے اور تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے۔ جاتے ہوئے مام کی دوست نے انہیں کچھ بات کرنے کے لیے بلایا۔ میں جو وہاں سے گزر کر اپنے کمرے میں جانے کی سوچ رہا تھا، لیکن ان کو اتنی تند تیزی آواز میں عریشہ کے خلاف زہر اگلتے ہوئے سن کر وہیں رُک گیا۔ بلکہ ڈیڈ بھی وہی موجود تھے اور ہم ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

''فرحین دھیان رکھنا اپنے بیٹے کا۔ تمہاری بھتیجی ہے بہت خوبصورت مگر ہے طلاق یافتہ۔ کہیں ایسا نہ وہ شایان کو لے اڑے۔ میں تو کہتی ہوں شایان کی بات پکی کر دو، تاکہ کوئی پریشانی نہ ہو۔'' مام کی دوست کہہ رہی تھیں۔

''واٹ! تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری بیٹی کے بارے میں یہ سب بولنے کی۔'' مام نے سخت لہجے میں کہا۔

''ارے میں اکیلی تھوڑی کہہ رہی ہوں، پوری شادی میں یہی چرچے ہو رہے تھے۔''

''جو بھی ہو اگر آئندہ عریشہ کے متعلق کچھ کہا تو ہماری دوستی ختم سمجھنا۔'' مام نے وارنٹ جاری کیے۔

مجھے کیا! تم ابھی تو محبت میں بہہ رہی ہو لیکن بعد میں پچھتاؤ گی، جب اس کی طلاق ہونے کی اصل وجہ تمہیں معلوم ہوگی۔'' مام کی دوست نے تیر پھینکا۔

''اچھا تمہیں کیا پتا ہے اس کے بارے میں۔'' مام نے ان سے سوال کیا۔

''یہی کہ لڑکی بہت ہی بدتمیز ہے۔ اس کا چکر چل رہا تھا۔ لڑکے کو پتا چل گیا اور اس نے طلاق دے دی۔''

''اور اپنی بیٹی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔''

مام کے سوال پر وہ پیر پٹخ کے چلی گئیں۔ میں اور ڈیڈ انہیں سنبھالنے لگے تھے۔ مگر ایک تیز چیخ ہمیں باہر سے سنائی دی جو یقیناً عریشہ کی تھی۔ وہ سیڑھیوں کے پاس گری ہوئی تھی۔ میں نے سرعت سے آگے بڑھ کر اس کا رُخ موڑا تو اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔

''اوہ نو! لگتا ہے اس نے ہماری باتیں سن لی تھیں۔ فرحین اسے فوراً اسپتال لے جانا ہوگا۔ شایان میں گاڑی نکالتا ہوں۔''

میں نے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور باہر کی جانب دوڑا۔

☆ ☆ ☆

ایک گھنٹے کے بعد ڈاکٹر باہر آیا اور ہم سب کی نگاہیں ان پر مرکوز تھیں۔

''اللہ کا شکر ہے وہ خطرے سے باہر ہے۔ سر پر چوٹ آئی ہے۔ مگر یہ چوٹ بھی شاید نروس بریک ڈاؤن کی وجہ سے آئی ہے۔''

''نروس بریک ڈاؤن۔'' ایاز ماموں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''جی ہاں! ان کا نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے، شاید کوئی گہرا صدمہ تھا انہیں اور ان کا دماغ اس کو قبول نہیں کر رہا ہوگا۔ اسی اثناء میں سیڑھیاں چڑھ رہی ہوں گی اور چکر آنے کی وجہ سے نیچے گر گئیں۔''

ڈاکٹر اپنے مخصوص انداز میں کہہ کر چلے گئے۔

اب میں نے جلد از جلد اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کر لیا تھا۔

☆...☆...☆

اس دن کے بعد ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے میری زبان ہی سی دی ہو۔ اپنے بارے میں اس طرح کے کمنٹس سننا میرے بس میں نہیں تھا کہ اچانک فرحین، آنی اور انکل شایان کا رشتہ لے آئے۔

سب خوش تھے مگر میں نے انکار کر دیا۔ شایان کو پتا چلا تو وہ میرے سر پر آن کھڑا ہوا۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی منع کرنے کی؟'' وہ بہت غصے میں تھا۔

''میں خود مختار ہوں۔''

''اچھا اور یہ فیصلہ کس بنا پر کیا ہے؟''

''میں وجہ بتانے کی پابند نہیں ہوں۔'' میں نے ٹکا سا جواب دیا۔ مگر وہ ٹلنے والے نہیں تھے۔

کہنے لگے وجہ بتا دو۔ میں خاموشی سے یہاں سے چلا جاؤں گا۔ عریشہ یہ سب کچھ اس خبیث کی وجہ سے ہوا، ورنہ تم تو میری ہوتیں اب تک۔''

''کیا مطلب!'' ان کی بات میرے سر کے اوپر سے گزر گئی تھی۔

''بتا دوں گا پہلے تم جواب دو۔''

''تو پھر سنو! میں طلاق یافتہ ہوں اور آپ کنوارے ہیں۔''

''یہ کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ ایک پیپر پر دستخط کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔''

''لوگ میری ذات پر انگلی اٹھائیں گے۔'' میں نے ایک عذر پیش کیا۔

''میں وہ انگلی توڑ دوں گا جو میری عریشہ کی طرف اٹھے گی۔''

''مجھے ترس اور ہمدردی نہیں چاہیے۔'' میں نے تنگ آ کر وہ کہہ دیا جو مجھے نہیں بولنا چاہیے تھا۔

''شٹ اپ! میری محبت کو ترس مت کہنا۔'' انہوں نے سختی سے کہا اور میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

''میری آنکھوں میں دیکھو یہ محبت ہے یا ترس۔'' میں نے جو اُن آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو ان آنکھوں میں محبت ہی محبت تھی۔

''میں تم سے محبت کرتا ہوں، پہلی نظر کی محبت۔ اس شوخ و چنچل سی لڑکی کو اس پہلی شام کو ہی دل دے بیٹھا تھا۔ جب وہ لان میں ٹکرائی تھی۔ مگر جب لندن جانے کے بعد تمہارا نکاح ہوا تو میں نے ہمیشہ کے لیے وہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا، مگر قدرت ہمیں ملانا چاہتی تھی، تب ہی وہ تمہیں چھوڑ گیا اور مجھے میری عریشہ دے گیا۔'' انہوں نے جذباتی ہو کر میرے ہاتھ تھام لیے اور بولے۔''وہ فیصلہ غلط تھا مگر آج ایک فیصلہ اور کرو۔''

میری آنکھوں سے آنسو کب سے بہہ رہے تھے مجھے خود بھی نہیں پتا تھا اور انہوں نے سارے آنسو اپنی پوروں پر چن لیے تھے۔''اب ان آنکھوں میں آنسو نہیں خوشی ہونی چاہیے...... بولو...... کرو گی نا مجھ سے شادی؟''

وہ بہت آس لیے مجھ سے پوچھ رہے تھے اور میں ان کی خوشیوں کو اندر آنے کے لیے اجازت دے دی۔ انہوں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور میں نے وہ ہاتھ ہمیشہ کے لیے تھام لیا اور باہر کی جانب چل دی۔ کیوں کہ باہر اپنوں کو بھی خوشخبری دینی تھی۔

صبح ہوتے ہی میری آنکھ کھل گئی۔ شایان مزے سے سو رہے تھے۔ میں نے اٹھ کر پردے اٹھا دیے۔ آسمان کو سوچتے ہوئے دیکھ رہی ہوں کہ اگر اللہ نے مجھے دکھ دیے تو شایان جیسا ہم سفر دے کر ساری تکالیف دور کر دی تھیں۔ اور اب میری اپنے رب سے یہی دعا ہے کہ، اللہ ہر لڑکی کو سچی خوشیاں عطا کرے۔ آمین۔

☆......☆......☆......☆

چوتھی سچ بیانی

عشق نے پامال کیا

صبا اقبال

دشمن، دشمن ہی ہوتا ہے، لیکن عشق سب سے بڑا ہتھیار ہے

اسی ہتھیار کا شکار ہونے والے ایک نوجوان کی داستانِ رسوائی



ایک رات سخت سردی میں میرا گزر لاہور کی ایک ایسی سڑک پر ہوا، جہاں سے گزرنے سے میں اکثر کتراتا ہوں۔ کیونکہ وہاں ٹریفک جام معمول کی بات ہے۔ نہ جانے کیوں اُس دن میں کیسے اُس سڑک پر

جا نکلا۔ کچھ آگے پہنچ کر پیچھے سے ٹریفک جام تھا۔ کافی دیر ٹریفک کی روانی کا انتظار کرنے کے بعد آخر میں گاڑی سے باہر نکلا تا کہ دیکھ سکوں کہ کس وجہ سے راستہ بند ہے۔ کچھ آگے جا کر میری نظر ایک لڑکے پر پڑی اس کی عمر لگ بھگ 22 سال تھی۔ جس کا ایک ساتھی اُسے ہوش میں لانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ بالکل مرنے کے قریب لگ رہا تھا۔ بیچ سڑک پر وہ نیم مردہ حالت میں پڑا تھا۔ پھٹے پرانے کپڑے، بکھرے بال، جسم پر کپڑوں اور میلی سی چادر کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ یہ دیکھ کر میرے قدم وہیں رُک گئے۔

میں نے اُس کے ساتھی سے پوچھا تو وہ بولا۔

''صاحب جی کوئی بھی آدمی اسے اسپتال لے جانے کے لیے تیار نہیں۔ آپ اسے اسپتال لے چلو، ورنہ یہ مر جائے گا۔'' میں سوشل ورکر ہونے کے ساتھ ایک رحم دل انسان بھی ہوں۔ اس لیے میں نے ایک لمحہ بھی دیر کرنے کے بجائے آدمیوں کے ساتھ مل کر اس لڑکے کو گاڑی میں ڈالا اور اسپتال کی طرف چل پڑا۔ لڑکے کے ساتھ جو آدمی تھا، وہ میرے ساتھ گاڑی میں موجود تھا۔ میں نے اُس آدمی سے لڑکے کی ایسی حالت کی وجہ پوچھی، تو وہ بولا۔

''صاحب جی! کچھ مہینے پہلے یہ لڑکا سندھ کے علاقے سے لاہور آیا۔ اس کا لاہور میں رہنے کے لیے کوئی ٹھکانہ بھی نہیں تھا، نہ ہی اتنے پیسے کہ کوئی مکان کرائے پر لے کر اُس میں رہتا، اس لیے یہ یہاں سڑک کے فٹ پاتھ پر ہی رہنے لگا۔ جب ہم نے اِس سے اس کا پتا پوچھا اور یہ پوچھا کہ یہاں کیوں آیا ہے؟ تب اس نے ہمیں اپنی کہانی سنائی، جو کچھ یوں ہے قارئین میں اس لڑکے خالد کی کہانی مِن و عن آپ کے گوش گزار رہا ہوں۔''

سندھ میں جہاں اس کا گھر تھا۔ وہاں گاؤں میں دو قبیلے تھے۔ ایک قبیلے کے لوگ دوسرے قبیلے لوگوں کے دشمن تھے۔ معمولی سی باتوں پر اس قدر جھگڑا ہوتا کہ دونوں ایک دوسرے کو قتل کرنے پر اُتر آئے۔ جس قبیلے میں ہم رہتے تھے، وہاں کا سربراہ میرا ماموں تھا۔ ہم دو بہن بھائی تھے۔ میری بہن مجھ سے چھوٹی جو کہ میرے ماموں زاد کی منگیتر تھی اور میں بھی ماموں زاد کا منگیتر تھا، کیونکہ ہمارے گاؤں میں وٹے سٹے کا رواج عام تھا۔ میری ماں بھی ماموں سے بہت محبت کرتی تھی اور ماموں ہمارے گھر کے فیصلے خود کرتا تھا۔ سب کچھ معمول کے مطابق ٹھیک چل رہا تھا ہم سب لوگ اپنی اپنی زندگی سے مطمئن تھے۔ ماموں جان بڑی محبت سے مجھے اپنے کاروباری اور ذاتی معاملات میں شریک کرتے تھے۔

گاؤں میں زیادہ تر زمینیں ہماری اور ماموں کی تھیں۔ اس لیے میں دونوں طرف یعنی اپنے اور ماموں کے گھر کے کاموں کی نگرانی کرتا۔

ایک دن کچھ یوں ہوا کہ میں معمول کے مطابق کھیتوں پر کام کر رہا تھا، سامنے کنوئیں سے کچھ عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ پانی بھرتے بھرتے اچانک سے دو عورتیں ایک عورت سے لڑنے لگیں۔ ایک لڑکی جو کہ اپنی ملازمہ کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ عورتوں کو اپنی ملازمہ کے ساتھ بحث کرتے دیکھ کر بھڑک اٹھی۔ اس دن اس قدر بھڑکی کہ سب کو خاموش کروا دیا لیکن ایک عورت مسلسل بحث کرتی جا رہی تھی۔ اس لڑکی کا نام نگہت تھا۔ مجھے اُن کی بحث دیکھ کر اچھا نہ لگا اور سوچا کہ ان کی مدد کردوں، لیکن جاتے جاتے پھر رُک گیا کہ یہ دوسرے قبیلے کی لڑکی ہے اور قبیلے کے سردار یاسر کی بیٹی ہے، لہٰذا میں نہ ہی جاؤں تو بہتر ہے، لیکن دوپہر کے وقت وہاں کوئی اور آدمی بھی نہیں تھا جو انہیں لڑنے سے روکتا۔ سب کچھ بھول کے میں آگے بڑھا اور جو عورت نگہت کے ساتھ جھگڑا کر رہی تھی اُسے چپ کروا کر نگہت کی ملازمہ کو پانی بھرنے دیا۔ وہ مسلسل مجھے دیکھتی جا رہی تھی۔ پانی لینے کے بعد نگہت اپنی ملازمہ کے ساتھ اپنے راستے چل پڑی۔ میں بھی کچھ دور ان کے ساتھ گیا۔ مجھے اپنے ساتھ چلتا دیکھ کر وہ بولی۔

''آپ کو میری مدد کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ نہ تو آپ ہمارے ہمدرد ہیں اور نہ ہی ہمارے قبیلے میں سے، پھر ایسا کیوں کیا......؟'' میں اُس کی معصومیت کو دیکھ کر حیرت زدہ تھا کہ یہ یاسر کی بیٹی ہے لیکن کس قدر تمیز دار اور مہذب ہے۔

میں دھیرج سے بولا۔ ''یہ ضروری نہیں کہ وہ لوگ ہی اچھے اور ہمدرد ہوں جو آپ کے قبیلے سے ہوں۔ ابھی آپ نے دیکھا کہ وہ عورت آپ کے قبیلے کی

ہونے کے باوجود آپ کی ملازمہ سے کس قدر بدتمیزی کر رہی تھی اور ہاں ایسے بھی نہیں ہوتا کہ غیر قبیلے کے لوگ اتنے برے ہوں کہ ایک انسان کو پریشان دیکھ کر وہ اس کی مدد نہ کریں، یہ تو سب کی سوچ ہی منفی ہے۔''

میری باتوں کو وہ بڑے غور سے سن رہی تھی پھر وہ میری بات کو کاٹتے ہوئے بولی۔

''خالد نام ہے نا آپ کا۔''

میں حیرت میں پڑ گیا کہ یہ میرا نام کیسے جانتی ہے؟''میں نے پوچھا تو بولی۔

''ابا جان اکثر آپ کی باتیں کرتے ہیں کہ غلام حیدر کے بھانجے خالد نے اپنے ماموں کو سہارا دیا ہے، ورنہ وہ اس قابل کہاں تھا کہ اتنی ترقی کرے۔ ظاہر ہے آپ اپنے ماموں کے راز دار ہونے کے ساتھ ساتھ وفادار بھی ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ آگے اپنی ملازمہ کے ساتھ چلنے لگی۔ اس لڑکی کی باتوں نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ میں اپنے ماموں جان کے لیے کس قدر اہم ہوں۔

پھر وہ لڑکی بولی۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟''

''آ آ آ ... میں سوچ رہا ہوں کہ آپ کا نام کیا ہو سکتا ہے؟'' میں ماتھے پر انگلی رکھتے ہوئے سوچنے کے سے انداز میں کہا۔

''اچھا جی! میرا نام جان کر کیا کریں گے؟'' وہ شوخی سے بولی۔

''وہی کروں گا جو آپ نے میرا نام جانتے ہوئے کیا۔'' میں بھی کچھ شوخ سا ہو چلا تھا۔

''اوہو تو کیا کیا میں نے؟ دیکھو خالد میں نے کچھ نہیں کیا۔'' اس نے مصنوعی غصے سے کہا۔

''ہاہاہاہا ... ہاں تو میں بھی یہی کروں گا۔'' میں بھی اسی انداز میں بولا۔

پھر وہ ایک قدم قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''نگہت نام ہے میرا۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے الگ راستے پر چل پڑی اور میں وہیں کھڑا اُسے جاتا ہوا دیکھتا رہا، کچھ دیر بعد میں بھی اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

نہ جانے اُس کی ملاقات میں ایسی کیا خاص بات تھی کہ ٹھہر ٹھہر کر اُس کی ہر بات مجھے یاد آ رہی تھی۔ اُس کے بعد وہ ہر روز کنوئیں پر اپنی ملازمہ کے ساتھ آنے لگی۔

اگلے دن اُسی وقت پر میں کنوئیں کے پاس بیٹھ گیا۔ عورتیں آ رہی تھیں اور اپنی اپنی باری سے پانی بھر کر لے جا رہی تھیں۔

لیکن نگہت اور اُس کی ملازمہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں، پھر میں نے سوچا کہ آخر میں اُس کے بارے میں اتنا کیوں سوچ رہا ہوں۔ میں اُٹھ کر کھیتوں کی طرف جانے لگا۔ اچانک کھیتوں سے نکل کر آتی ہوئی نگہت مجھ سے ٹکرا گئی۔

''اُف!! دھیان سے چلیں۔ کیا آپ کی گاڑی چھوٹ رہی ہے؟ اتنی جلدی میں کہاں جا رہے ہیں۔'' اُس نے تیزی سے کہا۔

''نہیں! دراصل مجھے کھیتوں میں کام ہے اس لیے ...'' میں نے خجالت سے کہا۔ ''اچھا جی چلیں مان لیتی ہوں۔ ویسے سامنے والے کھیت آپ کے ہیں نا؟''

''جی ہاں!'' میں نے پھرتی سے کہا۔

''واہ بھئی اتنے ہرے بھرے نظر آ رہے ہیں ...... ہیں نا ......؟''

''ویسے خالد، کیا آپ مجھے اپنے کھیت دور دور سے ہی دکھائیں گے؟''

''چلیں میں بھی آپ کے ساتھ کھیتوں پر چلتی ہوں۔''

''جی یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' میں حیرت سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟ کیا میں نے کچھ غلط کہا؟''

''نہیں تو بالکل نہیں ...... بات یہ ہے کہ آپ کو اگر کسی نے میرے ساتھ دیکھ لیا تو۔'' میں نے ڈرتے ہوئے کہا۔

''تو ...... تو کیا؟'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''چلیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ جب میں نہیں ڈر رہی، تو تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''آپ سے وہ اچانک تم پر آ گئی۔ اُس کا بے تکلفانہ اور بدلا رویہ میرے لیے حیرت کا باعث تھا۔ پھر وہ میرے ساتھ کھیتوں پر آ گئی اور فصلوں کو دیکھ کر میری تعریف کر رہی تھی۔ تقریباً آدھا گھنٹہ ہم ایسے ہی کھیتوں میں باتیں کرتے رہے، پھر اچانک یاد آیا کہ اُس کی ملازمہ نے پانی بھر لیا ہوگا۔ یہ کہتے ہی وہ جلدی سے

کنویں کی طرف چل پڑی۔

نکہت کا میرے ساتھ یوں بے تکلف ہونا خطرے کی بات تھی، لیکن پھر بھی میں خود کو اس کی طرف مائل ہونے سے نہ روک سکا۔

نکہت کے جانے کے بعد پھر سے پورا دن اور رات اُس کو سوچتے ہوئے گزارا۔ اگلی صبح ہوتے ہی مجھے اُس کے آنے کا انتظار ہونے لگا اور کام میں بھی میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ دوپہر کے وقت کنوئیں پر عورتوں کی قطاریں نظر آنے لگیں۔ اُن عورتوں میں میری نظریں نکہت کو تلاش کر رہی تھیں جو کہ شاید ابھی نہیں آئی تھی۔

کافی انتظار کے بعد مجھے لگا کہ جیسے آج وہ نہ آئے۔ اور میں اُٹھ کر چل پڑا اور کھیتوں میں کام کرنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ نکہت میرے سامنے کھڑی ہے۔ میں اُسے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

''نکہت! آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟'' میں نے پریشان لہجے میں کہا۔

''کیوں! کیا یہاں آنا منع ہے؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''منع تو نہیں لیکن کیا آپ جانتی نہیں کہ ہم دونوں الگ الگ قبیلے سے ہیں۔ آپ کے لوگ ہمیں اور ہمارے لوگ آپ کے لوگوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں! لیکن اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟''

''بات یہ ہے کہ.....'' میں ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس نے میری بات کاٹ دی۔

''اچھا اچھا چھوڑو ان باتوں کو اور یہ بتاؤ کہ تم آج کنوئیں پر کیوں نہیں آئے؟''

''مجھے کچھ کام تھا.....'' میں نے ٹالنے کے سے انداز میں کہا۔

''کیا کام تھا؟'' اس نے نہ ٹلنے والے انداز میں پوچھا۔

''دراصل کچھ کھادیں اور اسپرے شہر سے منگوانے تھے، وہی لکھ رہا تھا۔''

''اوہو تو جناب منصوبہ بندی ہیں...''

''نہیں نہیں! یہ بتاؤ کہ آپ پورا دن گھر میں کیا کرتی ہو؟''

''میں گھر میں کچھ خاص نہیں کرتی۔ کام کرنے کے لیے ملازمہ وغیرہ ہیں۔ یہ ملازمہ جو پانی لینے آتی ہے میری اعتماد والی ہے۔ اس لیے میں بھی اس کے ساتھ آ جاتی ہوں۔'' کچھ باتیں کرنے کے بعد نکہت چلی گئی۔ اس کے بعد ہر دن ہماری ایسے ہی ملاقات ہونے لگی، کبھی میں کنوئیں پر چلا جاتا اور کبھی وہ کھیتوں میں آ جاتی۔

پھر کچھ یوں ہوا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ ساتھ نبھانے کے لیے قسمیں اور وعدے کیے گئے۔ دن یوں ہی گزرنے لگے اور میں بدلنے لگا۔ میری تبدیلی میری ماں سے زیادہ دیر چھپی نہ رہی، لیکن انہیں وجہ سمجھ میں نہ آ سکی۔

ایک دن میں اور نکہت معمول کے مطابق بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ میرے ماموں کو کسی نے خبر دی اور وہ عین موقع پر پہنچ گئے اور ہمیں دیکھ لیا۔ نکہت تو فوراً وہاں سے چلی گئی اور ماموں مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ گھر پہنچ کر وہ امی سے بولے۔

''جانتی ہو تمہارا بیٹا کیا گل کھلا رہا ہے؟''

ماموں کے غصے کو دیکھ کر امی ڈر گئی اور بولی۔ ''خدا خیر کرے بھائی جان کیا ہوا؟ آپ اتنے غصے میں کیوں ہیں اور یہ کیا کہہ رہے ہیں؟'' ماموں بولے۔

''پوچھو اسی سے۔ یہ یاسر کی بیٹی کے ساتھ کیا کر رہا تھا؟ اس سے ہر روز کیوں ملتا ہے؟'' امی حیرت زدہ آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی اور بولی۔

''بولو خالد کیا بات ہے۔ تمہارے ماموں کیا کہہ رہے ہیں؟ تم یاسر کی بیٹی کے ساتھ؟'' انہوں نے کہا۔ تو میں نے بڑے سکون سے امی کو بتایا۔

''امی جان نکہت ایک اچھی لڑکی ہے۔''

''کیا اچھی لڑکی.....؟ تو اس کا مطلب تم اس سے ملنے لگو گے؟ بولو کیوں ملتے ہو اُس سے۔'' امی سخت غصے میں تھیں۔

ساتھ ہی ماموں کی آواز اس قدر شدید تھی کہ در و دیوار ہلتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔

ماموں جان وہ.....''

وہ، وہ کیا خالد؟'' اُن کی حالت غصے سے غیر ہو رہی تھی۔

''ماموں جان وہ مجھے اچھی لگتی ہے اور میں اُس سے پیار کرتا ہوں۔'' یہ سننا ہی تھا کہ امی نے ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر رسید کیا اور ماموں جان تو ایکدم خاموش ہی ہو گئے۔ شاید انہیں اپنی بیٹی اور میری ماں کی فکر ہونے لگی تھی۔

''ثریا...... اپنے بیٹے کو سمجھالو۔'' ماموں نے میری امی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ سمجھ جائے اور اپنی حرکتوں سے باز آجائے تو ٹھیک...... ہم اگلے دس دن میں ہی اپنے بچوں کی شادی کرلیں گے۔'' (ماموں کا مطلب میری شادی اپنی بیٹی اور میری بہن کی شادی اپنے بیٹے سے کرنے کا مطلب تھا) ''ورنہ تم لوگ اس گاؤں سے نکلنے کی تیاری کرلینا اور میں تم سب کے لیے مر گیا اور تم سب میرے لیے۔ اور ہاں اسے سمجھا دو کہ یاسر کی بیٹی اسے صرف اور صرف فریب دے رہی ہے۔ میں یاسر کی فطرت سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ اگر یہ سمجھ جائے تو بہت اچھا ورنہ پھر سزا بھگتنے کے لیے تیار رہے۔'' یہ کہہ کر ماموں گھر سے چلے گئے۔

ماموں کے جانے کے بعد امی جان نے ہر ممکن کوشش کی کہ مجھے سمجھا سکے لیکن میرے سر پر نگہت کی محبت کا بھوت سوار تھا اور میں اُس کے خلاف ایک بات بھی سننے کو تیار نہیں تھا اور رہ رہ کر نگہت کا خیال آرہا تھا کہ اگر اُس کے گھر والوں کو بھی اس بات کی خبر ہوگئی ہے۔ تو نہ جانے وہ نگہت کے ساتھ کیسا سلوک کررہے ہوں گے۔

امی نے ساتھ ساتھ یہ فیصلہ بھی صادر کیا تھا کہ جب تک میری شادی میری ماموں زاد خدیجہ سے نہیں ہو جاتی، میں گھر سے باہر نہیں جاسکتا۔'' اور صاف الفاظ میں کہہ دیا۔

یہ سُن کر مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے بدتمیزی شروع کردی کہ تم لوگ کون ہوتے ہو؟ مجھے اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کا پورا حق ہے۔ میں جیسے چاہوں زندگی گزاروں۔ جس سے چاہوں شادی کروں یا نہ۔'' اسی دوران ابو بھی گھر آگئے۔ امی نے ابو کو تمام بات بتائی جس سے ابو بھی پریشان نظر آنے۔ سب نے مجھے ڈانٹ

غزل

نظر کا زاویہ بدلا ہوا ہے
کہ دل کا فیصلہ بدلا ہوا ہے
حکایت اور ہی لگتی ہے ان کی
فسانہ عشق کا بدلا ہوا ہے
جھگڑنے کے بہانے ڈھونڈتا ہے
کہ معنی لفظ کا بدلا ہوا ہے
نہ پائیں گے کبھی منزل مسافر
ہمارا رہنما بدلا ہوا ہے
تعین سمت کا کس طرح ہوگا
کہ جب قبلہ نما بدلا ہوا ہے
چلے گا راہ پر سیدھی وہ کیونکر
جو ضد میں راستہ بدلا ہوا ہے
دعاؤں میں اثر کیسے ہو پیدا
خدا سے رابطہ بدلا ہوا ہے
بدلیے آپ بھی اب خود کو بابر
تقاضا وقت کا بدلا ہوا ہے

شاعر: پرنس بابر علی بلوچ۔ جھوک، ساہیوال

کر اور پیار سے غرض ہر طرح سے سمجھایا لیکن میں اپنی ضد سے نہ ہٹا۔

مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس قدر پابندیوں کے بعد اب نگہت سے کیسے ملا جائے؟

دو دن کے بعد میں کھیتوں پر گیا وہاں ماموں جان پہلے سے موجود تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر میں کھیتوں پر آؤں گا تو ہوسکتا ہے کہ پھر سے نگہت سے ملنے کی کوشش کروں۔ میں ایک طرف بیٹھا کنوئیں کی طرف دیکھتا اور نگہت کا انتظار کرتا رہا۔ اُس دن نگہت نہ آئی تو میں نے ایک خط لکھا اور چھپ کے وہ خط نگہت کی ملازمہ کو دے دیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ نگہت کی بھروسہ مند ملازمہ ہے۔ خط میں رات کو ملنے کا ذکر تھا ملازمہ نے کہا اور یہ کہ وہ یہ خط نگہت کو ضرور دے دے گی۔

رات کے وقت میں گھر میں ہی تھا۔ جب

سارے لوگ سو گئے تو میں خط پر لکھی مقررہ جگہ پر گیا جہاں میں نے نگہت کو بلایا تھا۔ نگہت وہاں کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔

میرے پوچھنے پر نگہت نے بتایا کہ اُس کے گھر والوں کو بھی سب کچھ پتا چل چکا ہے اور انہوں نے نگہت کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا ہے۔ یہ سُن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے رنجیدہ دیکھ کر نگہت نے کہا۔

''صبر سے کام لو، اور جلد ہی میں اپنے گھر والوں کو منالوں گی۔'' نگہت نے مجھے شادی نہ کرنے کا کہا۔ جبکہ پورے گاؤں میں میری شادی کا چرچا ہو رہا تھا کہ میں اپنی ماموں زاد سے شادی کر رہا ہوں۔ نگہت کو بھی یہ سب کچھ معلوم تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''میں کیا کروں جو میری شادی ماموں زاد سے نہ ہو، کیونکہ امی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔''

نگہت نے مجھ سے کہا۔ ''شادی کے دن تم گھر سے چلے جانا اور تین دن کے بعد گاؤں لوٹنا تب تک میرے گھر میں بھی سب کو یقین ہو جائے گا کہ تم نے میری وجہ سے شادی نہیں کی اور وہ مان جائیں گے اور یہ بھی کہ تم مجھے دھوکہ نہیں دو گے، پھر ہم شادی کر لیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''اگر وہ تب بھی نہ مانے تو......؟''

نگہت بولی۔ ''تب ہم گاؤں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے اور شادی کر لیں گے ہیں ہر طرح تمہارا ساتھ دوں گی۔''

نگہت سے بات کر کے مجھے ہر طرف سے اُمید کی کرن نظر آنے لگی اور میں اُسی کے کہنے پر، گھر میں سب کے ساتھ خوشی خوشی رہنے لگا تاکہ کسی کو شک نہ ہو سکے۔ شادی کے دن بھی میں گھر میں ہی تھا سب لوگ خوش نظر آ رہے تھے۔ مجھے نگہت کا مشورہ یاد تھا اور ٹھیک بھی لگ رہا تھا، چنانچہ میں آنکھ بچا کر گھر سے نکل گیا۔

اس وقت میں نے کسی کے بارے میں نہ سوچا، نہ ماموں کی عزت، نہ ابو جان اور امی کی خوشی...... صرف نگہت کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ میں اس کے ساتھ دھوکہ نہ کروں۔ ایسے ہی میں گاؤں سے نکل کر اپنے ایک دوست کے پاس پہنچا۔ میں نے جب اُسے پوری سچائی بتائی تو اُس نے مجھے بہت سمجھایا کہ میں واپس لوٹ جاؤں اور گھر والوں کو پریشان نہ کروں لیکن میں نے اُس کی ایک نہ سنی، آخر اُس نے مجھے کہہ دیا کہ وہ ایسے غلط کام میں میرا ساتھ نہیں دے گا۔ لہٰذا میں وہاں سے چلا جاؤں۔ پھر میں ایک ہوٹل میں چلا گیا۔ وہاں میں نے تین دن گزارے ان دنوں میں میرے گھر والوں پر کیا قیامت گزری، یہ تو وہی جانتے ہیں۔

تین دن بعد جب میں اپنے گھر پہنچا تو امی ابو نے مجھے گھر میں رکھنے سے انکار کر دیا اور میرے ساتھ تمام رشتے ناتے بھی ختم کر دیے۔ ماموں نے اپنی بیٹی کی شادی میری خالہ زاد کے ساتھ کر دی، جو ساتھ والے گاؤں میں رہتی تھیں۔

ماموں نے ہم سب سے قطع تعلق کر لیا تھا اور امی سے بھی کہا کہ وہ اس گاؤں کو چھوڑ دیں لیکن امی نے کہا کہ ہم آپ کو نہیں چھوڑیں گے اور اپنے بیٹے کو پوری زندگی اپنے گھر میں قدم رکھنے نہیں دیں گے، لہٰذا ماموں مان گئے۔

ماں باپ کو چھوڑ کر میں گھر سے چلا گیا اور کنوئیں کے پاس جا کر بیٹھ گیا کہ شاید نگہت اپنی ملازمہ کے ساتھ آ جائے۔ اُس وقت میرا کوئی نہیں تھا لیکن مجھے اُمید تھی کہ نگہت نے سب کو راضی کر لیا ہوگا، اس لیے پھر سے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ کچھ دیر بعد نگہت اپنی ملازمہ کے ساتھ مسکراتی ہوئی آئی۔ میں نے نگہت کو ملنے کا اشارہ کیا، لیکن اُس نے غور نہ کیا۔ کچھ دیر بعد میں نے پھر سے نگہت کو بلایا کہ وہ مجھے ملے کیونکہ اگر میں سب کے سامنے اُس سے بات کرتا تو ہو سکتا تھا کہ گاؤں میں پھر کوئی اُس کے گھر والوں کو بتا دیتا۔ اس لیے میں نے احتیاط سے کام لیا۔

اس کا بدلا ہوا رویہ دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا کہ شاید نگہت کو مجھے واپس دیکھ کر کوئی خوشی نہیں ہوئی لیکن یہ سب میرا وہم ہو سکتا ہے، یہ سوچ کر میں نے خیال بدل دیا۔ لیکن پھر اچانک سے نگہت میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

میں نے پوچھا۔ ''نگہت کیسی ہو؟''

''ٹھیک ہوں...... بولو کیا کہنا ہے مجھے؟ کیوں اتنی

دیر سے مجھے بلا رہے ہو؟'' اس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔

''نگہت میں نے کہنا ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہوگیا ہے بالکل ویسے جیسے تم نے کہا تھا۔ کیا تم نے اپنے ابا کو منالیا؟''

اُف! سوری خالد میں ناکام رہی۔ ابا نہیں مانے اور پلیز تم مجھے بھول جاؤ۔ کیونکہ میرا رشتہ طے ہو چکا ہے اور جلد ہی میری شادی بھی ہے۔'' اس نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا جس کے بارے میں، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

''کیا...... تم یہ کیا کہہ رہی ہو...... تم پاگل تو نہیں ہوگئی؟''

''خالد دیکھو، جو قسمت میں نہیں، وہ نہیں ہو سکتا اور مجھے اپنے گھر والوں کی عزت عزیز ہے۔ میں تمہاری طرح خود غرض نہیں جو اپنی خوشی کے لیے اپنے گھر والوں کو تنہا چھوڑ دوں۔'' اس نے مجھ پر چوٹ کی تھی۔

''نگہت میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''اچھا! تمہاری مرضی، معافی مانگ کون رہا ہے؟ اور ہاں میں اب جا رہی ہوں۔ آئندہ مجھے بلانے کی کوشش بھی مت کرنا ورنہ تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔''

یہ کہہ کر وہ انتہائی عجلت میں تیزی سے قدم پٹختے چلی گئی۔ اور میرے ذہن پر سوالوں کی بوچھاڑ کر گئی۔

''اُف خدا! اس لڑکی نے تو واقعی میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ ماموں جان نے سچ ہی تو کہا تھا۔ کاش! میں نے اُن کی بات مان لی ہوتی۔ اب میں کہاں جاؤں؟'' یہ باتیں سوچ سوچ کر میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔

چونکہ خالد کے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اُس نے خالد کو اپنے گھر اور ماموں سے الگ کر کے ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا، جو بہت بڑی رسوائی تھی۔

اس لیے یہ گاؤں چھوڑ کر وہ لاہور آ گیا۔ جب خالد لاہور آیا تو بہت رویا کرتا تھا۔ لاہور میں اس کا کوئی جاننے والا نہیں تھا، اس لیے یہ سڑک پر ہی رہنے لگا۔ اس لڑکی کے دھوکے اور گھر والوں سے جدائی کے غم میں یہ اس قدر روتا کہ اس کی حالت غیر ہو جاتی۔ شروع میں اس نے نیند کے لیے دوائی لینا شروع کر دیا۔ جس سے یہ کسی حد تک پُرسکون رہتا، لیکن پھر آہستہ آہستہ اس نے خطرناک حد تک نشے کی مقدار بڑھا دی اور آج یہ اس حالت میں پڑا ہے۔

یہ سب سُن کر مجھے بے حد دُکھ ہوا۔ اس نوجوان لڑکے نے اُس لڑکی کی خاطر اپنی زندگی خراب کرنے کے ساتھ ساتھ گھر والوں کو بھی بُری طرح رسوا کیا۔ اور ایسی رسوائی جو شاید پوری زندگی بھی ختم نہ ہو۔

اسپتال آ چکا تھا۔ میں جلدی سے خالد کو ایمرجنسی وارڈ میں علاج کے لیے بھیجا۔ خالد کا علاج شروع ہو چکا تھا۔

کچھ مہینے علاج کے بعد خالد صحت یاب ہو گیا اور پھر میرا کام اُسے دماغی طور پر پُرسکون کرنا تھا۔ اُس کے لیے میں نے اُسے نفسیاتی ڈاکٹر پاس بھیجا۔ کچھ خاص علاج کے بعد خالد مکمل طور پر ٹھیک ہو چکا تھا۔ لیکن پھر بھی جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا، اسے اس کا غم تھا۔ لیکن وہ سمجھ چکا تھا کہ خوشی اور غم زندگی کا حصہ ہیں۔ اس لیے کبھی غم زدہ ہو کر زندگی جیسی نعمت کو ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ خدا کی ایک امانت ہے اور اس امانت کی حفاظت ہر انسان کا فرض ہے۔

اس کے بعد میں نے خالد کو لاہور میں ایک نوکری پر لگوا دیا۔ جہاں دن رات محنت کر کے جلد ہی وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد اُس کی شادی ایک اچھی لڑکی سے کروا دی اور اب وہ خوش و خرم زندگی گزار رہا ہے۔ لیکن اپنے ماں باپ کے چھوٹ جانے کا غم ابھی بھی اُس کے دل میں ہے۔ وہ آج بھی اُسی اُمید پر خوش رہتا ہے کہ شاید ایک دن اُس کے ماں باپ اُسے پھر سے اپنا لیں۔ اُمید پر ہی دنیا قائم ہے۔ خالد کی اتنی بڑی غلطی اُسے ہمیشہ یاد رہے گی، چاہے وہ زندگی میں جتنی بھی خوشیاں حاصل کر لے، لیکن ایسی غلطیاں انسان کو مطمئن ہونے نہیں دیتیں۔

کیونکہ بچے وہ نہیں جانتے جو اُن کے بڑے جانتے ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگیوں کا ایک خاص حصہ انہی تجربات میں گزارا ہوتا ہے۔

☆☆......☆☆

تم میری ہو!

نجمہ جبیں علیزئی

دزد آدم خیل سے، ایک عاشقِ نامراد کا فسانۂ غم

آج بہت دنوں بعد شیراز خان میرا دوست مجھ سے ملنے میرے گھر آیا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ چپ چپ اور اَپ سیٹ سا رہنے لگا تھا۔ آج بھی وہ مجھے پہلے سے زیادہ پریشان حال اور بے چین سا نظر آ رہا تھا۔ وہ میرا پھوپی زاد تھا۔ اماں اور بابا اُسے دیکھ کر خوش ہو گئے۔ بڑے تپاک سے اُس کا سواگت کیا۔

''میرا شیری بہت کمزور لگ رہا ہے۔ کیا بات ہے بچے طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اماں نے محبت سے پوچھا۔

''مجھے بھی کچھ ایسا لگ رہا ہے بیٹا۔'' بابا بھی اماں کی تائید کیے بنا نہ رہ سکے تو وہ جانے کیوں نظریں چُرا کر انہیں مطمئن کرنے لگا۔

''ارے نہیں میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ لوگوں کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ آپ کو ایسا اس لیے لگ رہا ہے کیونکہ میں بہت دنوں بعد جو آپ سے ملنے آیا ہوں۔'' اُس نے چہرے پر زبردستی کی بشاشت سجائی تھی۔

''ہاں بچے تیری یہ بات بھی درست ہے۔ ہمایوں دو ہفتے گھر پر نہیں تھا تو تم نے بھی آج شکل دکھائی۔'' اماں نے لگاوٹ بھرا گلہ کیا تو وہ شرمندہ سا ہو گیا۔

''کیا کروں بی بی گل! بابا جانی کی اسلحے والی فیکٹری کی دیکھ بھال کی وجہ سے میرا آئے روز وہاں آنا جانا بڑھ گیا ہے، خیر آپ اچھی سی چائے پلوا دیں۔ میں اور ہمایوں کمرے میں گپ شپ لگاتے ہیں۔''

''چل یار مجھے ذرا اپنے کراچی کے ٹوُر کے بارے میں بتا، وہاں کیا جھک مار کر آیا ہے تُو۔'' وہ اماں سے چائے کی فرمائش کر کے میرے ساتھ اندر کمرے میں چلا آیا۔

میں کل رات کراچی سے لوٹا تھا۔ وہاں بابا کے ایک دوست کے پاس جاب کے سلسلے میں گیا تھا۔ پورے پندرہ دن لگ گئے تھے۔

''کیا بتاؤں انٹرویو تو دے آیا ہوں، دعا کرو کامیاب ہو جاؤں۔ یقین جانو تعلیم مکمل ہونے کے بعد فارغ رہنا بہت برا لگتا ہے۔ اچھا تم سناؤ آج کل بدلے بدلے سے یہ تیور سرکار کے کیوں نظر آنے لگے ہیں۔ مجھے لگتا ہے شیری تم کسی اُلجھن اور پریشانی کا شکار ہو رہے ہو۔ کیا بلوشہ سے لڑائی ہو گئی ہے۔'' میں نے اپنی ٹٹولتی نگاہیں اُس کے سلگتے چہرے پر جما دیں۔ وہ چند لمحے جیسے چپ سا ہو گیا۔

''کیا بات ہے شیراز کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں تمہارا کلوز فرینڈ ہوں، یار تم مجھ پر اعتبار کر سکتے ہو۔''



میں نے آگے بڑھ کر اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا، تو وہ جیسے پھٹ پڑا۔

''کیا بتاؤں ہمایوں! میرے خواب، میری خوشیاں کسی نے اپنے قدموں تلے روند دی ہیں۔ میری اُلجھن، میری پریشانی پلوشہ ہے دوست۔ وہ راستہ بدل رہی ہے۔ مجھ سے، میری محبت سے دور بھاگنے لگی ہے۔ کسی اور کو اپنی چاہتوں کا مرکز بنا کر مجھ سے دامن چھڑانا چاہتی ہے۔ میری غیرت، میری عزت، میری پُرخلوص محبت کی دھجیاں بکھیرنا چاہتی ہے، جو مجھے کسی طور گوارا نہیں ہے۔''

اُس کا غم و غصہ اپنے عروج پر تھا، آنکھیں مارے غیظ و غضب کے لہو رنگ ہو رہی تھیں۔ وہ یوں بھی خاصا جذباتی اور غصیلے مزاج کا لڑکا تھا۔

''تمہیں کوئی غلط فہمی یا بدگمانی بھی ہو سکتی ہے شیری۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ شیراز خان جیسا خوبصورت انسان جس کو دیوانگی کی حد تک چاہتا ہو، وہ والی لڑکی بھلا یوں کیسے بھٹک سکتی ہے۔ کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے یا تم ایسے ہی الزام تراشی کر رہے ہو۔'' میرا دل و دماغ کسی طور اس حقیقت کو ماننے پر آمادہ نہیں تھا۔ شکر تھا کہ اماں نے چائے ملازم لڑکے کے ہاتھ بھجوا دی تھی، خود آتیں تو شیراز کا یہ روپ انہیں پریشان کر دیتا۔

''مجھے جھوٹ بولنے یا خوامخواہ الزام تراشی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں یہ اذیت پچھلے دو ڈھائی ماہ سے برداشت کر رہا ہوں۔ وہ اپنی کلاس فیلو کے بھائی کو پسند کرنے لگی ہے۔ میں نے کئی بار خود کو دھوکا اور فریب دینے کی کوشش کی کہ شاید یہ میرا واہمہ اور نگاہوں کا دھوکا ہو۔ مگر حقیقت بہت تلخ اور اٹل ہوتی ہے ہمایوں۔ میں نے کئی بار نہ صرف اُسے ایمل خان کے ساتھ گاڑی میں دیکھا ہے بلکہ وہ اب اکثر اپنی اُس کلاس فیلو کے گھر پائی جاتی ہے۔''

شیراز نے دانت پیستے ہوئے مجھے ساری صورتِ حال سے تلخ لہجے میں آگاہ کیا۔ اُس کی آنکھوں اور لب و لہجے میں دُکھ بھری سچائی تھی۔ جس سے میرے لیے بھی نظریں چرانا مشکل ہو گیا۔ مگر میں پھر بھی اُس کے غم و غصے اور جوش و جذبات کو کنٹرول میں رکھنا چاہتا تھا۔

''ہو سکتا ہے شیری یہ سب غلط نہ ہو مگر میری رائے ہے کہ تم کوئی بھی قدم اٹھانے یا فیصلہ کرنے سے پہلے پلوشہ سے اس ٹاپک پر کھل کر بات کر لو۔ اگر وہ واقعی

بھنک چکی ہے تو تم پھر گھر والوں کو درمیان میں لے آؤ۔ یوں بنا سوچے سمجھے جذباتی ہو کر کوئی قدم اٹھانا مناسب نہیں۔'' میں نے غیظ و غضب کا پیکر بنے شیراز کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مشورہ دیا۔

''میں نادان نہیں ہمایوں! جو پلوشہ کے بدلتے رنگ ڈھنگ اور طور طریقے نہ جان سکوں۔ بہن کی خاطر اب تک بہت حوصلے سے یہ ذلت، یہ رسوائی برداشت کر رہا ہوں۔ اگر تم چاہتے ہو تو میں پلوشہ سے بات کر کے بھی ایک بار اُسے آزما لیتا ہوں۔ لیکن اگر وہ باز نہ آئی تو پھر تم بخوبی جانتے ہو ہم پٹھانوں کے کیا اصول اور کیا روایات ہیں۔''

میرے مشورے پر عمل کرنے کا وعدہ کرتے شیراز خان کا لہجہ آخر میں انتہائی خطرناک ہو گیا تھا۔ وہ جو کچھ بتا رہا تھا، غلط نہ تھا۔ ہم پٹھان لوگ اپنی خاندانی روایات، عزت و آبرو، آن و غیرت سے بغاوت کرنے والی خودسر عورت کا ناقابلِ معافی جرم کبھی نہیں بخشتے۔ من مانی کرنے والی، سرکشی کی حدود کو عبور کرنے والی لڑکی کو قبیلے اور خاندان میں عبرتناک انجام سے دوچار کیا جاتا تھا۔ اس ٹھوس اور تلخ حقیقت سے پلوشہ بھی بخوبی واقف تھی۔ مگر شاید وہ کم عقل اور نادان تھی یا پھر ایمل خان کی اندھی محبت نے اُس سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں چھین لی تھیں۔ میں اس احمق لڑکی کی سوچ پر، اُس کی عقل پر حیران تھا، جو شیراز جیسے محبت کرنے والے انسان کی بے لوث وفاؤں کو پس پشت ڈال کر، ایک انجانے شخص کی چاہتوں کی اسیر ہو گئی تھی۔ شاید محبت یوں بھی ہوتی ہے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ایسا کر سکتی ہے۔ وہ میرے پاگل دوست کی نگاہوں کا پہلا، روپیلا خواب تھی۔ اور یہ خوبصورت خواب کوئی ستم گر تعبیر پانے سے پہلے چھین رہا تھا۔ تو پھر اس زیادتی کو، اس ستم کو شیراز خان یا قبیلے کا کوئی بھی خود کیسے معاف کر سکتا تھا۔

شیراز خان میرا قریبی دوست اور سگا پھوپی زاد تھا۔ وہ میرے بابا کی اکلوتی بہن کا لاڈلا، جوشیلا اور جذباتی سا بیٹا تھا۔ اکلوتا ہونے کے ناتے وہ پھوپو کو بے حد عزیز تھا۔ شیراز خان کی دو ہی بہنیں تھیں۔ مہر بانو آپا اور شاہ بانو گل آپا، ہم دونوں کا تعلق پٹھان قبیلے سے تھا۔ ہمارے رسم و رواج ہماری ثقافت و طرز زندگی غیرت و آن آبرو کے لیے مرمٹ جانا سب روایات اور اصول گویا ہمارے قبیلے کی شناخت اور فخر کا سمبل تھے۔ ہمارے ہاں رشتے ناتے اپنے قبیلے اور خاندان سے باہر کرنا گناہِ عظیم تصور کیا جاتا تھا۔ میری بہن گل جانہ اور مہر بانو آپا کی شادیاں میرے بڑے ماموں کے بیٹوں سے ہوئی تھیں۔ دونوں اپنے گھروں میں خوش اور آباد تھیں۔ مجھ سے بڑے جہانگیر بھائی کی شادی بدلے میں مہر بانو آپا کی نند زرینہ بھابی سے ہوئی تھی۔ جہانگیر بھائی بیوی بچوں سمیت کراچی میں ہوتے تھے۔ گل آپا یعنی شاہ بانو کا رشتہ اپنے چچازاد رستم خان سے ہو چکا تھا اور نا چاہتے ہوئے بھی نا جانے کیسے رستم لالہ کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی نٹ کھٹ لاابالی بہن پلوشہ شیراز خان کی امنگوں اور توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔ وہ اُس کی کافرانہ اداؤں کا ایسا شیدائی ہوا کہ ببانگِ دہل اُسے پانے کا اعلان کر دیا۔ کسی کو اس بندھن، اس رشتے پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ گھر اور خاندان کا دیکھا بھالا لڑکا تھا۔ اُس کی سگھڑ اور سلجھی ہوئی بہن گل آپا اُن کے گھر کی بہو تھی۔ کس برتے پر انکار ہوتا۔ پلوشہ ابھی کم عمر تھی، فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی۔ خاندان میں چونکہ لڑکوں کو اُس زمانے میں بی اے سے آگے پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ اس لیے، ہم عمر ہونے کی وجہ سے ہم دونوں نے ایک ساتھ بی اے کیا۔ پھر شیراز خان نے تو اپنے آبائی گاؤں درہ آدم خیل میں والد کی اسلحے کی فیکٹری سنبھال لی۔ اور میں ذریعہ معاش کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کرنے لگا۔

میری شادی اپنے چھوٹے چچا کی بیٹی ماہ رُخ سے طے تھی۔ بس نوکری ملنے کی دیر تھی۔ گھر والے تو سہرا سجانے کو تیار تھے۔ شیراز کی شادی بھی میرے ساتھ ساتھ ہونا تھی۔ پلوشہ کی ضد اور خواہش تھی کہ وہ بی اے کرے گی خاندان کے بزرگ اس کے حق میں نہ تھے۔ شیراز کو اُس کی خواہش کا علم ہوا تو اُس نے پلوشہ کی خوشی کے لیے اُس کی مرضی پر یہ فیصلہ چھوڑ دیا۔

پورے خاندان میں اس وجیہہ و خوبصورت لڑکے کی جنونی محبت اور اٹل ارادوں کے قصے مشہور تھے۔ سب کو خبر تھی کہ وہ پلوشہ کا نام لے کر سانس لیتا ہے۔ اُس کے پاگل دل کی دنیا میں صرف پلوشہ کا وجود آباد ہے۔ نٹ کھٹ لاابالی سی پلوشہ، اُس کی محبت پر ناز کرتی تو اُس کی سہیلیاں پلوشہ کی قسمت پر رشک کرتیں جسے ایسا جاں نثار

کرنے والا محبوب ملا تھا۔ جس کے جیون کی ہر خوشی، ہر رنگ پلوشہ کی ذات سے وابستہ تھی۔ وہ بھی شیراز کی چاہتوں اور وفاؤں کی قدردان تھی۔ اپنے اور شیراز کے اس اٹوٹ بندھن پر، اس تعلق پر اُسے کوئی اعتراض، کوئی انکار نہ تھا۔ پھر یہ سب کیسے ہوگیا۔ کیوں وہ شیراز خان جیسے بھرپور مرد کی رفاقت ٹھکرا کر کسی اور کی قربتوں میں پناہ تلاش کرنے لگی تھی۔ اُس کا یہ جرم سنگین تھا۔ جسے نظرانداز کرنا مشکل تھا۔

☆......☆......☆

یہ اتفاق تھا کہ اُس دن میں اور اماں پلوشہ کے والد کی مزاج پرسی کے لیے اُن کے گھر چلے آئے تھے۔ شاید اب بھی شیراز خان کی بدگمانی ہر شبہ رہتا اگر میں اُسے اپنی آنکھوں سے کالج واپسی پر ایک خوش شکل، اسمارٹ سے لڑکے اور اپنی ہم عمر لڑکی کے ساتھ گاڑی سے اُتر کر گھر کی طرف آتے اور اُن دونوں کو کھلکھلاتے انداز میں جھک کر اُسے بائے بائے کہتے نہ دیکھتا۔ اُس کا یہ انداز، یہ بے باک روپ مجھے بھی سلگا گیا تھا۔

میں پلٹ کر اندر حویلی میں چلا آیا۔ مجھے اُس پر رہ رہ کر طیش آرہا تھا۔ وہ سیاہ پھولدار چادر میں دمکتا چمکتا چہرہ لیے اندر چلی آئی تھی۔

''السلام علیکم بی بی جان! اور ہمایوں لالہ۔'' وہ ہمیں سامنے پاکر بڑے موڈ کے ساتھ چہکی۔ ہمارے آگے چائے رکھتی گل آپا نے تاسف سے سر اٹھا کر اُسے دیکھا تھا۔

''جیتی رہو بچی! کیسی ہو۔'' اماں نے اُسے ساتھ لگا کر روایتی انداز میں اُس کے رخساروں پر پیار کیا۔

''بالکل ٹھیک ہوں، تم سناؤ ہمایوں لالہ جاب وغیرہ کا مسئلہ حل ہوا۔'' بڑی خوش مزاجی سے وہ میری طرف متوجہ ہوئی تھی۔

''بھئی جاب کا مسئلہ تو اتنا مشکل نہیں۔ البتہ ایک اور مسئلہ خاصا پریشان کن ہے۔'' دھیرے سے تلخ لہجے میں کہتے ہوئے میں نے ایک اچٹتی نگاہ باقی گھر والوں پر ڈالی۔ وہ سب آپس میں خوش گپیوں میں اُلجھے ہوئے تھے۔ میں چائے ختم کرکے قدرے فاصلے پر بنے لان کی طرف اُٹھ آیا۔ پلوشہ کو بھی اشارے سے پیچھے آنے کا کہہ آیا۔

''خیریت ہمایوں لالہ! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔'' اُس نے میرے پیچھے آتے ہی قدرے فکرمندی سے پوچھا۔

''ہاں میں واقعی یہاں آکر پریشان ہوگیا ہوں کہ تم نے اب تک اُس شخص کے بارے میں مجھ سے نہیں پوچھا۔ جو تمہیں اس پوری دنیا میں ٹوٹ کر چاہتا ہے۔ اس لاتعلقی کی وجہ کیا ہوگئی پلوشہ۔'' میرے لہجے میں شکوہ ہی نہیں برہمی بھی اُتر آئی تھی۔ وہ انجان نہ تھی۔ میری بات پر پل بھر کو اُس کا خوبصورت چہرہ خفیف سا ہوا۔ پھر جیسے سنبھل کر لاپرواانداز میں بولی۔

''آپ کس کی بات کررہے ہو لالہ! مجھے تو چاہنے والے اَن گنت ہیں۔'' اُس کی خوبصورت سحرانگیز آنکھوں میں شرارت سمٹ آئی تھی۔ میں سُلگ اٹھا۔

''انجان مت بنو پلوشے میں اس وقت شیراز خان کی بات کررہا ہوں۔ سُنا ہے تم نہ صرف اُس سے بے رخی اور بیگانگی برت رہی ہو بلکہ دور بھی بھاگنے لگی ہو۔ آخر کیوں ایسا کررہی ہو۔'' میں نے ناراضگی سے چبھتے ہوئے کئی سوال کر ڈالے۔ اُس کے جگمگاتے چہرے کا رنگ پل بھر کو بدلا تھا۔

''اُفوہ! تو آپ بھی اُس موصوف کی حمایت کرنے آئے ہو۔ جس کے نام سے بھی اب مجھے چڑ ہونے لگی ہے۔ کہہ دیں لالہ اپنے اُس وحشی اور اجڈ یار سے کہ میرا خیال دل سے نکال دے اور آپ نے اس بارے میں جو بھی سُنا ہے وہ بالکل درست ہے۔ مجھے شیراز خان نہ تو پسند ہے اور نہ ہی میں اس سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔'' پلوشہ نے بے باکی اور دیدہ دلیری کی حد کردی تھی۔ شاید وہ یہ سب مجھے واضح طور پر اس لیے بھی سُنا رہی تھی کہ میں شیراز خان کا قریبی دوست اور خیرخواہ تھا اور اُسے بخوبی علم تھا یہ تکلیف دہ باتیں پلوشہ کا کھلم کھلا انکار سب میں اُسے بتادوں گا۔

''خدا کے لیے پلوشہ ایسا مت کہو۔ وہ دیوانہ تم پر جان دیتا ہے۔ پھر پورا خاندان، سارا قبیلہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ تم شیراز خان کا نصیب ہو۔ جانتی ہو تمہارے اس واضح انکار سے کس قدر جگ ہنسائی، کس قدر خاندان بھر میں ذلت و رسوائی ہوگی۔ خون خرابے کا ڈر الگ ہوگا۔'' اُسے سمجھاتے ہوئے اپنے خدشے اور واہمے ظاہر کیے۔ تو وہ بدلحاظی سے چیخ سی پڑی۔

"اپنے دوست کی بے جا وکالت مت کرو ہمایوں لالہ! مجھے کسی کی پرواہ ذرا نہیں۔ میں نہ تو اُسے اپنا نصیب مانتی ہوں اور نہ مجھے خاندان کی رسوائی یا جگ ہنسائی کا خوف ہے۔ ہر انسان کو اپنی مرضی سے جینے کا حق ہے۔ شیراز خان اور میرے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں اس گھٹن زدہ فرسودہ روایات میں جکڑے ماحول میں زندگی نہیں گزار سکتی اور اپنے دوست کو سمجھا دیں کہ وہ میرا پیچھا چھوڑ دے۔" پلوشہ بڑی بے خوفی سے شیراز کی ذات سے بیزاری کا اظہار کرتی، سرکش انداز میں مجھے سب کچھ سُنا کر وہاں سے چل دی۔ اُس کا یہ بے باک انداز، یہ نڈر پن، یہ بے خوف روپ میرے لیے بالکل نیا اور حیران کن تھا۔ گویا شیراز خان کے اندیشے، اُس کے شکوک وشبہات غلط نہ تھے۔ پلوشہ کے بدلتے تیور اُس کے طور طریقے، اُس کے باغیانہ خیالات کسی انجانے طوفان کا پتا دے رہے تھے۔

کیا شیراز خان بے وفائی کا یہ دُکھ، یہ اذیت برداشت کر پائے گا؟

کیا وہ پلوشہ کو عمر بھر کے لیے کھونے کا غم سہہ پائے گا؟ یہ سوالیہ نشان مجھے اگر واپسی تک پریشان کرتا رہا۔ ہمارے ہاں باغی عورت کی سزا کیا تھی، یہ میں اچھی طرح جانتا تھا۔ پلوشہ کی بے خوف آنکھوں میں مجھے واضح طور پر سرکشی اور بغاوت کے عکس لہراتے دکھائی دیے تھے۔ وہ شیراز خان جیسے چاہنے والے سے ایکدم متنفر دکھائی دے رہی تھی۔ صاف پتا لگ رہا تھا کہ اُس کے بہکے قدم ایک ایسی منزل کی طرف چل پڑے ہیں جسے اپنانے کے لیے وہ کسی بھی طوفان سے ٹکرا سکتی تھی۔

میں نے فی الحال اس تلخ صورتِ حال سے گھر والوں کے علاوہ شیراز کو بھی آگاہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اماں اور بابا کے نزدیک تو عورت کا بھٹک جانا گناہِ کبیرہ تھا۔ ابھی تو شیراز کے گھر والے اس حقیقت سے بے خبر تھے۔ گل آپا اُس کی بہن اور پلوشہ کی بھابی تھیں، یقیناً اُس کے بدلتے طور طریقے وہ بخوبی نوٹ کرتی ہوں گی۔ شاہد نے مصلحت کے تحت یا پھر کسی انجانے طوفان کے آنے کے خوف سے اپنے ہونٹ اس معاملے میں سی لیے تھے۔ اپنے خاندانی روایات اور قبیلے کے اصولوں اور رسم و رواج سے وہ اچھی طرح واقف تھیں۔ میں جیسے اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ شیراز تین چار دن کے لیے گاؤں گیا ہوا تھا۔ مجھے اُس کی بے حد فکر تھی۔ پلوشہ کا انکار، پلوشہ کی بے وفائی کا دُکھ وہ کیسے سہہ پائے گا۔ کیا اُسے کھونے کے بعد وہ جی سکے گا؟ یہ سب سوچ سوچ کر میں تھک سا جاتا فی الحال مجھے ایسی کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ جو شیراز خان جیسے جذباتی اور انتہا پسند سوچ کے حامل بندے کو پلوشہ کی بے وفائی کے دکھ سے بچا سکے۔

☆......☆......☆

پھر اِن دنوں اڑتے اڑتے ہم نے سُنا کہ پلوشہ کا غیر خاندان یعنی ایمل خان کے گھر والے رشتہ لے کر آئے تھے۔ اُس کے گھر جیسے طوفان آ گیا تھا۔ گھر والے کسی طور اس رشتے پر راضی نہ تھے۔ مگر سب کے جذبات واحساسات کو روندتی اور نظر انداز کرتی پلوشہ اس رشتے پر دل و جان سے راضی تھی۔ وہ بلا خوف وخطر گل آپا اور ماں کے ذریعے بزرگوں پر دباؤ ڈال رہی تھی کہ وہ ایمل خان کے پرپوزل کو قبول کرلیں۔ جو کہ بالکل ناممکن بات تھی۔ اُن لوگوں بلکہ خاص طور پر شیراز خان کے گھر والوں کی انا اور غیرت پر کاری ضرب لگانے کے مترادف تھا۔ پلوشہ جیسی ضدی لڑکی ایمل خان کی محبت میں اپنے عزت دار ماں باپ اور شیراز خان جیسے باوفا محبوب کی عزت و غیرت اور خاندانی اصولوں اور روایات کی دھجیاں اُڑانے پر تلی ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

اُس روز گل آپا پریشان حال سی میرے پاس چلی آئیں۔ وہ اس چپقلش کی وجہ سے زیادہ اَپ سیٹ اور ڈسٹرب تھیں۔

"کیا حال ہے گل آپا اور آپ کی اُس ضدی اور خود سر نند کے مزاج اب کیسے ہیں۔" اماں جان چائے اور خاطر مدارات کے لیے اٹھیں تو میں نے سوال کیا۔

"میرا حال تو تمہارے سامنے ہے ہمایوں لالہ، وٹے سٹے کے اس رشتے نے میری زندگی بھی داؤ پر لگا دی ہے۔ پلوشہ جیسی سرکش اور ہٹ دھرم لڑکی کو تو کوئی احساس نہیں ہے۔ اُس کے تو مزاج نہیں ملتے۔ شیراز ابھی تک اس حقیقت سے بے خبر ہے، درہ آدم خیل سے ابھی تک نہیں لوٹا۔ شاید فیکٹری میں کام کے لوڈ کی وجہ سے مصروف ہے۔ اُسے ایمل خان کے رشتے کا علم ہو گیا تو طوفان اٹھا

دے گا۔ تم بتاؤ! اُسے کیسے سنبھال پائیں گے؟'' انہیں خاصی تشویش ہو رہی تھی جو بے جا نہ تھی۔

''واقعی! اُس جیسے جذباتی اور جوشیلے انسان کو سنبھالنا بہت مشکل مرحلہ ہے بہر حال پلوشہ کے ماں باپ نے کیا سوچا ہے۔ کیا وہ بیٹی کی مرضی اور رضا پر سر جھکا دیں گے۔'' میں نے سوالیہ انداز میں انہیں ٹٹولا۔

''نہیں لالہ وہ لوگ ایسا بالکل نہیں ہونے دیں گے۔ تم تو اس خاندان کا حصہ ہو، جانتے ہو نا روایات کا بھرم توڑنے اور قبیلے و ماں باپ کی عزت اور غیرت کا جنازہ نکالنے والی لڑکیوں کا کیا انجام ہوتا ہے۔ وہ اس خاندان کی منگ اور غیرت ہے لالہ! ایسے فیصلوں پر خون خرابے ہو جاتے ہیں۔ پھر یہاں تو لین دین کا معاملہ ہے۔ پلوشہ کے اماں اور بابا بیٹی کی خوشی کے لیے مان بھی جائیں تو کیا میرے گھر والے اور خاص طور پر شیراز خان یہ ذلت، محبت کی یہ توہین برداشت کرے گا۔ نہیں بالکل ناممکن ہے یہ سب۔'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

''اس لیے میں بچیوں کی پڑھائی کے خلاف ہوں۔ زیادہ پڑھ لکھ جائیں تو آنکھوں کی شرم و حیا مر جاتی ہے۔'' چائے کی ٹرے اُٹھا کر اندر آتی اماں نے بڑی نخوت سے مداخلت کی۔

''آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں ماں جان۔ اللہ پلوشہ کو عقل دے اور خاندان کا شملہ اونچا رکھنے کی توفیق دے۔'' اُن کی تائید کرتی گل آپا نے جیسے بے چارگی سے دعا کی تھی۔

''ہاں بچے، پاک رب اُسے ہدایت دے۔ غلط راہ پر چل کر خود کو تباہ کر لے گی۔ اسے پتا نہیں ہے کہ شیراز خان کتنا غصے کا تیز اور بد دماغ لڑکا ہے۔ پھر مرد اپنی ذلت، اپنی توہین کب برداشت کرتا ہے۔'' اماں کے لہجے میں بھی اندیشے پنہاں تھے۔

اس احمق لڑکی کی غلط سوچ اور بھٹکے قدموں نے پورے خاندان میں کتنی بے سکونی پھیلا دی تھی۔ ہونہہ خود غرض لڑکی۔ مجھے اُس پر رہ رہ کر طیش آ رہا تھا۔ جس کی بے جا ضد اور ہٹ دھرمی نے سب کو پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

دو روز بعد شیراز خان درہ آدم خیل سے لوٹا تو میں اُس سے ملنے اُس کے ہاں چلا گیا۔ اُس کی دیوانوں جیسی مضطرب حالت دیکھ کر مجھے گہرا شاک لگا۔ اُسے شاید سب پتا چل گیا تھا۔ اُس کے خوبصورت وجیہہ چہرے پر عجیب سی ویرانی اور گہری براؤن آنکھوں میں جیسے وحشت سی ناچ رہی تھی۔ تھکن زدہ وجود بہت ٹوٹا ہوا اور شکست خوردہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر کی بے سروپا باتوں میں لگانے کی کوشش کی۔ گپ شپ کا موڈ بنایا مگر وہ آج جیسے احساسات و جذبات سے عاری ہو چکا تھا۔ پھوپو کے اشارے پر میں اُسے لے کر گھومنے پھرنے کے ارادے سے گھر سے باہر نکال لایا۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد وہ خود ہی اس موضوع پر آ گیا۔

''تم نے سنا ہمایوں۔ وہ ظالم لڑکی جو میرے رگ و پے میں روح کی طرح بستی تھی، اُس نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔'' شیراز کرب زدہ لہجے میں جیسے پھٹ پڑا تھا۔

''ہاں دوست مجھے واقعی پلوشہ کی اس حرکت، اس خود سری پر افسوس ہوا ہے۔ اُسے خاندانی عزت اور ہماری روایات کی پاسداری کرنی چاہیے۔'' میں نے تاسف بھرے انداز میں جواباً کہا۔

''خاندانی عزت اور روایتوں کی بات چھوڑو ہمایوں خان! اُس نے میری محبت کی، میری مردانگی کی، میرے پُرخلوص جذبوں کی تذلیل اور بے عزتی کی ہے۔ ہمارے قبیلے میں آج تک کسی مرد کو یوں بے رحمی سے دھتکارنے کی کسی عورت نے جرأت نہیں کی۔ پھر پلوشہ نے ایسا کیوں کیا۔ کیوں ایمل خان کو مجھ پر، شیراز خان پر فوقیت دے رہی ہے۔ جس نے ہر پل، ہر لمحہ صرف اُس کی رفاقت کے خواب دیکھے، اُسے ہی چاہنے کا جرم کیا۔'' شکوہ بھرے لہجے میں اپنے اندر کا غبار نکالتا شیراز سخت متوحش لگ رہا تھا۔

''فار گاڈ سیک یار! خود کو سنبھالو۔ پلوشہ ناسمجھ ہے۔ تم ایک بار اُسے مل کر اپنی چاہتوں کا یقین دلاؤ۔ اُسے یہ احساس دلاؤ شیری کہ تم نے روزِ اول سے صرف اُسے ہی پانے کی تمنا کی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ کسی بدگمانی کا شکار ہو۔ اُسے بتاؤ یار کہ اُس کی یہ ناعاقبت اندیشی، یہ سرکشی، یہ یکطرفہ فیصلہ تم دونوں کو زندہ درگور کر دے گا۔'' میں نے جوشیلے انداز میں گہری سوچ میں گم شیراز کو مشورہ دیتے

ہوئے راہ دکھائی۔

"وہ اگر نہ مانی تو......" اُس نے سلگتے انداز میں سوال اٹھایا۔

"تم ایک کوشش کرو، پلوشہ عورت ذات ہے۔ تمہاری محبت کے دو بول اُسے سرتاپا بدل دیں گے۔" میرے لہجے میں ہلکا پھلکا مزاح سمٹ آیا تھا۔

"ٹھیک ہے یار میں آخری بار خود بھی ہر صورت اُسے ملنا اور جی بھر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم اُسے ابھی فون کرو، ملنے کی بات میں طے کروں گا۔" اُس کے برفیلے لہجے میں عجیب سی بے تابی تھی۔

شیری یار صرف ملنے کی بات نہیں ہوگی اُسے راضی اور قائل کرنا بھی تمہاری کوشش ہونی چاہیے۔ گاڑی گھر کی طرف موڑتے ہوئے میں نے چھیڑا۔ وہ لبوں کو بھینچے سرد نگاہوں سے سامنے اسکرین کو دیکھتا رہا۔

☆......☆......☆

میرے آفس کے کولیگ کی اگلے روز شادی تھی۔ مجھے دفتر سے دو دن کی چھٹی لے کر سوات جانا تھا اور اس دن میرے سامنے فون پر شیراز نے پلوشہ سے منت سماجت کر کے ملاقات کا وعدہ لیا تھا۔ مجھے یقین تھا کل ہونے والی یہ ملاقات اِن دونوں کے درمیان ساری غلط فہمیاں اور بدگمانیاں دور کر کے انہیں پھر سے محبت کی مضبوط ڈور میں باندھ دے گی۔ میں مطمئن سا تھا اور وہ عجیب بے کل سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس ملن کے تصور نے اُسے جانے کیوں ایک یاسیت، ایک افسردگی میں گھیرا ہوا تھا۔ گوکہ میں نے اُسے جاتے جاتے کافی تسلیاں دی تھیں اور آنے والی صبح کے خوش نما خواب بھی اُس کی آنکھوں میں بسائے تھے۔ وہ لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ سجائے میری بکواس سنتا رہا۔

دوسرے دن میں سویرے ہی سوات کے لیے نکل گیا۔ پشاور سے چار پانچ گھنٹوں کا سفر تھا۔ تب ڈائیوو وغیرہ یا اے سی کوچ کی سہولت نہ تھی۔ میرا ارادہ ایک روز قیام کے بعد اگلے روز واپسی کا تھا۔

شادی کے ہنگامے میں میرے ذہن سے شیراز اور پلوشہ والی ملاقات بالکل نکل گئی۔ سرِ شام شادی کا فنکشن ختم ہوا تو میں کچھ دیر کے لیے مینگورہ بازار دیکھنے نکل گیا۔ میرا قیام سیدو شریف میں تھا۔

رات گئے لوٹا تو گھر سے پریشان حال اماں نے یہ اطلاع دے کر میرے حواسوں پر بجلی گرادی کہ پلوشہ صبح سے غائب ہے۔ وہ کالج جانے کے بعد واپس اب تک نہیں آئی۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے اماں! شیراز کہاں ہے؟" میں نے بوکھلا کر سوال داغا۔

"وہ بے چارہ تو رات کو دو تین دن کے لیے کسی اہم کام کے سلسلے میں پنڈی چلا گیا تھا۔" اماں نے مجھے معلومات فراہم کیں۔

"شیراز دو دن کے لیے پنڈی چلا گیا......میرا دماغ جیسے اُلجھا۔

"ہاں بچے! اُسے گھر والوں نے یہ منحوس خبر فون پر سنائی ہے۔ پورا خاندان پریشان ہے۔ ہمایون تم صبح گھر کے لیے نکل پڑو تو بہتر ہوگا۔" میری ماں کی پریشانی عروج پر تھی۔

"آپ حوصلہ رکھیں اماں! میں سویرے ہی روانہ ہوجاؤں گا۔ ہوسکتا ہے پلوشہ کسی دوست کے گھر ہو انشاء اللہ بخیریت مل جائے گی۔" میں نے بڑے ضبط سے گزرتے ہوئے اُن سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی۔ یہ اور بات کہ ساری رات میں ڈسٹرب اور پریشان رہا۔

☆......☆......☆

اگلے دن میں منہ اندھیرے پشاور روانہ ہوگیا۔ گھر لوٹا تو ایک قیامت سی برپا تھی۔ جوان جہان لڑکی، وہ بھی عزت دار گھرانے کا خون...... پورا ایک دن اور رات سے غائب تھی۔ تاحال کوئی اتا پتا نہ چل سکا تھا۔ گھر والوں کا دھیان اور شک پلوشہ کی گہری دوست شاہدہ اور اُس کے بھائی ایمل خان کی طرف بھی گیا تھا اور اُن سے سخت لہجے میں پوچھ گچھ بھی کی مگر شومئی قسمت کہ ایمل خان گھر پر تھا اور بقول شاہدہ کے پلوشہ تو کالج میں ایک کلاس لینے کے بعد چھٹی لے کر گھر واپس چلی گئی تھی۔ سوال یہ تھا کہ وہ پھر گھر کیوں نہیں لوٹی تھی حالانکہ شاہدہ کے والد کو اٹیک ہوا تھا اور ایمل خان رات بھر باپ کے ساتھ ہاسٹل میں رہا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ پلوشہ کی گمشدگی کی خبر اُس پر برق بن کر گری تھی۔

ہمارے سب گھر والوں کے برا بھلا اور شکوک و شبہات کا اظہار کرنے کے باوجود اُس نے خدا کو گواہ بنا کر

اس واقعے سے نہ صرف لاعلمی ظاہر کی بلکہ سب کے ساتھ اُس کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا تھا۔ مجھے انجانے میں رہ رہ کر شیراز کی بے حسی پر اُس کی اس اندوہناک واقعے سے لاتعلقی پر طیش آتا۔ جس سے ابھی تک میری بات نہیں ہوسکی تھی۔ میرے پاس اَن گنت سوالوں کے جواب تھے جو میں صرف اُس سے پوچھنا چاہتا تھا۔

پلوشہ کے والدین نے ابھی تک پولیس میں اس گمشدگی کی رپورٹ درج نہیں کروائی تھی۔ یہ ہماری غیرت، انا اور ذلت کا مسئلہ تھا۔ ہم علاقہ غیر کے لوگ تھے، جہاں کے اپنے ہی قوانین اور اپنے ہی قائم کردہ اصول تھے۔ اور کسی بھی قاتل یا مجرم کو سزا و معاف کرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں تھا۔ ہمارے علاقے میں اپنے ہی قانون اور اصول چلتے تھے۔ اور ہم سب اِن کے تابع تھے۔ کسی کو سر اٹھانے کی مجال نہ تھی۔

پھر دوپہر کو شیراز خان بھی پنڈی سے آ گیا۔ پلوشہ کے گھر میں جیسے صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ چھپتے چھپاتے بھی خاندان بھر میں آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی تھی۔ میں شیراز کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اُس کے وجیہہ چہرے پر گہری اُداسی اور آنکھوں میں جیسے وحشت پھیلی ہوئی تھی۔ منگیتر ہونے کے ناتے سب اُس سے افسوس کررہے تھے۔ وہ چپ چاپ اور کھویا کھویا سا تھا۔

”سب ٹھیک ہوجائے گا گل آپا! آپ سب یونہی واویلا مچارہے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ ایمل خان کے ساتھ چلی گئی ہو۔ آخر وہ اُس کا چاہنے والا تھا۔ ایک دوسرے کو پسند بھی تو کرتے تھے۔“ اُس کا بے نیاز سا ٹھنڈا چبھتا ہوا لہجہ جانے کیوں مجھے چونکا گیا تھا۔

”غلط بات مت کرو شیراز! بے شک ایمل اُس کی پسند تھا مگر وہ اُس کے ساتھ نہیں گئی۔ اتنا ہم سب کو یقین تھا۔“ میں نے غصے سے کھولتے ہوئے اُسے بری طرح جھڑک دیا۔

”ہمایوں ٹھیک کہہ رہا ہے شیراز۔ وہ ایمل کے ساتھ نہیں گئی اور نہ اپنی کسی دوست کے گھر گئی ہے۔ وہ اتنی غیر ذمہ دار بالکل نہیں تھی۔“ گل آپا سخت متوحش تھیں۔ جانے کیوں اُن کی کھوجتی نگاہیں بار بار شیراز کے سپاٹ اور بے حس چہرے کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ یہی میری کیفیت تھی۔

”میں پتا کرتا ہوں شاید وہ چھوٹی پھوپی کے ہاں درہ آدم خیل چلی گئی ہو۔“ وہ بڑی لاپروائی سے قیاس آرائی کررہا تھا۔ مجھے طیش آنے لگا۔

”تمہیں پتا کروانے کی ضرورت نہیں، گھر والے کل یہ کام سرانجام دے چکے ہیں۔ تم اپنی رائے دو کہ وہ آخر کالج سے کہاں اچانک چلی گئی ہے۔“ میں جیسے سلگ اٹھا آخر وہ کیوں نہیں مان رہا تھا کہ پلوشہ کا اُس کا ساتھ ملاقات کا پروگرام تھا۔ بہرحال مجھے ہرصورت یہ کھوج لگانا تھی۔ یہ کسی لڑکی کی زندگی اور ایک پورے خاندان کی عزت و نیک نامی کا سوال تھا اور شومئی قسمت کہ شیراز خان سے پوچھ گچھ کرنے سے پہلے پلوشہ کی گمشدگی کا مسئلہ حل ہوگیا۔ پلوشہ کا سراغ مل گیا تھا۔ مگر وہ زندہ نہیں مردہ حالت میں ہمیں ملی تھی۔ درہ آدم خیل کی پہاڑیوں پر اُس کی مردہ لاش پائی گئی تھی۔

پلوشہ کی اچانک اور بے وقت موت ہم سب کے لیے کسی تکلیف دہ سانحے سے کم نہ تھی۔ کسی کے گمان میں بھی نہ تھا کہ یوں مردہ حالت میں گھر سے دور سنگلاخ پہاڑوں پر وہ ملے گی۔

وہ وہاں کیسے گئی؟ کس نے اُسے مار کر وہاں ڈالا؟ کون اتنا اُس کا سفاک دشمن تھا؟ ایمل خان یا پھر کوئی اور کوشش کے باوجود کوئی کھوج نہیں لگا سکا تھا۔ اُس کا سراغ بھی پولیس نے لگایا تھا۔ وہ پولیس جس سے ہم کتراتے تھے۔ نامعلوم لاش کے طور پر تھانے لائی گئی۔ اُس کے بیگ، کتابوں اور کالج کارڈ سے یہ معلومات حاصل کر کے گھر پر اطلاع دی گئی۔ پولیس کا منہ بند کرانا ہم علاقہ غیر کے لوگوں کے لیے اتنا مشکل نہ تھا۔ راتوں رات اُس کی میت اپنے آبائی گاؤں لے گئے جہاں ہمارے اپنے قانون اور رواج چلتے تھے۔ جہاں کسی قانونی کارروائی کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ خاندان کے کچھ افراد کا شک ایمل خان پر تھا۔ مگر وہ اور اُس کے گھر والے جس طرح پلوشہ کی موت پر غمزدہ اور اُداس تھے۔ جس طرح سے ایمل دیوانوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔ اُس کی حالت کے پیش نظر اُسے قاتل یا مجرم ٹھہرانا ہی ناممکن لگتا تھا۔

مضطرب اور بے چین تو شیراز خان بھی کافی تھا۔ پلوشہ کے خوبصورت وجود کو لاش کی صورت میں سامنے پا کر اُس کی آنکھیں لہورنگ ہونے لگی تھیں۔ ساکت د

جامد چہرے پر جیسے پتھریلا پن سمٹ آیا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا اُس نے ایمل خان یا گھر کی عورتوں کی طرح کسی جذباتی پن کا اظہار نہیں کیا تھا۔ بس لحد میں اُترانے تک ایک ٹک اُسے نگاہوں میں اُتار تار ہا تھا۔ بظاہر پلوشہ کی بے وفائی اور شیراز خان کی جنونی محبت کی کہانی ختم ہو چکی تھی۔ دو دن سوگ منانے کے بعد سب نے اپنی اپنی دنیا اور مصروفیات میں گم ہو جانا تھا، مگر دوست اور راز دان ساتھی ہونے کے ناتے ایک چبھتا ہوا سوال مجھے شیراز خان سے ہر صورت کرنا تھا کہ پلوشہ سے ملاقات کا عہد کرنے کے بعد اُسے اچانک پنڈی کیوں جانا پڑ گیا تھا؟

''سنو شیراز خان تم مجھے وہ جگہ، وہ پہاڑ دکھا سکتے ہو۔ جہاں پلوشہ گر کر مری ہے۔'' اُس کے سوئم والے دن پشاور واپسی سے کچھ دیر پہلے میں نے گم صم سوچوں میں کھوئے شیراز سے اچانک وہ انہونا سوال کیا جس کی غالباً اُسے توقع یا اُمید نہ تھی۔ سب گھر والے پشاور لوٹ چکے تھے بس میں نے ضد کی تھی کہ میری واپسی شیراز کے ساتھ، اُس کے سنگ ہوگی۔

''ہاں چلو دکھاتا ہوں۔ نہیں میرا مطلب ہے مجھے کیا معلوم......'' وہ جیسے بری طرح گڑبڑا گیا تھا۔ اپنی ہی بات کی خود نفی کرتے ہوئے اُس کا چہرہ زرد سا پڑ گیا تھا۔

''تمہیں ہی تو سب کچھ معلوم ہے شیراز۔ مجھ سے کچھ چھپانے یا مجھے دھوکہ دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تم بھول رہے ہو کہ میں تمہارا دوست ہی نہیں تمہارا راز دان اور تمہاری رگ رگ سے واقف بھی ہوں۔ تمہارا اضطراب، تمہاری بے چینی، تمہاری آنکھوں سے جھلکتی وحشت سب مجھے اَن کہی کہانی سنا رہے ہیں۔ چلو بیٹھو گاڑی میں اور بتاؤ کہ تم نے پلوشہ پر ایسا ظلم کیوں کیا۔'' ساکت و جامد کھڑے شیراز کو زبردستی فرنٹ سیٹ پر دھکیل کر میں نے خود ہی گاڑی چلانے کا فیصلہ کیا کہ اُس کی حالت خاصی دگرگوں تھی۔

میں نے جس طرح پورے یقین اور وثوق سے اُس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔ اُس کے لیے اب اپنے جرم کا اعتراف کرنا مشکل نہ تھا۔

''تم جانتے ہو ہمایوں وہ میری رگِ جان سے بھی زیادہ قریب تھی۔ میری خواہش میرے خواب صرف اُسی سے وابستہ تھے۔ اس کے باوجود اُس نے میری چاہت، میری لگن کی قدر نہیں کی۔'' وہ میرے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا دھیرے دھیرے خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ میری گاڑی آہستہ آہستہ چڑھائی کی طرف جا رہی تھی۔ میری توجہ اسکرین پر مگر تمام تر دھیان اور سماعتیں اُس کی باتوں کی طرف تھیں۔

''اس لیے تم نے اُس کی جان لے ڈالی۔'' میں نے غضب ناک انداز میں اُس کی بات کاٹی۔

''یہ غلط ہے ہمایوں! میں نے پلوشہ کو نہیں مارا۔'' اُس نے کمزور سا احتجاج کرنا چاہا۔

''بکواس مت کرو۔ تم کیا سمجھتے ہو تمہارے پنڈی جانے والے ڈھونگ اور ڈرامے پر میں یقین کر لوں گا۔ نو نیور۔ تم کم از کم مجھے احمق نہیں بنا سکتے۔ مجھے صاف بتاؤ اس روز اُسے یہاں لے کر کیوں آئے تھے۔'' ہماری گاڑی اس زگ زیگ اونچائی والی سڑک پر ایک طرف بلند و بالا خشک پہاڑ اور دوسری جانب گہری کھائیوں کے درمیان ایک سائیڈ پر شیراز کے اشارے پر رُک چکی تھی۔ شیراز کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ وہ اپنے آپ میں نہیں لگ رہا تھا۔ پتھر کے بت کی طرح ساکت و جامد بیٹھے شیراز کو میں نے زبردستی باہر نکالا تھا۔ وہ ٹرانس زدہ سا دھیرے دھیرے چلتا سڑک کے دوسری جانب سیمنٹ سے بنی ریلنگ کے پاس جا کر ٹھہر گیا۔ میں بھی اُس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ نیچے ناہموار سنگلاخ پہاڑیاں اور کھائیاں تھیں۔ اس وقت کوہاٹ جانے والی اِکا دُکا گاڑیاں سرعت سے گزر رہی تھیں (اُس وقت کوہاٹ ٹنل نہیں بنی تھی) مگر شیراز کو آس پاس کا ہوش نہیں تھا۔ وہ ریلنگ پر دونوں ہاتھ رکھے خلاؤں میں دیوانوں کی طرح گھورتے ہوئے اعترافِ جرم کر رہا تھا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو ہمایوں! پلوشہ سے ملاقات کا وعدہ کر کے میں بھلا پنڈی کیسے جا سکتا تھا۔ مجھے اُس سے ملنا تھا۔ تجدیدِ عہد لینا تھا یا پھر یوں راستہ بدلنے کی وجہ جاننی تھی۔ سب کچھ تمہارے سامنے طے ہوا تھا۔ اگلے روز تم سوات چلے گئے اور میں پلان کے مطابق گھر والوں کو پنڈی ضروری کام کا بتا کر اسی رات گاڑی لے کر ہوٹل میں شب گزارنے چلا گیا۔ یقین جانو ہومی میں نے پوری شب اُسے سوچتے اُس سے ملنے کا خواب دیکھتے گزاری۔ انجانے خدشے مجھے دہلا رہے

تھے۔ پلوشہ کے انکار کا خوف مجھے بے سکون کیے دے رہا تھا۔ صبح میں نے اپنی گاڑی معمولی نقص بتا کر ورکشاپ میں دی اور پھر رینٹ پر گاڑی لے کر نو بجے اُسے کالج سے پک کیا۔ وہ اِن گزرے سالوں میں پہلی بار میرے ساتھ کہیں اکیلی جا رہی تھی۔

''مجھے تمہارے ساتھ اب کہاں جانا ہے۔'' پلوشہ نے بڑے بے زار کن انداز میں اپنا آپ چادر میں چھپاتے ہوئے پوچھا۔

اُس کا موڈ آف تھا۔ شاید اُسے میرے ساتھ آنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ''بس چند گھنٹوں کی رفاقت آخری بار مجھے دے دو پلوشہ۔ مجھے تمہارے ساتھ درہ آدم خیل کے ایک ہوٹل میں جانا ہے۔ میں تم سے اپنے دل کی تمام باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ شاید پھر کبھی زندگی میں یہ پل ملیں یا نہ ملیں۔''

''ٹھیک ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' وہ دھیمے لہجے میں کہتی اپنا منہ دوسری طرف کر کے بیٹھ گئی۔

آخر کار اپنی منزل پر پہنچ کر ہم نے چائے اور کولڈ ڈرنک پی اور قدرے ریلیکس ہو کر میں اصل موضوع پر آ گیا۔

''پلوشے! تم جانتی ہو۔ تم میری چاہت اور دیوانگی ہی نہیں میری زندگی بھی ہو۔ بتاؤ کیوں تم ایمل خان میں دلچسپی لینے لگیں۔ اتنی کہ میرا اور اپنا رشتہ بھی بھول گئیں۔ یہ بھی بھول گئیں کہ تمہارے انکار سے دو خاندان کس طرح ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے۔

پلیز! مت کرو میرے ساتھ ایسا مجھے اپنا ساتھ بخش کر جینے کی نوید دے دو۔ کرلو میرے ساتھ شادی۔ پلیز بتاؤ، کیوں کیا تم نے انکار، وجہ تو بتا دو.....'' میری بات سُن کر وہ سخت اشتعال میں آ گئی اور پھٹ پڑی۔

''ہاں مجھے تم سے شادی نہیں کرنی ہے۔ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ آج میں تمہیں صاف صاف بتا دینا چاہتی ہوں شیراز خان کہ ایمل خان ہی میرا خواب، میری خوشی اور محبت ہے۔ اپنے دل سے مجھے پانے کی ساری خوش فہمیاں نکال دو شیراز خان۔ وہ تعلق ایک وقتی جذبہ تھا۔ میں تم جیسے وحشی اور اجڈ قسم کے انسان سے شادی کر کے اپنی زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتی۔ بہتر ہوگا آج کے بعد تم پھر کبھی میرے راستے میں مت آنا۔'' اُس نے رعونت بھرے دوٹوک لہجے میں جی بھر کے میرے سچے جذبوں کی، میری بے لوث چاہتوں کی خوب تذلیل کی۔ اُس کے حسین چہرے پر پھیلی نفرت اور لہجے میں پنہاں حقارت نے میرے پورے جسم میں آگ سلگا دی تھی۔

''پلوشہ خان!'' میں نے غراتے ہوئے اُس کے دونوں بازو اپنی آہنی گرفت میں جکڑ لیے۔

''اپنی زبان کو لگام دو۔ ایمل خان کی چار دن کی محبت نے تم سے شرم و حیا چھین لی ہے۔ تم اس طرح میری بے لوث چاہت اور خاندان کی عزت و شرافت کو داؤ پر لگا کر ایمل کی نہیں بن سکتیں۔ تمہارا اور میرا رشتہ اتنا کمزور نہیں ہے۔ بھول جاؤ کہ کوئی تمہیں من مانی کی جرأت کرنے دے گا۔ تم مجھے دھتکار کر بے وفائی نہیں کر سکتی ہو پلوشہ۔ تم صرف میری ہو۔ صرف میری سمجھیں۔'' میری آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔

''ہونہہ مجھے تم سے محبت ہی کب تھی جو بے وفائی کروں گی۔ تم اس قابل کہاں ہو کہ میں تم سے ایسا کوئی تعلق جوڑوں گی۔'' وہ نفرت سے پھنکاری تو میرے لیے جیسے اُسے مزید برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ میری نہیں بننا چاہتی تھی پھر میں اُسے کسی اور کے لیے کیسے زندہ رکھتا۔ وہ مجھے ٹھکرا رہی تھی، بے وفائی کر رہی تھی۔ میری چاہتوں کا مذاق اُڑا رہی تھی، پھر میں کیسے اُسے آزاد چھوڑ دیتا ہمایوں۔ میرا پورا وجود نفرت اور غم و غصے کی آگ میں جل اٹھا۔ میں نے کسی لمحہ کی مزید تاخیر کیے بنا اُسے بے رحمی سے پیچھے دھکا دے کر گرا دیا۔ مجھ میں اُسے پا کر کھونے کا حوصلہ نہیں تھا ہمایوں، اس لیے میں نے اُسے مار دیا۔''

اپنے جرم کا اعتراف کرتا وہ اونچا لمبا شیراز خان پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔ میں خاموش کھڑا لب کاٹتا رہا۔ وہ قاتل تھا، مجرم تھا۔ اس لیے ہمدردی کے دو بول نہ کہہ سکا۔ مگر میں جانتا تھا اس تلخ حقیقت کا پردہ فاش ہونے کے باوجود شیراز کو کوئی اُس کے سنگین جرم کی سزا نہیں دے گا۔ کیونکہ بغاوت کی صورت میں خاندان والے ویسے بھی پلوشہ کو معاف نہ کرتے۔

قارئین! یہ کہانی دو دھائی پرانی ہے اب پختون طبقہ پڑھ لکھ کر خاصا باشعور ہو چکا ہے۔ بس کہیں کہیں کسی قبیلے میں ایسی روایات اب بھی زندہ ہیں۔

☆☆.....☆☆

چھٹی سچ بیانی

میرے برادر کی دلہن؟



عظیم الدین انصاری

کراچی سے اُس بہن کی کتھا، جسے اپنے بھائی کے لیے دلہن کی تلاش ہے





''امی! میرے کپڑے کہاں رکھ دیے ابھی کل ہی تو لایا تھا۔'' اعظم زور سے چلایا۔

''بھئی مجھے نہیں پتا کہاں ہیں۔ اپنی چیزیں خود ہی سنبھال کے رکھا کرو۔'' امی نے بھی غصے میں کہا۔

اعظم نے کہا ''مجھے پتا ہے کرن نے ہی رکھے ہوں گے چھپا کے کہیں۔ یہ تو چاہتی ہی یہی ہے نا کہ میں نئے کپڑے نہیں پہنوں۔''

ارے کرن او کرن ...... کہاں مرگئی۔ بھائی کو کپڑے ڈھونڈ کر دے۔'' امی نے آواز لگائی تو کرن دوڑی چلی آئی اور آتے ہی غصے میں لال پیلی ہوگئی۔

''ارے یہ کیا؟ بھائی! تم نے تو پورے کمرے کا حشر خراب کردیا۔ یہ بیڈشیٹ دیکھو، ابھی بچھائی تھی اور الماری کے سارے کپڑے باہر پھینک دیے ہیں۔'' کرن غصے سے بولی۔

اعظم کہاں چپ رہنے والا تھا۔ وہ بھی فوراً بولا۔'' محترمہ اتنا ہی شوق ہے صفائیاں کرنے اور سگھڑ بننے کا تو میرے نئے کپڑے کہاں رکھ دیے۔'' ان دونوں کی نوک جھونک دیکھ کر امی نے دونوں کو ڈانٹا۔ کرن خاموشی اور غصے کے ساتھ اپنے پیر پٹختی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی اور اعظم ہاتھ ملتا ہوا خاموشی سے ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

میں کرن ہوں، اعظم کی چھوٹی بہن ہماری فیملی میں بس میں ہوں، اعظم ہے اور امی ابو ہیں۔ میں نوٹ کر رہی تھی کافی دنوں سے اعظم کو وہ کچھ زیادہ ہی خوش رہنے لگا ہے اور تیار بھی خوب رہنے لگا ہے۔ ہر کسی سے ہنسی مذاق کرتا ہے اور امی ابو کا بھی بہت خیال رکھنے لگا ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ پہلے مذاق کے موڈ میں نہیں رہتا تھا اور کسی کا خیال نہیں رکھتا تھا مگر آج کل یہ سب بہت زیادہ ہوگیا ہے۔

اعظم میرا بھائی ایک چھوٹا سا کاروں کا شوروم چلاتا تھا، جسے ابو نے بڑی محنت سے بنایا تھا۔ اعظم تو صبح جلد ہی گھر سے نکل جاتا تھا شوروم جانے کے لیے مگر ابو اپنی بیماری کی اور عمر کی وجہ سے ذرا دیر سے جاتے تھے اور جلدی واپس آجاتے تھے۔ ہمارا تعلق کراچی کی ایک متوسط فیملی سے تھا اور ہم لوگ کراچی کی ایک قدیم بستی میں رہتے تھے جو اولڈ ٹاؤن ایریا کے نام سے مشہور ہے۔

یہ شہر کا مصروف ترین علاقہ ہے جہاں کاروباری سرگرمیاں عروج پر ہوتی ہیں اور کراچی کی بڑی مارکیٹ بھی اسی علاقے میں واقع ہیں۔ یہ اتفاق تھا کہ والد صاحب جب قیامِ پاکستان کے بعد اپنا سب کچھ چھوڑ کر یہاں آئے تو انہیں اسی علاقے میں روزگار کے ساتھ ہی رہائش بھی مل گئی اور پھر وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

آج ہفتہ وار تعطیل تھی اسی لیے اعظم بھی گھر پر ہی تھا۔

وہ اکثر اتوار کو دیر سے سو کر اٹھتا تھا مگر اس دن خلاف توقع موصوف جلدی اُٹھ کر واش روم چلے گئے اور نہا دھو کر فریش ہو کر جب باہر آئے تو مجھے ایک خوشبو کا احساس ہوا۔ اور پھر جب میں نے واش روم میں جا کر دیکھا تو جناب نے ہیئر ریموونگ کریم یوز کی تھی۔

''اُف میرے خدا۔'' میں جلدی سے واش روم سے باہر آئی اور امی کو بتایا۔ بس پھر کیا تھا اس امی نے تو ہنگامہ کھڑا کر دیا اور اعظم کو آوازیں دینے لگیں۔

''کمینے...... تیرے کو شرم نہیں آتی، کیا کیا حرکتیں کر رہا ہے۔''

اعظم امی کی آواز سن کر اپنے کمرے سے آیا اور مسکراتا ہوا بڑے پر جوش انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے جیسے کسی اشتہار میں ایکٹنگ کر رہا ہو۔ ''کرن کیسا لگ رہا ہوں۔''

حرکتیں۔ وہ ہمیشہ ایسی ہی بچوں والی حرکتیں کرتا تھا۔

☆......☆......☆

شام کے وقت اعظم باہر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد آیا تو میری فیورٹ آئس کریم لے کر آیا۔ وہ مجھے اسی طرح جلا جلا کر آئس کریم خود کھاتا تھا۔ میں بھی عارضی ناراض ہو کر اپنے کمرے میں چلی گئی، پھر تھوڑی دیر بعد میرے کمرے میں آیا۔ میں بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ بھی آ کر بیڈ پر بیٹھ گیا اور اپنی جیب سے ایک اور آئس کریم نکال کر میری طرف بڑھائی۔ میں نے بھی نخرے دکھائے اور منع کر دیا۔

''جاؤ خود کھاؤ، ٹھونس لو خود ہی مجھے نہیں کھانی۔'' پھر ایک دم اعظم سیریس ہو گیا اور کہا۔

''بیٹا تم ہی ہو میری بہن۔ اب تمہیں بھی تنگ نہ کروں



امی نے اپنی چپل اُٹھا کر اُسے دے ماری۔ ''کم بخت کیا لگایا ہے چہرے پر تُو نے؟''

اعظم نے فوراً اسٹائل بناتے ہوئے کہا۔ ''کریم لگائی ہے کرن کی۔ جبھی تو میں کہوں یہ دن بدن خوبصورت کیسے ہو رہی ہے۔ چھپا کے رکھتی ہے اپنی کریم وہ بھی واش روم میں۔''

امی زور سے چلائیں۔ ''بے غیرت یہ خوبصورت کرنے والی کریم نہیں ہے، ہیئر ریموونگ ہے۔ اتنا پڑھا لکھا ہے، گریجویشن کر لی مگر رہا جاہل کا جاہل۔''

میں سائیڈ میں ہو کر پردے کے پیچھے کھڑی ہنستی رہی۔ میں اس دن اتنا ہنسی کہ پیٹ میں بل پڑ گئے اور اعظم شرمندہ ہو کر فوراً واش بیسن کی طرف بھاگا۔ یہ تھیں اُس کی

تو کسے کروں۔ مذاق کر رہا تھا۔ زیادہ نخرے مت کرو، لو اب کھا لو ورنہ......''

''اچھا! کیا ورنہ......'' میں نے بیڈ سے ذرا آگے کھسکتے ہوئے کہا۔

''ورنہ یہ کہ......'' اعظم ایکدم رُک گیا، آگے کچھ نہ بولا۔

''مجھے ایسا مذاق پسند نہیں۔'' میں نے بھی منہ بناتے ہوئے کہا۔ دل تو کر رہا تھا فوراً آئس کریم لے لوں مگر نہیں لی۔ کیونکہ بعد میں میرا مذاق اُڑاتا۔ کچھ دیر بعد اعظم بولا۔

''کرن تم بہت اچھی ہو...... یار تھوڑا سا مذاق کر لیا بس...... کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں خود کھا لوں اور تمہارے لیے نہیں لاؤں؟ نہیں بیٹا تم تو میری زندگی ہو۔ جیسے امی ابو ہیں۔''

میں نے دیکھا کہ یہ کہتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
میں فوراً اُٹھی اور بھائی سے لپٹ گئی۔ اس سے آئس کریم بھی لے لی۔ اور دوبارہ ناراض نہ ہونے کا بھی وعدہ کیا، مگر کیا کریں وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہوجائے۔ ایک ہفتے بعد ہی موصوف کپڑوں کے لیے لڑ رہے تھے اور میں نے اُسی کی الماری سے اُسے کپڑے نکال کر دیے۔ اور پھر ناراض ہوگئی۔
خیر اعظم اپنے کپڑے لے کر واش روم چلا گیا، واپس آیا تو تھوڑی دیر میں ہی تیار ہوکر میرے کمرے میں آیا اور بڑے خوشی کے انداز میں بولا۔
''بہنا ذرا اپنی کوئی کریم تو دو، آج دوست کی شادی میں جارہا ہوں، لڑکیاں وڑکیاں تو ہوں گی۔ کسی کو بھی پسند کرکے تمہاری بھابی بنادوں گا۔'' یہ کہتے ہی پُرجوش انداز میں ہنسا بھی اور شرمایا بھی۔
میں نے غصے میں کہا۔ ''نہیں ہے کوئی کریم وریم جاؤ خود اپنے پیسوں کی خریدلو جاکے۔''
مگر جناب کہاں ماننے والے تھے اعظم صاحب، فوراً ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں سے نکال لی ایک کریم۔
''یہ دیکھو میں چلائی۔''
''امی...... امی دیکھو بھائی کو یہ تنگ کررہے ہیں، دراز سے میری کریم نکال لی ہے۔'' امی کچن سے آگئیں اور پیار سے بھائی کو دیکھ کر کہا۔
''ماشاء اللہ کتنا اچھا لگ رہا ہے میرا بیٹا۔'' میں بھی مذاق میں بول پڑی۔
''پورا بندر لگ رہا ہے...... ہاہاہا۔''
اعظم نے غصے سے مجھے دیکھا اور کہا۔
''دیکھنا آج جارہا ہوں شادی میں اور آج تمہاری بھابی سے بھی ملوں گا۔'' امی نے فوراً ڈانٹا۔
''بے شرم غیرت کرلے تھوڑی سی، بولی ہی جارہا ہے۔'' اور پھر امی مسکراتی ہوئی دوبارہ کچن کی طرف چلی گئیں۔ اعظم کریم لگا رہا تھا۔ میں نے کہا۔
''اعظم'' اُس نے بھی جواب میں بس ''ہوں'' کہا۔ پھر میں نے کہا۔
''میرے بھائی کیا واقعی کوئی ہے جس پر میرا بھائی فدا ہے اور کیا آج ملوگے اُس سے؟''
وہ خوش ہوتے ہوئے میرے قریب آیا اور میرے بازو پکڑ کر بولا۔

''ہاں بہنا ہے ایک لڑکی۔ وہ بہت اچھی ہے۔ اُسے میں نے دیکھا نہیں مگر آج دیکھوں گا۔'' میں نے حیرت سے کہا۔
''کیا مطلب تم نے دیکھا نہیں اُسے؟'' اُس نے کہا۔
''وہ میرے دوست کی کزن ہے۔ موبائل پر تو اُس سے بات ہوتی ہے مگر آج دیکھوں گا پہلی بار۔ میری بہنا تم دعا کرنا کہ میں اُسے پسند آجاؤں، پھر امی ابو کو اُس کے گھر لے کر جاؤں گا اور تمہیں بھی ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔
''اچھا میرے پیارے بھائی اُس کا نام تو بتادو۔'' اُس نے آہستہ سے میرے کان میں اُس کا نام بتایا جو کہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔
میں نے کہا۔ ''دوبارہ بتاؤ ذرا زور سے۔'' تو کہنے لگا۔
''پٹواؤ گی کیا امی سے۔'' اور پھر شرماتے ہوئے اُس نے نام بتایا 'کلثوم' اور نام بتا کر شادی میں چلا گیا۔ میں کھڑی کھڑی اُسے دیکھتی رہی اور دل میں سوچتی رہی کہ میرا بھائی اعظم کلثوم نامی لڑکی کو پسند کرتا ہے۔ وہ لڑکی تو نہیں ہوگی جس کا اتنا پرانا نام ہے، خیر......
میں سوچوں میں گم تھی کہ امی نے آواز دی مجھے اور میں کچن میں چلی گئی۔
امی نے کہا۔ ''کہاں گیا ہے تیرا بھائی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''بس امی چلا گیا۔'' یہ کہہ کر میں گھر کے کاموں میں مصروف ہوگئی۔
رات کو دو بجے موصوف گھر تشریف لائے اور میرے لیے آئس کریم بھی لائے جناب۔ میں نے اُس وقت پوچھنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنے کمرے میں آگئی سونے کے لیے۔
امی نے پوچھا۔ ''آگیا اعظم۔'' میں نے کہا۔
''جی امی ابھی آیا ہے میں اُسی کا انتظار کررہی تھی۔''
اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا اور اعظم کا وہی ہنسی مذاق کا سلسلہ جاری تھا۔ میں نے بھی اعظم سے کچھ نہیں پوچھا لیکن ایک مہینے بعد وہ تھوڑا سا اُداس رہنے لگا تھا۔ میں نے ایک دن موقع دیکھ کر بڑی خاموشی سے امی نہ سن لیں بھائی سے کہا۔
''اعظم کیا بات ہے، آج کل کام کی ٹینشن بہت زیادہ ہے یا کلثوم سے کوئی ناراضگی وغیرہ ہے۔'' اُس نے کہا۔
''کچھ نہیں بیٹا۔'' اُس رات اعظم نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور اگلی صبح وہ اپنا موبائل بھی بھول کر چلا گیا۔ میں نے اُس کا موبائل اٹھا کر رکھ دیا اور اعظم کے بارے میں پورا

دن سوچتی رہی کہ کوئی تو بات ہے جو کھانا تک نہیں کھایا۔ میں نے امی سے بھی کہا۔ امی نے بھی کہا۔

''ہاں بیٹا شاید یہ کام کی وجہ سے پریشان ہے شوروم میں گاڑیوں کی سیل اور پرچیز نہیں ہو رہی ہوگی۔'' مگر مجھے لگا کہ نہیں کوئی اور بات ہے۔

آج ابو بھی پورا دن گھر میں ہی تھے میں دوپہر میں ابو کو کھانا دینے گئی تو ابو سے بھی پوچھا کہ بھائی بہت پریشان سے لگ رہے ہیں آج کل، نہ وہ اتنی بات کرتے ہیں اور نہ ہی وہ کھانا ٹھیک سے کھاتے ہیں، آخر کیا بات ہے، شوروم تو ٹھیک چل رہا ہے نا۔'' ابو نے بھی کہا۔

''ہاں شوروم تو ٹھیک چل رہا ہے۔ وہ وہاں بھی الٹی سیدھی حرکتیں کر رہا ہے۔'' ابو نے مزید کہا کہ پتا نہیں کیا سوچ رہا تھا۔ اچانک سے اپنا ہاتھ سلپ کر لیا اور انگلی ٹیبل فین سے ٹکرائی اور خون نکل آیا۔''

میں نے کہا۔ ''ابو یہ دو دن پہلے ہوا تھا۔ میں نے پوچھا بھی تھا مگر کچھ بتایا نہیں اعظم نے۔'' خیر! ابو کو کھانا دے کر میں اعظم کے کمرے میں آئی اور اس کا موبائل اٹھایا اور میسج پڑھنے لگی۔ سارے فضول سے میسج تھے۔ شعر و شاعری کے لیکن ایک میسج پر میری نظر رک گئی۔ اُس میں لکھا تھا۔

''اعظم اب تم مجھ سے بات مت کرنا۔ میرے بھائی کو پتا چل گیا ہے۔ کلثوم۔'' میں نے اس کی ڈیٹ دیکھی تو ایک ہفتہ پہلے کا میسج تھا۔ میں نے اُسی میسج پر رپلائی کر دیا۔

''بھابی میں ہوں کرن۔'' تو فوراً میسج آ گیا۔

''السلام وعلیکم کرن کیسی ہیں آپ اور آپ کے بھائی کیسے ہیں۔''

پھر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے کلثوم نے کہا۔

''آپ اپنے بھائی کا خیال رکھنا اُس نے کل بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ آج اُسے کھانا کھلا دینا پلیز۔''

میں نے کہا۔ ''جی بھابی جو حکم آپ کا۔'' میں بہت خوش ہوئی۔

پھر میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ ناراض ہیں اعظم سے۔'' انہوں نے کہا۔

''نہیں تو، وہ بہت اچھے ہیں۔ اُن سے بھلا میں کیوں ناراض ہوں گی۔ بس کبھی کبھی لڑائی ہو جاتی ہے۔ ہاہاہاہا!''

یہ میسج آیا تھا، پھر میں نے Bye لکھ کر رابطہ ختم کر دیا اور اپنے گھر کے کام میں مصروف ہو گئی۔

رات کو اعظم آیا تو میں نے کہا۔ ''کھانا لاؤں۔'' اُس نے منع کر دیا۔

پھر امی نے کہا۔ ''بیٹا تھوڑا سا کھا لے، کیوں پریشان ہو رہا ہے۔'' اُس نے کوئی جواب نہیں دیا پھر امی نے کہا۔

''کرن نے بھی نہیں کھایا۔'' میرا سن کر وہ تھوڑا سا غصہ ہوا پھر ہم دونوں بہن بھائی نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد میں نے کلثوم سے ہونے والی ساری بات اعظم کو بتا دی۔ اُس نے کہا۔

''امی کو مت بتانا، میں اُسی کی وجہ سے پریشان ہوں۔ وہ کبھی کہتی ہے بات کرو اور کبھی منع کرتی ہے۔'' میں نے بھی کہا۔

''OK۔''

اگلے دن میں نے امی سے کہا۔ ''امی میرا تو آپ نے رشتہ پکا کر دیا ندیم سے اور اعظم کے لیے کیا کیا۔'' امی نے کہا۔

''ہاں بیٹا ڈھونڈ رہی ہوں لڑکی، اگر تمہاری نظر میں ہے تو بتاؤ۔'' پھر میں نے امی کو ساری بات بتا دی، مگر امی نے یہ کہہ کر منع کر دیا۔

''نہیں جو لڑکی میرے بھولے بھالے معصوم لڑکے کو پھنسا سکتی ہے وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔'' خیر اس کے بعد ساری بات ختم ہو گئی۔ میں بھی کام میں مصروف ہو گئی۔

میں بہت خوش تھی کیونکہ دو مہینے بعد میری شادی تھی مگر اُداس بھی تھی کہ اعظم کی بھی ساتھ میں ہوتی تو اچھا تھا۔

جیسے تیسے کر کے میری شادی ہو گئی اور میں اپنے بھرے پُرے سسرال پہنچ گئی۔ سسرال میں میری بہت تعریف ہوئی اور آج تک ہوتی ہے۔

میرے شوہر ندیم بھی بہت پیار کرنے والے انسان ہیں۔ آتے جاتے مجھے 'فلائنگ کس' دیتے رہتے ہیں۔ وہ بھی بہت خوش مزاج ہیں جیسے اعظم تھا۔ ایک سال بعد میں ماں بن گئی اور اس دوران امی کے ہاں بھی جاتی تھی اور فون پر بھی رابطہ رہتا تھا، مگر اعظم ویسے ہی اُداس اُداس رہتا تھا۔ میری بیٹی پیدا ہونے کے بعد میں میکے رہنے کے لیے گئی اور سوچ کر گئی تھی کہ اب تو لازمی اعظم سے پوچھوں گی کہ کیا بات ہے۔

☆......☆......☆

اتوار کا دن تھا اعظم بھی گھر پر تھا۔ منی بھی بہت تنگ کر رہی تھی۔ میں اُسے امی کو دے کر اعظم کے کمرے میں آ گئی۔ اعظم اپنے بیڈ پر لیٹا رو رہا تھا۔ میں فوراً گھبرا گئی اور اُسے بازو سے پکڑ کر اُٹھایا اور پوچھا۔

''بھائی کیا ہوا ہے۔ کیا مسئلہ ہے؟ اب تو تمہیں میری بھی اتنی فکر نہیں رہتی اور نہ اپنا خیال رکھ رہے ہو۔ آخر کیا بات ہے، بھائی کیوں دن بہ دن کمزور ہوتے جارہے ہو۔''

میرا یہ کہنا تھا اور وہ مزید پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں نے بھی بھائی کو فوراً اپنے گلے سے لگالیا، پھر اعظم نے مجھے بتانا شروع کیا۔

''ڈیڑھ سال پہلے کلثوم سے میری بات ہوئی تھی۔ اُس کا نمبر میں نے اپنے دوست کے موبائل سے لیا تھا۔ اُس دِن دوست کی شادی میں بھی گیا تھا کہ وہ آئی ہوگی۔ اُسے دیکھوں گا، بات کروں گا۔ وہ آئی تھی۔ وہ زیادہ خوبصورت تو نہیں تھی، مگر مجھے پسند تھی، میری محبت تھی۔ میں نے اُس سے بات نہیں کی کیونکہ سب لوگ موجود تھے اور وہ بھی بہت بے تاب تھی بات کرنے کے لیے، مگر ہم بات نہیں کرسکے۔ بس ایک دوسرے کو میسج پر میسج کرتے رہے۔ اُس نے میری تعریف بھی کی تھی کہ 'بہت کیوٹ لگ رہا ہوں' مگر وہ عام سے حلیے میں بھی نہ کوئی خاص میک اپ اور نہ ہی کوئی جیولری، بس گلے میں ایک گولڈن چین تھی۔ میں نے آئیڈیا لگایا کہ وہ لوگ بھی ہماری طرح کے ہیں زیادہ امیر نہیں ہیں۔ میں خوش تھا کہ اب تو رشتہ پکا ہونے کے چانسز ہیں، پھر ایک دن موقع دیکھ کر شوروم پر ہی میں نے ابو سے کلثوم کی بات کی مگر ابو خوش ہونے کے بجائے برہم ہوگئے اور کہنے لگے۔

''ہم برادری سے باہر شادی نہیں کرتے۔ نہ لڑکی دیتے ہیں اور نہ لیتے ہیں۔''

میں نے ابو سے کہا ''ابو وہ مجھے پسند ہے۔'' خیر تھوڑی ضد بحث کے بعد ابو مان گئے مگر یہ کہا کہ تمہاری امی نہیں مانیں گی۔ وہ اپنی بھانجی کو اپنی بہو بنانا چاہتی ہیں۔''

''ابو نے امی سے بات بھی کی تھی کلثوم اور میری مگر امی نے وہی بات کی جو ابو نے کہی تھی۔''

میں نے فوراً اعظم سے کہا۔

''میرے بھائی! یہ تو میری شادی سے پہلے کی بات ہے اور تم نے تو مجھے نہیں بتایا۔'' میں بہت حیرت میں تھی کہ ان سب کو پتا تھا، آپس میں امی ابو اور اعظم کی بات بھی ہوگئی اور مجھے نہیں پتا۔

پھر اعظم نے کہا ''ہاں بہنا تمہارے سامنے ہم نے کوئی بات نہیں کی۔ اس کے بعد اعظم نے مزید بتایا کہ کلثوم کسی اور میں بھی انٹرسٹڈ تھی مجھے یہ پتا نہیں تھا مگر بعد میں پتا چلا کہ وہ خراب لڑکی ہے۔ وہ اسی طرح لڑکوں سے بات کرتی ہے۔ ڈیٹ پر جاتی ہے اور مطلب پورا ہونے پر نیا لڑکا پھنساتی ہے۔ اُس کا مقصد ہی کھاؤ پیو اور عیش کرو ہے۔ اس کے نزدیک زندگی بس اسی کا نام ہے کہ اسی طرح تیرے میرے اور کبھی اس کے ساتھ گھوم پھر کر وقت گزارو۔ اس نے کئی لڑکوں سے تعلقات قائم کررکھے ہیں۔ ہر لڑکا اس کی ایک نئی داستان سناتا ہے۔ وہ میرے کئی دوستوں کی بھی مشترکہ فرینڈ ہے۔ وہ لوگ اکثر نائٹ پروگرام کرتے ہیں اور کلثوم سب کے ساتھ برابر کا کھیلتی ہے۔ بڑی ہمت ہے اس لڑکی کی جو ایک ساتھ کئی کئی لڑکوں کو کمپنی دیتی ہے۔ دوست بتاتے ہیں کہ وہ ایک دم ربڑ کی گڑیا معلوم ہوتی ہے۔ اتنی نرم و گداز کہ بس......'' بھائی بلا تکان بولے جارہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ آپے میں نہیں ہیں۔

یہ سب سن کر میں بہت شاکڈ ہوئی اور اُس دن کلثوم سے ہونے والی باتیں میرے ذہن میں گھومنے لگیں کہ اپنے بھائی کا خیال رکھا کرو آپ، وہ کھانا ٹھیک نہیں کھاتے وغیرہ۔''

''اُف ایسی لڑکی تھی وہ۔'' یہ بتاتے ہوئے اعظم بہت رورہا تھا۔ پھر وہ کہنے لگا۔

''جس دن مجھے میری بہن کی طرح کوئی لڑکی مل جائے گی، میں تب ہی شادی کروں گا ورنہ نہیں۔''

اعظم نے یہ بھی بتایا کہ کلثوم نے مجھے کہا تھا کہ تمہارے قابل اس دنیا میں کوئی لڑکی نہیں۔''

اس کے بعد میں اعظم کو سمجھانے لگی۔

''بھائی ایک کے جانے کے بعد دنیا ختم نہیں ہوجاتی، دیکھنا میں ڈھونڈوں گی تمہارے لیے لڑکی اور وہ میرے بھائی کے قابل ہوگی۔'' یہ سُن کر اعظم نے بس 'ہوں' کہا اور میں اس کے کمرے سے باہر آگئی۔

☆......☆......☆

رات کو سونے سے پہلے میں سوچ رہی تھی کہ کوئی لڑکی کسی کو اتنا پیار دے اور پھر اچانک سے کسی دوسرے پر فدا ہوجائے، کیا وہ ٹھیک ہوسکتی ہے۔ نہیں بالکل نہیں۔ بس اب میں کل سے ہی کوشش کروں گی اپنے بھائی کے لیے ایسی لڑکی کی جو میرے بھائی کے قابل ہو، جو صرف اور صرف میرے بھائی سے محبت کرے، اُسی کو چاہے اور بس، یہ کام مجھے کل سے شروع کرنا تھا اس لیے میں جلدی سو گئی، کیونکہ صبح مجھے اپنی کالج کی ایک دوست کے گھر جانا تھا۔

☆☆......☆☆

گلاب لمحے بکھر گئے ہیں

چمن اعوان

آزاد کشمیر سے گلاب لمحوں کے خار بننے کی داستانِ الم

آج بچوں کو اسکول بھیجنے کے بعد جیسے ہی ناشتے کے برتن اٹھاتے ہوئے اس کی نظر سامنے آئینے پر پڑی تو وہ آئینے میں خود کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، پیلی رنگت اور بکھرے بال......



''کیا یہ میں ہوں عالیہ......؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے۔ میری حالت ایسی......نہیں کبھی نہیں۔ میں کبھی ایسی نہ تھی نہ ہو سکتی ہوں'' تقریباً دو گھنٹے بیٹھ کر وہ خود اپنی ایسی حالت پر آنسو بہاتی رہی۔ ایسے میں اس کا خیال اپنی پچھلی زندگی کی طرف چلا گیا، جب اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

خاندان بھر کی لاڈلی اور سب بہن، بھائیوں میں سب سے الگ ایک خاص ہی شخصیت کی مالک جسے اللہ تعالیٰ نے بہت اچھی سیرت کے ساتھ ساتھ حسن سے نوازا تھا جو بھی دیکھتا بس گرویدہ ہو جاتا۔ سب کا خیال رکھنے والی، بولنے کا انداز ایسا جیسے منہ سے پھول برس رہے ہوں۔ گاؤں کی کسی شادی میں جاتی تو سب کی نظریں اس پر جم جاتیں، آخر کیوں نہ جم جاتیں وہ خوبصورت بھی تھی تو اس قدر تھی کہ دیکھنے کے قابل اور اس کے علاوہ سلیقہ شعار بھی۔ گاؤں کی لڑکیاں اس سے ملنا، اس سے باتیں کرنا اپنے لیے اعزاز سمجھتی تھیں۔

جوانی کی عمر میں قدم رکھتے ہی خاندان اور خاندان سے باہر اس کے لیے بہت سے رشتے آنے لگے۔ ہر کوئی چاہتا تھا کہ عالیہ ہمارے گھر کی رونق بنے لیکن وہ خود چپ تھی۔ کبھی کسی کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔ اسے بس اپنے والدین کا ہر فیصلہ منظور تھا۔ اس طرح اس کے والدین نے بھی اس کے لیے جو بہتر سمجھا کر دیا کیوں کہ اس کے والدین بھی چاہتے تھے کہ ہماری کفایت شعار بیٹی کسی اچھے گھر میں بیاہ کر جائے، جہاں پر اس کی قدر ہو۔

اس طرح ایک بہت ہی سلجھے ہوئے، پڑھے لکھے لڑکے کا رشتہ آیا تو انہوں نے قبول کر لیا۔ لڑکا ایک اسکول میں ٹیچر تھا۔ بہت شریف اور اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔

سب بہت خوش تھے کہ عالیہ ایک اچھے انسان کی ساتھی بننے جا رہی تھی۔ وہ ٹیچر بہت چاہنے والا تھا، ہر طرح سے عالیہ کا خیال رکھتا اور اس کی بہت عزت کرتا۔ وہ بھی اپنی قسمت پر ناز کرتی کہ اسے اتنا چاہنے والا انسان ملا ہے۔ لیکن آنے والے وقت کا کسی کو پتا نہیں ہوتا کہ ہمارے ساتھ کیا ہوگا۔ اس طرح عالیہ بھی کبھی سوچ نہیں سکتی تھی کہ جس رشتے سے وہ اتنا مطمئن ہے، اس سے اس کی شادی نہیں ہو سکے گی۔

☆......☆......☆

گھر میں شادی کی تیاری چل رہی تھی بس تاریخ رکھنا باقی تھی لیکن اس سے پہلے اس کے ایک کزن کی شادی آ گئی، جس میں عالیہ کی زندگی ہی بدل گئی۔ کزن کی شادی میں سب خاندان والے جمع تھے۔ سب بہت انجوائے کر رہے تھے۔ عالیہ بھی بہت خوش تھی وہ بھی شادی پر بہت انجوائے کر رہی تھی۔ اسی دوران اس کی ملاقات اپنے ایک چاچو کے بیٹے سے ہوئی، جو گاؤں کے باہر کسی شہر میں رہتا تھا۔ وہ بھی اس شادی میں شریک تھا۔ اس سے پہلے وہ گاؤں آیا تو بہت چھوٹا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد بھی نہیں تھا اور عالیہ کو بھی اس نے بہت پہلے دیکھا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ ہو جائے گا۔

عمر میں حارث عالیہ سے چھوٹا تھا لیکن جب اس نے عالیہ کو دیکھا تو پہلی ہی نظر میں اس کا دیوانہ ہو گیا۔ اسے لگا کہ اگر عالیہ نہ مل سکی تو شاید وہ جی نہ سکے اور حارث نے اسے حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے طے کر لیا جو بھی ہو جائے، وہ عالیہ کو حاصل کر کے رہے گا، جب کہ عالیہ اس بات سے بالکل بے خبر تھی کہ حارث اس کے بارے میں کیا سوچ رہا ہے۔ وہ تو اسے بس چھوٹا بھائی سمجھتی تھی۔

اسی شادی میں حارث نے عالیہ کے نام ایک خط لکھا اور اس میں اپنے دل کی بات عالیہ کو بتا دی۔ وہ تو یہ خط پڑھ کر سکتے میں آ گئی۔ کیوں کہ اسے پتا تھا اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو قیامت آ جائے گی۔ سارے خاندان کی عزت خاک میں مل جائے گی، اس کے والدین بھی یہ صدمہ برداشت بھی نہ کر سکیں گے، یہ سب سوچ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور اس نے حارث کو بہت سختی سے منع کر دیا۔ اور کہا آئندہ کے لیے ایسا سوچنا بھی نہ تمہیں پتا ہے میری شادی ہونے والی ہے لیکن حارث تو جیسے پاگل ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ عالیہ نہیں مان رہی تو اس نے گھر جا کر ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ اگر عالیہ سے اس کی شادی نہ ہوئی تو وہ خودکشی کر لے گا۔ اس نے اپنا کھانا

پینا بند کر دیا گھر والے بھی حارث کی اس حرکت پر حیران و پریشان تھے۔ حارث کی ماں سے اپنے اکلوتے بیٹے کا دکھ دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ سب نے بہت کوشش کی حارث مان جائے اور اس طرح کی فضول ضد چھوڑ دے لیکن اس نے کسی کی ایک نہ سنی اور اپنی ضد پر قائم رہا۔ تب حارث کے گھر والے اس کی ضد کے آگے ہار گئے۔

☆......☆......☆

ادھر عالیہ کی شادی کی تیاریاں تقریباً مکمل ہو گئی تھیں کہ اس دن حارث کے گھر والے ان کے گھر پہنچ گئے اور ساری صورتحال بتا دی اور ساتھ ہی منت سماجت کرنے لگے کہ ہمارے بچے کی زندگی کا سوال ہے۔ آپ عالیہ کا رشتہ ختم کر کے ہمارے بیٹے سے کر دیں۔

عالیہ کے گھر جیسے صفِ ماتم بچھ گئی۔ اس کے والد نے کہا ایسا ممکن ہی نہیں ہے۔ میں اپنی زبان سے کبھی نہیں پھرتا چاہے جو بھی ہو جائے۔'' اس کے بھائیوں کے لیے بھی غیرت کا مسئلہ تھا۔ ان کی انا پر بنی ہوئی تھی۔ سب بہت پریشان ہو گئے۔

اُدھر حارث، عالیہ کو کبھی خون سے خط لکھ کر اور کبھی خودکشی کی دھمکی دے کر اپنی محبت کا یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وہ ایسا کچھ نہیں چاہتی تھی، کیوں کہ اس کے لیے اپنے والدین کی عزت سب کچھ تھی۔

پھر اچانک ایسا واقعہ پیش آیا کہ عالیہ کے والدین کو عالیہ کا بھی قصور لگنے لگا اس معاملے میں۔ وہ اسے قصور وار سمجھ کر بہت سزا دیتے۔ اس نے بہت کہا اس میں میرا کوئی قصور نہیں لیکن اس کی بات سننے والا کوئی نہیں تھا۔ عالیہ کی ماں اپنے بھتیجے کے پیار میں اس کے ساتھ ہو گئی۔ اور عالیہ کو بھی سمجھا بجھا کر ٹیچر کے رشتے سے انکار کروا دیا، پھر اس نے بھی سوچا کہ ایک انسان اسے اتنا پیار کرتا ہے اور ماں کا بھی ساتھ ہے تو کیوں نہ اس سے شادی کر کے ساری زندگی اپنی مرضی سے جیوں، ویسے بھی باپ اور بھائی مجھے قصور وار سمجھتے ہیں۔''

عالیہ وہ جس نے والد اور بھائی کے سامنے کبھی آنکھ نہ اٹھا کر بات نہ کی تھی، ان کے سامنے اس نے اس رشتے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ حارث سے شادی کا بھی کہہ دیا۔ والد اور بھائیوں نے بہت سمجھایا اور سزا بھی دی لیکن عالیہ اب مکمل طور پر حارث کی باتوں میں آ چکی تھی، آخر کار شادی کی تیاریاں ایک طرف رہیں، رشتے سے انکار ہو گیا۔ اور حارث کے ساتھ بات طے ہو گئی۔

گھر میں سب پریشان تھے۔ کوئی بھی عالیہ سے بات نہیں کرتا تھا کیوں کہ ہر ایک کو لگتا تھا اس کی وجہ سے ہماری عزت خراب ہوئی ہے، اس کے ابو بازار جاتے تو لوگ طرح، طرح کی باتیں کرتے اس لیے انہوں نے گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا، خیر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات کچھ بہتر ہوئے اور عالیہ کی حارث سے شادی کر دی گئی۔

☆......☆......☆

حارث کو لگتا تھا کہ وہ دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہے جس کی دلہن عالیہ بنی ہے اور عالیہ بھی بہت خوش تھی کہ اسے جان سے زیادہ محبت کرنے والا انسان مل گیا ہے۔ اسے یقین تھا کہ جن مشکل حالات سے گزر کر حارث نے مجھے حاصل کیا ہے، وہ ہمیشہ میرا خیال رکھا گا۔ شادی کے بعد بھی وہ دونوں خوش تھے۔ عالیہ بھی جی جان سے حارث کا خیال رکھتی۔ اگرچہ حارث کے گھر والوں کا رویہ عالیہ کے ساتھ بالکل اچھا نہیں تھا، لیکن حارث اس سے بہت محبت کرتا تھا اور کیوں نہ کرتا وہ اپنے سارے خاندان والوں کو ناراض کر کے آئی تھی۔ خاندان کا کوئی بھی انسان اس کی شادی سے خوش نہیں تھا، سوائے عالیہ اور حارث کے۔

عالیہ بھی اپنے سارے مسائل بھول کر حارث کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی تھی۔ وہ اپنے فیصلے سے خوش تھی کیوں کہ حارث اس کی ہر خواہش ہر بات اس کے لبوں تک آنے سے پہلے پوری کر دیتا تھا۔

حارث کا عالیہ سے اس قدر پیار اس کے گھر والوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ انہوں نے حارث کی ضد کے آگے ہتھیار تو ڈال دیے تھے لیکن دلی طور پر آج بھی عالیہ کو قبول نہیں کیا تھا۔ اور جہاں دل نہ ملیں وہاں مسائل تو پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے گھر میں بھی آئے دن کوئی نہ کوئی مسئلہ ہوتا اور جھگڑا شروع ہو جاتا لیکن عالیہ کو حارث کی مکمل حمایت حاصل ہوتی تھی، اس طرح وقت گزرتا رہا اور شادی کو پانچ سال ہو گئے اس دوران اللہ نے انہیں

تین بچے بھی دے دیے۔

وہ ہر وقت اپنے بچوں کے ساتھ لگی رہتی۔ تین بچوں کی پرورش کوئی آسان کام نہیں ہوتا پھر عالیہ بچوں کے ساتھ اپنا بھی پورا خیال رکھتی اور اس کی خوبصورتی پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا بہت مشکلوں کے باوجود وہ آج بھی اتنی ہی خوبصورت تھی جتنی شادی سے پہلے کیوں کہ جب عورت کو خاوند کی توجہ حاصل ہو تو اسے دنیا کی کوئی بھی پریشانی مشکل نہیں لگتی۔ اس طرح کا معاملہ عالیہ کے ساتھ تھا۔

رات کو جب حارث گھر لوٹتا تو اس کی ایک مسکراہٹ جو عالیہ کو دیکھ کر اس کے چہرے پر آتی، عالیہ کے سارے دن کی تھکاوٹ ختم کر دیتی۔ حارث کا اس کی تعریف کرنا اسے بہت اچھا لگتا اس لیے ہر وقت بن سنور کے رہتی، پھر ایسا ہوا کہ حارث کو کاروبار کے سلسلے میں کراچی جانا پڑا، عالیہ یہ سن کر بہت پریشان ہوئی حارث کے بغیر رہنے کا تصور بھی اسے خوفزدہ کر دیتا تھا۔ کیوں کہ جب سے وہ اس گھر میں آئی تھی، ایک دن بھی حارث کے بغیر نہیں رہی تھی۔ حارث کا دل بھی عالیہ اور بچوں سے دور جانے کا نہیں تھا، مجبوری تھی، جانا بھی ضروری تھا۔ پھر وہ اس وعدے کے ساتھ کہ وہ بہت جلد عالیہ اور بچوں کو بھی بُلا لے گا اسے چھوڑ کر کراچی جیسے انسانوں کے سمندر بھرے شہر روانہ ہو گیا۔

یہاں اس نے اپنا کاروبار سیٹ کر لیا تقریباً ایک ماہ بعد حارث نے عالیہ اور بچوں کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔

حارث کا کاروبار بہت اچھا چل نکلا تھا۔ عالیہ کو خود کو نئے شہر میں ایڈجسٹمنٹ کرنے کے لیے تھوڑی سی مشکل تو ہوئی لیکن وہ بہت خوش تھی کہ اب وہ حارث اور بچوں کے ساتھ اکیلی رہے گی۔ وہ اپنی مرضی کی زندگی گزاریں گے جہاں پر تیسرا کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں ہوگا۔ ہر لڑکی کی طرح عالیہ کا بھی الگ گھر میں رہنے کا خواب پورا ہو گیا تھا۔

اس نے بہت جی جان سے اپنے گھر اور اپنے بچوں کے لیے چیزیں خریدیں اور اپنے گھر کی تمام سجاوٹ خود اپنی مرضی سے کی۔ جہاں پر صرف وہ تھی اور اس کا حارث......

☆......☆......☆

لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس کی یہ سب خوشیاں اس وقت ختم ہونے لگی جب حارث کا رویہ اس کے ساتھ تبدیل ہونے لگا۔ وہ رات کو بہت دیر سے گھر لوٹتا، اگر وہ پوچھتی تو کام کا بول دیتا چونکہ عالیہ خود سے زیادہ حارث پر اعتماد کرتی تھی۔ اس لیے وہ اس کی ہر بات کو حرف آخر سمجھتی تھی۔ اسے اپنی محبت اور حارث کے ساتھ اس محبت کی مضبوطی کا اس قدر یقین تھا کہ وہ سوچتی کہ حارث چاہے جو بھی کر دے اس کے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتا۔ کبھی کبھی تو وہ غرور میں آ جاتی کہ اس کا خاوند اسے اتنا پیار کرتا ہے، آخر کیوں نہ کرتی وہ غرور حارث ہمیشہ اسے کہتا میں چاہتا ہوں تم زمین پر پاؤں بھی نہ رکھو، تمہارے پاؤں خراب ہو جائیں گے۔ کاش میں تمہارے لیے مخمل کا فرش بنا سکتا۔ تم اس پہ چلتی راج کرتی۔ لیکن اس کے لیے تو اتنا ہی کافی تھا کہ وہ حارث کے دل پر راج کرتی تھی۔ اس کے خاوند نے کبھی اس سے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ جب بھی بولا پیار سے ہی بولا، پھر اپنے خاوند سے بھلا کوئی بیوی کیسے بے وفائی کی امید کر سکتی ہے لیکن کہتے ہیں کہ حالات بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی، یہی کچھ ہوا عالیہ کے ساتھ۔

حارث ہمیشہ دیر سے آتا اور اگر وہ پوچھ لیتی تو وہ غصے سے جواب دیتا۔ بات بات پہ تعریف کرنے والا حارث کچھ دنوں میں عالیہ کو دیکھنا ہی بھول گیا تھا۔ وہ حارث کے اس رویے سے بہت پریشان تھی لیکن پھر سوچتی، شاید آفس میں کام کی وجہ سے اس کا یہ رویہ ہے۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ حارث اس کے ساتھ کتنا بڑا کھیل کھیل رہا ہے۔ عالیہ کو دنیا کی سب سے اچھی بیوی کہنے والا کسی اور کی زلفوں کا اسیر ہو گیا ہے۔ ہر لڑکی کو عالیہ کے پاؤں کی جوتی کہنے والا آج کس طرح کسی اور کو اس کے مقابل کھڑا کر سکتا ہے؟ لیکن سب کچھ ہو چکا تھا اور وہ ہوا جس کا تصور بھی وہ نہیں چاہتی تھی۔ اسے حارث پر مان تھا، کیا اعتماد اس کا مان سب ٹوٹ چکا ہے۔

☆......☆......☆

ایک دن حارث کے کزن نے کال کر کے بتایا کہ حارث کا کسی لڑکی سے افیئر چل رہا تھا اور چھ ماہ پہلے اس نے نکاح بھی کر لیا ہے یہ خبر اس کے لیے کسی دھماکے کی

طرح تھی۔ وہ پورا دن جائے نماز پر بیٹھی دعائیں مانگتی رہی کہ کاش یہ سب جھوٹ ہو۔ حارث بول دے کہ کسی نے افواہ پھیلائی ہے، ایسا کچھ نہیں ہے، وہ تو عالیہ کے علاوہ کسی کا سوچ بھی نہیں سکتا شام تک رو رو کے برا حال ہو چکا تھا عالیہ کا...... پھر بھی ایک امید کہ حارث آ کے جھٹلا دے گا اس بات کو، وہ مجھے تسلی دے گا کہ تم لوگوں کی باتوں میں نہ آ جایا کرو، میں تمہاری قربانی کیسے بھول سکتا ہوں جو تم نے میرے لیے دی ہے۔ اپنی منگنی ختم کی، والدین کو ناراض کیا...... لیکن یہ ساری امیدیں اس وقت ختم ہو گئیں جب حارث نے نہ صرف اس بات کی تصدیق کر دی بلکہ اسے دھمکی بھی دی کہ تم کیا کر سکتی ہو، میں نے نکاح کیا ہے اور رہنا چاہتی ہو تو میرے ساتھ رہو ورنہ اپنے والدین کے پاس چلی جاؤ۔

یہ سن کر وہ تو جیسے سکتے میں آ گئی تھی۔ اسے تو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا" وہ جب کچھ سنبھلی تو دیکھا حارث وہاں نہیں تھا۔ وہ جاتی تو کہاں جاتی تین بچوں کو لے کر، والدین تو پہلے ہی اس شادی کے خلاف تھے، آج وہ کیسے اس کو جگہ دیتے۔ سسرال والے تو اپنے بیٹے کے ساتھ پہلے بھی تھے اور آج بھی اس کے تھے۔ آج پہلی بار اسے لگا کہ اس کی قسمت بہت خراب تھی کہ اسے حارث جیسا بے وفا آدمی ملا۔ اور تباہی کا سبب بنا تھا۔ اس کے اس کی زندگی کو سرد شعلوں کی نذر کر دیا تھا۔ وہ روز جیتی اور روز مرتی۔ اب اس کے لیے جینے کی آرزو موت کی دعا بن چکی تھی۔

عورت دنیا کا ہر دکھ برداشت کر سکتی ہے لیکن اپنے شوہر کے ساتھ کسی عورت کو نہیں۔ شوہر کی بے وفائی مضبوط سے مضبوط عورت کو بھی توڑ دیتی ہے۔ آج عالیہ بھی ٹوٹ چکی تھی۔ اسے دنیا سے نفرت ہو گئی تھی۔ اسے کراچی شہر سے نفرت ہو گئی۔ پھر اس نے دنیا کو چھوڑنے کا سوچا تو معصوم بچوں کے چہرے سامنے آ گئے۔ وہ اپنے بچوں کو کس کے سہارے چھوڑ کر جاتی، باپ تو پہلے ہی کسی دوسری عورت کا ہو چکا تھا، کون خیال رکھے گا ان معصوموں کا۔

بس پھر اس نے اپنے بچوں کی خاطر جینے کا فیصلہ کر لیا۔ حارث کہاں سے آتا ہے۔ کہاں جاتا ہے، اسے

ایک شعر

یوں اس کا منتظر رہتا ہوں اظہر
کہ جیسے وہ مرا گھر جانتا ہے
شاعر: اظہر حسیب۔ کراچی

کوئی پروا نہیں تھی، نہ بھی اس نے پوچھنے کی کوشش کی بھلا کیا پوچھتی۔ کس کی بات کا شکوہ کرتی جس نے دنیا بسائی تھی اس نے خود ہی اجاڑ دی تو کیا کہتی کسی کو...... بجنا سنورنا تو وہ بھول گئی تھی، بجتی بھی کس کے لیے۔ اس کے لیے جو اس کے علاوہ کسی اور کا بھی تھا جو بے وفائی کا سراپا مجسمہ تھا، جس نے اسے زندہ درگور کر دیا تھا۔

اگرچہ ایک سال بعد ہی حارث دوسری بیوی سے تنگ آ کر واپس عالیہ کے پاس آ گیا تھا لیکن اس کی زندگی اب پہلے والی نہیں تھی۔ وہ ایک ہی گھر میں دو اجنبیوں کی طرح رہتے تھے، کہا جاتا ہے جب شدید محبت نفرت میں بدلتی ہے تو اس میں بھی شدت ہوتی ہے۔ عالیہ کی محبت بھی نفرت میں بدل گئی تھی۔ وہ جیسے ہی حارث کو دیکھتی اسے جلن ہوتی، جس نے اس کا اعتماد توڑا تھا۔

وہ بھی کبھی جب تنہا بیٹھ کر سوچتی ہے تو یہ سب ایک خواب لگتا ہے۔ خوشی کہ کچھ دن اور پھر اداسی بھری زندگی...... خاوند کی بے وفائی نے اسے مکمل تبدیل کر دیا تھا۔ باہر جاتی تو اسے یوں لگتا لوگ اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ اتنی خوبصورت اور خوب سیرت ہونے کے باوجود ایک شخص اس سے اتنی بے وفائی کر گیا تھا، نجانے کیوں......؟؟ شاید اس کی یہی تقدیر تھی یا اس کی شادی پر والدین کی ناراضگی......

وہ اسے اپنے ماں باپ کی بددعاؤں کا اثر سمجھتی تھی لیکن ماں باپ تو بچوں کے لیے سراپا رحمت ہوتے ہیں۔ وہ تو بچوں کی بڑی سے بڑی خطا بھی معاف کر دیتے ہیں لیکن اس کی زندگی میں یہ کیسی تباہی اور بربادی آئی تھی۔ وہ یہی سوچ رہی تھی یا اس کے والدین نے اسے ابھی بھی معاف نہیں کیا ہے؟؟

☆☆......☆☆☆

کنارا مل گیا مجھ کو!



بابر نایاب

ساہیوال سے اُس دوشیزہ کی داستان، جسے آخرکار زیست کا کنارا مل گیا تھا

''بس بہت ہوگیا اب میں تمہارا کوئی بھی جھوٹ نہیں سنوں گا، بے شرمی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، دن بھر آوارہ گردی کر کے رات کو یہاں ہوٹل سمجھ کر آتے ہو''، پروفیسر عباس نے اپنے جوان بیٹے فیصل پر گرجتے ہوئے کہا، پروفیسر عباس آج بہت جلال میں تھے کیونکہ روز ہی فیصل رات کو دیر سے گھر آتا تھا اور آج بھی ہمیشہ کی طرح فیصل نے معصوم سا چہرہ بنا کر کہا۔

''ابو جی سچی آج ایک دوست کی پارٹی تھی۔ میں توبہ کرتا ہوں آئندہ کبھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

''دیکھو میں دن بھر اسٹوڈنٹس کو پڑھاتا ہوں۔ انھیں ہر ایک بات سمجھاتا ہوں اور یہ میرے لیے کتنے شرم کی بات ہوگئی کہ خود دوسروں کو نصیحت کرنے والے کا بیٹا اپنے باپ کے اصولوں کو ہر روز توڑتا ہے۔ میں ڈرتا ہوں جس رفتار سے تم بھاگ رہے ہو کہیں یہ رفتار ہم سب کے لیے عذاب نہ بن جائے۔ دیکھو زندگی کی اور وقت کی قدر کرنا سیکھو۔ وقت بہت بے رحم ہے، جو اس کی قدر نہیں کرتا یہ اُسے مسل کر رکھ دیتا ہے۔ کب سے تم نے ایم۔ ایس۔ سی کی ہوئی ہے۔ کوئی جاب یا میری طرح ٹیچنگ کیوں نہیں کرتے۔''

''ابو جی مناسب وقت پر کرلوں گا، آپ فکرمند مت ہوں میں کبھی آپ کی اُمیدوں کو مایوسی میں نہیں بدلوں گا۔'' فیصل نے مضبوط لہجے میں اپنے باپ پروفیسر عباس سے کہا۔

''فیصل تم آگئے کب سے تمہاری راہ تک رہی تھی۔'' فیصل کی امی مسز تبسم عباس ہاتھ میں تسبیح لیے لان میں داخل ہوئیں۔

''ہاں صاحبزادے کو فرصت مل گئی ہے گھر آنے کی۔ اسے سمجھاؤ میں تو چلتا ہوں سونے کے لیے۔ اس کے لیے جاگ رہا تھا۔'' پروفیسر عباس نے کہا اور واپس اپنے کمرے کی طرف چل دیے۔ باپ کے جاتے ہی فیصل جو سر جھکائے کھڑا تھا نے اچانک سر کو اُٹھایا اور اپنی امی سے کہا۔

افوہ! امی آپ بھی نا کمال کرتی ہیں۔ ابھی تک سوئی نہیں۔ دیکھیں اب ابو کی طرح کوئی نصیحت مت

کرتا آپ مجھے سخت نیند آرہی ہے۔''

''بیٹا تمہارے اور تمہاری بہن کنول کے علاوہ میرا اس دنیا میں کون ہے۔ بس تم دونوں کی فکر لگی رہتی ہے اور ہمیشہ خدا سے تم دونوں کی سلامتی کی دعا میں مانگتی رہتی ہوں تم تو اب بڑے ہو گئے ہو۔ کہاں ہماری نصیحت کو مانو گے۔ بس بیٹا جلدی گھر آجایا کرو تمہیں نہیں پتا ماں کا انتظار کیسا ہوتا ہے۔ میں تمہیں دیکھے بنا سو بھی کیسے سکتی ہوں۔ فیصل کو اپنی امی کے لفظ لفظ سے ممتا کی وہ خوشبو محسوس ہو رہی تھی جس کا دنیا میں کوئی نعم البدل نہیں۔ فیصل نے اپنی امی کے تسبیح والے ہاتھ کو تھام کر اُسے چوما اور کہا۔'' اب کبھی آپ کو انتظار کی کیفیت سے نہیں گزرنا پڑے گا۔'' بس یہ سننا تھا کہ مسز تبسم نے اپنے لاڈلے فیصل کو اپنے کلیجے سے لگا لیا۔

☆......☆......☆

فیصل کے ابو پروفیسر عباس ایک گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے۔ اپنی شرافت اور ایمانداری اور اپنے سچے اُصولوں کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ پروفیسر عباس نے اپنی زندگی میں نیک نامی اور شرافت کے سوا کچھ نہیں کمایا تھا۔ زندگی کی یہی کل جمع پونجی تھی جس پر اُنھیں ہمیشہ فخر رہتا تھا۔ فیصل اور کنول دو ہی بہن بھائی تھے اور دونوں کی آپس میں خوب نوک جھونک ہوتی رہتی تھی اور مسز تبسم عباس تو اپنی اولاد کو ٹوٹ کر چاہتی تھیں۔ پروفیسر عباس اپنے بیٹے فیصل کی وجہ سے کافی فکر مند تھے وہ چاہتے تھے کہ جلد فیصل کوئی اچھی سی جاب ڈھونڈ لے تاکہ اُس کی شادی کی جا سکے اور وہ ایک ذمہ دار انسان بن جائے۔ مگر فیصل کی عادات اور بے فکری انھیں کبھی کبھی بہت فکر مند کر دیتی تھی۔ فیصل اپنی زندگی میں بہت خوش تھا مگر ایک ایسا حادثہ ہوا جس نے فیصل کے خاندان کی زندگی بدل کر رکھ دی۔

☆......☆......☆

فیصل اپنے آبائی گاؤں سے واپس لوٹ رہا تھا اور تیزی سے موٹر سائیکل چلا رہا تھا تاکہ رات ہونے سے پہلے گھر پہنچ جائے۔ ایک ویران رستے پر اُسے ایک نوجوان لڑکی نظر آئی جس کے ہاتھ میں ایک سفری بیگ تھا، جس کو وہ اپنے کاندھے سے لٹکائے پیدل تیزی



سے چل رہی تھی۔ پہلے تو فیصل اُسے نظرانداز کر کے آگے بڑھ گیا مگر پھر خیال آیا کہ یہاں سے تو کسی بس نے نہیں گزرنا اور شہر کا راستہ بھی کافی ہے یہ بیچاری کیسے اتنا فاصلہ طے کرے گی۔

فیصل نے اپنے موٹر سائیکل کو بریک لگائی اور نیچے اُتر کر اُس لڑکی کو دیکھا جس نے اپنے چہرے کو نقاب سے ڈھانپ رکھا تھا اور اُس کا لباس بالکل عام سا تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ کسی گاؤں کی باسی ہے۔ لڑکی بھی فیصل کو یوں رکتے ہوئے دیکھ کر رک گئی۔

''محترمہ آپ کو کہاں جانا ہے۔ یہاں سے کوئی بس نہیں گزرتی اور شہر کا راستہ بھی کافی ہے۔ اگر آپ کو مناسب لگے تو میری یہ کھٹیچر سی بائیک آپ کو آپ کی منزل تک پہنچا سکتی ہے۔'' فیصل نے لڑکی کو مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''میری کوئی منزل نہیں اور میں کسی اجنبی کے ساتھ کبھی نہیں بیٹھی۔ آپ کی ہمدردی کا شکریہ۔'' اُس لڑکی نے انتہائی تلخی سے فیصل کو جواب دیا۔

''منزل اُن کی نہیں ہوتی جو زندگی کو بوجھ سمجھ کر خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ آپ کے لیے رکنا میرا اخلاقی تقاضا تھا اور اسی انسانی اور اخلاقی بنا پر آپ کو یہ پیشکش کی تھی وگرنہ میں تو اپنے راستے پر جا رہا تھا۔ ویسے بھی شام ڈھل رہی ہے اور یہاں دور دور تک کوئی سواری نہیں آنے والی۔ اگر مناسب لگے تو آجائیں ورنہ میں تو چلتا ہوں۔ فیصل نے اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر لی۔

لڑکی کچھ پل سوچنے کے بعد فیصل کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ گئی۔ راستے بھر لڑکی خاموش رہی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی بہت گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اسی خاموش اور اجنبی سفر کے بعد جب فیصل شہر میں داخل ہوا تو پھر اُس نے اس پُراسرار لڑکی سے پوچھا۔

''اب کہاں جانا ہے۔'' لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ فیصل نے اپنے سوال کو دوبارہ دہرایا مگر پھر بھی وہی خاموشی...... فیصل نے بریک لگائی اور پھر مڑ کر اُس کو دیکھا تو اُس لڑکی کے آنکھوں سے زاروقطار برسنے والے آنسوؤں کو دیکھ کر اُسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ فیصل نے انتہائی تیزی سے کہا۔

''ارے آپ کو کیا ہوا۔ کیوں رو رہی ہیں۔ خدا کے لیے رونا بند کیجیے۔ رونے سے آپ کی پریشانی یا اُلجھنوں کا خاتمہ نہیں ہونے والا۔ ہاں اگر آپ مجھے اپنے بارے میں کچھ بتائیں گی تو ہوسکتا ہے میں آپ کے کچھ کام آسکوں۔'' لڑکی نے رونا بند کر دیا مگر پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ فیصل اتنا تو سمجھ گیا کہ یہ لڑکی بہت بڑی مصیبت میں ہے۔ پہلے تو فیصل کو خوف محسوس ہوا کہ اگر ابو کو پتا چل گیا کہ میں ایک لڑکی کے ساتھ گھومتا پھرتا ان کو نظر آگیا تو پھر میرا خدا ہی حافظ ہے مگر پھر دوسری طرف یہ خیال بھی آیا کسی کے کام آنا کوئی جرم اور کوئی گناہ نہیں۔

''دیکھیے لگتا ہے آپ کو چائے کی طلب ہو رہی ہے۔'' فیصل نے یہ کہتے ہوئے موٹر بائیک ایک ہوٹل کی طرف موڑ لی۔

چائے پینے کے لیے جب اُس لڑکی نے اپنے نقاب کو اُتارا تو فیصل اُسے دیکھ کر دم بخود رہ گیا، سامنے ایک مکمل حسن کا شاہکار تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں جن میں دنیا کی خوبصورتی اپنی مچلتی آرزوؤں کے ساتھ سمٹ کر آگئی ہو۔ مصنوعی بناوٹ سے پاک چہرہ جس پر زندگی کی تلخیوں کو اُجاگر کرتی ایک گہری سنجیدگی تھی۔ جھکی جھکی پلکیں جو حیا کی سرخی سے لبریز تھیں۔ کشادہ اور روشن پیشانی جو اُس کی زندگی کی تاریکیوں میں بھی روشن اُمید کی طرح چمک رہی تھی۔

لڑکی نے انتہائی ٹھہرے لہجے میں فیصل کو بتانا شروع کیا۔

''میری زندگی روزِ اول سے ہی طوفانِ حوادث کے تھپیڑوں میں ہچکولے کھاتی رہی ہے۔ خوشی کا لفظ میرے لیے بالکل ایک اجنبی سا ہے۔ پیدا ہونے کے کچھ عرصے بعد میرے ماں باپ ایک روڈ ایکسیڈینٹ میں جاں بحق ہو گئے۔ دور کے ایک بوڑھے چاچا نے مجھے پالا پوسا۔ میں نے بمشکل ایف اے کیا ہی تھا کہ میرے چچا کا بھی انتقال ہوگیا۔ کرایہ کا مکان تھا جس میں چچا اور میں رہتے تھے۔ گھر کا کرایہ ادا کرنے کے لیے اور اس پیٹ کے دوزخ کو بجھانے کے لیے کسی طرح ایک جاب ڈھونڈ لی، مگر مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ دنیا ایک کمزور، دُکھوں کے آنگن میں رہنے والی اکیلی اور تنہا لڑکی کو نہیں جینے

دے کی گھر سے نکلتی تو گلی بھر کے آوارہ لڑکے میرے پیچھے ہوتے۔ قدم قدم پر بھوکی نظروں کا سامنا کرنا پڑتا۔ ہاں مجھے لگتا تھا وہ سب گدھ ہیں جو مجھے نوچنا کھسوٹنا چاہتے ہیں۔ جب میں نے دامن بچانا چاہا تو میرے کردار پر اُنگلیاں اُٹھنی شروع ہو گئیں۔ میں بدنامی کی آگ پر دکھوں کی روٹیاں پکانے والی وہ لڑکی ہوں جو اس جنگلی زندگی سے عاجز آ چکی ہوں اب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر سے نکلی تھی، کتنے ہی ہمدرد ملے جو بڑھاپے کی منزل پر رواں دواں تھے مگر اندر اُن کے بھیڑیے غرا رہے تھے ہاں میں سب سے لڑتے لڑتے تھک چکی ہوں۔ مر بھی نہیں سکتی کیونکہ خودکشی حرام ہے۔ سر پر کسی کا سایا نہیں۔ اپنی انجان منزل پر جا رہی تھی کہ آپ مل گئے اور مجھے پہلی بار کسی کے لہجے میں انسانیت کی جھلک نظر آئی تو اعتبار کر کے آپ کے ساتھ چل پڑی۔ یہ ہے میری زندگی کی داستان۔''

یہ کہتے ہوئے لڑکی چپ کر گئی اور حوا کی بیٹی کا شرم و حیا والے چہرے پر آنسوؤں کی لڑیاں برسنا شروع ہو گئیں۔ فیصل جو محویت کے ساتھ اُس کی باتیں سن رہا تھا اُس کے چپ ہونے پر بولا۔

''کسی کا کوئی بھی نہ ہو تو ایک ہستی ضرور ہوتی ہے اور وہ خدا کی ہستی ہے، جس نے آپ کی عزت کی حفاظت کی ہے اور آپ کو ایک ایسے انسان سے ملا دیا ہے جو آپ کے دکھوں پر مرہم ضرور رکھے گا۔ چلو میرے ساتھ میرے گھر۔'' یہ کہتے ہوئے فیصل اُٹھ پڑا، فیصل کو اُس کے لہجے اور اُس کی باتوں سے پکا یقین ہو گیا یہ لڑکی جو کہہ رہی ہے وہ سب سچ ہے۔

''آپ کا نام تو پوچھنا ہی بھول گیا۔'' راستے میں فیصل نے اُس سے پوچھا۔

''میرا نام شبنم ہے مگر میں نام کی طرح شبنم نہیں ہوں۔''، شبنم نے جواب دیا۔ فیصل کو زندگی میں پہلی بار کسی کے لیے کچھ میٹھا سا پیار محسوس ہوا۔ ہاں پیار وہ احساس جو بہت مقدس ہے مگر اس احساس، اس لفظ کو بدنام کر دیا گیا ہے اس لفظ پر لوگوں نے اپنے خود غرضی اور بدنامی کے کھیلوں کو کھیلا، کسی نے اس نام کی اس احساس کی لاج نہیں رکھی، یہی سوچتے سوچتے فیصل کا گھر آ گیا۔

فیصل شبنم کو لے کر گھر داخل ہوا، شبنم جھجکتے ہوئے فیصل کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی۔ مسز تبسم اور کنول لان میں بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔

''امی جی دیکھیں تو سہی کون آیا ہے۔'' فیصل کے ساتھ، کنول نے مسز تبسم سے کہا۔ فیصل کی امی نے فیصل کے ساتھ ایک نوجوان اور انجان لڑکی کو دیکھ کر فیصل کی طرف سوالیہ نشان سے دیکھا۔

''امی جی یہ شبنم ہے۔ یہ اس کا نام ہے اور اب یہ یہاں رہے گی۔'' فیصل نے اپنی امی کی نظروں کا جواب دیا۔ مسز تبسم نے کچھ نا سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کنول جاؤ اس کے ساتھ اور اس کو کمرے میں لے جاؤ یہ بہت تھکی ہوئی ہے۔ فیصل نے اپنی بہن کنول کو کہا، کنول نے اپنے بھائی کے حکم پر عمل کرتے ہوئے شبنم کو لے کر اندر کمرے کی طرف چلی گئی۔

''ہاں اب بتاؤ یہ کون ہے اور اسے یہاں کیوں لے کر آئے ہو۔'' مسز تبسم نے فیصل سے پوچھا، فیصل نے مختصر لفظوں میں اپنی امی کو شبنم کے بارے میں سب بتا دیا۔ یہ سن کر مسز تبسم کے چہرے پر فکرمندی کے تاثرات اُبھر آئے۔

''پر بیٹا اسے یہاں ہم مستقل کیسے رکھیں گے۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ اس نے تم سے کچھ کہا وہ سچ ہے۔''، مسز تبسم نے فیصل سے پوچھا۔

''ہاں امی جس طرح مجھے یقین ہے کہ آپ میری ماں ہیں اسی طرح مجھے شبنم کے ہر لفظ پر یقین ہے۔ مسز تبسم جانتی تھی کہ فیصل بہت سچ بولتا ہے۔'' اُس نے کبھی جھوٹ کا سہارا نہیں لیا، چاہے سچ کے لیے اُس کتنے ہی نقصان کیوں نا اُٹھانا پڑ جائیں۔

''اور جہاں تک اس کے یہاں پر مستقل رہنے کا سوال ہے اُس کا جواب میں آپ کو کل دوں گا۔''، فیصل نے اپنی امی کو جواب دیا۔

''مگر بیٹا تمہارے ابو سے مجھے خطرہ ہے۔ وہ اس انجان لڑکی کے یہاں رہنے پر کبھی راضی نہیں ہوں گے۔''

''امی جی اُنھیں راضی ہونا پڑے گا۔ میں نے کوئی جرم یا کوئی گناہ نہیں کیا۔ ایک انسانی ناتے اس کو پناہ دی

ہے اور باقی باتیں کل ہوں گی۔ مجھے بہت سخت نیند آئی ہے۔ فیصل اپنی امی کو سوچوں میں چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

بستر پر لیٹتے ہی خیالوں اور گہری سوچوں نے فیصل کو گھیرے میں لے لیا، فیصل کو انتہائی جلدی میں کوئی فیصلہ کرنا تھا آخر ایک طویل سوچ کی کشمکش میں فیصل نے ایک فیصلہ کر لیا اور پھر ایک پُرسکون نیند فیصل پر مہربان ہوگئی۔

☆......☆......☆

صبح فیصل کی آنکھ زرا دیر سے کھلی تب تک فیصل کے ابو کالج جا چکے تھے۔ مسز تبسم آج بہت خوشگوار موڈ میں تھیں۔

''بیٹا ناشتہ بناؤں کیا۔'' مسز تبسم نے ایک پیار بھری نظر فیصل پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''ہاں امی بنائیں اور وہ شبنم نے ناشتا کر لیا کیا؟''

''ہاں بیٹے اُس نے ناشتا بھی کر لیا اور میں نے اُس سے کافی ڈھیر ساری باتیں بھی کر لیں۔ ہاں تم سچ کہتے ہو وہ بہت دُکھی لڑکی ہے۔ تم نے ایک بہت نیک کام کیا ہے جو اسے یہاں لے آئے۔ اللہ تمہیں اس کا اجر ضرور دے گا۔ اب کنول اُس سے باتیں کر رہی ہے اور ہاں تمہارے ابو کو میں نے بتا دیا ہے مگر انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ کالج چلے گئے ہیں۔ بس اتنا مجھ سے کہا ہے کہ فیصل کی آنکھ کھلے تو اُسے کہنا وہ گھر میں رہے، واپس آ کر اُس سے بات کرنی ہے۔''

''اچھا امی جی میں کہیں نہیں جا رہا آج۔'' فیصل نے جواب دیا۔

پروفیسر عباس اپنے وقت مقررہ پر گھر لوٹے اور آتے ہی فیصل سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''فیصل زرا میرے کمرے میں آؤ۔'' فیصل اپنے ابو کے حکم کی تعمیل کرتا ہوا اُن کے ساتھ کمرے میں چل پڑا۔

''یہ لڑکی کون ہے اور کیوں اسے یہاں لے کر آئے ہو۔'' پروفیسر عباس نے ایک گہری نظر فیصل پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

فیصل نے جواب میں شبنم کے بارے میں سب بتا دیا، پوری بات سن کر اور پھر کچھ پل سوچنے کے بعد پروفیسر عباس نے فیصل کو کہا۔

''چلو ٹھیک ہے مان لیتا ہوں تم میں انسانی جذبہ بہت زیادہ ہے مگر میں زندگی کی جھلساتی ہوئی آگ کے تجربوں سے نکلا ہوا ہوں اور میں تمہاری نظروں میں صرف انسانی ہمدردی ہی نہیں دیکھ رہا بلکہ مجھے کچھ اور بھی نظر آرہا ہے۔''

''جی ابو! آپ نے ٹھیک پہچانا۔ میں اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور اس کی محرومیوں اور دکھوں کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ شادی میں نے کل بھی کرنی ہے تو کیوں نہ آج کر لوں۔ شادی بھی ہو جائے گی اور کسی کو اُلجھے راستوں میں اس کی منزل بھی مل جائے گی۔'' فیصل نے بے خوف ہو کر اپنے ابو سے کہا۔

اتنا سننا ہی تھا کہ پروفیسر عباس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ جس کا تمہیں کوئی اتا پتا نہیں تم اُس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ مجھے پہلے ہی لگتا تھا تم میرے نام کو ضرور ڈبوؤ گے۔ جو ہم نے تمہارے لیے اچھے خاندان کی لڑکی دیکھی ہے اُس کا کیا ہو گا۔ دیکھو فیصل یہ باتیں، یہ سوچیں کتابوں میں لفظوں کی صورت میں اچھی لگتی ہیں ان کا زندگی کی حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ انسانی ہمدردی صرف ہمدردی ہی رہے تو بہتر ہے، اُسے بوجھ بنانا ہماری ذمہ داری نہیں۔ جوانی کے جذبات سوائے ذلت اور رُسوائی کے سوا کچھ نہیں دیتے۔ تمہاری اتنی عمر نہیں جتنا میرا تجربہ ہے۔''

''ابو جی آپ مجھ سے زیادہ علم رکھتے ہیں مگر انتہائی احترام سے میں آپ سے یہ عرض کرتا ہوں پھر ان کتابوں کو جلا دیں جو ہمیں انسانیت کا درس دیتی ہیں جو ہمیں انسان کے کام آنے کا درس دیتی ہیں۔ جب ان علم کی کتابوں کا ہماری زندگی کی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تو پھر کیا فائدہ ان کتابوں کو پڑھنے کا اور پڑھانے کا۔ ابو جی میرا دل مطمئن ہے کہ میں ایک نیک کام کر رہا ہوں اور یہ نیک کام کرتے ہوئے میں اپنے ماں باپ کا دل بھی نہیں دکھانا چاہتا۔ خدارا مجھے اس نیک کام کرنے سے نہ روکیں۔ آپ اپنی عزت اور رسوائی کا کوئی خوف نہ رکھیں یاد رکھیں۔ عزت اور ذلت اللہ کے ہاتھ میں

تو ہی تو

عشق میں تیرے
ہم جاں سے گزر جائیں گے
لیکن او بے وفا!
یاد رکھ
مر کے بھی ہم تو
اپنا جیون......
تیرے نام کر جائیں گے

ندیم عباس میواتی ۔ پتوکی

جنگل سے نکل کر ایک ایسی انسانی دنیا میں آ گئی ہو جس میں پیار اور محبت کی سچی رعنائیاں ہیں۔اب تو شبنم کے سنجیدہ چہرہ فیصل اور کنول کی باتیں سن کر کھل اُٹھتا تھا ۔مسز تبسم کو بھی پتا چل گیا کہ فیصل شبنم کو اپنانا چاہتا ہے اور اس کی اجازت تو پروفیسر عباس نے بھی بخوشی دے دی ہے۔تو پھر مسز تبسم کیوں اجازت نہ دیتی۔

''شبنم جی میں کسی بھی تمہید کو باندھے بغیر آپ سے اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اگر ایک ہینڈسم، پڑھا لکھا، ذہین نوجوان فیصل آپ کو اپنانا چاہے تو آپ کا جواب کیا ہوگا۔''فیصل نے انتہائی شوخی سے شبنم کو کہا۔شبنم کی آنکھیں حیا کی خوبصورتی سے جھک گئیں اور شبنم کی ہلکی سی سرگوشی اُبھری۔

''یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہوگی مگر نا جانے مجھے لگتا ہے ابھی تک میں کسی افسانوی دنیا میں مقید ہوں۔''

''نہیں شبنم یہ افسانوی نہیں حقیقت کی دنیا ہے وہی دنیا جس نے تمہیں غموں کے بے رحم موسموں سے آشنا کروایا اور آج اسی دنیا میں تم میری محبتوں کی وادی میں داخل ہو رہی ہو۔''فیصل نے یہ کہا تو شبنم نے اپنی آنکھیں بند کر کے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور اس سانس میں شبنم اپنے غموں کو ماضی میں چھوڑ آئی کیونکہ نوزائیدہ خوشیاں شبنم کا انتظار کر رہی تھیں۔

☆☆......☆☆

ہے۔انسان کے اختیار میں نہیں، اگر میں اس حوا کی بیٹی کو نہیں اپناؤں گا تو پھر مجھے ڈر ہے یہ دنیا کی بے حسی اور ظلم کا شکار ہو جائے گی اور پھر میں اپنے ضمیر کو معاف نہیں کر سکوں گا۔ابو جی آپ ہی تو مجھے انسانیت کا درس دیتے تھے۔آپ ہی تو کہتے تھے کہ بیٹا مصیبت زدہ کی مدد کرو چاہے اُس کے لیے تمہیں کتنی بھی سختی کیوں نا جھیلنی پڑے، اور آج جب میں اپنی خوشی اور مسرت سے یہ کام سرانجام دے رہا ہوں تو آپ ہی مجھے روک رہے ہیں۔تو پھر اب میں کیا سمجھوں اور یہ میرے جوانی کے جذبات نہیں۔جوانی کے جذبات منہ زور ہوتے ہیں جو کسی بند باندھنے سے بھی نہیں رُکتے یہ انسانی جذبات ہیں اور انسانیت کا رشتہ تمام رشتوں سے عظیم ہوتا ہے۔

فیصل نے یہ سب باتیں آنکھیں جھکا کر اپنے ابو سے کہیں۔پروفیسر عباس اپنے بیٹے کی یہ سب باتیں سن کر ایکدم سناٹے میں آ گئے۔پروفیسر عباس کو لگا کہ کل کا بچہ فیصل آج کتنا بڑا ہو گیا ہے۔ہاں علم تو وہ ہے جو عمل کی تمنا کا طالب ہے۔آج پروفیسر عباس کو زندگی میں پہلی بار اپنا اندر کھوکھلا نظر آیا۔آج پروفیسر عباس کو اپنے آپ میں تضاد نظر آیا، کتنا غلط سمجھتے تھے وہ اپنے بیٹے فیصل کو اور آج وہی فیصل اُنھیں علم کے سمندر میں غوطہ زن نظر آیا۔

''بیٹا مجھے معاف کر دو۔میں تمہارے اچھے کام میں رکاوٹ ڈال رہا تھا۔سچ تو یہی ہے جو تم کہہ رہے ہو بیٹا مجھے آج پہلی بار تم پر فخر ہو رہا ہے اور میری دعا ہے کہ ہر باپ کا ایسا ہی بیٹا ہو جو لوگوں کی بھلائی اور غم بانٹنا جانتا ہو۔ہاں بیٹا آج ہماری باتیں، ہماری نصیحتیں صرف دوسروں کے لیے ہی رہ گئی ہیں، پر بیٹا تم نے آج ان باتوں پر عمل کر ڈالا ہے۔پروفیسر نے بھرائی ہوئی آواز میں اپنے جگر کے ٹکڑے فیصل کو کہا۔فیصل نے جلدی سے اپنے ابو کو گلے سے لگا لیا اور کہا۔

''ابو خدارا مجھ سے معافی مانگ کر مجھے شرمندہ مت کریں۔آپ کا حکم اور آپ کی فرمانبرداری مجھے ہر ایک چیز سے زیادہ عزیز ہے۔''

☆......☆......☆

فیصل کے گھر میں شبنم کے آتے ہی جیسے خوشیوں نے قدم رکھ لیا۔گھر کا سماں بدل گیا، شبنم کو ایسا لگا جیسے وہ

دوسرا ووٹ

ڈاکٹر راحیلہ خان

یونیورسٹی کی ہنگامہ پرور زندگی کا ایک ان کہا راز عیاں کرتا ایک سچ، کراچی سے

یہ اس وقت کی بات ہے جب کالج میں یونین پر پابندی تھی۔ لیکن ہر کلاس اپنے مسائل حل کرنے کے لیے غیر جماعتی الیکشن منعقد کرا کے ایک کلاس یونین چن لیا کرتی تھی۔ جسے الیکشن کمیٹی بھی کہتے ہیں۔ ہم فائنل ایئر ایم بی بی ایس میں تھے اور ہمیں تین ممبرز پر مشتمل یونین چننا تھی۔ الیکشن کی سرگرمیاں عروج پر تھیں ایک ٹولہ آتا اور اپنے امیدوار کے حق میں دلائل دے کر ووٹ دینے کی اپیل کر کے جاتا، کہ دوسرا ٹولہ آ جاتا اور مصر ہوتا کہ دراصل ان کا امیدوار ہی تمام قائدانہ صلاحیتوں سے مالا مال ہے اور اس کے چنتے ہی سارے مسائل چٹکی بجاتے حل ہو جائیں گے۔ تب ہی ایک لڑکی نے معصومیت سے پوچھا تھا۔

''کیا سر نور محمد کا ٹرانسفر بھی ہو جائے گا۔''

دراصل سر نور محمد کو رومانی جوڑوں سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ وہ ہر وقت اس تاک میں لگے رہتے تھے کہ گل و بلبل کہیں مل نہ پائیں اور اگر شامت اعمال کوئی رنگے ہاتھوں دھر لیا جاتا تو پھر اگلے امتحان میں اس کی وہ درگت بنتی کہ سارا رومان ہرن ہو جاتا۔ ٹیلی فون آپریٹر کو انہوں نے خاص ہدایت کی ہوئی تھی اور وہ بھی وفاداری سے عین اس وقت سر نور محمد سے لائن کنکٹ کر دیتا جب دو پیار کے متوالے کھل کے رموز عشق ڈسکس کر رہے ہوتے تو اچانک درمیان میں کسی کوہ قاف کے جن کی طرح سر نور محمد کی آواز گونجتی،

مانو لڑکی کو تو جیسے جاڑے کا بخار چڑھ گیا۔ ریسور پٹخ کر یوں بھاگتی کہ سیدھی لحاف میں جا گھستی اور اگلے دو دن کالج جانے کی ہمت نہ پڑتی۔

لڑکے اپنی مردانگی کو چیلنج سمجھتے ہوئے کلاس میں جاتے۔

جب سر نور کا پیریڈ شروع ہوتا تو وہ ایک عجیب سی نگاہ سے کلاس کا جائزہ لیتے اور پھر نگاہ مجرم پر ٹھہر کر جیسے جم جاتی اور بس سرد لہجے میں ایک جملہ کہتے۔

''خمیانی See me in my office۔''

آفس میں اس کے ساتھ کیا ہوتا یہ ایک راز تھا گو کہ یہ سیدھا سادھا شخصی آزادی پر حملہ تھا لیکن ابھی تک کوئی بھی سر نور محمد کا کچھ بگاڑ نہ سکا تھا۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ الیکشن ہونے والے تھے گو کہ الیکشن تو غیر جماعتی تھے لیکن پس منظر میں جماعتی

کیمپین جاری تھی۔ بڑی جماعتوں کے امید وار چاہتے تھے کہ تینوں ممبران ان کی جماعت سے ہی چنے جائیں، ایک دو آزاد امید وار بھی تھے۔ ناصر جلبانی بھی الیکشن کے امیدواروں میں سے ایک تھا۔ اس کا تعلق ایک ایسی پارٹی سے تھا جس کو بڑی جماعتوں والے مضحکہ اڑاتے ہوئے تانگہ پارٹی کہتے تھے۔ اور تاویل اس کی یہ دیتے کہ اس کے کل ممبران اتنے ہیں کہ بس ایک تانگہ بھر جائے۔

ناصر جلبانی سانولے رنگ کا دبلا پتلا نا ہوش لمبا لڑکا تھا۔ پچھلے چار سالوں میں کوئی بھی غیر شریفانہ حرکت کرتے نہ دیکھا گیا تھا۔ لڑکیوں سے تو وہ خاص طور پر بہت مؤدبانہ ہو کر ملتا تھا۔ دنگے فسادوں کے زمانے میں بھی ہم نے اسے کبھی کسی جھگڑے میں الجھتے نہیں پایا۔ وہ بہت ہی شریف النفس اور معصوم سا لگتا تھا۔ شاید اسی لیے لوگوں کی رائے میں وہ یونین میں چنے جانے کے لیے مناسب نہیں تھا۔



تب میں نے اس کے لیے ورک کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں خود بہت بڑے بڑے ''vote apeal for Nasir'' کے پوسٹرز بناتی اور اسے گرلز ہاسٹل کی بیرونی دیواروں پر چپکا کے آتی، کیوں کہ کالج کے 80 فیصد لڑکے یہاں سے ضرور گزرتے تھے۔ بہت سے تو گھنٹوں یہاں بیٹھے رہتے تھے۔

میں لوگوں سے مل کر انہیں بھی ناصر جلبانی کی خوبیوں سے آگاہ کرتی جن سے شاید وہ خود بھی واقف نہ ہوگا۔

کالج میں مجھے Scissors پکارا جانے لگا تھا اور اب اس Scissors کی ساری دھار ناصر جلبانی کی راہ کے کانٹے کاٹنے میں استعمال ہو رہی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ ناصر خود اس بات پر حیران و پریشان ہوگا کہ میں ایسا کیوں کر رہی ہوں۔ جیسا کہ کلاس کے سارے لوگ تھے۔ دوسرے امیدوار میرے پاس ووٹ کی اپیل لے کر آتے تو میں صاف کہہ دیتی۔ دو ووٹ تو میں کسی اور کو دے سکتی ہوں مگر تیسرا ووٹ ناصر جلبانی کے لیے ہے۔

ایک بڑی پارٹی کے امیدوار نے اپنی جانب سے ٹھوس دلیل جانتے ہوئے کہا۔

''دیکھیں جی ناصر جلبانی کی پارٹی کیا ہے ہمارے آگے، تانگہ ہے تانگہ پارٹی۔''

''تو کیا ہوا؟'' میں نے فٹ سے کہا۔

''کیا یہ جماعتی الیکشنز ہیں......؟''

''نہیں......'' وہ سٹپٹا کے بولا۔

''لیکن دیکھیں نا ایک جیسی سوچ کے لوگ آئے گے تو اسٹرانگ یونین ہوگی۔ کام اچھا ہوگا۔''

''ایک جیسی سوچ ہونے سے زیادہ میں سمجھتی ہوں اچھی سوچ ہونا ضروری ہے۔''

''کیا مطلب! آپ کو ہماری سوچ اچھی نہیں لگتی۔''

''نہیں ادا! آپ تو اچھے ہیں آپ کو ووٹ دینے سے میں نے کب منع کیا ہے، پر تیسرا ووٹ تو ناصر جلبانی کا ہے۔''

☆......☆......☆

ایک آزاد امیدوار وصی تھا جو اپنے جسم اور وزن کے لحاظ سے بھی خاصا وسیع تھا۔ ہم لڑکیاں اسے ماما وصی کہتی تھیں۔

وہ اپنی سفارش کے لیے سرمد کو ساتھ لے کر آیا تھا۔ سرمد میرا کلاس فیلو ہونے کے ساتھ ساتھ میرا پڑوسی بھی تھا۔ اس کے والد مجھے بیٹی کہتے تھے اور میں دھڑلے سے اسے کالج میں بھائی کہتی تھی۔ پہلے تو وہ بڑا جذبز ہوا۔ پھر آخر اس نے سب کے سامنے تسلیم کر لیا کہ میں اس کی بہن ہوں۔

ماما وصی نے ایک بار لڑکیوں کی ایک خبر اخبار والوں کو دی تھی اور وہ بھی ناموں کے ساتھ چھپی تھی۔ جس پر لڑکیاں خاصی ناراض تھیں اور ان کے حق میں ووٹ دینا ذرا مشکل ہی تھا۔ اسی لیے وہ سرمد کو ساتھ لایا تھا۔ لیکن میں نے اس سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''بھئی میں نے تو Decide کر لیا ہے۔''

''کس کو ووٹ دے رہی ہیں آپ؟'' سرمد نے تیوری چڑھائی میں نے نام گنوا دیے۔

''تو چلیں ٹھیک ہے ناصر جلبانی کے بجائے آپ وصی کو ووٹ دیں۔'' سرمد نے روایتی بھائیوں کے رعب سے کہا۔

''کیوں......؟'' میں نے دوبدو پوچھا۔

''کیوں کہ میں نے کہا ہے اور میں آپ کا بھائی ہوں۔''

''واہ یہ اچھی بات کرتے ہو، جمہوریت کی اور آزادیٔ اظہار کی اور ووٹ ڈالتے وقت بہنوں اور بیٹیوں کو اپنی مرضی پہ چلانا چاہتے ہو۔ ہم کیا گائے بھینسیں ہیں۔ ہم اس شخص کو ووٹ نہیں دے سکتے جسے ہم سمجھتے ہیں کہ وہ اس کا حق ہے۔ میں تو کہتی ہوں یہ سارے الیکشن ڈھکوسلہ ہوتے ہیں۔ گھر کے مرد جسے کہیں اس کو جا کے ووٹ ڈال کے آجاتی ہیں عورتیں۔ کیسی رائے دہی کیسی جمہوریت۔''

سرمد میری اس تقریر سے جھنجھلا کر بولا۔ ''مسئلہ کیا ہے؟ آپ کو ناصر جلبانی سے کہیں عشق تو نہیں ہو گیا۔''

''کیوں کیا تم نے مجھے اس سے کونوں کھدروں میں ملتے یا بس کا ٹکٹ Pay کرتے ہوئے دیکھا ہے یا پھر گرلز ہاسٹل کے گیٹ پر لائن میں لگا ہوا پایا ہے۔''

''تو پھر آپ اس کے لیے اتنے پاپڑ کیوں بیل رہی ہیں۔'' اس نے انگلی سے گرلز ہاسٹل کی دیواروں پر لگے ہوئے پوسٹرز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ ایک اچھا آدمی ہے اور بس۔؟ ویسے بائی دا وے تم جو ماما وصی کے لیے آئے ہو۔ تمہیں اس سے عشق ہو گیا ہے کیا۔'' میں نے اپنے تئیں نہلے پہ دہلا مارا۔ اب سرمد کے لیے رکنا ممکن نہ تھا۔ وہ کہتے ہوئے مڑ گیا۔

''چلو بھئی یہ پگلا گئی ہے۔''

اس دوران میں ناصر جلبانی مجھ سے ایک بار بھی نہیں ملا تھا۔ اس گہما گہمی میں آخر الیکشن کا دن آن پہنچا۔ آڈیٹوریم میں پولنگ کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایک دروازے سے اندر داخل ہونا تھا۔ تین ووٹ کاسٹ کرنا تھے۔ اور دوسرے دروازے سے رخصت ہو جانا تھا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

☆......☆......☆

گرلز ہاسٹل اور کالج کی مین بلڈنگ کے درمیان ایک وسیع لان تھا۔ جس کے درخت جھاڑیاں اور بینچیں بہت سی رومانی داستانوں کے امین تھے۔ لڑکیاں کالج جانے کے لیے عموماً یہی روش استعمال کرتی تھیں۔ الیکشن کی صبح ہم لڑکیاں اسی روش سے گزر رہے تھے کہ سرمد نے میرا راستہ روک لیا۔ پس منظر میں ماما وصی کو دیکھ کر میں اس کا مقصد سمجھ گئی تھی۔ اس لیے میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے اس کے بولنے سے پہلے اعلان کر دیا میں ووٹ ناصر جلبانی کو دوں گی۔ سرمد راستہ بند کر کے کھڑا ہو گیا۔

''میں آپ کو جانے نہیں دوں گا جب تک آپ مجھ سے وعدہ نہیں کر لیتیں کہ آپ ووٹ وصی کو دیں گی۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا۔ کوئی زبردستی ہے۔''

''بس جو سمجھیں زبردستی یا مان۔''

''دیکھو اگر میں تم سے وعدہ کر لوں اور اندر جا کے ووٹ ناصر جلبانی کو دوں تو تم کو کیا پتا چلے گا۔''

''ایک بار آپ نے وعدہ کر لیا تو پھر مجھے فکر نہیں کیوں کہ میں جانتا ہوں آپ وعدے کی بہت پکی ہیں۔ آپ اندر جا کے بھی وہی کریں گی جو آپ نے کہا ہے۔'' یہ اس کا مجھ پر ایقان تھا یا حربہ! اس کا فیصلہ

بقیا قصہ پڑھ کر کریں گے۔
وہ اس وقت تک میری جان کھاتا رہا جب تک اس نے یہ کہلوا نا لیا کہ میرا وعدہ ہے میں وسی ماما کو ہی ووٹ دوں گی۔''

☆......☆......☆

آڈیٹوریم کے باہر بڑی گہما گہمی تھی امیدوار اور ان کے حامیوں میں جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ ہم رش سے بچنے کے لیے ایک طرف کھڑے ہو کر خوش گپیاں کرتے رہے اور اس رونق کو انجوائے کرتے رہے۔ آخر بھیڑ بھاڑ چھٹی تو ہم بھی اپنی دوستوں کے ساتھ پولنگ اسٹیشن میں داخل ہوئے۔ ووٹ کاسٹ کیے اور Exit سے باہر نکل آئے۔ اب ہمارا رخ کینٹین کی طرف تھا۔ تب ہی سرمد تیزی سے میری طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ گھبرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔
''آپ کہاں تھیں؟ میں آپ کو تلاش کررہا تھا۔''
''کیا ہوا خیریت تو ہے۔'' میں نے پوچھا۔
''وہ مجھے یہ کہنا تھا آپ جس کو چاہے ووٹ دے دیجیے۔'' میرا مطلب ہے ناصر جلبانی کو دینا چاہتی ہیں تو دے دیں۔
''مگر تم تو...... میں سراپا حیران و پریشان تھی۔
''ہاں میں نے آپ سے کہا تھا لیکن ابھی ابھی ہمیں پتا چلا ہے کہ وسی ماما بہت بری طرح ہار رہا ہے۔ تو پھر بلا وجہ آپ کیوں...'' گھبراہٹ میں لفظ اس سے کھو گئے تھے۔ آخر میں اس نے اپنا مافی الضمیر ہاتھ کی حرکت سے پورا کیا تھا۔ اور تب میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔
''سرمد میں ووٹ کاسٹ کر آئی ہوں......
''میری بات پتا نہیں اس نے سنی یا نہیں، وہ تیزی سے پلٹ چکا تھا۔

☆......☆......☆

الیکشن کے نتائج بہت دل شکن تھے۔ ناصر جلبانی کو صرف تین ووٹ ملے تھے۔ جیتنے والے خوشیاں منا رہے تھے۔ دھوم دھڑکا کر رہے تھے۔ میں رضیہ اور ثمرہ کے ساتھ کینٹین چلی گئی۔ مجھے اس وقت چائے کی شدید ضرورت تھی۔ چائے کے ساتھ کیک پیس کا بھی آرڈر دے دیا تھا۔ تب ہی ناصر جلبانی میری طرف چلا آیا۔ اس نے تہذیباً بیٹھنے کی اجازت طلب کی اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ وہ مجھے دل گرفتہ لگ رہا تھا۔ میرا دل بھر آیا (کم بخت لوگوں کو قدر ہی نہیں) اس نے دھیمے لہجے میں بولنا شروع کر دیا اور جوں جوں وہ بولتا گیا میں کسی ان دیکھے صحرا میں دھنستی چلی گئی۔
''آپ کو الیکشن کے رزلٹس کا پتا تو چل ہی گیا ہوگا۔ میں بہر حال آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے بے غرضی سے میرے لیے کام کیا۔ بغیر کسی لالچ کے، اور مجھے ووٹ کیا۔''
کیک میرے حلق میں پھنس گیا تھا۔ میں نے چائے کا بڑا سا گھونٹ پی لیا۔
''ویسے میں ایک بات سوچ رہا ہوں۔'' وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔
''کیا......'' بمشکل مجھ سے کہا گیا۔
''مجھے تین ووٹ ملے ہیں۔ ایک ووٹ تو میرا اپنا ہوا، دوسرا ووٹ آپ نے دیا، تیسرا ووٹ کس نے دیا ہوگا۔'' اچھا چلتا ہوں، السلام علیکم۔
وہ مجھے گردن تک ریت میں دھنستا چھوڑ کے چلا گیا۔ میں اسے یہ بھی بتا نہ سکی کہ تیسرا ووٹ اسے کس نے دیا تھا۔
تیسرا ووٹ اسے نتاشا نے دیا تھا۔ جو اسے چاہتی تھی۔ مجھے تو الجھن یہ تھی کہ دوسرا ووٹ اسے کس نے دیا تھا؟؟

☆......☆......☆

آج اس واقعے کو کئی برس بیت چکے ہیں۔ ناصر جلبانی تانگہ پارٹی چھوڑ کر ایک بڑی پارٹی جوائن کر چکا ہے اور سیاست کے گر بھی اسے آگئے ہیں۔ کیوں کہ اخبار میں اس کا نام پڑھتی رہتی ہوں۔
میں نے سارے نام بدل دیے ہیں۔ پھر بھی اگر کوئی پہچان جائے تو میری درخواست ہے پلیز ناصر جلبانی کو نہ بتایئے گا کہ میں اس دن ایک عام پاکستانی عورت کی طرح اپنا حق رائے دہی اپنے بھائی کے مان کی نذر کر چکی تھی۔

☆☆......☆☆☆

ساجن کی کہانی

افتخار بھٹی

ڈسٹرکٹ جیل ملیر کراچی میں سزا کاٹ رہے ایک مجرم کی زندگی کا ایک سچا واقعہ



میرا نام افتخار ہے۔ مجھے جیل میں قید ہوئے تین سال ہو گئے ہیں۔ میں جیل میں جنرل منشی ہوں۔ آج میں بیرک نمبر 3 میں سیل چیک کرنے گیا تو بیرک کا منشی خدا بخش عرف ساجن بہت پریشان کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

''افتخار بھائی! آپ نے آج آنے میں دیر کردی۔'' میں نے کہا۔

''بکواس نہیں کر جلدی بتا کتنے پرسیل ہے۔'' (یعنی کتنے قیدی اندر موجود ہیں)۔

ساجن نے کہا۔ ''115۔'' میں لکھ کر چلا گیا۔

صبح 8 بجے بنوری کی یعنی گنتی کی، قیدیوں کی تو میں نے ساجن کو بلایا اور پوچھا۔

''ساجن! رات کو تُو بہت پریشان تھا۔ خیریت تو تھی۔'' ساجن نے گلوگیر آواز میں کہا۔

''بھائی بیس ہزار کے ضمانت کے آرڈر ہوئے ہیں۔ میرے پاس شیورٹی رکھنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ افتخار بھائی آپ جیل میں جنرل منشی ہو ہمارے۔ آپ میرے لیے کچھ کرو۔ میں باہر نکل کر پانچ دن میں آپ کے پیسے واپس کردوں گا۔'' میں نے کہا۔

''یار میں خود تین سال سے بند ہوں۔ مجھے ایک کیس میں بند کیا تھا۔ اب میرے جیل میں آنے کے بعد تین چھوٹے کیس میرے پیچھے اور بھیج دیے ہیں۔ میں کچھ نہیں کرسکتا۔ میرے لیے اپنا کیس لڑنا بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ یہ بتا تیری ملاقات کیوں نہیں آرہی۔'' ساجن بولا۔

''افتخار بھائی میرے والدین فوت ہوگئے ہیں۔ ایک بہن شادی شدہ ہے، وہ کبھی کبھار آجاتی ہے۔''

''ساجن! یہ تو بتا یار کہ تُو اس کیس میں پھنسا کیسے؟'' تو خدا بخش عرف ساجن نے جو روداد بتائی وہ من و عن میں آپ کے گوش گزار کررہا ہوں۔

میں جام شورو کا رہائشی ہوں۔ وہاں میں ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھتا تھا۔ میرے ساتھ ایک لڑکی سعدیہ بھی پڑھتی تھی۔ میری اور سعدیہ کی دوستی ہوگئی۔ دن بدن ہماری دوستی بڑھتی چلی گئی۔

ہم دونوں نے ساتھ ہی میٹرک کیا اس کے بعد جس کالج میں سعدیہ نے داخلہ لیا تھا میں نے بھی اسی کالج میں داخلہ لے لیا۔ ہماری دوستی اب پیار میں بدل گئی تھی۔

کالج ہم نے ساتھ پڑھا، پھر ہم نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔

ان ہی دنوں میں سعدیہ کے گھر والے سعدیہ کی شادی کی فکر میں لگ گئے۔ سعدیہ نے مجھے کہا۔

''ساجن میرے لیے میرے گھر والے رشتہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ دیر ہو جائے تم اپنی بہن کو میرے گھر رشتے کے لیے بھیجو۔'' میں نے کہا۔

''میری جان! میں موقع دیکھ کر باجی سے بات کرتا ہوں۔''

جب سعدیہ نے مجھے شادی کے لیے بہت زیادہ فورس کرنا شروع کیا تو میں نے ایک دن اپنی بہن کو اپنے اور سعدیہ کے بارے میں ڈرتے ڈرتے سب کچھ بتا دیا اور اپنی بہن سے کہا کہ میرے لیے سعدیہ کا رشتہ مانگنے جائیں۔''

باجی نے پہلے تو مجھے بہت ڈانٹا کہا اور کہا کہ اپنی پڑھائی پر دھیان دو۔ یہ پیار ویار سب چند دنوں کی باتیں ہیں۔ پھر بھی وہ لوگ زمیندار ہیں۔ وہ تمہیں اپنی بیٹی کا رشتہ نہیں دیں گے۔''

یہ سن کر میرے دل پر گھونسا سا لگا لیکن سعدیہ سے دور جانے کا تو میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے میں روز اپنی بہن کی منتیں کرتا کہ باجی آپ ایک بار رشتہ مانگو تو سہی، اگر انہوں نے منع کر دیا تو میرا نصیب۔''

ادھر سعدیہ میری منتیں کرتی اور میں باجی کی مگر میری باجی ہر بار منع کردیتی۔

☆......☆......☆

ایک دن میں باجی کے پاس بیٹھ کر بہت رویا۔ میں نے کہا۔

''باجی آج اگر میرا باپ، میری ماں زندہ ہوتے تو وہ میرے یہ آنسو نہ دیکھ پاتے اور میری خوشی کے لیے وہ سعدیہ کے گھر میرا رشتہ لے کر ضرور جاتے۔ میری باتیں سن کر اور میرے آنسو دیکھ کر میری بہن کے آنسو بھی نکل آئے۔ ہم دونوں بہن بھائی اپنے ماں باپ کو یاد کرتے رونے لگے۔ میری بہن نے مجھے حوصلہ دیا۔

''میرے بھائی چپ ہو جاؤ۔ میں کل ہی تیرے لیے سعدیہ کا رشتہ مانگنے جاؤں گی۔''

دوسرے دن باجی گھر کے کام سے فارغ ہو کر سعدیہ کے گھر گئی اور میں بے چینی سے اپنی بہن کا انتظار کرنے لگا۔

میں ظہر کی نماز پڑھنے مسجد گیا۔ وہاں جا کر بھی خوب دعا کی کہ یا اللہ سعدیہ کے گھر والے ہمارے رشتے کے لیے ہاں کر دیں۔''

نماز پڑھ کر میں گھر آیا تو باجی آ چکی تھیں۔ میں نے پوچھا'' باجی کیا ہوا سعدیہ کے گھر والوں نے کیا رشتے کے لیے کیا جواب دیا۔''

میری بہن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انھوں نے بتایا کہ سعدیہ کے گھر والے سعدیہ کا رشتہ طے کر چکے ہیں۔ اور ہمیں انکار کر دیا ہے۔''

یہ سن کر میں بہت رویا اور پتا نہیں کب تک میں روتا رہا۔

ادھر جب صبح میری سعدیہ سے بات ہوئی تو سعدیہ بھی پریشان تھی۔ ہم بیٹھے کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ سعدیہ نے کہا۔

'' میں شادی کروں گی تو صرف تم سے، ورنہ مر جاؤں گی۔ ''میں نے کہا۔

''اچھا سعدیہ اب تم گھر جاؤ بہت ٹائم ہو گیا ہے۔'' سعدیہ نے کہا۔

''نہیں میں نہیں جاؤں گی۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ ہم بھاگ کر شادی کر لیتے ہیں۔''

میں نے کہا۔'' سعدیہ اس سے ہمارے گھر والوں کی کتنی بدنامی ہوگی۔'' سعدیہ نے کہا۔

'' ساجن! میں ہر بدنامی سہہ لوں گی مگر تمہارے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتی۔'' میں نے سعدیہ کو گھر بھیجنے کی بہت کوشش کی مگر سعدیہ نہیں مانی۔ آخر کار میں نے سعدیہ کو یہ کہہ کر گھر بھیج دیا کہ مجھے دو دن دو۔ تاکہ میں کچھ پیسوں کا انتظام کر سکوں اور دیگر گزارے لائق چیزوں کا بھی۔ بڑی مشکل سے سعدیہ کو گھر بھیجا۔ دو دن بعد ملنے کے وعدے کے ساتھ۔

☆......☆......☆

دو دن بعد سعدیہ پھر آ گئی۔ میں نے کہا کہ سعدیہ میرے پاس پیسوں کا تھوڑا انتظام ہو گیا ہے، تھوڑا اور کرنا ہے۔ مجھے دو تین دن اور دے دو۔''

میری بات سن کر وہ رونے لگی اور میرے پیروں میں گر گئی۔

'' ساجن میں پچاس ہزار روپے ساتھ لائی ہوں۔ کچھ تمہارے پاس ہیں۔ ہم آج ہی کہیں چلتے ہیں۔ میں گھر واپس کسی قیمت پر نہیں جاؤں گی۔''

میرے بہت سمجھانے پر بھی جب وہ نہیں مانی اور مسلسل روتی رہی تو۔ میرا بھی دل پگھل گیا۔ میں نے گاڑی پکڑی اور ہم دونوں کراچی آ گئے۔ کراچی میں محمود آباد کے علاقے میں ہم نے ایک کرائے کا مکان لیا اور کورٹ میرج کر کے رہنے لگ گئے۔

☆......☆......☆

تقریباً ہمیں یہاں رہتے ہوئے دو مہینے ہوئے تھے۔ ایک دن رات میں دروازہ بجا میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے سعدیہ کے ابو اور چچا کھڑے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ خیر میں نے اُن کو اندر آنے کا کہا وہ اندر آئے۔ سعدیہ نے اپنے ابو کو دیکھا تو بہت خوش ہوئی۔ سعدیہ کے ابو نے کہا۔

''بیٹا ہم آپ کو لینے آئے ہیں چلو ابھی چلتے ہیں۔'' سعدیہ نے کہا۔ ابو آج رات آپ لوگ یہاں رُکیں صبح خدا بخش بھی اور ہم ساتھ چلیں گے۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ ابھی چلو مگر سعدیہ نہیں مانی۔ آخر مجبور ہو کر انہوں نے کہا ٹھیک ہے صبح چلیں گے۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد سب سونے کی تیاری کرنے لگے۔

ہمیں لیٹے ہوئے آدھا گھنٹہ ہوا ہوگا پھر دروازہ بجا۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے پولیس کھڑی تھی۔ میں نے پوچھا۔

''جی کیا کام ہے۔'' تو انہوں نے کہا۔

''ادھر آؤ بات سنو۔'' میں نے ابھی قدم اٹھایا ہی تھا کہ سعدیہ کے ابو نے کہا پکڑ لو یہی ہے خدا بخش۔'' پولیس نے فوراً مجھے پکڑ لیا۔ سعدیہ نے شور شرابہ سنا تو اُٹھ کر

آ گئی۔'' اس نے دیکھا کہ مجھے پولیس نے پکڑا ہوا ہے تو فوراً مجھے چھڑانے کی کوشش کی۔ سعدیہ کے ابو نے سعدیہ کو پکڑ لیا اور کہا۔

''تم اِدھر آؤ۔'' اور پولیس والوں سے کہا۔'' اس کو لے جاؤ۔ وہ مجھے لے جانے لگے تو سعدیہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

کبھی اپنے ابو کو تو کبھی پولیس والوں کو کوسنے اور برا بھلا کہنے لگی۔

پولیس نے تھانے پہنچتے ہی مجھے الٹا لٹکا کر مارنا شروع کر دیا۔ مار کھاتے کھاتے میں بیہوش ہو گیا۔ وہ مجھے وہیں پھینک کر لاک اپ کو تالا لگا کر چلے گئے۔ صبح مجھے عدالت میں پیش کیا گیا۔

''جج صاحب اس نے سعدیہ کو اغواء کیا ہے۔''

میں نے کہا۔'' جج صاحب میں نے سعدیہ کو اغواء نہیں کیا سعدیہ تو میری بیوی ہے۔ آپ سعدیہ کو بلا کر پوچھ لیں۔ ہم نے شادی کی ہے۔ میں نے اغواء نہیں کیا۔'' جج صاحب نے پولیس سے پوچھا۔

''سعدیہ کہاں ہے؟'' پولیس نے بتایا کہ سعدیہ اپنے ابو کے ساتھ باہر بیٹھی ہے۔'' جب میں نے یہ سنا کہ سعدیہ یہیں موجود ہے تو میری جان میں جان آ گئی۔ میں شور کرنے لگ گیا۔

''جج صاحب آپ سعدیہ کو بلا کر پوچھیں۔'' جج صاحب نے میرے آنسو دیکھے اور کہا کہ سعدیہ کو فوراً پیش کرو۔''

سعدیہ جیسے ہی عدالت میں داخل ہوئی اسے دیکھتے ہی میں اپنے سارے درد بھول گیا۔ مجھے جیسے سکون مل گیا تھا۔ جج صاحب نے سعدیہ سے پوچھا کہ تم اس کو جانتی ہو۔ سعدیہ نے کہا۔

''جی جانتی ہوں۔''

جج صاحب نے کہا کہ اس نے تمہیں اغوا کیا تھا یا تم خود اپنی مرضی سے اس کے ساتھ رہ رہی تھیں۔''

سعدیہ نے کہا۔'' جج صاحب یہ مجھے میرے گاؤں سے اغواء کر کے یہاں لے کر آیا ہے اور مجھ سے زبردستی زیادتی کرتا رہا ہے۔'' یہ سن کر میرے تو ہوش اُڑ گئے۔ پھر مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ جج نے مجھے اغواء اور زنا کے کیس میں جیل بھیج دیا۔ دو سال ہو گئے ہیں میں جیل میں پڑا ہوں۔

اللہ جانے سعدیہ کو اس کے گھر والوں نے کیا کہا کہ وہ مجھے چھوڑنے کے درپے ہو گئی۔ اب پتا نہیں وہ کن حالات میں ہے مگر میری زندگی میں یہ محبت اندھیرا کر گئی ہے۔

☆......☆......☆

ساجن کی کہانی سن کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں نے ساجن سے پوچھا کہ اب تمہاری کورٹ کی تاریخ کب ہے۔''

ساجن نے کہا کہ کل ہے۔''

''تم اپنے بیل آرڈر کی کاپی لے کر آنا۔''

دوسرے دن ساجن اپنے آرڈرز کی کاپی لے کر آیا تو میں نے اس سے کہا کہ ساجن میرے پاس کچھ پیسے پڑے ہیں جو میں نے وکیل کو دینے ہیں۔ یہ میں تمہاری شیورٹی کے لیے دے دیتا ہوں۔ میرے بھائی پر تم مجھے پانچ چھ دن بعد لازمی واپس کر جانا۔''

ساجن نے کہا کہ ''افتخار بھائی آپ فکر نہ کریں۔ میں جیل سے نکلتے ہی پیسوں کا بندوبست کر لوں گا۔''

میں نے اپنے کیس کے لیے جو رکھے ہوئے جو پچیس ہزار روپے رکھے ہوئے تھے، اٹھا کر ساجن کو دے دیے۔

ایک ہفتے میں ساجن رہا ہو کر چلا گیا۔ ساجن کو رہا ہوئے پانچ ماہ گزر گئے ہیں مگر ساجن واپس نہیں آیا۔

اب بتایئے ساتھیو! یہ دنیا ایسی جگہ ہے جہاں کسی پر بھروسا کیا جا سکے؟

ساجن نے میرے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ لیکن کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کہیں ایسا نہیں سعدیہ کے گھر والوں نے اُسے جیل سے نکلتے ہی اپنے انتقام کا نشانہ بنا لیا ہو۔

کچھ بھی ہو سکتا ہے مگر...... یہ میرے بھروسے کا جو خون ہوا اس کا کیا......

پلیز آپ لوگ کسی کی باتوں میں آ کر اپنے بھروسے کا خون مت کر دیجیے گا۔

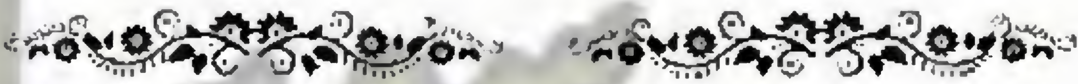
☆☆☆☆☆

ہم شکل

ایم اے راحت

سچی کہانیاں میں پہلی بار، برصغیر کے نامور قلم کار، ایم اے راحت کے قلم کا جادو

سطر سطر تجسس سموئے، نئے سنسنی خیز سلسلے کی نویں کڑی



خلاصہ

شاہ زیب کا تعلق روایت پسند گھرانے سے تھا۔ مشترکہ خاندان پر مبنی اس خاندان میں شاہ زیب سب سے چھوٹا اور لاڈلا فرد ہے۔ خاندان کی بزرگ، دادی اماں بڑی اہمیت کی حامل شخصیت ہیں۔ اُن کے قصوں اور ٹوٹکوں سے ہر فرد مستفید ہوتا ہے۔ ایک دن قصوں کے درمیان دادی اماں نے کہا کہ دنیا میں اللہ نے ہر انسان کے سات ''ہمشکل'' بنائے ہیں۔ ایک دن شاہ زیب کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی۔ ہسپتال لے جانے کے بعد ڈاکٹر شاہ زیب کو برین ٹیومر ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔ شاہ زیب زندگی کے باقی ماندہ دنوں کو ہسپتال کی نذر کرنے کے بجائے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے اور یوں وہ گھر والوں کو اطلاع دیئے بغیر شہر سے دور سفر پر نکل جاتا ہے۔ دلاور ایک عادی مجرم ہے اور اس کی شکل شاہ زیب سے مشابہ ہے۔ دلاور کے دھوکے میں پولیس شاہ زیب کو گرفتار کر لیتی ہے۔ دلاور ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہوکر شاہ زیب کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد دلاور شاہ زیب کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ طویل سفر کرنے کے بعد ریل اسٹیشن پر رُکتی ہے تو ایک مجمع اُسے نظر آتا ہے۔ ایک لڑکی شاہ زیب کو ''عالی'' کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ مجمع میں موجود ایک بزرگ اُسے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے جانے پر مجبور کرتا ہے۔ شاہ زیب کو اپنی دادی کی بات یاد آتی ہے سات ہمشکل والی یعنی کہ ایک اور ''ہمشکل'' اس نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ذہنی کوفت کا شکار ہو جاتا ہے۔ گھر پہنچنے کے بعد شاہ زیب کو معلوم پڑتا ہے کہ ''عالی'' جو اس گھر کا بیٹا ہے وہ شاہ زیب کا ہم شکل ہے۔ اسٹیشن والی لڑکی جس کا نام نشاط ہے وہ عالی کی بیوی ہے عالی نشاط سے غلط فہمی کا شکار ہوتے ہوئے گھر سے چلا گیا تھا۔ اب شاہ زیب کو عالی سمجھ کر سب گھر والے اور نشاط سمجھانے کی اور غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاہ زیب نے بڑی مشکل سے ان کو یہ بات باور کرائی کہ وہ عالی نہیں شاہ زیب ہے جس کی شکل عالی سے مشابہہ ہے۔ بہرکیف عالی کے خاندان والوں کو جب شاہ زیب کی حقیقت معلوم ہوئی تو وہ اس کے احسان مند ہوگئے اور شکریہ ادا کرتے اس سے اس کے بارے میں معلوم کرنے لگے۔ شاہ زیب نے بتایا کہ اس کی دادی ماں نے ایک بار کہا کہ ہر انسان کے سات ہمشکل ہوتے ہیں بس میرا دل چاہا کہ اپنی زندگی میں اپنے ہمشکلوں کو تلاش کروں اور یقین کریں کہ مجھے میرے دو ہمشکل مل گئے ایک دلاور اور آپ کا عالی اور تیسرا میں اور اب چوتھے ہمشکل کی تلاش ہے۔ عالی کے گھر والے اس کو خاصی رقم دے کر رخصت کرتے ہیں۔ شاہ زیب اپنے تیسرے ہم شکل عالی کے بعد وہاں سے نکل کر ایک فور اسٹار ہوٹل میں جاتا ہے۔ اب شاہ زیب کی زندگی میں بیزار و آجاتا ہے۔ وہ برطانیہ کے ایک خفیہ گینگ سے منسلک ہے۔ جس نے



سیزارو کو ہائی جیک کیا ہوا ہے۔ ابھی شاہ زیب سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اُسے کوروتی ٹکرا جاتی ہے۔ کچھ بندے اُسے زبردستی اُس جگہ پہنچا دیتے ہیں جہاں پر ڈینیل نے کوروتی کو رکھا ہوا ہے۔ سیزارو کی بہن سیسل سے بھی شاہ زیب کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اچانک سیزارو کا قتل ہو جاتا ہے۔ شاہ جانتا تھا کہ اِس قتل کے پیچھے ڈینیل کا ہاتھ ہے۔ مگر وہ بے بس تھا۔ سیسل پھر شاہ زیب سے ٹکراتی ہے اور بتا دیتی ہے کہ وہ اپنے بھائی کا انتقام لینا چاہتی ہے۔ شاہ زیب اُس کی ہر ممکن مدد کا وعدہ کرتا ہے۔ مگر اس شرط پر کہ وہ اُسے بتادے کہ سیزارو کا اصل مشن کیا تھا اور وہ ڈینیل کے ساتھ کام کیوں کر رہا تھا۔ کوپن ہیگن سے شاہ زیب کا اگلا پڑاؤ سوئیڈن ہوتا ہے۔ سوئیڈن میں شاہ زیب کو انیشا ٹکراتی ہے اور پھر انیشا کے دادا جان مسٹر سائمن سے اُس کی ملاقات ہوتی ہے۔ مسٹر سائمن اُسے ایشیائی جان کر بہت محبت سے پیش آتے ہیں۔ انہیں بارہ سنگھے بہت پسند ہیں۔ وہ اپنی ہر بات میں بارہ سنگھے لے آتے ہیں۔ شاہ زیب کسی طرح سے اُن کی مہمان نوازی سے فراغ ہو کر واپس کوپن ہیگن آ جاتا ہے۔ یہاں وہ دوبارہ ڈینیل کے بندوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے اور پھر پولیس اُس کے ہم شکل کی تلاش میں اُسے دھر لیتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہی پولیس پھر سے اُسے ڈینیل کے پاس پہنچا دیتی ہے۔ جہاں اُس کی ملاقات پھر کوروتی سے ہوتی ہے۔ اب شاہ زیب کے پاس ایک نئی حیرت کی دنیا ہے۔ اُسے کوروتی کو لے کر اُس کے آباؤ اجداد کی کھوج میں ہندوستان جانا ہے۔ شاہ زیب بھاری معاوضے پر یہ ڈیل فائنل کر لیتا ہے۔ جب کوروتی کو لے کر وہ کوپن ہیگن چھوڑنے لگتا ہے تو حادثاتی طور پر اُسے سیسل کی لاش دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ سیسل کو بھی ڈینیل نے راستے سے ہٹا دیا ہے۔ مگر وہ بے بس ہو کر سفر شروع کر دیتا ہے۔ کوروتی کو ایک ریاست کی راج کماری کے طور پر شاہ زیب سے متعارف کرایا گیا تھا۔ یہاں اِس کا ہم شکل کنور شمشیر سنگھ کوروتی سے اُس کے خزانے کا نقشہ لے اُڑا تھا۔ اب شاہ زیب نے کنور شمشیر سنگھ بن کر کوروتی کی حقیقت معلوم کرنی تھی۔ کوروتی اور شاہ زیب ہندوستان کی سرزمین پر میاں بیوی کے روپ میں قدم رکھ دیتے ہیں۔

اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد عورت بولی ”بس میں اپنی زندگی کے بارے میں خود بھی کچھ نہیں جانتی۔ کون ہوں، کیا ہوں، یہ بہت سے سوالات میرے ذہن میں الجھتے رہتے ہیں۔“

”نام کیا ہے آپ کا؟“

”نام.. ہم ناموں کو تعارف کا ذریعہ سمجھتے ہیں، تعارف کے لیے بعض اوقات صورتیں بھی کافی ہوتی ہیں۔ تم مجھے اپنی ایک صورت آشنا سمجھ لو۔“ ”اور کیا یہ اس حقیقت سے انحراف نہیں ہے کہ آپ اپنے آپ کو برتر سمجھتی ہیں۔“

”نہیں یہ حقیقت ہے کہ میں بہت سوں سے برتر ہوں۔“ عورت نے جواب دیا۔

”اور اگر میں آپ کی برتری تسلیم نہ کروں۔“

”کوئی بات نہیں، میں برتری تسلیم کراتی ہوں اور کچھ دن کے بعد میرے شناساؤں کو اپنے خیالات تبدیل کرنا پڑتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں ایک غرور سا شامل ہو گیا تھا، لیکن نجانے شاہ زیب کو اس کے یہ الفاظ اپنی توہین محسوس ہوئے۔ اس نے آہستہ سے کرسی پیچھے کھسکائی اور بولا۔

”میڈم ہو سکتا ہے آپ ڈرامائی زندگی گزارنے کی عادی ہوں، آپ نے اپنے آپ کو ایک پراسرار اور پُر سحر شخصیت تسلیم کیا ہو لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص آپ کو اسی حیثیت سے تسلیم کر لے۔ میں سوچ رہا تھا کہ آپ سے آپ کے بارے میں معلوم کروں اور میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ میرے ذہن میں تجسس تھا لیکن آپ اپنے آپ کو بہت زیادہ ڈرامائی بنانے کی کوشش کر رہی ہیں تو معاف کیجیے گا میرے ذہن میں آپ کا وہ مقام نہیں رہا، ہاں اگر آپ اچھے انسانوں کی طرح مجھ سے اپنا تعارف کروا دیتیں تو شاید میں آپ کی دوستی قبول کر لینے پر غور بھی کرتا۔“

”جا رہے ہیں، ٹھیک ہے ظاہر ہے میں نے آپ کو خود نہیں بلایا تھا، آپ آئے تھے، آپ کو جانے سے روک بھی نہیں سکتی، لیکن ایک بات ذہن نشین کر لیجیے کہ وقت ہمارا خود تعارف کرائے گا اور اس وقت آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ نے میری دوستی کی پہلی کوشش کو قبول نہیں کیا۔“

شاہ زیب تلخی سے مسکرایا اور ہال سے نکل کر واپس اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچ گیا۔ کمرے میں آ کر اس نے لباس

تبدیل کیا اور سونے کے لیے مسہری پر دراز ہوگیا۔ ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ دفعتاً دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ شاہ زیب نے چونک کر گھڑی دیکھی، اس وقت روم سروس کا کوئی آدمی تو نہیں ہوسکتا کیونکہ قواعد کے مطابق مقررہ اوقات کے بعد مہمانوں کے دروازے نہیں کھٹکائے جاتے۔ پھر کون ہے؟ شاہ زیب نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ نارنجی رنگ کی خوبصورت ساڑی میں ملبوس ایک درمیانی جسامت کی لڑکی سامنے کھڑی تھی۔

''جی فرمایئے؟'' شاہ زیب نے سوال کیا۔ ''تھوڑی سی جگہ دیں گے اندر آنے کے لیے؟'' اس نے بے باکی سے سوال کیا اور شاہ زیب بے اختیار پیچھے ہٹ گیا، وہ اندر آگئی اور دروازہ بند کردیا۔

''کون ہیں آپ.. اور کیا چاہتی ہیں؟'' شاہ زیب نے اس کی اس حرکت کو تعجب کی نگاہ سے دیکھا تھا۔

''میں تنہائیوں کی ساتھی ہوں، سرلا ہے میرا نام۔''

''کس نے آپ سے کہا کہ میں تنہا ہوں؟''

''میرے دل نے، میں نے محسوس کیا کہ تم یہاں اس وقت کسی کی کمی محسوس کررہے ہو۔''

''دروازہ کھولو اور باہر نکل جاؤ، میں تم جیسی لڑکیوں کو اچھی طرح سمجھتا ہوں، سوری ڈیئر، تم غلط کمرے میں آگئی ہو۔''

''میں کبھی غلط جگہ کا انتخاب نہیں کرتی۔'' ''کاش.. تم کوئی شریف لڑکی ہوتیں تو میں تمہیں احترام سے کہتا کہ بیٹھو یا چلی جاؤ۔''

جواب میں وہ شاہ زیب کی صورت دیکھتی رہی، اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ آہستہ آہستہ غائب ہوتی جارہی تھی، شاہ زیب نے لڑکی کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھے تو آہستہ سے بولا۔

''لڑکی! میں ان راستوں کا راہی نہیں ہوں جن کا تم نے مجھے سمجھ لیا ہے، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ میں یہاں اس کمرے میں تنہا ہوں۔''

''سوری مسٹر، سوری دراصل.. دراصل..'' اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''ہاں کہو... آگے کہو۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''کوئی بات نہیں، میں جارہی ہوں۔'' اس نے دروازہ کھولا اور واپسی کے لیے پلٹی۔

''ایک منٹ.. ایک منٹ اندر آؤ۔'' شاہ زیب نے کہا اور وہ ایک لمحے کے لیے رکی پھر اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ واپس آگئی۔ ''نہیں تم غلط سمجھی ہو، میں نے تمہارے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر دیکھا جس نے مجھے تمہیں دوبارہ واپس بلانے پر مجبور کردیا۔ میرا وہ مقصد نہیں ہے جو تمہارے ذہن میں آیا ہے۔''

''دراصل جناب میں... میں اس وقت مجبور ہوں۔ انتہائی مجبور.. مجھے پیسے چاہیے ہیں، میرے لیے تھوڑی سی رقم بے حد ضروری ہے، ورنہ بہت سے نقصانات سے دوچار ہوسکتی ہوں۔ جانے کیوں آج تقدیر ساتھ نہیں دے رہی، کئی جگہ کوشش کی، لیکن کامیابی نہیں ہوئی، بڑی ہمت کرکے یہاں تک پہنچی تھی۔''

''ہوں.. کم از کم کتنی؟'' شاہ زیب نے سوال کیا۔ ''جو کچھ بھی آپ دے دیں۔''

''لو یہ پیسے رکھ لو اور جاؤ، اگر تم فریب کررہی ہو تو بھی مجھے یہ پیسے دے کر کوئی افسوس نہیں ہوگا، لیکن بہتر ہے کہ آئندہ ایسا فریب کبھی کسی کے ساتھ نہ کرنا۔'' اس نے عجیب سی نظروں سے شاہ زیب کو دیکھا، پیسے لیے اور آہستہ سے بولی۔

''بھگوان کی سوگند، میں نے فریب نہیں کیا۔'' اس نے یہ کہا اور پھر باہر نکل گئی۔ شاہ زیب نے دروازہ بند کرلیا اور واپس بستر پر آلیٹا، تھوڑی دیر کے بعد اسے نیند آگئی تھی۔

☆☆☆

صبح تقریباً ساڑھے آٹھ بجے آنکھ کھلی تو شاہ زیب نے گنگناتے ہوئے غسل خانے کا رخ کیا ابھی پوری طرح نہا بھی نہیں سکا تھا کہ دروازے پر زور زور سے دستک سنائی دینے لگی، شاہ زیب نے غسل خانے ہی سے آواز لگائی کہ انتظار کروا رہا ہوں، کوئی ویٹر وغیرہ ہوسکتا تھا، غسل کے بعد بال سنوارتا ہوا باہر نکلا۔ پہلے جس شخص پر نگاہ پڑی وہ ہندوستانی پولیس آفیسر تھا۔ اس کی آنکھیں شاہ زیب کو گھور رہی تھیں، پھر اس نے مشتبہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا اور فوراً ہی اندر گھس آیا، اس کے پیچھے تین پولیس والے اور ہوٹل کے عملے کے کچھ افراد بھی تھے جنہیں شاہ زیب نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ ان سب کو اس جارحانہ انداز میں اندر

آتے دیکھ کر شاہ زیب ہکا بکا رہ گیا تھا، اس کی چھٹی حس نے اعلان کیا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔

''ہوں... تو یہ تم ہو۔'' آفیسر نے شاہ زیب کو گھورتے ہوئے کہا۔

''خیریت آفیسر کیا بات ہے؟'' شاہ زیب نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

''اور کون رہتا ہے یہاں تمہارے ساتھ؟''

''کوئی نہیں، مگر تمہیں کیا تکلیف ہے؟''

''تکلیف تو تمہیں پہنچنے والی ہے دوست۔ کتنی معصوم صورت بنائے کھڑے ہو۔''

''آفیسر.. بات بتائے بغیر فضول باتوں سے گریز کریں آپ؟'' شاہ زیب نے کسی قدر کرخت لہجے میں کہا جس کے اثرات کچھ بہتر نمایاں ہوئے اور آفیسر ایک لمحے کے لیے جھجک گیا تھا، پھر اس نے کہا۔

''تم نے لڑکی کو کیوں قتل کیا، کیا بات تھی؟''

''کیا؟'' شاہ زیب نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

''تمام مجرم ایسی ہی اداکاری کرتے ہیں۔''

''میں ایک بار پھر آپ سے کہہ رہا ہوں آفیسر کہ ذرا احتیاط سے گفتگو کریں، میں بھی کوئی گیا گزرا آدمی نہیں ہوں، آپ کو مشکل پڑ جائے گی۔''

''مجرم کتنا ہی بڑا آدمی ہو، پولیس اسے کوئی اہمیت نہیں دیتی۔''

''آپ مجھے کم از کم یہ تو بتائیے کہ مجھ پر الزام کیا ہے؟''

''تم نے سرلا نامی لڑکی کو قتل کیا ہے۔''

''کیا؟'' شاہ زیب حیرت سے اچھل پڑا، سرلا کا نام وہ بھول نہیں سکا تھا، پھر شاہ زیب نے بے ساختہ پوچھا ''کک... کیا، کیا اسے قتل کر دیا گیا؟''

''کیا تم سرلا کے قتل کی وجہ بتا سکتے ہو؟''

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے آفیسر، کہاں ہے اس کی لاش؟''

''جہاں تم نے اسے پھینکا، سیڑھیوں کے نیچے جو خلاء بنا ہوا ہے وہاں لاش پڑی ہے۔ پولیس وہاں متعین ہے، کیا سمجھے، وہاں تمہاری انگلیوں وغیرہ کے نشانات ضرور موجود ہوں گے، سب کچھ پتا چل جائے گا، چلو تیاریاں کرو۔''

''کک... کہاں؟''

''پولیس اسٹیشن، ظاہر ہے تمہیں وہیں لے جانا ہے۔'' پولیس آفیسر نے کہا۔

شاہ زیب بڑا پریشان ہو گیا تھا، سرلا بے شک اس کے پاس آئی تھی، لیکن قتل۔ کس نے قتل کر دیا اسے، شاہ زیب پولیس آفیسر کے ساتھ باہر نکل آیا۔ اس کا تمام سامان پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا اور پولیس آفیسر اسے ساتھ لے کر باہر نکل آیا، یہی شکر تھا کہ اس نے شاہ زیب کے ہاتھ میں ہتھکڑی لگانے کی کوشش نہیں کی تھی، غالباً اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اسے شواہد ضرور ملے تھے کہ سرلا کا قاتل شاہ زیب ہو سکتا ہے، لیکن کوئی ٹھوس ثبوت اس کے پاس موجود نہیں تھا جو شاہ زیب کو سرلا کا قاتل ثابت کر سکتا۔ شاہ زیب کی درخواست پر آفیسر نے سیڑھیوں کے نیچے سرلا کی لاش دکھائی جس کے فوٹو گراف وغیرہ بنائے جا چکے تھے اور اب اسے اٹھانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سرلا کو غالباً گردن دبا کر ہلاک کیا گیا تھا، شاہ زیب کو اس لڑکی کا مظلوم چہرہ دیکھ کر نجانے کیوں بے حد دکھ ہوا، اس نے چلتے وقت قسم کھائی تھی کہ اس نے شاہ زیب سے فریب نہیں کیا، لیکن اسے کس نے قتل کیا، شاہ زیب کا ذہن چند لمحات کے لیے ماؤف ہو گیا تھا۔

پولیس آفیسر کو خواہ مخواہ شاہ زیب سے کدورت ہو گئی تھی۔

''گڈ.. وری گڈ، آپ تو یوں لگتا ہے جیسے انگریزوں کا ہندوستان سے لے جایا ہوا سارا مال واپس لے آئے ہیں، لندن ہی سے لائے ہیں نا یہ سونے کے زیورات اور جواہرات وغیرہ۔'' شاہ زیب خاموش رہا تھا آفیسر نے پھر کہا۔

''آیئے.. بہتر ہے کہ یہ سب سامان یہاں سے نکال لیا جائے کیونکہ اب اس سامان کو پولیس کی تحویل میں ہی رہنا چاہیے۔''
شاہ زیب بھلا انکار کر سکتا تھا، ڈی ایس پی نے سامان نکلوا کر ایک تھیلے میں بھرا اور اسے سیل کر دیا، شاہ زیب کو لاک اپ میں بھیج دیا گیا۔ ڈی ایس پی نے تھانے جا کر شاہ زیب سے اور کوئی بات نہیں کی۔ آفیسر کے اس رویے کی بنیادی وجہ شاید یہ تھی کہ شاہ زیب نے اس کے ساتھیوں کے سامنے بہت تلخ اور کسی قدر بدتہذیبی سے گفتگو کی تھی۔ چنانچہ وہ شاہ زیب کو زیادہ سے زیادہ ذلیل و خوار کرنے پر تل گیا تھا۔ لاک اپ میں پہنچنے کے بعد جب شاہ زیب نے سنجیدگی سے حالات پر غور کیا تو دفعتاً ہی اسے غصہ آ گیا۔ ان لوگوں نے جو سلوک شاہ زیب کے ساتھ کیا تھا وہ سراسر زیادتی تھی، بھلا کیا ثبوت ہے ان کے پاس کہ وہی سرلا کا قاتل ہے۔ بے شک وہ شاہ زیب کے کمرے میں کچھ دیر کے لیے آئی تھی اور جتنی گفتگو اس نے کی اس بارے میں جانے بغیر ان لوگوں نے شاہ زیب کو اس کا قاتل سمجھ لیا۔
شاہ زیب کو پولیس اسٹیشن میں چار گھنٹے گزر چکے تھے پھر ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی موجودگی میں اسے باہر نکال لیا گیا۔ ڈپٹی کسی قدر نرم مزاج اور سلیقے کا آدمی تھا، اس نے سر سے پاؤں تک شاہ زیب کو دیکھا اور پھر کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر وہ شاہ زیب سے بولا۔
''کیا یہ سچ ہے کہ آپ نے سرلا کو ہلاک کر کے اس کی لاش ہوٹل کی سیڑھیوں کے نیچے پھینک دی۔''
''آفیسر! بہت افسوس کی بات ہے کہ کسی بھی حقیقت کا ثبوت حاصل کیے بغیر آپ نے مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کی اور انتہائی غیر ذمے دارانہ انداز میں مجھے یہاں لے آیا گیا۔''
''نہیں... ایسی بات نہیں ہے، دراصل آپ کے سلسلے میں چند ایسے لوگوں نے گواہیاں دی ہیں جنھوں نے سرلا کو اور آپ کو ایک ساتھ دیکھا ہے۔''
''غلط.. بالکل غلط...''
آپ کا ان سے تعارف کرائے دیتا ہوں، بلاؤ۔'' اس نے غالباً انسپکٹر سے کہا اور اس نے ایک شخص کو اندر بلا لیا جو ویٹر کے لباس میں ملبوس تھا، شاہ زیب کے لیے یہ چہرہ بالکل اجنبی تھا۔ اندر آنے کے بعد وہ سہما سہما ایک طرف کھڑا ہو گیا۔
''ہوں... تم بتاؤ، تم نے کیا دیکھا؟'' ڈی ایس پی نے پوچھا۔
میری رات کی ڈیوٹی تھی، اس وقت مہمانوں کی آمد و رفت بہت کم ہو گئی تھی، میں گیلری میں کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا تھا کہ میں نے اس لڑکی کو ان کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ کمرے کے اندر چلی گئی اور میں پریشانی سے یہ سوچتا رہ گیا کہ منیجر صاحب کو اس بارے میں اطلاع دوں یا نہ دوں.. صاحب.. ہمارے ہوٹل میں عیاشی نہیں ہوتی، ہم نے اس سلسلے میں خاص طور سے نگاہ رکھی ہے، مگر یہ سب کچھ.. یہ سب کچھ.. میں وہاں سے ہٹ کر منیجر صاحب کے کمرے کی طرف گیا تو منیجر صاحب مجھے اپنے کمرے میں نہیں ملے، بہر طور میں واپس گیلری میں آ گیا۔ پھر میں نے سوچا کہ جب وہ واپس جائے گی تو میں اس سے بات چیت کروں گا، پھر میں انتظار ہی کرتا رہا، لیکن وہ واپس نہیں گئی۔''
''ہوں... کیا خیال ہے جناب، ویسے اتفاق سے ہم ابھی تک آپ کے بارے میں بھی نہیں جان سکے''
''میرا نام شاہ زیب ہے، آوارہ گرد ہوں اور بغرض سیاحت یہاں آیا ہوا ہوں، زیادہ دن نہیں گزرے، آگرہ اور دہلی دیکھ کر یہاں پہنچا ہوں، ویسے لندن کا باشندہ ہوں، مستقل وہیں قیام رکھتا ہوں''
''گڈ.. گڈ بہر طور.. ہم آپ کا احترام کرتے ہیں، لیکن قانون شکنی کو کسی صورت میں بھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ سرلا کو آپ نے کیوں قتل کر دیا؟''
''ڈی ایس پی صاحب میں اس بارے میں بالکل کچھ بھی نہیں جانتا۔ کیوں آپ اس قتل کو میرے نام سے منسوب کر رہے ہیں۔''
''اوہو.. اوہو.. نہیں نہیں، آپ کا یہ خیال غلط ہے، ایک منٹ بلاؤ..'' اس نے پہلے ہی کے انداز میں پھر انسپکٹر سے کہا

اور انسپکٹر پھر باہر نکل گیا، اس بار وہ ایک ایسے شخص کو ساتھ لے کر آیا جو دھوتی اور کرتے میں ملبوس تھا، چہرے ہی سے بدمزاج آدمی نظر آتا تھا، ادھیڑ عمر تھا، وہ اندر آگیا اور آتے ہی بولا۔

صاحب... یہ اچھی بات ہے کرے کوئی بھرے کوئی، یعنی نیکی کرو اور بھاڑ میں چلے جاؤ، ہم سے غلطی ہوگئی صاحب، معاف کردیجیے آئندہ کبھی دھرم سدھارنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ سماجی کارکن نہیں بنیں گے۔ بس غلطی ہوگئی ایک بار آئندہ نہیں ہوگی۔''

''آپ تفصیل تو بتا دیجیے۔'' پولیس آفیسر نے پوچھا۔

''ارے بھائی، تفصیل کیا، بگڑے ہوئے نوجوان ہیں آج کل کے، عیاشی کے بغیر زندگی نہیں گزرتی، ہم اچھے خاصے سو رہے تھے کہ دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی دی، گھر والی نے کہا کہ ہمارے کمرے کے دروازے پر کوئی ہے۔ ہم نے دروازہ کھول کر دیکھا تو وہ لڑکی جس کی لاش سیڑھیوں کے نیچے پڑی ملی ہے ان کے کمرے کا دروازہ بجا رہی تھی۔ پھر انہوں نے دروازہ کھولا اور وہ لڑکی اندر چلی گئی۔ بس جی! یہ ہم نے دیکھا اور دروازہ رام رام کہہ کر بند کرلیا اور یہ فیصلہ کرلیا کہ آئندہ جب بھی کبھی ممبئی آئیں گے ہوٹل میں نہیں ٹھہریں گے، اپنا ہی کوئی ٹھکانا کرنا پڑے گا۔ ہم یہاں کاروبار کے سلسلے میں اکثر آتے رہتے ہیں۔ اس بار ہماری دھرم پتنی اور بیٹی بھی ساتھ آگئی تھیں۔ اب بتایئے وہ ہم سے پوچھنے لگیں کہ کون تھا، کیا جواب دیتے انہیں، رام رام رام...''

''ہوں.. ٹھیک ہے، اب آپ اپنے ہوٹل واپس جاسکتے ہیں، لیکن انسپکٹر ان کے بارے میں تمام تفصیل حاصل کرلیجیے تاکہ اگر ان کی ضرورت پیش آئے تو انہیں بلایا جاسکے۔''

''ارے بھائی، کیوں مصیبت میں پھانس رہے ہو ہمیں۔ ہم بھلا کہاں سے آتے پھریں گے، ہم کاروباری آدمی ہیں، ایک دن کام نہ کریں تو جانے کتنے کا نقصان ہوجاتا ہے۔''

''بہرطور! یہ آپ کو کرنا ہوگا، جایئے۔'' ڈی ایس پی نے کہا اور انسپکٹر اسے ساتھ لے کر باہر نکل گیا، تب ڈی ایس پی شاہ زیب کی طرف دیکھ کر بولا۔

''ہاں جناب! کیا نام بتایا آپ نے اپنا.. شاہ زیب، غالباً۔ شاہ زیب صاحب! اب آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ آپ نے سرلا کو کیوں قتل کیا؟''

شاہ زیب کو صورت حال کا کافی حد تک اندازہ ہوگیا تھا، ویٹر نے سرلا کو اس کے کمرے کے دروازے پر دیکھا تھا، اس کے بعد اس شخص نے جو غالباً اس کمرے کے پڑوس ہی میں رہتا تھا، اب وہ کیا بتاتا ان لوگوں کو کہ اس کے ساتھ کیا بیتی ہے، اس نے مدہم لہجے میں ڈی ایس پی سے کہا۔

''ڈی ایس پی صاحب، ظاہر ہے ان لوگوں نے جو گواہی دی ہے اس کی روشنی میں آپ مجھے ہی مجرم قرار دے سکتے ہیں، لیکن انسانی بنیادوں پر ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں آپ سے...''

''جی جی فرمایئے۔''

''آپ پوری طرح اس مسئلے کی تفتیش کیجیے۔ میں نے قتل نہیں کیا۔ سرلا نامی وہ لڑکی دستک دے کر میرے کمرے میں داخل ہوگئی، اس نے مجھ سے کہا کہ وہ میری تنہائی دور کرنا چاہتی ہے۔ میں نے اس سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔ تب اس نے اپنی مجبوریاں بتائیں، کہنے لگی کہ میں پریشان حال ہوں، میری ماں بیمار ہے اور مجھے اس کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے۔ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ہی میں نے تھوڑی سی رقم اسے دے دی اور اس کے بعد وہ چلی گئی۔ پھر مجھے نہیں معلوم کہ اس کے ساتھ کیا بیتی، کیا ہوا، کیسے ہوا؟''

''بڑی ہلکی کہانی سنائی ہے شاہ زیب! ان دو آدمیوں کی گواہی کے بعد اتنی معمولی سی بات پر یقین نہیں کیا جاسکتا، یہ بات تو آپ تسلیم کرچکے ہیں کہ وہ آپ کے پاس آئی تھی۔''

''جس طرح آئی تھی میں نے آپ کو بتادیا ہے۔''

''اب اس سلسلے میں تو تحقیقات ہی ثابت کرسکتی ہیں کہ صورت حال کیا تھی، آپ اطمینان رکھیے، لاک اپ میں ضرور

رہنا پڑے گا آپ کو، لیکن میں انسپکٹر کو ہدایت کر دوں گا کہ اس وقت تک جب تک آپ کے خلاف کوئی جرم مکمل طور پر ثابت نہ ہو جائے آپ کے ساتھ کوئی بدسلوکی یا گستاخی نہ کی جائے، براہِ کرم اس حد تک پولیس سے تعاون کیجیے، اگر آپ بے گناہ ہیں تو ہمیں آپ کو نقصان پہنچا کر کوئی خوشی نہیں ہوگی۔''

☆☆☆

تیسرے دن ڈی ایس پی نے شاہ زیب کو اپنے آفس میں طلب کر لیا، شاہ زیب کا سامان اس کے سامنے رکھا ہوا تھا، لیکن اس سامان کے ساتھ ایک اور شخصیت کو شاہ زیب نے دیکھا اور اس کے دل میں پریشانی پیدا ہوگئی، یہ وہی جوہری تھا جسے شاہ زیب نے سونے کے سکے فروخت کیے تھے اور ایک بالکل ہی جھوٹی کہانی سنا دی تھی، جوہری کو دیکھ کر شاہ زیب کی پیشانی پر غور و فکر کی لکیریں پھیل گئیں، ڈی ایس پی غالباً اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ جوہری کی یہاں موجودگی کا شاہ زیب پر کیا اثر مرتب ہوا ہے، اس نے اسی شرافت سے شاہ زیب کو بیٹھنے کی پیشکش کی اور پھر بولا۔

''شاہ زیب صاحب! یہ آپ کا سامان ہے۔''

''جی ہاں۔''

''ہوٹل کے کمرے میں یہی تمام سامان موجود تھا یا اس کے علاوہ بھی اور کچھ تھا آپ کے پاس۔''

شاہ زیب نے ایک نگاہ اپنے سامان پر ڈالی ''نہیں یہی میرا سامان تھا۔''

''سوچ لیجیے، کچھ اور بیگ، پرس یا ایسی کوئی چیز ہو جو اس وقت یہاں موجود نہ ہو؟''

''جی نہیں، یہی سب کچھ تھا۔''

''تو آپ کا پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات کہاں ہیں، جیسا کہ آپ نے کہا کہ آپ مقامی نہیں ہیں اور لندن کے شہری ہیں۔ ہندوستان میں آپ بغرض سیاحت آئے ہیں، یقیناً آپ نے یہ سب کچھ سچ ہی کہا ہوگا۔''

شاہ زیب ایک لمحے کے لیے دہشت زدہ سا ہو گیا، بڑی گہری گرفت تھی یہ۔ شاہ زیب نے اپنے آپ کو سنبھالا اور آہستہ سے کہا ''پاسپورٹ میرے بیگ میں ہے غالباً آپ نے اس کی تلاشی نہیں لی۔''

''جی نہیں.... آپ کے تمام سامان کی تلاشی لی جا چکی ہے، پاسپورٹ یا آپ کی شہریت سے متعلق کوئی کاغذ آپ کے اس سامان میں موجود نہیں ہے۔''

''جب میں اپنے کمرے کے ہوٹل میں تھا تو یہ تمام اشیاء میرے سامان میں موجود تھیں۔'' شاہ زیب نے فوراً کہا۔

''ان سے ملیے یہ رام لعل جی ہیں۔ آپ نے ان کے ہاتھ کچھ سونا فروخت کیا تھا۔ کیوں رام لعل جی؟''

''ہاں جی یہی وہ صاحب ہیں۔ انہوں نے یہ بتایا تھا کہ یہ شاہی خاندان کے آدمی ہیں اور یہ سونے کے سکے ان کے ماتا پتا نے ورثے میں ان کے لیے چھوڑے تھے۔ اب انہیں پیسے کی ضرورت ہے تو یہ سونا فروخت کر رہے ہیں۔'' شاہ زیب خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

''کیا خیال ہے شاہ زیب صاحب رام لعل جی جھوٹ بول رہے ہیں۔''

''نہیں۔'' شاہ زیب نے آہستہ سے کہا۔

''آپ چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ آپ رام لعل جی کی صورت بھی نہیں پہچانتے۔ کبھی نہیں دیکھا آپ نے انہیں۔'' شاہ زیب کے منہ سے اب بھی کوئی آواز نہیں نکل سکی تھی۔

''اب بھی بتا دو جانِ من، کہ اتنی قیمتی چیزیں تم نے کہاں سے حاصل کی ہیں؟''

''دوست بتا دوں تو شاید تم یقین نہیں کرو گے؟''

''کوشش کروں گا کہ یقین کر لوں۔ تم بتانے کی کوشش تو کرو۔'' انسپکٹر نے پھر مذاق کیا۔

''لندن میں مجھے ایک ایسا نقشہ دستیاب ہو گیا تھا جو کسی سیاح ہی کا بنایا ہوا تھا اور اس نقشے میں اس خزانے کے

بارے میں تفصیلات تھیں۔ میں اس کی تلاش میں چل پڑا اور یہ خزانہ مجھے فتح پور سیکری میں جودھا بائی کے محل کے ایک گوشے سے دستیاب ہو گیا۔''

''اچھا اچھا گویا یہ خزانہ تم نے زمین کی گہرائیوں سے حاصل کیا ہے۔''

''ہاں۔''

''بیوقوف بنانے کے لیے ہم ہی رہ گئے ہیں۔ وہ نقشہ کہاں ہے جس میں خزانہ پوشیدہ تھا۔'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''وہ بھی پاسپورٹ کے ساتھ دوسرے کاغذات میں شامل تھا۔''

''بہت چالاک آدمی ہو تم، لیکن میں تمہاری بات پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

''تو پھر مجھے اس کے لیے کیا کرنا ہوگا؟''

بات بتانی ہوگی۔''

''صحیح بات اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے کہ یہ خزانہ میں نے زمین کی گہرائیوں سے حاصل کیا ہے''

''رہنے والے کہاں کے ہو؟''

''لندن کا۔''

''یہ تو تم پہلے بھی کہہ چکے ہو، اصل بات بتاؤ۔''

''اصل بات تم خود معلوم کرلو انسپکٹر میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔'' شاہ زیب یہ کہہ کر خاموش ہو گیا، انسپکٹر کو شاید شدید تاؤ آ گیا تھا وہ شاہ زیب کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اچانک پیچھے سے ایک سپاہی کی آواز آئی۔

''سر بڑے صاحب کی کال ہے۔'' انسپکٹر اس کی بات سن کر اپنی جگہ رک گیا، ایک لمحے کے لیے اس نے کچھ سوچا اور پھر ان دونوں آدمیوں کی طرف رخ کر کے بولا۔

''نگرانی رکھنا، میں ابھی آیا۔'' یہ کہہ کر انسپکٹر چلا گیا، کوئی دس منٹ کے بعد وہ واپس آیا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، اس نے آتے ہی شاہ زیب سے کہا۔

''ابھی تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا، کچھ وقت مزید دیا جاتا ہے تمہیں، اچھی طرح سوچ لو کہ تمہیں مار کھانی ہے یا....''

شاہ زیب خاموش ہی رہا تھا، بہر حال اسے پھر لاک اپ میں پہنچا دیا گیا۔

رات ہو گئی، رات کو اپنی جگہ پر لیٹ گیا، اپنے حالات کے بارے میں سوچتا رہا تھا اور پھر نجانے کب نیند آ گئی۔

رات کے کسی پہر اچانک شاہ زیب کی آنکھ کھل گئی تھی، آنکھ کھلنے کی وجہ یہ تھی کہ اسے اپنے بدن میں سوئی کی چبھن کا شدید احساس ہوا تھا اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں، کوئی کیڑا یا سانپ وغیرہ بھی نہیں تھا، پھر اسے ایک دھندلا ہیولا نظر آیا جس کے ہاتھ میں سرنج تھی، اس سے پہلے کہ شاہ زیب کچھ سمجھ پاتا اس پر پھر نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا، غالباً یہ اس انجکشن کا اثر تھا جو اسے لگایا گیا تھا۔

☆☆☆

شاہ زیب کو جب ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک بستر پر پایا، کشادہ کمرہ تھا جس میں آرائشی چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ ماحول بے حد پرسکون تھا۔ پھر شاہ زیب کی نظر ایک لڑکی پر پڑی۔ وہ صاف ستھرا مقامی لباس پہنے ہوئے تھی، کسی قدر خاموش طبع اور چہرے سے سنجیدہ نظر آتی تھی۔ شاہ زیب حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا، کیا یہ بھی پولیس کا کوئی اور ڈیپارٹمنٹ ہے، اس نے دل ہی دل میں سوچا لیکن پھر اپنی زبان بند نہ رکھ سکا اور اس بارے میں سوال کر ڈالا۔

''یہ پولیس ہیڈ کوارٹر ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے متحیرانہ انداز میں کہا۔

''تو پھر یہ کونسی جگہ ہے؟''

''یہ ہمارا گھر ہے۔''

''اور آپ کون ہیں؟''

''میرا نام شانیہ ہے۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''مس شانیہ، نہ تو میں آپ کو جانتا ہوں اور نہ ہی آپ کے گھر والوں کے بارے میں مجھے کچھ تفصیل معلوم ہے میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ پولیس اسٹیشن سے مجھے کون یہاں لایا ہے؟''

''اوہ آپ کے سر میں چوٹ لگی ہے شاید، غالباً آپ ذہنی طور پر بھٹک گئے ہیں۔ پولیس اسٹیشن کا نام بار بار لے رہے ہیں، کیا قصہ ہے یہ؟''

''اگر اداکاری کرنے کی کوشش کر رہی ہو تو ایک بات سن لو، میری زندگی ایسے اداکاروں کے درمیان ہی گزری ہے، میں تمہاری بات سے متاثر نہیں ہو سکتا۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ تم مجھے یہاں کے بارے میں بتانا نہیں چاہتیں۔''

''میرا خیال ہے تمہیں ایک اور انجکشن لینا پڑے گا تا کہ تمہاری ذہنی کیفیت بھی درست ہو جائے''

''مطلب یہ کہ بے ہوشی کا انجکشن؟'' شاہ زیب نے سوال کیا۔

''ہاں یقیناً، ابھی کچھ دیر اور پُرسکون رہو۔''

''نہیں پلیز نہیں، سنو میں بالکل پُرسکون ہوں۔''

''میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے تو تمہاری تیمارداری کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔''

''کس نے کیا ہے، پولیس نے؟''

''نہیں... پولیس کا ہم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''تو پھر مجھے پولیس اسٹیشن سے کون یہاں لایا ہے؟''

''انجکشن دیتی ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھی لیکن شاہ زیب نے ہاتھ بڑھا کر اس کے لباس کو پکڑ لیا۔

''پلیز بیٹھ جاؤ.. مجھے کسی انجکشن کی ضرورت نہیں۔ اگر تم مجھے پولیس اسٹیشن سے نہیں لائیں اور کوئی بھی جو اس گھر کا مکین ہے مجھے پولیس اسٹیشن سے نہیں لایا تو کم از کم اتنا تو جانتی ہو گی تم کہ مجھے یہاں کہاں سے لایا گیا ہے؟''

''معاف کرنا، مجھے اس کی اجازت نہیں ہے، اب میں چلتی ہوں تمہاری حالت کافی بہتر معلوم ہوتی ہے۔ البتہ ایک ہدایت تمہیں کیے جاتی ہوں، یہاں تم بے حد سکون کے ماحول میں ہو۔ باہر نکلنے یا بھاگنے کی کوشش کی تو بلا وجہ الجھنوں میں پھنس جاؤ گے۔'' وہ چلی گئی اور پھر لوٹ کر نہ آئی۔

☆☆☆

رات کا کھانا بڑا پر تکلف تھا جو شاہ زیب کو اس کے کمرے میں پیش کیا گیا۔ وہی لڑکی شاہ زیب کے لیے کھانا لے کر آئی تھی۔ شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''کیا اس مکان میں تمہارے علاوہ اور کوئی موجود نہیں ہے؟''

''بہت سے لوگ ہیں کیوں؟''

''میرا مطلب ہے تم ہی میری تیمارداری کر رہی ہو۔''

''یہ ڈیوٹی میرے سپرد کی گئی ہے۔''

''اس زندگی میں مجھے ایک انتہائی دلچسپ تجربہ ہوا ہے۔ مجرم ہوں یا دوسرے لوگ، مجھ جیسے شخص کی تیمارداری کے لیے خاص طور سے لڑکیاں ہی مقرر کی جاتی ہیں، اس کی وجہ بتا سکتی ہو؟''

''اگر وجہ بتاؤں گی تو کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا، چنانچہ بہتر ہے کہ وجہ پوچھنے کے بجائے کھانا کھاؤ۔'' لڑکی نے جواب دیا اور شاہ زیب نے گردن ہلا دی، پھر شاہ زیب کھانے میں مصروف ہو گیا۔ کسی قسم کی جدوجہد بے مقصد ہو گی۔ ہر چند کہ یہ جگہ ہسپتال نہیں تھی، لیکن یہاں جو کچھ ہو رہا تھا وہ بے حد غنیمت تھا۔ چنانچہ شاہ زیب نے بھی فیصلہ کر لیا کہ کتنے ہی دن گزر جائیں وہ آرام سے یہیں رہے گا۔ پھر اس نے اپنے فیصلے پر عمل درآمد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

دوسرا دن، تیسرا دن اور چوتھا دن گزر گیا۔ پھر شاہ زیب کے لیے نئے لباس لائے گئے۔ پتا نہیں یہ اہتمام کیوں ہو رہا تھا، بہرطور اب اس زندگی سے اتنا ناواقف بھی نہیں تھا کہ لوگوں کی ان حرکتوں پر حیرت ہوتی۔

چوتھا دن گزرنے کے بعد جب پانچویں دن کی صبح کا آغاز ہوا تو کچھ نئی شکلیں شاہ زیب کے سامنے پہنچ گئیں۔ دو مقامی آدمی تھے جنہیں شکل وصورت سے شریف نہیں کہا جا سکتا تھا، البتہ ان کے انداز میں شرافت کی جھلکیاں تھیں۔

''پرنسز آپ کو طلب کرتی ہیں۔''

''گویا میں کسی شہزادی کا مہمان ہوں۔'' شاہ زیب نے کہا اور وہ دونوں اسے دیکھنے لگے پھر بولے۔

''ہدایتیں دی جاتی ہیں آپ کو ان پر عمل کرنے سے آپ کا فائدہ ہے۔''

''پرنسز کا احترام کیجیے گا، ان کی کسی بات سے انحراف نہ کریں، اسی میں آپ کی بہتر زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔''

''کوشش کروں گا۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''تو پھر آیئے۔'' ان میں سے ایک نے کہا اور شاہ زیب ہوش میں آنے کے بعد پہلی بار اس کمرے سے باہر نکلا۔ مکان تھا کہ محل... بڑا خوبصورت گھر تھا اور بڑے وسیع وعریض علاقے میں پھیلا ہوا تھا، پتا نہیں ممبئی ہے یا کوئی اور جگہ.. ان چیزوں میں دماغ کھپانا بیکار تھا۔ ایک طویل راہداری سے گزرنے کے بعد بڑے ہال کے چوبی دروازے پر وہ لوگ رکے اور دروازہ کھول دیا۔

اندر کی سج دھج قابل دید تھی۔ دیواروں پر بہت ہی اعلیٰ پائے کے شیڈز لگے ہوئے تھے۔ چھت میں تقریباً چھ فٹ کے دائرے میں فانوس لٹکا ہوا تھا، زمین پر سرخ رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا، بہت ہی پراسرار سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شاہ زیب نے ہال کا جائزہ لینے کے بعد جب اس کے اختتامی سرے کو دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ سیاہ رنگ کی وسیع وعریض میز کے پیچھے ایک خوبصورت عورت بیٹھی تھی۔ اس کے قدموں کے پاس ایک خونخوار چیتا زبان نکالے ہانپ رہا تھا... لیکن یہ عورت... شاہ زیب اسے دیکھ کر چونکا تھا، یقیناً اس کی آنکھیں ایک بار دیکھنے کے بعد دھوکہ نہیں کھاتیں۔ یہ وہی عورت تھی جس نے کیمرے سے شاہ زیب کی تصویر بنائی تھی اور ساحل پر اسے ملی تھی۔ شاہ زیب نے اس سے گفتگو بھی کی تھی۔ ایک لمحے میں سیکڑوں خیالات اس کے ذہن میں آکر گزر گئے۔ عورت کا وہ عہد یاد آیا جو اس نے شاہ زیب کے سامنے کیا تھا۔ شاہ زیب کا اس سے انحراف اور اس کے بعد کے حالات بھی روشن تھے۔ سرلا کا قتل بھی سامنے تھا۔ یہ سب شاہ زیب کو ہراساں کرنے کی سازش تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ ہر شخص تسلط جمانے کے لیے اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کیوں کرتا ہے۔ شاہ زیب اپنی جگہ کھڑا اسے دیکھتا رہا اور اس نے انگلی کے اشارے سے شاہ زیب کو قریب آنے کے لیے کہا۔ دروازے پر وہی دونوں آدمی جم گئے تھے اور بالکل ساکت وجامد مجسمے کی مانند کھڑے ہوئے تھے۔ شاہ زیب آگے بڑھ کر اس کے سامنے پہنچ گیا اور پھر اس نے بڑی دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ہیلو۔''

''ہیلو بیٹھ جاؤ، وہ کرسی تمہارے ہی لیے ہے۔'' اس نے ایک کرسی کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

شاہ زیب اطمینان سے کرسی پر جا بیٹھا۔ ایک دو بار شاہ زیب نے اس چیتے کو دیکھا تھا جو بے حد عجیب وغریب لگ رہا تھا۔ اس کی گردن میں کوئی پٹا وغیرہ نہیں تھا، لیکن وہ بالکل پرسکون بیٹھا ہوا تھا۔ عورت بھی اس وقت خاص قسم کے لباس میں ملبوس تھی اور اس کے بال ایک مخصوص طرز پر بنے ہوئے تھے۔ بلاشبہ ایک نگاہ میں وہ کوئی شہزادی ہی نظر آرہی تھی۔

''افسوس! آپ نے مجھے اپنا نام بتانے کی زحمت ہی گوارہ نہیں کی۔'' شاہ زیب نے اس سے پوچھا۔

''وہ ایک مخصوص وقت کے لیے تھا اور شاید ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ میں تمہیں اپنا نام بتاؤں۔''

''ٹھیک ہے، مجھے بھی جلدی نہیں ہے۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''تم بالآخر میرے پاس آ گئے شاہ زیب۔''

''آیا نہیں لایا گیا ہوں۔''

''مطلب؟''

''اگر آپ کو تفصیلات معلوم ہیں تو میرا خیال ہے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے آپ کو۔''

''اوہ.. تمہاری مراد ہے کہ تمہیں ہوش کے عالم میں یہاں نہیں لایا گیا؟''

''آپ یہ بات اچھی طرح جانتی ہیں۔''

''لیکن کیا تمہارا یہاں آنا تمہارے حق میں بہتر ثابت نہیں ہوا؟''

''اس سے مجھے کب انکار ہے، ظاہر ہے، جس عذاب میں مجھے گرفتار کرایا گیا ہے وہ میرے لیے تکلیف دہ تھا۔ یہاں آپ نے عارضی طور پر ہی سہی، لیکن مجھے پُرسکون ماحول دیا ہے۔''

''تم چاہو تو یہ پُرسکون ماحول دائمی بھی ہو سکتا ہے۔''

''کیوں... کیا آپ مجھے قتل کر کے یہاں میری قبر بنا دیں گی؟''

''نہیں... یہاں سے تمہیں ایک نئی زندگی مل سکتی ہے۔''

''کیا حساب کتاب ہوگا اس نئی زندگی کا؟''

''بہت جلد کر ڈالا یہ سوال تم نے، پہلے مجھے کچھ سوال کرنے کی اجازت دو؟''

''اجازت کی کیا ضرورت ہے، ظاہر ہے آپ کا نمک خوار ہوں، چار دن سے آپ کے مہمان کی حیثیت سے رہ رہا ہوں۔ آپ میزبان کی حیثیت سے جو سوال چاہیں کر سکتی ہیں۔''

کیا ہے، میں نہیں جانتی تھی کہ تمہاری شخصیت میں کچھ پُراسرار پہلو بھی ہیں، لیکن اب حالات مجھے معلوم ہو چکے ہیں۔ یعنی تمہارے پاس سے ایک اچھا خاصا قیمتی خزانہ دستیاب ہوا ہے جس کے بارے میں تم نے بیان دیا ہے کہ وہ تمہیں فتح پور سیکری میں ملا تھا۔ میں اس بیان پر یقین نہیں کرتی، حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ تم فتح پور سیکری گئے تھے۔ اس کے علاوہ تمہارے پاس پاسپورٹ بھی نہیں ہے۔ تم نے اپنے آپ کو لندن کا بادشاہ ظاہر کیا ہے۔ لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ پولیس تم سے یہی سوال کر رہی تھی لیکن اس کے یہ سوالات قانون کے لیے تھے۔ میں قانون کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے یہ سوالات کرنا چاہتی ہوں کہ تمہاری اصل شخصیت کیا ہے؟''

''بتاؤں گا تو کبھی یقین نہیں کرو گی اس لیے جانے دو۔''

''نہیں نہیں.. ہو سکتا ہے ایسا ہو، لیکن میں حالات کا تجزیہ تو کر سکتی ہوں۔''

''میں اپنے آپ کو کسی تجزیے کے لیے پیش نہیں کر سکتا۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''میں یہ بات خاص طور سے محسوس کر رہی ہوں شاہ زیب کہ تم بہت ضدی ہو، اور ضد میں نقصانات بھی اٹھاتے رہتے ہو۔ میں نے تمہیں پیشکش کی تھی کہ میرے دائرۂ اختیار میں آجاؤ اور تم نے اس سے انحراف کر ڈالا تھا جس کے نتیجے میں آج تم ایک مصیبت میں گرفتار ہو، لیکن ایک بات ذہن نشین کر لو۔ مصیبت بھی میری بھیجی ہوئی تھی اور اس کے بعد تمہیں اس مصیبت سے نکالنا بھی میرا ہی کام ہے۔''

''کیا تم اس بات کا اعتراف کرتی ہو کہ سرلا کو تم نے یا تمہارے آدمیوں نے قتل کیا تھا؟''

''آپ سے تم پر آگئے، اس کی وجہ؟''

''نہیں نہیں... کوئی وجہ نہیں... بس ایسے ہی بے اختیارانہ انداز میں یہ الفاظ منہ سے نکل گئے ہیں''

''ٹھیک ہے، مجھے آپ کہہ کر مخاطب کرو، میں بہت زیادہ بے تکلفی پسند نہیں کرتی۔''

''جی... میرا سوال برقرار ہے۔'' شاہ زیب نے خشک لہجے میں کہا وہ اس کی اس حالت سے فائدہ اٹھا رہی تھی اور اپنے آپ کو برتر سمجھ رہی تھی۔

''تمہارا خیال غلط نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

''خوب... گویا آپ مجرمانہ ذہنیت رکھتی ہیں، خاص مجرمانہ ذہنیت.. اور آپ کے پاس ایسے لوگ موجود ہیں جو کسی کو

ہلاک بھی کرسکتے ہیں۔'' شاہ زیب نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ جواب میں اس پراسرار عورت نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا تھا۔

''مائی ڈیئر مسٹر شاہ زیب! میں کیا کیا کرسکتی ہوں اس کا اندازہ تو تمہیں آہستہ آہستہ ہوتا رہے گا۔ مجھے اب اس سوال کا جواب دو کہ خزانہ تم نے کہاں سے حاصل کیا تھا؟''

''اور اگر جواب نہ دوں تو؟''

''تو کوئی بات نہیں، ظاہر ہے وہ خزانہ اب میں اپنی تحویل میں تو نہیں لے سکتی، نہ ہی مجھے ایسے خزانوں سے کوئی دلچسپی ہے۔ تمہاری اصل شخصیت جاننا چاہتی ہوں۔''

''میری اصل شخصیت جو بھی ہے آپ کے سامنے ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ کا مقصد کیا ہے؟''

''نہیں... میں کبھی کسی ایسے شخص پر اعتماد نہیں کرتی جو مجھ سے منحرف ہو۔''

''آپ کا ساتھی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، میں تو آپ کو اپنے دشمنوں میں تصور کرتا ہوں۔ آپ نے مجھ پر تسلط جمانے کے لیے مجھے قاتل بنادیا ہے اور اب چاہتی ہیں کہ میں تعاون کروں''

''اوہ... اس کا مطلب ہے کہ جہاں سے چل تھے وہیں ہو، یہ تعاون تو تمہیں کرنا پڑے گا مائی ڈیئر اور اگر تم تعاون نہیں کروگے تو بھی ایسے بہت سے حالات تمہارے سامنے آئیں گے جو تمہاری زندگی کو جہنم بنادیں گے۔''

''ہوسکتا ہے ایسا ہو، میں اپنے آپ کو آزمانے کی کوشش بھی کرنا چاہتا ہوں۔''

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے میں جو چاہتی ہوں وہ تمہیں بتائے دیتی ہوں، کچھ وقت تمہیں فیصلہ کرنے کے لیے دیا جائے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ تم بھی دوسرے لوگوں کی طرح میرے غلاموں میں شامل ہوجاؤ۔ میرے غلام کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ اندازہ تمہیں بعد میں ہی ہوگا۔ اتنا کہہ سکتی ہوں تم سے کہ بڑے بڑے لوگ میری غلامی کے خواہاں ہوتے ہیں لیکن ایسے بہت کم ہوتے ہیں جن پر میری نگاہِ التفات ہو اور جو میرے غلاموں میں شامل ہوجاتا ہے پھر وہ بہت کچھ ہوتا ہے۔ جاؤ غور کرنا، اگر میرے تلوے چاٹنے پر آمادہ ہو تو میرے پاس واپس آجانا، میں تمہاری پذیرائی کروں گی۔''

شاہ زیب کے ہونٹوں پر ایک نفرت بھری مسکراہٹ پھیل گئی، لیکن پھر اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا تھا۔ اس پراسرار عورت نے اشارہ کیا اور شاہ زیب کو واپس اسی جگہ لے آیا گیا جہاں وہ تھوڑی دیر پہلے موجود تھا، وہ لوگ شاہ زیب کو بند کرکے چلے گئے۔ شاہ زیب خاموشی سے اپنے قید خانے میں وقت گزارتا رہا۔ معمولات زندگی ہمیشہ کے مطابق تھے۔



رات کو شاہ زیب کو اسی طرح کھانا پیش کیا گیا جس طرح روزانہ دیا جاتا تھا، انسان خواہ کسی بھی حالت میں ہو، پیٹ کو تکلیف دینا پسند نہیں کرتا۔ شاہ زیب بھی بہر طور کسی حد تک انسانوں ہی میں شمار ہوتا تھا۔ چنانچہ اس نے کھانا وغیرہ کھایا اور آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ جانے کتنی دیر تک وہ خیالات میں کھویا رہا تھا اور پھر اچانک ہی اسے نیند آگئی تھی۔ یہ اچانک نیند شاید اس کھانے میں ملائی گئی کسی چیز کا اثر تھا۔ پھر صبح اس وقت آنکھ کھلی تھی جب کسی نے شاہ زیب کی پسلیوں میں ٹھوکر ماری تھی۔ اس نے چونک کر ٹھوکر مارنے والے شخص کو دیکھا وہ کوئی صفائی والا تھا جو صفائی کرنے میں مصروف تھا۔ شاہ زیب نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ صفائی والے کی آواز ابھری۔

''اٹھ جا اوئے... صبح ہوئے دیر ہوچکی ہے، کب تک سوتا رہے گا لاٹ صاحب، صفائی کرنے دے''

شاہ زیب نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے اردگرد ماحول کا جائزہ لیا، وہی لاک اپ تھا جہاں وہ قید ہوا تھا، شاہ زیب زمین پر پڑا تھا۔ سامنے سنتری دروازہ کھولے مستعد کھڑا ہوا تھا کہ اگر اس کی طرف سے کوئی حرکت ہو تو جوابی کارروائی کرے۔ لاک اپ میں صفائی والا صفائی کررہا تھا، شاہ زیب پاگلوں کی طرح اٹھ کر بیٹھ گیا تو صفائی والا پھر بولا۔

''اوئے... ادھر سرک جا ادھر۔''

شاہ زیب نے اس کی ہدایت پر عمل کیا، لیکن یہ سب کچھ.. یہ سب کچھ اس کے لیے ناقابل یقین تھا، جو واقعات اس دوران پیش آئے تھے، وہ کیا حیثیت رکھتے تھے، کیا وہ صرف ایک خواب تھا گیا؟ اس نے زور سے اپنے بدن میں کئی جگہ چٹکیاں کاٹیں اور اسے تکلیف ہونے لگی۔ ایک ہی بات سوچی جاسکتی تھی صرف ایک بات... کسی طرح پولیس والوں کا اس پراسرار عورت سے کوئی گٹھ جوڑ ہے، مجھے یہاں نکالنے میں بھی پولیس ہی نے اس کی مدد کی تھی اور دوبارہ یہاں پہنچانے میں بھی پولیس ہی کا ہاتھ کارفرما تھا، چنانچہ کچھ لمحوں کے بعد وہ دروازے کے پاس آ کھڑا ہوا، پہرہ دینے والے سنتریوں نے شاہ زیب کو چونک کر دیکھا اور پھر ان میں سے ایک بولا۔

''کیا بات ہے؟''

''سنتری صاحب، مجھے پچھلی رات اس لاک اپ میں کب لایا گیا؟''

''او بھائی، پچھلی رات ہماری ڈیوٹی نہیں تھی، رات کو ڈیوٹی والا آئے گا تو پوچھ لینا۔'' دوسرے سنتری نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا اور شاہ زیب گردن ہلانے لگا۔ اب اسے اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ کوئی بڑی پوسٹ کا پولیس آفیسر اس عورت کا آلۂ کار ہے۔ یہ تو بڑی خوفناک بات تھی، شاہ زیب کے حق میں یہ بات قطعی بہتر نہیں تھی۔ کافی دیر گزر گئی۔ اس کے بعد سنتریوں نے لاک اپ کا دروازہ کھولا اور شاہ زیب کو باہر آنے کے لیے کہا، پھر اسے انسپکٹر کے کمرے میں پہنچا دیا گیا، انسپکٹر نے طنزیہ نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھا اور سنتریوں کو واپس جانے کا اشارہ کیا اور بولا۔

''کہو... دماغ ٹھکانے آیا کچھ؟''

''انسپکٹر جو کھیل تم کھیل رہے ہو تمہارے حق میں بھی بہتر ثابت نہیں ہوگا۔''

''دھمکیاں دے رہے ہو مجھے؟'' انسپکٹر گرجا۔

''نہیں... حقیقت بتا رہا ہوں، تم نے آخر مجھے کیوں گرفتار کیا ہے؟''

''سرلا کے قتل کے سلسلے میں۔ تم نے اسے قتل کیا اور اس کے دو گواہ موجود ہیں۔''

''گواہ صرف یہ کہتے ہیں کہ سرلا میرے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔''

''ہاں اور اس کے بعد کسی نے اسے تمہارے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا، البتہ ہوٹل کی سیڑھیوں کے نیچے اس کی لاش پائی گئی تھی۔''

''تو کیا اس بات سے میں قاتل ثابت ہو گیا؟''

''ہوئے نہیں تو ہو جاؤ گے۔''

''تو ٹھیک ہے، تم میرا مقدمہ عدالت میں پیش کر دو، مجھے اعتراض نہیں ہے۔ لیکن اب مجھے لاک اپ میں رکھنا کیا معنی رکھتا ہے؟''

''یہ کام قانون کے رکھوالے زیادہ بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ تمہیں ہدایات دینے کی ضرورت نہیں ہے''

''انسپکٹر.. یہ پرنسز کون ہے، مجھے بتاؤ؟'' شاہ زیب نے کہا اور انسپکٹر تعجب سے اسے دیکھنے لگا پھر بولا

''کون پرنسز؟''

''تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا عدالت اس بات کو دلچسپی سے نہیں سنے گی کہ مجھے کئی دن تک لاک اپ سے باہر ایک پرنسز کی قید میں رکھا گیا ہے، وہ مجھ سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔''

''اب پاگل پن کی اداکاری کرو گے... کیوں؟''

''نہیں انسپکٹر! سوچا تھا میں نے اس بارے میں بھی کہ کہیں واقعی میرا دماغ تو نہیں چل گیا ہے، لیکن یہ پتا چلا کہ تمہارے اور پرنسز کے گٹھ جوڑ سے یہ سارا کھیل عمل میں آیا ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد سرلا کا قاتل میں ہی ہو سکتا ہوں اور کون ہو سکتا ہے؟''

''تمہاری الٹی سیدھی باتیں میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہیں۔ میں تو تم سے صرف یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تمہارا

پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات کہاں ہیں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے تم غیر قانونی طور پر اس ملک میں داخل ہوئے ہو، ہوسکتا ہے غیر ملکی جاسوس ہو۔ پڑوسی ملک سے ہمارے ویسے ہی اچھے تعلقات نہیں ہیں، یہ بات ثابت ہوگئی تو سوچ لو کہ تمہارا کیا حشر ہوگا؟''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' شاہ زیب نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''مسکرا کیوں رہے ہو، یہ نہیں جانتے کہ سارے دانت حلق میں گرادوں گا۔''

''جانتا ہوں، تم ایسا کر سکتے ہو، لیکن در پردہ کیا تم مجھ سے یہ نہیں کہنا چاہتے کہ میں پرنسز کی غلامی قبول کرلوں؟''

''اگر پاگل پن کی اداکاری کروگے تو یہ جان لوگے کہ ہم نے اچھے اچھے پاگلوں کو درست کردیا ہے''

''تو پھر تم مجھے بھی درست کردو۔'' شاہ زیب نے کہا اور انسپکٹر اسے گھورنے لگا۔

''ٹھیک ہے جاؤ.. چلو اسے اندر لے جاؤ۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اس کے گٹے توڑ دوں گا تا کہ اسے ہوش آجائے۔''

سنتری ایک بار پھر شاہ زیب کو لے کر لاک اپ میں آگئے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ زیب پولیس کے چنگل میں بے بس تھا اور پولیس افسر سے بدکلامی اس کے حق میں بری ثابت ہوسکتی تھی، مگر کیا کرتا، حالات کو قبول نہیں کر پارہا تھا، شاہ زیب کو سو فیصد یقین ہوگیا تھا کہ پرنسز اور پولیس والے ملے ہوئے ہیں۔ شاہ زیب کو ابھی لاک اپ میں زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دوبارہ بلاوا آگیا، اس بار جب وہ ایس ایچ او کے کمرے میں داخل ہوا تو ڈی ایس پی بھی وہاں موجود تھے اور ان کے چہرے پر عجیب سے آثار تھے۔

''بیٹھیے مسٹر شاہ زیب!''

شاہ زیب کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈی ایس پی نے معنی خیز نگاہوں سے انچارج کی طرف دیکھا اور انچارج نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلادی۔ شاہ زیب سے وہ آنکھ ہی نہیں ملا رہا تھا، ڈی ایس پی صاحب کہنے لگے۔

''دوست یہ بات ثابت نہیں ہوسکی کہ تم لندن سے آئے ہو، ہم چاہیں تو کم از کم اس جرم کے سلسلے میں تمہیں بند رکھ سکتے ہیں، لیکن ہم نے آپس میں مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں آزادی دے دی جائے۔''

''یہ فیصلہ تو آپ کو کرنا ہی تھا ڈی ایس پی صاحب۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ کسی بھی مسئلے میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔''

''بکواس کرتے ہو، بالکل بکواس کرتے ہو، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سرلا کا قاتل گرفتار ہوگیا ہے اور اس نے ہیڈ کوارٹر میں پیش ہوکر گرفتاری دے دی ہے، لیکن اس سے یہ مت سمجھنا کہ تمہارا دوسرا جرم بھی ختم ہوجاتا ہے۔''

''سرلا کا قاتل گرفتار ہوگیا؟'' شاہ زیب نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

''ہاں اس نے ہیڈ کوارٹر میں پیش ہوکر اپنا جرم قبول کرلیا ہے اور بتایا ہے کہ سرلا اس کی بہن تھی۔ وہ آوارہ اور بدچلن ہوکر پیسہ کمانے لگی تھی۔ چنانچہ اس نے شدت غضب میں آکر اپنی بہن کو اس وقت ہلاک کردیا جب وہ ہوٹل کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ سرلا ہوٹلوں میں کال گرل کی حیثیت سے آتی جاتی رہتی تھی۔ اس نے تمام اعترافات کر لیے اور تمہاری گرفتاری کا کوئی جواز نہیں رہ گیا ہے۔ کم از کم سرلا کے قتل کے سلسلے میں لیکن پاسپورٹ کا نہ ہونا اور تمہاری اپنی شخصیت کا جاننا ہمیں اس بات کا حق دیتا ہے کہ ہم تمہیں ابھی لاک اپ میں رکھ سکیں، لیکن ہم ایسا نہیں کررہے جاؤ تمہاری چھٹی۔''

''اور میرا وہ خزانہ۔''

''کون سا خزانہ۔ دماغ خراب ہوا ہے پاگل پن کی باتیں کررہے تھے اور ابھی تک بدستور کیے جارہے ہو''

''اوہ تو یہ مسئلہ ہے۔'' شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مسئلہ ہے، خبردار اگر کسی کے سامنے خزانے کا نام بھی لیا۔ سونے کے وہ سکے جن کی تعداد ساٹھ ستر کے قریب ہے تمہارے

پاس سے مشتبہ طور پر برآمد ہوئے تھے۔ وہ پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیے ہیں اور اس کے علاوہ کیا تھا تمہارے پاس؟''

''ٹھیک ہے ڈی ایس پی صاحب ٹھیک ہے، ظاہر ہے میرے پاس یہ سب کچھ ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اگر آپ اس پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں تو ظاہر ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے تو میں جاؤں۔'' ''جاؤ۔''

''کچھ تو دے دیجیے مجھے اس میں سے، زندگی گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ضروری ہے''

''تمہارے پاس سے جو کرنسی ملی ہے ہمیں وہ تمہاری ملکیت ہے۔ تم اسے واپس لے جاسکتے ہو'' ڈی ایس پی صاحب نے ازراہِ کرم کہا۔ شاہ زیب نے اسی کو غنیمت جانا اور کرنسی جیب میں ڈالنے کے بعد دروازے کی جانب چل پڑا تب عقب سے ڈی ایس پی صاحب کی آواز ابھری۔

''بہتر ہے کسی دماغی ہسپتال میں جاکر اپنا علاج کرالو، خواہ مخواہ اول فول بکتے پھرو گے تو لوگ پٹائی بھی کریں گے تمہاری اور دوبارہ تھانے میں بند کردیے جاؤ گے۔''

وہ درپردہ اس دھمکی کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ ڈی ایس پی نے کہا تھا کہ باہر جاکر وہ کچھ بھی کہے، لیکن کم از کم خزانے کا نام نہ لے اور یہی بات ہے کہ شاہ زیب خزانے کا نام لینا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کی تقدیر میں تھا ہی نہیں۔ ایک بار پھر وہ سڑکوں پر آوارہ ہوگیا تھا، بہت تھوڑی سی رقم اس کے پاس تھی اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا اور پھر ممبئی جیسے شہر میں بے یارومددگار تھا۔ جہاں فٹ پاتھ پر سونے کے لیے بھی کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ بہت دیر تک آوارہ پھرتا رہا۔ ذہن ماؤف ہورہا تھا کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ پاسپورٹ کا حصول آسان نہیں ہوگا۔ اگر کوشش بھی کی جاتی تو اول تو اس کے پاس خرچ کرنے کے لیے کوئی بڑی رقم بھی نہیں تھی اور پھر پاسپورٹ لے کر بھی کیا کرتا اور یہاں سے کیسے نکلتا۔

شاہ زیب تھوڑی دیر تک یونہی آوارہ گردی کرتا رہا، پھر ایک چھوٹے سے ہوٹل میں قیام کے لیے جگہ تلاش کرلی۔ اتنی رقم تھی کہ ابھی چار پانچ دن تک اس کا کرایہ ادا کرکے یہاں اس ہوٹل میں گزارہ کیا جاسکتا تھا۔ دو دن گزر گئے تیسرا دن اور چوتھا دن بھی گزر گیا۔ رقم تیزی سے ختم ہوتی جارہی تھی اور اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ کسی بھی طریقے سے دوبارہ رقم کا بندوبست کیا جائے۔

یہ خیال بھی تھا کہ کسی نہ کسی وقت کسی سڑک یا کسی گلی میں یا کسی ہوٹل کے دروازے پر ایک بار پھر وہ لوگ شاہ زیب تک پہنچ جائیں گے اور وہ دوبارہ اس پرنسز کے سامنے ہوگا جو اسے اپنا غلام بنانا چاہتی تھی۔ اس نے ایک بات یہ بھی سوچی تھی کہ جب دوسرے لوگوں کی خواہش کے مطابق وہ بہت سے کردار ادا کرچکا ہے تو پرنسز کا غلام بن کر بھی دیکھ لیا جائے۔ آخر اس غلامی کے ذریعے وہ کیا چاہتی ہے۔ بیکار کی ضد کسی طرح کارآمد نہیں ہوتی چنانچہ اس نے ایک بار پھر ہمت باندھی اور سڑکوں پر نکل آیا۔ لیکن مزید دو دن گزر گئے اور کسی نے اس کی جانب رخ بھی نہیں کیا۔ کیا پرنسز اس سے مایوس ہوچکی ہے یا وہ اسے تلاش نہیں کرپارہی ہو۔ جانے وہ کون سی جگہ تھی جہاں اسے لے جایا گیا تھا۔ اگر وہ خود ہی وہاں پہنچ سکتا تو ضرور پہنچ جاتا، وہ بے حد پریشان تھا۔ پھر اس نے فیصلہ کرلیا کہ ممبئی چھوڑ دیا جائے۔ لیکن ممبئی چھوڑ کر وہ کہاں رہ سکتا ہے، عجیب الجھن میں گرفتار تھا۔

☆☆☆

دوسری صبح ایک اور پریشانی کا آغاز ہوگیا اس نے اخبار خریدا تو نہیں تھا لیکن ہوٹل کے نچلے حصے میں ایک جگہ سے گزرتے ہوئے وہ ٹھٹک گیا۔ اس نے اخبار کا وہ صفحہ غور سے دیکھا جو اس کے سامنے تھا، یقیناً یہ اسی کی تصویر تھی نیچے ایک خبر موجود تھی۔ اس خبر کو پڑھ کر اس کے بدن نے ٹھنڈا پسینہ چھوڑ دیا تھا۔

خبر تھی کہ ایئرپورٹ پر ایک پراسرار شخص ایک جہاز کمپنی سے اترا اس کے ساتھ سامان کا ایک بیگ بھی تھا۔ کسٹم ڈیپارٹمنٹ میں اس کے بیگ کی تلاشی لینے کی تیاریاں شروع کی گئیں تو اس نے دفعتاً کسٹم افسروں پر فائرنگ شروع کردی اور وہاں سے نکل بھاگا۔ دو کسٹم آفیسر ہلاک ہوگئے۔ تصویر سو فیصدی اس کی ہی تھی اور اب وہ ہوش وحواس سے بیگانا ہوا جارہا تھا۔ سرلا کے قتل کے بعد جب وہ اس الزام سے بچا تو اس نے سوچا کہ کم از کم موت کا پھندا تو اس کے حلق

سے علیحدہ ہو گیا ہے، لیکن اب دو کسٹم افسروں کے قتل کا مسئلہ اور اس کی تصویر..... ظاہر ہے وہ پراسرار شخص شاہ زیب تو نہیں تھا۔ ان صاحب نے کسی اعتراض نہیں کیا تھا کیونکہ وہ اس سے ڈسٹرب نہیں ہوئے تھے۔ وہ باہر نکل آیا۔

اب شاہ زیب کے لیے ایک بار پھر بھاگ دوڑ کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ شاہ زیب جانتا تھا کہ چاروں طرف پولیس چوکس ہو گئی ہوگی، لیکن یہ سب کیسے ہوا اور اس سلسلے میں زیادہ سوچنا نہ پڑا اس نے خوفزدہ انداز میں سوچا کہ صورت حال تبدیل ہو گئی ہے اور یقیناً یہ سب کچھ پرنسز کا کیا ہوا ہے۔ وہ ایک مسئلے میں ناکام ہو گئی تو اس نے کوئی دوسرا کھیل کھیل ڈالا، لیکن... لیکن یہ تو بہت خوفناک بات ہے۔ کہاں چھپوں.. کہاں جاؤں کیا کروں.. اس نے سیدھا ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا تھا۔ پاس پلے جو رقم تھی اس کے ذریعے اگر ممبئی ہی سے نکل جائے تو اس سے اچھی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ ریلوے پلیٹ فارم پر پہنچنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو دوسروں کی نگاہوں سے چھپاتے ہوئے یہ دیکھنا شروع کر دیا کہ وہ کون سی ٹرین میں چھپ کر بیٹھا جا سکتا ہے۔ ٹرینوں کے بارے میں اسے صحیح معلومات نہیں تھیں۔ شاہ زیب ایسے ہی ٹرینوں کے اوقات پڑھنے لگا اور ان کے راستوں کے بارے میں جاننے کا چارٹ دیکھنے لگا۔ دفعتاً اسے اپنے عقب سے شور وغل کی آوازیں سنائی دیں۔ دیکھا تو چند پولیس والے دوڑے چلے آ رہے تھے اور ان کا رخ شاہ زیب کی جانب تھا، وہ اچھل کر بھاگا۔ پلیٹ فارم سے نیچے کود کر سیڑھیوں پر پہنچا اور پھر سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرنے لگا، پولیس والوں کی سیٹیاں فضا میں ابھریں اور اس پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ کئی گولیاں اس کے پاس سے سنسناتی ہوئی گزر گئی تھیں۔ پھر وہ مال گاڑی کے ایک ڈبے میں گھس گیا، پولیس والے مسلسل اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ مال گاڑی کے اس ڈبے میں گھس کر وہ ایک لمحے کے لیے پولیس والوں کی گولیوں سے محفوظ ہو گیا تھا، لیکن ظاہر ہے چند لمحات کے بعد وہ وہاں پہنچ جائیں گے، وہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا چنانچہ ڈبے کے دوسرے حصے سے اترنے کے بعد اس نے ایک بار پھر دوڑنا شروع کر دیا۔ لیکن اس بار اس نے عقل سے کام لیا تھا، وہ سیدھا نہیں دوڑا تھا بلکہ اس ڈبے کے نیچے گھس کر واپس اس طرف دوڑنے لگا تھا جس طرف سے پولیس والے آ رہے تھے۔ اس کی یہ چال کارگر رہی۔ پولیس والے مال گاڑی کے ڈبے کے قریب پہنچ گئے اور پھر اسے چاروں طرف سے گھیرنے لگے۔ وہ برق رفتاری سے لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو کر پلیٹ فارم سے باہر نکل آیا اور ابھی اس نے اسٹیشن سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک آدمی اس کے قریب پہنچ گیا۔

''جناب وہ آپ کی کار کھڑی ہوئی ہے۔''

شاہ زیب نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ اس کے ساتھ تیزی سے چل پڑا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس شخص نے فوراً ہی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا، اندر بیٹھ کر کار اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ شکل وصورت سے وہ ایک پڑھا لکھا اور مہذب آدمی معلوم ہوتا تھا، تعلق بھی اسی ملک سے تھا، لیکن پتا نہیں اسے کوئی دھوکہ ہوا تھا یا کوئی اور بات تھی، بہرطور، وہ سکون سے بیٹھا رہا۔ اگر اس میں بھی پرنسز کا ہاتھ ہے تو وہ تو ہے ہی پرنسز کی تلاش میں۔

کار دوڑتی رہی اور تھوڑی دیر کے بعد ایک مکان کے سامنے جا رکی۔ خوبصورت مکان تھا، شاہ زیب کو دروازے سے اندر داخل کر دیا گیا اور یہاں مزید دو افراد نے اس کا استقبال کیا، وہ اس کے سامنے مؤدب ہو گئے تھے۔ انہوں نے گردن خم کر کے کہا۔

''اندر تشریف لے چلیے جناب، آپ کے لیے تمام انتظامات مکمل ہیں۔ ہم معافی چاہتے ہیں کہ بروقت آپ تک نہ پہنچ سکے۔''

''کوئی بات نہیں ہے، میں مطمئن ہوں۔'' شاہ زیب نے جواب دیا، اب تو یہ سارے ڈرامے اسے مضحکہ خیز ہی لگتے تھے۔ مؤدب لوگ اسے اندر لے گئے اور پھر ایک دروازے کے پاس رک کر انہوں نے کہا۔

''یہ آپ کا بیڈ روم ہے جناب! ہم سب آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہیں، کوئی بھی ضرورت ہو تو دیوار پر لگا بٹن دبا دیجیے۔ آپ آرام کرنا پسند کریں گے۔ غسل کر لیجیے گا آپ کے لباس ابھی پہنچا دیے جائیں گے۔''

''او کے... او کے..'' شاہ زیب نے بھاری لہجے میں کہا اور بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ طبیعت خوش ہو گئی تھی، اپنی تقدیر کے بارے میں کچھ کہنا مذاق اڑانے کے مترادف تھا۔ عام طور سے اسے اچھی رہائش گاہیں ہی ملتی تھیں اور ان معاوضہ اتنا زبردست ہوتا تھا کہ طبیعت خوش ہو جاتی تھی۔ اسی طرح سے یہ کمرہ بھی تھا۔ اتنی شاندار

ڈیکوریشن تھی کہ آنکھیں نہیں ٹھہر پاتی تھیں۔ وہ درحقیقت طبیعت پر بہت گرانی محسوس کر رہا تھا، چنانچہ غسل کیا تو انتہائی فرحت محسوس ہوئی۔ تب کسی نے دروازے پر دستک دی اور وہ چونک کر ادھر دیکھنے لگا۔

''جناب! آپ کا لباس باہر اسٹینڈ پر ہے، میں دروازہ باہر سے بند کیے دیتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے...'' شاہ زیب نے جواب دیا اور اس کے بعد پھر ٹھنڈے پانی سے لطف اندوز ہونے لگا۔ پھر غسل سے فارغ ہو کر بدن خشک کیا۔ سلک کا ایک سلیپنگ سوٹ پہن لیا، لباس حیرت انگیز طور پر اس کے بدن پر پورا تھا، اس کے بعد وہ اطمینان سے مسہری پر بیٹھ گیا۔ اب جو کچھ بھی ہوا گر اسی کمبخت پرنسز نے یہ نئی چال چل کر اس کی جان بچائی ہے تو اس وقت اسے پرنسز کا شکر گزار ہی ہونا چاہیے تھا۔ بعد کے معاملات بعد میں دیکھے جائیں گے جہاں تک کسی چکر میں پھنسنے کی بات ہے تو اس سے فرار کہاں تھا، کسی چکر میں نہ بھی پھنستا تو چکر خود ہی اس کے ساتھ پھنس جاتے تھے۔ بار بار یہ فیصلے کیے تھے کہ اب کسی بھی مسئلے میں حالات سے روگردانی نہیں کرے گا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہی دو افراد اندر داخل ہو گئے، ان میں سے ایک ٹرالی ڈھکیلتا ہوا آیا تھا جس پر کوفی کے برتن اور کچھ لوازمات سجے ہوئے تھے۔ ٹرالی مسہری سے لگا دی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں ادب سے گردن جھکا کر کچھ کہے بغیر واپس چلے گئے تھے۔ اس نے کوفی کی دو پیالیاں پیں، بسکٹ اور خشک میوے کھاتا رہا اور کمرے کی سجاوٹ دیکھتا رہا۔ ایک چھوٹے سے ایکوریم میں مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ رنگین اور خوبصورت مچھلیاں۔ شاہ زیب کی نگاہیں ان پر جم گئیں اور وہ مچھلیوں کی پُرسکون زندگی دیکھنے لگا۔ بظاہر وہ پُرسکون تھیں لیکن کون جانے کہ اس ایکوریم میں قید ہونے کے بعد ان کی ذہنی کیفیت کیا ہو، دل چاہا کہ ایک ایک مچھلی کو ایکوریم سے نکال کر دریا میں پھینک دے، لیکن اول تو دریا کہاں تھا، دوسری بات یہ کہ یہاں سے جا نہیں سکتا تھا، تیسری بات یہ کہ شاہ زیب کو ان مچھلیوں کو آزاد کرنے کا حق نہیں تھا، جانے کتنا وقت اسی طرح گزر گیا۔

رات کو اعلیٰ قسم کا ڈنر دیا گیا، لیکن ڈنر ٹیبل پر وہ تنہا تھا، بڑے اطمینان سے اس نے رات کا کھانا کھایا، پھر ان میں سے ایک شخص نے کہا۔

''کیا آپ چہل قدمی کرنا پسند کریں گے؟''

''بالکل پسند کریں گے۔'' اس نے جواب دیا اور ان کے ساتھ باہر نکل آیا۔ تب اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ یہ عمارت ساحل سمندر پر واقع ہے۔ اس کے عقبی حصے بے حد حسین ہیں۔ عمارت کے عقبی حصے میں گھاس کا ایک بہت بڑا قطعہ تھا جس میں کیاریاں بنا کر پھول لگائے گئے تھے۔ قطعے کے اختتام کے بعد چند سیڑھیاں نیچے اترتی تھیں اور ساحل تک چلی جاتی تھیں، بلاشبہ یہ حسین ترین جگہ تھی۔ شاہ زیب ان لوگوں کے ساتھ چلتا رہا، رات کا وقت تھا اس لیے کوئی خطرہ بھی نہیں تھا اور پھر خطرہ کیا حیثیت رکھتا تھا، اب ظاہر ہے اس کے بعد کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی تھا۔ وہ سمندر کے کنارے دیر تک چہل قدمی کرتا رہا، وہ دونوں باادب خاموشی سے دو قدم پیچھے ہٹ کر اس کے ساتھ چلتے رہے۔

پھر جب شاہ زیب تھک گیا تو واپسی کا ارادہ کیا اور وہ دونوں اس کے ساتھ اندر آ گئے۔ ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائی گئی تھیں اور وہ اپنے آپ کو بہت خوشگوار کیفیت میں محسوس کر رہا تھا۔ وہ ان تمام چیزوں سے کھل کر لطف اندوز ہونا چاہتا تھا کیونکہ یہ نہیں معلوم تھا کہ کتنی دیر کے بعد مصیبتوں کا آغاز ہو جائے گا۔ دوسرا دن بھی گزر گیا، پھر دوسرے دن شام کو سات بجے کے قریب ایک شخص دوڑتا ہوا اندر آیا اور شاہ زیب سے مخاطب ہو کر کہا۔

''جناب میڈم جولیانا آئی ہیں، ابھی ابھی گاڑی سے اتری ہیں، کیا حکم ہے ان کے بارے میں۔ ملیں گے آپ ان سے یا انہیں ٹال دیا جائے۔''

''میڈم جولیانا۔'' شاہ زیب نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''جلدی فرمادیں، یقیناً وہ اندر داخل ہو گئی ہوں گی۔''

''جب اندر داخل ہو گئی ہیں تو آنے دو۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''ڈرائنگ روم میں بٹھایا جائے یا یہاں بیڈروم میں بھیج دوں؟''

''بیڈروم ہی میں بھیج دو۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

وہ باہر نکل گیا، چند لمحات کے بعد دروازہ کھل گیا، لمبے قد کے دبلے پتلے بدن لیکن انتہائی خوبصورت اور متناسب بدن کی مالک تقریباً پچیس سالہ لڑکی یا عورت اندر داخل ہو گئی تھی۔ دروازہ کھول کر اس نے شاہ زیب کو دیکھا شوخ انداز میں دیکھتی رہی اور پھر دونوں ہاتھ پھیلا کر بے اختیار آگے بڑھ آئی۔

پرتھوی ڈارلنگ اوہ مائی گاڈ یہ تم ہی ہو، کیا تم ہی ہو مسٹر پرتھوی...''

''ہیلو سوئٹ ہارٹ، کیسی ہو تم؟'' شاہ زیب نے بھی اسی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔

''گڈ... گاڈ تم اتنے شاندار ہو گے میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی، ویری گڈ، تم سے مل کر دلی مسرت ہوئی ہے۔'' اس نے شاہ زیب کو اوپر سے نیچے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اس کے بازو پر دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ شاہ زیب تھوڑا سا ٹھنک گیا تھا، اس کے یہ الفاظ کہ تم اتنے شاندار ہو گے مجھے اندازہ نہیں تھا۔ اس بات کی نشاندہی کرتے تھے کہ پرتھوی جو کوئی بھی ہے اور جس کے بارے میں اسے ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کم از کم اس کا صورت آشنا نہیں ہے۔ شاہ زیب نے جس انداز میں اس کی پذیرائی کی تھی اس سے یہ اظہار کیا تھا کہ جیسے یہ دونوں گہرے ساتھی دوست یا کچھ اور بھی ہیں۔ پھر شاہ زیب نے کہا۔

''تم بھی میرے خیال کے برعکس ہو ڈیئر جولیانا۔''

''اوہ نو نو... مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے میں بیان نہیں کر سکتی۔''

''بیان کر دو تو اچھا ہے۔'' شاہ زیب نے کہا اور وہ ہنس پڑی۔

''ویری گڈ! خوش مزاج بھی ہو، ورنہ عموماً ہماری فیلڈ کے لوگ چڑچڑے اور بدمزاج ہوتے ہیں لیکن تمہارے بارے میں مجھے پتا چل گیا تھا کہ تم عام لوگوں سے بالکل مختلف ہو۔ اوہ... کتنی خوش ہوں بیان نہیں کر سکتی۔'' اس نے پھر اپنے الفاظ دہرائے۔ کسی قدر کھسکی ہوئی سی لگتی تھی، لیکن بہر طور شکل و صورت بہت عمدہ تھی۔ ''مجھے تو جب تمہارے بارے میں معلوم ہوا تو ایک لمحہ بھی نہ رک سکی فوراً ہی دوڑی چلی آئی۔''

''تمہیں صبر کرنا بھی نہیں چاہیے تھا ڈیئر۔'' شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے کہا اور اسے بیٹھنے کی پیشکش کی، وہ کرسی پر بیٹھنے کے بجائے مسہری پر جا بیٹھی اور اس حرکت سے شاہ زیب اس کے بارے میں اندازے لگانے لگا، پھر وہ خود ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ میٹھی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھ رہی تھی پھر بولی۔

''تم، تم نے کیسے کیسے بیش بہا کارنامے انجام دیے ہیں۔ میں تو جب تمہارے بارے میں کچھ سنتی تھی تو خوفزدہ ہو جاتی تھی۔ یہ سوچتی تھی کہ پتا نہیں تم کس قسم کے آدمی ہو گے۔ ڈراؤنے اور خوفناک۔ چہرے پر زخموں کے نشانات ہوں گے اور پورے بدن پر بال ہی بال... مگر تم... اب لطف آئے گا کام کرنے کا... اوہ... ڈیئر پرتھوی...''

پھر یہ دونوں اٹھ کر باہر نکل آئے، لڑکی اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگی، عجیب والہانہ انداز تھا اس کا پھر وہ بولی

''یہاں تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟''

''بالکل نہیں، بہت اچھا ماحول ہے یہاں کا، سب لوگ بہت اچھے ہیں اور پھر اب تو تم آ گئیں، کیا تم واپس چلی جاؤ گی؟''

''ہرگز نہیں۔ اب تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، ویسے میں نے معاف کرنا یہاں آتے ہوئے سوچا تھا کہ اگر تمہاری شخصیت میری توقع کے مطابق ہی نکلی تو میں تم سے معذرت کر کے چلی آؤں گی، لیکن اب کس کا جانے کو جی چاہتا ہے۔''

''میرا بھی نہیں چاہتا۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔ یہ خاتون کیا تھیں۔ ان کی اپنی حیثیت کیا تھی۔ اس بارے میں جاننا مشکل تھا، لیکن بہر طور آہستہ آہستہ معلومات حاصل ہو ہی جائیں گی، فی الحال تو ان کی ویری گڈ ویری گڈ سے لطف اندوز ہوا جائے۔ دیر تک وہ دونوں ساحل پر چہل قدمی کرتے رہے۔

ساحل کے کنارے کی نم ہوائیں فرحت بخش تھیں، وہ کافی دیر کے بعد واپس لوٹے تھے۔ جولیانا کی پسندیدگی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اس نے رات کو بھی واپسی کی ضرورت نہ سمجھی۔ شاہ زیب جو اپنے حالات سے جنون کی حد تک اکتا چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اجنبی جولیانا کی قربت کو بھی اس نے خوشدلی سے برداشت کر لیا۔

صبح ناشتے کے بعد وہ تھوڑی دیر کے لیے شاہ زیب سے اجازت لے کر گئی اور پھر واپس آ گئی۔ شام کی چائے البتہ اس نے شاہ زیب کے ساتھ ہی پی تھی۔

''تم نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ یورپ میں گزارا ہے، میں تمہارا ہنری والا کیس کبھی نہیں بھول سکوں گی۔ کمال کر دیا تھا اس میں تم نے پرتھوی۔'' اس نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

''اوہ ڈیئر پرتھوی۔ بس کمالات خود بخود ہو جاتے ہیں اور ان میں انسان کی اپنی کوششوں کا دخل نہیں ہوتا''

''لیکن برینڈنی کو تو تم نے کھلے عام شکست دی تھی، کتنا مغرور انسان تھا وہ۔ کتنا وحشی اور درندہ صفت... لیکن یہ صرف پرتھوی ہی تھا جس نے برینڈنی کو کتے کی موت مار ڈالا''

''بس یوں سمجھ لو کہ اس کی موت ہی آئی تھی۔'' شاہ زیب نے ہنستے ہوئے کہا۔

''شاید تم اس بات پر یقین نہ کرو کہ تم اسی وقت میرے ہیرو بن گئے تھے۔''

''اوہ.. اچھا اچھا...'' شاہ زیب اپنے آپ ہنس رہا تھا۔ وہ تو اپنے ہم شکلوں کی تلاش میں دنیا میں گھوم پھر رہا تھا اور کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔ بہرحال اسے ان تمام باتوں میں مزہ آ رہا تھا۔ اسی طرح پانچ دن گزر گئے۔ چھٹے دن جولیانا نے شاہ زیب سے کہا۔

''ڈیئر پرتھوی! تمہارے لیے بھلا یہ کیا مشکل ہے کہ اپنے چہرے میں تھوڑی سی تبدیلی کر لو، آؤ کیوں نہ ممبئی کی سیر کو چلیں، یہ جگہ ایسی دلنواز ہے کہ انسان کو اپنے آپ میں گم کر دیتی ہے۔''

''لیکن ڈیئر جولیانا! میک اپ کا سامان بھی تو ہونا چاہیے۔''

''کیا ضروری ہے۔ آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک اور ناک کے نتھنوں میں دو اسپرنگ، تمہاری شخصیت ہی تبدیل ہو جائے گی، میں تمہیں یہ دونوں چیزیں مہیا کر دیتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' شاہ زیب نے دلیرانہ کہا حالانکہ باہر جاتے ہوئے اس کی روح کانپ رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جو الزام اس پر ہے وہ اتنا معمولی نہیں ہے کہ پولیس والے اس کا چہرہ آسانی سے فراموش کر دیں، چپے چپے پر اس کی تلاش ہو رہی ہوگی، لیکن اب اتنی بزدلی کا مظاہرہ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا کہ لوگ اس کے لیے جان کی بازی لگا دیں۔ جس طرح انہوں نے پہلی مرتبہ شاہ زیب کو پولیس کے چنگل سے نکالا تھا اسی طرح یقیناً وہ اب بھی اس کی نگرانی کا معقول بندوبست کریں گے۔

☆☆☆

جولیانا نے اسے ممبئی کی سیر کرائی، حسین عمارتوں اور حسین چہروں کا یہ شہر درحقیقت اس کے لیے بہت پرکشش تھا۔ سوچا تو یہ تھا کہ اپنے اس مال و دولت کے ساتھ ممبئی میں ایک اعلیٰ درجے کی زندگی گزارے گا۔ لیکن سب کچھ بدل گیا تھا، لیکن وہی تقدیر کا مسئلہ آ جاتا ہے۔ تقدیر کے کھیل بھی انوکھے ہوتے ہیں۔ یہ تمام عیش و عشرت کا حساب ہونے والا تھا، یہ سب کچھ بھی اب اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

اس رات جولیانا نے شاہ زیب کو بتایا کہ کل ساڑھے دس بجے مسٹر گرینڈی فرانس سے یہاں پہنچ رہا ہے، تمہیں یقینی طور پر مسٹر گرینڈی کا انتظار رہا ہوگا، ویسے پرتھوی اس منصوبے کی تکمیل کے بعد تمہارا کیا پروگرام ہوگا، یہیں رکو گے یا یہاں سے کہیں چلے جاؤ گے؟''

''یہاں سے کہاں جا سکتا ہے؟'' شاہ زیب نے ٹھنڈی سانس لے کر گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ یہ مسٹر گرینڈی کیا چیز تھا، اس کے بارے میں بھلا شاہ زیب کو کیا معلوم، ایک بات بار بار ذہن میں آ رہی تھی، بقول جولیانا کے وہ کوئی ایسا منصوبہ لے کر آ رہا تھا جس پر شاہ زیب کو عمل کرنا تھا اور یہ بات بھی سامنے تھی کہ شاہ زیب کو اس منصوبے کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے تھا۔ مسٹر گرینڈی کے آنے کے بعد شاہ زیب کا کیا ہوگا، اس کا فیصلہ کرنا بھی مشکل تھا، لیکن ڈر کی کیا بات ہے، صورت حال بگڑ گئی تو جو ہوگا دیکھا جائے گا، چنانچہ اس نے مطمئن رات گزاری۔

دوسرے دن ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد جولیانا شاہ زیب سے رخصت ہو کر چلی گئی۔ وہ مسٹر گرینڈی کو لینے کے لیے ایئرپورٹ گئی تھی۔ شاہ زیب کے لیے اب بھی موقع تھا کہ اس کوٹھی سے بھاگ جائے اور اپنی جان بچا لے۔ بالآخر انسان تھا خوف و دہشت کو دل سے کیسے جدا کر سکتا تھا، خطرناک لوگ تھے۔ یہ بات معلوم ہونے کے

بعد کہ وہ پرتھوی نہیں ہے اوران لوگوں کو دھوکہ دیتا رہا ہے۔ وہ شاہ زیب کی زندگی کے گاہک بھی بن سکتے تھے۔ لیکن اس وقت یہاں سے بھاگنا بھی قیامت تھا کیونکہ چپے چپے پر اس کی زندگی کے گاہک پھیلے ہوئے تھے۔ ناچار انتظار کرتا رہا اور ٹھیک پونے بارہ بجے مسٹر گرینڈی جولیانا کے ساتھ پہنچ گئے۔

مسٹر گرینڈی نسلاً افریقی تھے، بدن پر اپنے دادا جان کا سوٹ پہنا ہوا تھا، اتنا ڈھیلا ڈھالا کہ ایسا لگتا تھا جیسے بانس پر لٹکا دیا گیا ہو، بڑا سا ہیٹ پہنے ہوئے تھے جو ان کے کانوں پر آرہا تھا، چہرے پر بھی حماقت ہی برس رہی تھی، آنکھوں پر چشمہ لگا ہوا تھا جو پرانے بوڑھوں کی طرز کا تھا، دیکھنے میں اچھے خاصے کسی تھیٹر کے مسخرے معلوم ہو رہے تھے۔ انہوں نے اپنا برف جیسا ٹخ ہاتھ شاہ زیب کے ہاتھ میں دے کر منمناتے ہوئے کہا۔

''بہت دن کے بعد آپ سے ملاقات ہو رہی ہے مسٹر رانا پرتھوی راج، کیسے ہیں آپ؟''

''بالکل ٹھیک ہوں مسٹر گرینڈی'' شاہ زیب نے لہجے کو پر اعتماد بناتے ہوئے کہا۔

''افسوس! کام وقت سے کچھ پہلے ہو رہا ہے، ہمیں اپنے بعض منصوبوں میں ناکامی ہوئی، مگر آیئے میں آپ سے تفصیلی گفتگو کئے لیتا ہوں کیونکہ کل ٹھیک ایک بجے وہ لوگ یہاں پہنچ رہے ہیں۔''

''اوہ... اتنی جلدی...'' شاہ زیب نے حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں کسی خاص وجہ سے ان کے پروگرام میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے۔ ہم لوگ بروقت نہیں جا سکے تھے''

''خیر! کوئی بات نہیں ہے، ابھی تو چوبیس گھنٹے کا وقت ہے ہمارے پاس۔'' شاہ زیب نے کہا، جولیانا بھی ان کے ساتھ ہی اندر آئی تھی۔ مسٹر گرینڈی نے آرام نہیں کیا۔ انہوں نے اپنا سوٹ کیس منگوالیا جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے اور پھر سوٹ کیس کھول کر بیٹھ گئے۔ کچھ کاغذات، فائلیں، لیپ ٹاپ اور ایسی ہی چند دوسری چیزیں... اس کے بعد انہوں نے فائلیں وغیرہ کھول کر شاہ زیب کے سامنے رکھ دیں اور وہ ان کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔

انہوں نے جولیانا سے کہا کہ وہ انہیں ملٹی میڈیا فراہم کرے اور جولیانا اٹھ کر باہر چلی گئی۔ مسٹر گرینڈی شاہ زیب کو دیکھتے رہے اور شاہ زیب فائل پر نگاہیں دوڑاتا رہا۔ عجیب وغریب عبارتیں درج تھیں اس فائل میں۔ غالباً یہ کوڈ ورڈز تھے جن میں پرتھوی کو ہدایات دی گئی تھیں، جولیانا کی آمد نے شاہ زیب کی مشکل حل کر دی اس نے ملٹی میڈیا ایک طرف رکھا اور پھر اسکرین پر سیٹ کرنے لگی، مسٹر گرینڈی نے اپنے لیپ ٹاپ سے ایک فائل لوڈ کر دی۔ تب شاہ زیب نے اسکرین پر ایک شخصیت کو دیکھا جس کے مختلف پوز نمایاں کئے گئے تھے۔

یہ شخصیت اس کے لیے اجنبی نہیں تھی، یہ ایک بہت بڑے ملک کی بہت بڑی سیاسی شخصیت تھی جو اس وقت ایک نہایت اہم سرکاری عہدہ رکھتی تھی۔ پھر اس کے بعد اس شخصیت کی عادات سے متعلق فلم رپورٹیں دکھائی گئیں اور ان فلم رپورٹوں میں کمنٹری بھی تھی۔ جس میں مسٹر پرتھوی کو ہدایات دی جا رہی تھیں۔ ایئرپورٹ پر کون کون سے لوگ متوقع ہو سکتے ہیں اور کتنے لوگوں کی نگاہوں میں دھول جھونک کر پرتھوی کو اپنا کام انجام دینا ہے۔ فلم رپورٹ میں ایئرپورٹ کے آس پاس کے مناظر بھی نمایاں کئے گئے تھے اور اس کے بعد وہ بلڈنگ بھی دکھائی گئی تھی جو ابھی زیر تعمیر تھی۔ اس کے فاصلے کا پورا پورا ناپ موجود تھا۔ یہ تمام چیزیں شاہ زیب کو بڑی تفصیل سے ذہن نشین کرائی جا رہی تھیں اور اس کے بدن سے ٹھنڈے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ پھر جب فلم ختم ہو گئی تو مسٹر گرینڈی نے شاہ زیب سے سوال کیا۔

آپ کا کیا خیال ہے مسٹر پرتھوی اس سے زیادہ تفصیلی رپورٹ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ ہم نے بہت دور بیٹھ کر انتظامات کئے ہیں۔''

''یقیناً... میں حیران ہوں۔'' شاہ زیب نے بھی زبردست اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

''اب آپ آخری چیز دیکھ لیجیے اور اس کے بعد آپ کے کام کا آغاز ہوتا ہے۔'' یہ چیز ایک جدید ساخت کی رائفل تھی جس پر دوربین فٹ کر دی گئی تھی۔ مسٹر گرینڈی نے اس رائفل کے مختلف پارٹس جوڑے، دوربین اس پر فٹ کی اور شاہ زیب سے بولے۔

''اس سے عمدہ چیز آپ کے کام کے لیے دوسری نہیں ہو سکتی، اس کی رینج بہت زیادہ ہے اور آپ جس جگہ اسے استعمال

کریں گے وہاں سے اس کا استعمال آپ کے لیے بے حد آسان ہوگا۔ طے یہ کیا گیا ہے کہ اس کے چھ فائر کئے جائیں اور چھ فائروں میں آپ لازمی طور پر کامیابی سے ہمکنار ہو جائیں گے، بس آپ کو ذرا محنت اور ہوشیاری سے کام کرنا ہوگا۔''

اب شاہ زیب کی ہمت جواب دے گئی تھی اور وہ بالکل ہی نڈھال ہو گیا تھا۔ بات سمجھ میں آ رہی تھی، زیر تعمیر عمارت، ایک غیر ملکی سیاسی شخصیت، اعلیٰ قسم کی رائفل اور اس شخصیت کے بارے میں فلم رپورٹ۔ گویا شاہ زیب کو ایک ماہر قاتل کی حیثیت سے ایک اہم ترین سیاسی شخصیت کو قتل کرنا تھا۔ شاہ زیب کا اعتماد ٹوٹا جا رہا تھا، کنپٹیاں چیخ رہی تھیں، ہاتھ پاؤں ڈھیلے ہو رہے تھے۔ مسٹر گرینڈی نے شاہ زیب کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

امید ہے کہ آپ اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھیں گے اور ہمیں کامیابی سے روشناس کرائیں گے۔''

شاہ زیب صرف سر ہلا کر رہ گیا تھا، لیکن اب اس نے کافی حد تک خود پر قابو پا لیا تھا، مسٹر گرینڈی اس کے سر ہلانے کا مطلب شاید یہی سمجھے تھے کہ شاہ زیب اپنی سابقہ روایات برقرار رکھنے کا عہد کر رہا ہے اور پُرعزم طور پر سر ہلا رہا ہے؛ ویسے بھی وہ افریقی نژاد تھے اور افریقہ کے باشندے ہر چیز آسانی سے مان لیا کرتے ہیں کیونکہ کسی بھی جنبش کا ان کے لیے جواز نکل آتا ہے، لیکن شاہ زیب کا حال عجیب وغریب ہو گیا تھا۔ بہت دیر تک وہ اپنے اس نئے منصب کے بارے میں سوچتا رہا تھا، پھر دفعتاً ہی مسٹر گرینڈی مسکرائے اور تاریکی میں جیسے دھوپ نکل آئی۔ انہوں نے پُرجوش انداز میں تالیاں بجاتے ہوئے کہا۔

''مجھے یقین ہے مسٹر پرتھوی کہ آپ کامیاب ہوں گے، اس نقشے میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو براہ کرم بتا دیجیے۔''

''آپ کو میرے نقشے میں کوئی کمی نظر آ رہی ہو تو مجھے بھی بتا دیجیے۔''

''کیا آپ نے بھی اپنے ذہن میں کوئی نقشہ ترتیب دیا ہے؟''

''ہاں! لیکن وہ بے حد خفیہ ہے، کسی مناسب وقت پر آپ کے سامنے پیش کروں گا۔''

مسٹر گرینڈی شاہ زیب کی بات نہیں سمجھ پائے تھے، بہرطور انہوں نے ایک بٹن دبا کر جولیانا کو طلب کر لیا اور پھر شراب کے برتن سج گئے۔ شاہ زیب کی کامیابی سے پہلے ہی اس خوشی میں جام چلتے رہے، شاہ زیب تو پہلے بھی ان تمام چیزوں سے دور ہی رہتا تھا، لیکن ان کے ساتھ بیٹھا رہا، پھر مسٹر گرینڈی اٹھ کر چلے گئے اور جولیانا شاہ زیب کو اپنی بچپن کی یادوں کا یقین دلانے میں مصروف ہو گئی، وہ شراب پی کر شاید بالکل ہی آؤٹ ہو گئی تھی۔ بہرحال تمام پروگرام پایہ تکمیل کو پہنچ گیا تھا اور اب شاہ زیب کے لیے سوچنے سمجھنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

رات گزری اور پھر وقت آ گیا جب قتل کے ماہر پرتھوی راج کو ایئرپورٹ ایریا میں داخل ہونا تھا، تمام نقشے شاہ زیب کے پاس محفوظ کر دیے گئے تھے اور اسے بتایا گیا تھا کہ اس کے تحفظ کا مکمل بندوبست کر لیا گیا ہے۔ اگر کوئی خطرہ درپیش ہوا تو اسے محفوظ رکھنے کی بھرپور کوشش کی جائے گی۔ ایک بند گاڑی میں شاہ زیب کو بمعہ اس کی رائفل کے لے کر چل پڑی، دو افراد اس کے ساتھ تھے، تیسرا ڈرائیور تھا۔ دونوں خاموشی سے شاہ زیب کے ساتھ اس جگہ تک آئے جہاں سے اسے ان دونوں کو خدا حافظ کہہ دینا تھا۔

یہ ایک ویران سی جگہ تھی اور یہاں سے ایئرپورٹ کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا، سامنے ہی بے شمار فلیٹ بنے نظر آ رہے تھے جو ایئرپورٹ کے احاطے سے کافی دور تھے، لیکن پھر بھی قریب محسوس ہوتے تھے۔ شاہ زیب کو ان فلیٹوں سے بھی دور اتار لیا گیا تھا اور پھر ایک طرف جھاڑیوں کی طرف اشارہ کیا گیا۔ یہاں جھاڑیوں کے جھنڈ ضرور تھے لیکن جس جگہ یہ گٹر لائن شروع ہوتی تھی وہاں جھاڑیاں نہیں تھیں، چنانچہ مصنوعی جھاڑیاں لگا کر یہاں اس کی نقل وحرکت کو پوشیدہ رکھا گیا تھا اور یہ جھاڑیاں صرف اسی وقت تک کے لیے تھیں جب تک وہ اپنا کام مکمل طریقے سے انجام دے کر وہاں سے فرار نہ ہو جائے، گٹر کا ڈھکن اٹھایا گیا اور اس نے گھبرا کر ناک بند کر لی۔ زندگی کا یہ تجربہ واقعی ناقابلِ برداشت ثابت ہو رہا تھا۔

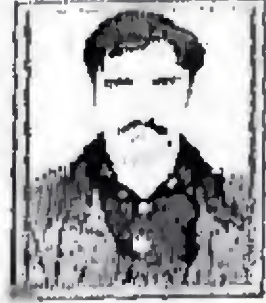
(زندگی کے پیچیدہ راستوں میں اپنے ہم شکلوں کی کھوج میں نکلے
شاہ زیب کی اگلی منزل کیا ہوگی......؟ جاننے کے لیے اگلی قسط کا انتظار کیجیے)

خوشبو خاص عنوان ست رنگ حکایتیں

منتظر مزاج بیاں فرحت ساماں ہر کار عبرت اثر حکایتیں

لڈن، وہاڑی سے پہلی حکایت

یہ آگ کب بجھے گی



منشی محمد عزیز مے

دہشت گردوں کا نشانہ بننے والے ایک غریب ڈرائیور کی زندگی کا مآل

اخبارات میں ہم روزانہ قتل و غارت گری اور گینگ ریپ کی انسانیت سوز خبریں پڑھتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے افسوس کرتے ہیں اور پھر بھول جاتے ہیں کیوں کہ یہی دنیا کا دستور ہے۔ لیکن آپ نے کبھی سوچا کہ جن گھروں کے کفیل ان حادثات یا واقعات میں مارے جاتے ہیں ان کے معصوم بچوں اور بوڑھے والدین پہ کیا گزرتی ہے۔ میں نے بھی کبھی اس سے پہلے اس معاملے پر اتنا غور نہیں کیا تھا۔ لیکن چند روز قبل ہونے والے ایک حادثے نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا ہے۔ ہمارے پاس والی بستی ''چاہ کتے والا'' کا رہائشی عالم شیر دولتانہ جمرود کے علاقے میں نامعلوم دہشت گردوں کی گولیوں کا نشانہ بن کر راہی ملک عدم ہو گیا۔ اس کا جنازہ پڑھنے کے لیے ہم لوگ بھی گئے تھے اور وہاں کے ماحول نے مجھے بے حد رنجیدہ کر دیا۔

ہمارا علاقہ ''لڈن'' دولتانہ خاندان کا آبائی گاؤں ہے۔ دولتانہ خاندان کے سپوت میاں ممتاز خان دولتانہ مرحوم پاکستان کے وزیر اعلیٰ رہے تھے۔ ان کے لخت جگر میاں جاوید ممتاز خان دولتانہ کا بھی سیاست میں بڑا عمل دخل ہے اور وہ ایم این اے بھی رہے ہیں۔

☆......☆......☆

عالم شیر بھی ایک کنٹینر ڈرائیور تھا۔ اس کے باپ کی تھوڑی سی زرعی اراضی تھی اور تین چار بھینسیں بھی ان لوگوں نے پال رکھی تھیں۔ عالم شیر کا باپ شاہ محمد عرف شامدا ایک محنتی قسم کا انسان ہے اور اس نے اپنی اکلوتی اولاد کو بھی محنت کرنے کی تلقین کی۔

عالم شیر اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس کا اور کوئی بہن بھائی نہ تھا۔ اس کو بچپن سے ہی تعلیم حاصل کرنے کا زیادہ شوق نہ تھا بلکہ وہ ڈرائیور بننا چاہتا تھا۔ کھلونوں کی صورت میں بھی اس کے پاس ٹریکٹر ٹرالر اور بڑے بڑے کنٹینر یا ٹرک ہوتے تھے اور وہ بڑے ''فخر'' کے ساتھ اپنے آپ کو ڈرائیور سیٹ پر بیٹھ کر ڈرائیو کرتے ہوئے لاہور، کراچی اور پشاور تک جانے کے سپنے دیکھا کرتا تھا۔

عالم شیر کی طبیعت اور مزاج کو دیکھتے ہوئے اس کے باپ نے اس پر کوئی سختی نہ کی اور اسے اس کے حال پر مگن چھوڑ دیا۔ عالم شیر اپنے ایک ہمسائے دوست محمد کے ٹریکٹر چلانے لگا۔ تاکہ اس ہنر میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہ رہے۔ دیہی علاقوں میں کامیاب ڈرائیور وہی سمجھا جاتا ہے جو ٹریکٹر چلانا اچھی طرح سے جانتا ہو اور

ٹریکٹر کے ذریعے کھیتی باڑی کا کام سنبھال سکے۔عالم شیر بھی اپنے شوق کی بدولت جلد ہی کامیاب ڈرائیور بن گیا۔اب وہ کھیتوں میں ہل چلاتا تھا اور خوب مزے سے رہتا تھا لیکن یہ اس کی منزل نہ تھی۔وہ کہتا تھا''میں بڑے کنٹینر کا ڈرائیور بننا چاہتا ہوں جو یہاں سے کبھی لاہور کبھی کراچی اور کبھی کوئٹہ اور پشاور تک چلے تاکہ اس طرح سے میں پورے پاکستان کی سیر بھی کرلوں گا اور اپنا شوق بھی پورا کرلوں گا۔

عالم شیر نے لڈن ٹرک اڈے پر جانا شروع کر دیا۔اس نے وہاں اڈے والے افراد سے سلام دعا بڑھائی اور یوں اس فیلڈ میں جانے کی راہ ہموار ہوگئی۔

اس دن وہ بہت خوش تھا، جب اسے ایک کنٹینر پر ایک کلینر کی آفر ہوئی۔یوں محسوس ہوتا تھا کہ اسے ملک کی صدارت مل گئی ہو۔وہ خوشی خوشی اپنے گھر گیا اور ماں سے کہنے لگا''ماں آج مجھے رانا فیاض نے اپنے ٹرک پر کلینری کی پیشکش کی ہے۔''

☆......☆......☆

اس کی ماں نے کہا''بیٹا تمہارے سوا اور کون ہے جو تم بھی ہم سے دور جانا چاہتے ہو؟''

ارے ماں! میں کوئی ہمیشہ کے لیے تھوڑی جا رہا ہوں۔اس نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر لاڈ کرتے ہوئے کہا''آتا جاتا رہوں گا۔''

اور پھر عالم شیر والدین سے اجازت اور دعا میں لے کر روانہ ہوگیا۔اس کا مالک رانا فیاض خود ہی کنٹینر چلاتا تھا وہ بہت اچھا آدمی تھا۔اس نے عالم شیر کی ہر ممکن مدد کی اور وہ جلد ہی ڈرائیور بن گیا۔رانا فیاض نے اس کا ڈرائیونگ لائسنس بھی بنوا دیا تھا۔اور یوں وہ اپنے خوابوں کی تعبیر پا گیا۔

عالم شیر کی ڈرائیونگ سے جب رانا فیاض مطمئن ہوگیا تو اس نے ٹرالر عالم شیر کے حوالے کر دیا اور خود اپنے دوسرے ٹرالر پر چلا گیا۔وقت گزرتا رہا عالم شیر کبھی کراچی تو کبھی لاہور چلا جاتا۔ڈیڑھ دو ماہ بعد وہ گھر کا چکر لگاتا تھا۔اور ماں باپ کی دعاؤں کے ساتھ واپس لوٹتا تھا۔اس کے والدین بھی بیٹے کی خوشی میں خوش تھے۔

اور گھر میں جو رقم آ رہی تھی۔وہ اضافی بچت تھی۔جس کی بنا پر اس کے والدین اس کی شادی کے لیے زور دینے



لگے۔

عالم شیر نے پہلے تو ٹال مٹول سے کام لیا پھر خصوصاً ماں کے شدید اصرار پر اس نے شادی کے لیے ہاں کر دی اور یوں اس کی خالہ زاد شبانہ اس کی بیوی بن کر اس کے گھر میں آ گئی۔ عالم شیر کی شادی کے موقع پر اس کے مالک رانا فیاض نے بھی دل کھول کر اس کی مدد کی تھی اور یوں بڑے دھوم دھڑکے کے ساتھ عالم شیر کی شادی ہوئی تھی۔ اس کی شادی کے موقع پر رانا فیاض نے ایک ماہ کی چھٹی بمعہ تنخواہ اسے ایڈوانس میں دے دی تھی۔

عالم شیر کی بیوی شبانہ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوب سیرت بھی تھی۔ عالم شیر کی غیر موجودگی میں اس نے گھر کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مویشیوں کے لیے چارہ کاٹنا اور دوسرے تمام امور بھی وہ خود ہی کرتی۔ کھانا پکانے کا سارا انتظام بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی ساس اسے دعائیں دیتی نہ تھکتی تھی۔

☆......☆......☆

شادی کے سال بعد اللہ تعالیٰ نے اسے بیٹے کی نعمت سے نوازا تو عالم شیر اور اس کے والدین کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ بیٹے کا نام اس نے سرفراز رکھا تھا۔ سرفراز سارے خاندان کی آنکھوں کا تارا تھا۔ سرفراز کے دو سال بعد اللہ تعالیٰ نے نائلہ کی صورت میں اسے اپنی رحمت سے نوازا اور دو ڈھائی برس کے بعد شبنم پیدا ہوئی۔

عالم شیر بہت خوش تھا۔ وہ کہتا تھا کہ پتا نہیں اللہ تعالیٰ کو اس کی کون سی نیکی پسند آئی ہے۔ جس کا اس نے اتنا خوبصورت صلہ دیا تھا کہ اس کی بیوی بھی بہت سلیقہ مند اور کفایت شعار تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اولاد بھی عطا کر دی تھی۔ عالم شیر کہتا تھا اتنی خوبصورت نعمتوں کے حصول پر وہ اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کرے وہ کم ہے۔

شبنم ابھی دس ماہ کی تھی جب عالم شیر کی والدہ اللہ کو پیاری ہوگئی تھی۔ عالم شیر ماں کے چالیسویں تک گھر میں ہی رہا۔ رانا فیاض نے اس موقع پر عالم شیر کی بہت مدد کی تھی۔ عالم شیر رانا فیاض کا شکریہ ادا کرتا تو وہ مسکرا کر کہتا۔ ''ارے بے وقوف میں نے تمہیں اپنا چھوٹا بھائی سمجھا ہے۔ یہ شکریہ وغیرہ ادا نہ کیا کرو میرا۔ بس صرف اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرتے رہو اور میرے حق میں بھی دعا کیا کرو۔'' فیاض بھائی ''اللہ تعالیٰ کا تو میں ہر وقت شکریہ ادا کرتا رہتا ہوں۔'' عالم شیر نے کہا ''لیکن آپ بھی شکریہ کے مستحق ہیں کیوں کہ آپ نے مجھ پر بہت سے احسانات کیے ہیں۔

ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ عالم شیر کا والد شامدا آ گیا اور کہنے لگا ''عالم بیٹا اب بس کرو نوکری کی اور گھر سنبھالو کیوں کہ میں تو اب کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اور شبانہ بے چاری کولہو کے بیل کی طرح سارا دن کام کر کے تھک جاتی ہے اوپر سے بچوں کو سنبھالنا ایک علیحدہ بہت بڑی ذمہ داری ہے۔''

''بس ابا جان آپ دعا کریں یہ میرا آخری چکر ہوگا۔ عالم شیر نے باپ سے کہا رانا صاحب سے میں نے معذرت کر لی ہے اگلے چکر تک وہ کسی ڈرائیور کا بندوبست کر لیں اور میں ہمیشہ کے لیے گھر آ جاؤں گا آپ لوگوں کے پاس۔''

لیکن کسے خبر تھی اب کا گیا عالم شیر کبھی زندہ واپس نہ آئے گا۔ چار مارچ کو فون آیا کہ جمرود کے علاقے میں نامعلوم دہشت گردوں کی گولیوں سے عالم شیر دولتانہ اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔

جب ہم جنازہ پڑھنے کے لیے عالم شیر کے گھر گئے تو اس کے معصوم بچے ماں سے پوچھتے ''امی ابو اٹھتے کیوں نہیں۔'' ان سے کہیں کہ وہ ہمیں وہ ٹافی لے کر دیں۔ ان کے معصوم جملے ہر صاحب دل کو رلا رہے تھے نہ جانے کیسے بے حس ہوتے ہیں وہ لوگ جن پر کسی کے آنسو اثر نہیں کرتے۔ عالم شیر تو مر گیا لیکن اس کے بیوی بچے بالکل بے آسرا ہو گئے ہیں۔

کاش! دہشت گردوں اور تخریب کاروں کی سمجھ میں یہ بات آ جائے کہ ایک انسان کا قتل، انسانیت کا قتل ہے۔ اللہ ہم سب کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق دے۔ (آمین)

☆☆......☆☆

ہم کب سوچیں گے

فرح انیس

اس [illegible] کی کہانی، جو اس وقت عالم گیر دکھ بن چکا ہے

[illegible] داغ پر ہتھوڑے کی [illegible] بر بر دالے گھر میں احمد [illegible] خود اپنے دکھتے ہوئے [illegible] اٹھی اور بے اختیار آئینے [illegible] اپنے داغ دار چہرے پر ہاتھ [illegible] آئینے کے سامنے سے ہٹ کر بیڈ [illegible] رفتہ رفتہ یاد آ رہا تھا۔ ٹھیک آج [illegible] اس کی بھی خوشی کا دن تھا۔

"[illegible] کیوں بیٹھی ہو۔" رخشندہ [illegible] ماں کی آواز پر وہ رخساروں [illegible] صاف کرتے ہوئے بولی۔

"[illegible] اب میری زندگی کا حصہ ہے۔" رخشندہ بیگم بیٹی کی بات پر چپ سی ہو گئیں اور آگے بڑھ [illegible]

[illegible] مایوسی کی باتیں۔ زندگی اسی اتار [illegible] وہی صحت یاب بھی کرتا [illegible] نہیں چھوڑنا چاہیے۔" رخشندہ بیگم [illegible]

[illegible] ایک دوست سے قرض مانگ کر تمہارا [illegible] میری جان۔ دیکھنا تم پہلے کی طرح پیاری سی ہو جاؤ گی۔ اپنے اندر حوصلہ پیدا کرو۔ مایوسی دور کرو۔"

"کیا فائدہ امی ابلال تو مجھے نہیں مل جائے گا نا۔"

رخشندہ بیگم بیٹی کی اس بات کو سن کر روتے ہوئے اپنی کی



بے رخی کو سوچنے لگیں۔ ان کی آنکھیں نم اور لب خاموش ہو گئے۔

عائلہ اور بلال خالہ زاد تھے۔ بلال کی ماں رخشندہ کی بہن نے بڑی چاہ سے اپنے بیٹے بلال کے لیے عائلہ کو مانگا تھا۔ خود رخشندہ بیگم بھی بہت خوش تھیں وہ جانتی تھیں کہ عائلہ اور بلال ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ اب جبکہ شادی کی تاریخ طے ہوگئی تھی اور ٹھیک ایک ہفتے بعد اس کی مایوں تھی۔ عائلہ بھی اپنے حسن کو سنوارنے میں لگی ہوئی تھی۔ گو کہ وہ خوبصورت شکل و صورت کی لڑکی تھی مگر اس کا بھی ہر لڑکی کی طرح ارمان تھا کہ شادی کے دن میں سب سے حسین لگوں۔ محلے میں قریب ہی ایک بیوٹی پارلر تھا۔ پارلر والی نے اسے ایک ہربل فیشل لکھ کر دیا جو اس نے اپنے بھائی سے قریبی میڈیکل اسٹور سے منگوا لیا۔ اسے چہرے پر لگانے کے بعد عائلہ کو چہرے پر جلن کا احساس ہوا جسے اس نے نظر انداز کر لیا مگر شام تک اس کے سارے چہرے پر جھائیاں سی ہوگئی، یہاں کے ان کے دوسرے دن چہرے پر لال لال سے دھبے ہو گئے۔ اس افتاد نے گھر والوں کو بدحواس کر دیا۔ عائلہ کی ماں پارلر گئی تو انہوں نے کہا فیشل تو ہم نے بہت سے لوگوں کو لکھ کر دیا ہے کبھی ایسی شکایت نہ ہوئی۔'' بعد میں پتا چلا جس میڈیکل اسٹور سے وہ فیشل منگوایا تھا، وہاں جعلی سامان ملتا تھا۔

اب بے چارے غریب ماں باپ ڈاکٹر کے چکر لگا رہے تھے اور ڈاکٹر کی بتائی ہوئی مہنگی مہنگی دوائیوں سے علاج کر رہے تھے۔ لیکن اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ یہاں تک کہ بات سرجری تک آ گئی۔ عائلہ کی ابھی اور بھی بہنیں بھی تھیں۔ سفید پوش ماں باپ نے بہت جتن کر کے عائلہ کی شادی کا انتظام کیا تھا، لیکن اب وہ اس نئی آفت سے پریشان ہو گئے تھے۔ رخشندہ بیگم نے ایک روز اپنی بہن کو اعتماد میں لے کر ساری بات بتادی تو بہن نے تو ایسے آنکھیں پھیرلیں کہ انہیں جانتی ہی نہیں۔ وہی خالہ جو عائلہ کو کو بہت چاہتی تھیں اب عائلہ کو دیکھ کر نظریں پھیرلیتی اور بلال نے بھی شادی سے انکار کر دیا تھا۔ رخشندہ کے آنسو بھی بہن کو نہ پگھلا سکے اس میں سارا قصور کس کا تھا۔

''عائشہ کو بہت دن سے بخار ہو رہا تھا۔ رخشندہ بیگم نے اپنے شوہر سے کہا اسے آج ڈاکٹر کو دکھا دیں علی۔''

ہاں کیوں نہیں۔ چلتے ہیں ہم اپنی گڑیا کو دکھانے۔'' علی بیٹی کو پیار کرتا ہوا بیوی کی تائید کرنے لگا۔

شام عائشہ کو ڈاکٹر کے ہاں لے گئے تو ڈاکٹر نے عائشہ کے بازو پر انجیکشن لگا دیا۔ گھر آنے کے بعد رات عائشہ درد سے رونے لگی ماں باپ اپنی اکلوتی بیٹی کے رونے پر پریشان ہو گئے۔ وہ بار بار ہاتھ میں درد کی شکایت کرتی۔ دو تین دن اسی طرح گزر گئے آخر ماں باپ پریشان ہو کر دوسرے ڈاکٹر کے ہاں لے گئے۔ معائنے کے بعد ڈاکٹر کی بات نے علی اور ماہا کے پیروں سے زمین کھینچ لی اور اس کا ہاتھ اس قدر اندر سے خراب ہو گیا ہے کہ اگر ہاتھ نہیں کاٹا گیا تو زہر پورے جسم میں سرایت کر جائے گا ماں باپ روتے ہوئے بے بسی سے اپنی پندرہ سال کی بیٹی کو بیڈ پر لیٹا دیکھ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆ ☆

ہمارے معاشرے میں اس طرح کے بہت سے واقعات بکھرے ہوئے ہیں، جو ہمارے معاشرے کی بے حسی کو نمایاں کرتے ہیں۔ چند دن پہلے میرا ٹی وی پر ایک عالم دین کا پروگرام دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کو دیکھ کر میری آنکھیں نم ہوگئیں معاشرے کی بے حسی اور جعلی ادویات کا استعمال اب عام ہو چکا ہے۔ اس بھیانک سازش میں میڈیکل اسٹور والے شامل ہیں۔ یہاں ہر میڈیکل اسٹور کو نہیں کہا جا رہا زیادہ تر شامل ہیں اور معذرت کے ساتھ ہمارے مسیحا بھی، جن پر ہم آنکھ بند کر کے اندھا اعتماد کرتے تھے، اب وہ بھی قصاب بنے ہوئے ہیں۔ ہر مسیحا کو یہاں نہیں کہا جا رہا پر کچھ ہیں جو ہمارے معاشرے میں مسیحا بن کر اس مکروہ سازش میں شریک ہیں۔ ان عالم دین کے پروگرام میں جو ڈاکٹر بیٹھے تھے، ان کے کہنے کے مطابق کچھ ڈاکٹر اس بھیانک کھیل میں شامل ہوتے ہیں اور جو میڈیکل اسٹور جعلی ادویات بیچ رہا ہے، ان کا اس سے لنک ہوتا ہے۔ کتنے ہی لوگ ان جعلی ادویات سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان کو حرام کا پیسا اتنا منہ کو لگ جاتا ہے کہ وہ اس بے رحمی سے لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ کتنے ہی لوگ ان جعلی ادویات کے استعمال کے نتیجے میں کومے میں چلے گئے، کوئی ہارٹ اٹیک کا شکار ہو گیا اور کوئی موت کے منہ میں چلا گیا۔ دراصل اس کام میں سب شریک ہیں۔ ہر طبقے کے لوگ ملوث ہیں۔ اگر حکومتی ادارے ان لوگوں کی سرپرستی نہ کریں تو معاشرے میں بگاڑ نہیں سدھار پیدا ہو جائے گا۔

☆☆......☆☆

جیکب آباد سے، تیسری حکایت

بڑے ابا

محمد اسماعیل بروہی

بروہی، نواب شاہ سے، انجانے میں بھائی کے ہاتھوں بھائی کی موت کا دلخراش واقعہ



آج میں اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہوں۔ میں نے ایک جرم کیا تھا۔

میں نے اپنے ہی گھر اور گھر والوں پہ قیامت ڈھائی تھی۔ اپنی ماں کے کلیجے کا ٹکڑا اور اپنے ہی بائیں بازو کو کاٹ دیا تھا۔ دو ننھے منے معصوم بچوں کو یتیم اور ایک جوان عورت کو بیوہ کیا تھا یعنی اپنے سگے بھائی کا خون کیا تھا۔

خون میں نے جان بوجھ کر یا کسی لالچ میں نہیں کیا تھا بلکہ جلد بازی میں کیا تھا۔ کاش میں جلد بازی کے بجائے تحمل سے کچھ سوچ بچار سے کام لے لیتا تو آج پچھتاوے کی آگ میں نہ جل رہا ہوتا۔

آج سے 12 سال پہلے ہمارے گاؤں والوں کو چوروں نے بڑا تنگ کیا تھا۔ رات کو گھروں میں گھس کر کسی کی بھینس، کسی کی موٹر سائیکل یا کسی کے گھر کا سامان زبردستی یا چوری سے لوٹ کر فرار ہو جاتے۔ سب لوگ تنگ آ چکے تھے اس صورتحال سے کہ چوروں سے نجات کی حکمت عملی کے لیے سب مل کر سوچ بچار میں پڑ گئے تھے۔ تاکہ کوئی ٹھوس قدم اٹھایا جا سکے۔ سب گاؤں والوں نے یہ فیصلہ کیا کہ نہ رات کو پہرا دیا جائے۔ ہمارا گاؤں بہت بڑا تو نہیں تھا مگر کوئی چھوٹا بھی نہ تھا زیادہ تر

لوگوں کی اپنی زمین تھی یعنی سب ہی زمین دار تھے۔
کچھ اپنی زمینوں کی خود دیکھ بھال کرتے اور کچھ نے ہاری رکھے ہوئے تھے۔ ہماری بھی کافی زمین تھی۔ ہم نے اپنی زمینوں پر ہاری رکھے ہوئے تھے۔ ہم دو بھائی اور چار بہنیں تھے۔ میں سب سے بڑا تھا۔ پھر چاروں بہنیں اور سب سے چھوٹا بھائی ولید تھا۔
ولید اپنی ملازمت کی وجہ سے اسلام آباد میں رہتا تھا۔ چھ یا سات مہینے بعد چھٹی پر آتا تھا۔
گاؤں کے سب لوگ میری اوطاق (بیٹھک) میں آئے تھے اور سب نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ روز رات کو 2 یا 3 آدمی پہرا دیں گے۔
ساتوں دن میں الگ الگ ٹیم ہوگی۔ اتوار سے لے کر جمعے تک تین تین لڑکوں کی ٹیمیں تشکیل پائیں اور ہفتے کو میرا نمبر آیا۔ مجھے اکیلے کو اس پہرے پر ٹھہرایا گیا کیوں کہ گاؤں میں، میں سب سے زیادہ نڈر اور دلیر تھا۔
سو سب اپنے اپنے دنوں پر اپنی اپنی ٹیموں کے ساتھ پہرا دینے لگے۔ اور ہفتے کی رات کو میں اکیلا پہرا دینے لگا۔ اس طرح یہ فائدہ ہوا کہ چور خاموش ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ ہمارا یہ حفاظت کا اقدام صحیح ثابت ہوا تھا...... سارا گاؤں چوروں سے امان میں رہنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

اُس روز ہفتے کا دن تھا۔ میرا بھائی ولید چھٹی پر آیا ہوا تھا وہ صبح ہی صبح گھر پہنچ گیا تھا۔
میرے اور اپنے بچوں کے لیے بہت سارے تحفے بھی لایا تھا۔ میرا بھائی بہت خوش تھا کیوں کہ وہ تین ماہ بعد چھٹی پر آیا تھا مگر ہمیں کیا خبر تھی اگلا دن ہم پر قیامت بن کر ٹوٹنے والا ہے۔ اسی روز میری بیوی نے طرح طرح کے کھانے ولید کی پسند کے پکائے تھے۔ ولید زیادہ تر میری بیوی سے کھانے کی فرمائش کرتا تھا۔ بقول ولید کے بھابی کے ہاتھ میں جادو ہے۔
کھانے کے بعد سب ولید کے ارد گرد جمع ہو گئے کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کی پھر سب اپنے کمرے میں سونے چلے گئے۔ اور میں اپنی ڈیوٹی یعنی پہرے پر جانے لگا۔
''کاش اس وقت ہم ولید کو بتا دیتے کہ رات گیارہ بجے کے بعد گھر سے نکلنا سب گاؤں والوں کے لیے بند ہے۔ چوروں کی وجہ سے رات گیارہ بجے کے بعد کسی کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔
میں اپنی بڑی حویلی کی چھت پر بیٹھ کر پورے گاؤں پر نظر رکھتا تھا۔ اس روز بھی رات ساڑھے گیارہ بجے لائٹ چلی گئی تھی اور میں نے اپنے آپ کو مزید چوکنا کیا ہوا تھا۔
ہماری حویلی کے پیچھے ہماری اوطاق تھی جس کا بڑا صحن تھا۔ اور بھینسوں کا باڑا بھی تھا۔ رات کو ساری بھینس اوطاق کے صحن میں باندھی جاتی تھیں۔ جب لائٹ چلی گئی تو چاند کی مدھم سی روشنی ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک میں نے دیکھا کوئی بندہ اوطاق کے صحن میں کھڑا ہوا ہے۔ اور وہ آہستہ آہستہ بھینسوں کی طرف جانے لگا۔
مجھے اپنے نشانے اور اپنی طاقت پہ گھمنڈ تھا، سو میں نے اسے چور سمجھ کر اس کا نشانہ باندھ لیا اور فوراً گولی چلا دی۔ گولی بالکل نشانے پر لگی اور ایک چیخ سی گونجی۔
وہ چیخ جو میں لمحے کے ہزارویں حصے میں پہچان گیا تھا۔ وہ چیخ میرے بھائی ولید کی تھی۔ گولی کی آواز پورے گاؤں نے سن لی تھی۔ اور سارا گاؤں ہماری اوطاق میں امڈ آیا تھا۔ اور سب کے منہ پر ایک ہی لفظ تھا۔
چور چور... چور مجھے بھی اور کچھ نہ سوجھا میں نے بھی چور چور کرتے ہوئے اس کی طرف دوڑ لگا دی۔
ہمارا نوکر اس کے پاس پہنچا تھا۔ اس سے پوچھا کہ کیا ہوا تو ولید نے دیوار کی طرف اشارہ کیا تھا۔ کہ گولی اس طرف سے آئی تھی''۔
لمحوں میں اوطاق میں لوگوں کا سیلاب امڈ آیا تھا جتنے منہ اتنی باتیں...... سب کے منہ پر ایک ہی بات تھی کہ ولید کو چور نے مار دیا...... اور میں نے بھی چلانا شروع کر دیا کہ ولید کو چوروں نے مار دیا۔
گاؤں کی ڈسپنسری کا ڈاکٹر ذیشان بھی بھاگتا ہوا آیا۔ ڈاکٹر ذیشان نے چیک کیا اور تصدیق کر دی کہ ولید تو ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔
اماں جی اور ولید کی بیوی بار بار ہوش کھو بیٹھتے ہیں اور سب انہیں سنبھالتے۔

☆......☆......☆

ولید کی اچانک موت پر ہر آنکھ اشک بار تھی۔ صبح کو پولیس آئی۔ ایف آئی آر کٹی اور نامعلوم افراد کے خلاف مقدمہ درج کر لیا گیا۔ اور تفتیش شروع ہو گئی جس سے پوچھا گیا اس نے یہی بتایا کہ ولید کو چوروں نے مارا ہے اور کیس بند کر دیا گیا۔

وقت بہت بڑا مرہم ہوتا ہے۔ سو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب کو صبر آ ہی گیا۔ اماں جی بھی رو رو کر چپ ہو گئیں ولید کے بیوی بچوں کو بھی اللہ نے صبر دیا اور سب گاؤں والوں نے بھی ہماری دلجوئی کی۔ پھر میں نے بھی ہمت کی اور خود کو سنبھالا اور اپنی پشیمانی کو ایک طرف لپیٹ کر رکھ دیا۔

اماں جان اور گاؤں کے بڑے بڑے لوگوں نے مجھے سمجھایا کہ میں ولید کی بیوی سے نکاح کر لوں مگر میں نے انکار کر دیا کیوں کہ ولید کی بیوی مجھے بڑے ابا کہتی تھی۔

ویسے تو میرا نام اصغر ہے اور اصغر ہمارے دادا کا نام تھا۔ سو ہمارے والد صاحب نے اپنے باپ کا نام مجھ پر رکھا تھا اور والد صاحب خود مجھے 'بڑے ابا' کہہ کر پکارتے تھے اور اسی وجہ سے سب مجھے بڑے ابا کہہ کر پکارنے لگے۔ یہاں تک کہ میری اپنی بیٹیاں اور ہمارے گاؤں والے بھی مجھے بڑے ابا کہتے تھے۔ ولید کی شادی کے بعد ولید کی بیوی بھی مجھے بڑے ابا کہنے لگی تھی۔

مجھے ولید کی بیوی بیٹیوں، بہنوں کی طرح عزیز ہے۔ پھر میں نے خود کو اپنی اولاد کے ساتھ ساتھ ولید کے بچوں کے لیے وقف کر دیا اور اپنے بچوں سے بڑھ کر ان کو چاہا۔ شاید اللہ مجھ سے راضی ہو جائے، مجھ پہ کرم کر دے۔ میں ہر وقت اپنے اس گناہ کی معافی مانگتا ہوں اور میں اللہ نے نام پہ فلاحی اداروں اور مدارس میں بھی باقاعدگی سے چندہ دیتا ہوں۔ بے سہارا اور غریبوں کی مدد کرنے لگا ہوں۔ یہ سب کر کے مجھے دل کو عارضی سکون تو ملتا ہے لیکن لگتا ہے احساسِ جرم بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

☆......☆☆......☆

وقت اپنی رفتار سے چل رہا ہے۔ وقت بھلا کبھی کسی کا انتظار کرتا ہے۔

اماں جی بھی ولید کی موت کے بعد کئی بیماریوں کا شکار رہیں اور پھر ایک دن ہمیں خاموشی سے چھوڑ کر ولید کے پاس چلی گئیں۔

میں نے اپنی دو بیٹیاں بیاہ دیں اور دو ابھی چھوٹی ہیں۔ ولید کا بڑا بیٹا پندرہ سال کا ہے اور نویں جماعت میں پڑھ رہا ہے۔ دوسرا بیٹا بھی پڑھ رہا ہے۔ میرا کوئی بیٹا نہیں ہے صرف چار بیٹیاں ہیں ولید کے دو بیٹے وحید اور سعید ہیں اور اب یہ دونوں ہی میرے وارث ہیں۔ ان کی کامیابی کے لیے دعائیں کرتا ہوں۔

میں اپنی زندگی سے اب کافی مطمئن ہوں جیسے تیسے وقت گزار رہا ہوں مگر دل میں ایک چبھن سی ہے۔

احساسِ گناہ آج بھی مجھے چین سے جینے نہیں دیتا میں اپنے جرم کا اعتراف اپنے گھر والوں اور اپنے رشتے داروں سے نہیں کر سکتا کیوں کہ اگر میں نے انہیں بتایا تو بہت برا ہوگا۔ میرے بھائی کے بیوی بچے مجھ سے نفرت کرنے لگیں گے۔ کیوں کہ میں نے انجانے میں سہی مگر کسی کا سہاگ اجاڑا ہے اور اپنے ہی بچوں کو یتیم کیا ہے۔ میں نے اسماعیل سے کہا کہ بیٹا میری کہانی لکھو۔ تاکہ سچی کہانیاں پڑھنے والے یہ کہانی پڑھ کر میرے لیے دعا کریں اور میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو۔ کہتے ہیں کہ کسی جرم کا اعتراف کر لیا جائے تو دکھ آدھا ہو جاتا ہے تو میں نے سوچا کہ میں آج اپنے جرم کا اعتراف کر ہی لوں۔ اس طرح شاید میری بے چین زندگی کو شاید قرار مل سکے۔

☆☆......☆☆

دنیا کی پہلی تیرتی ہوئی مسجد

جولائی 1976 میں شیخ الازہر نے عرب جمہوریہ مصر (فورٹ سوئیز نہر سوئیز) میں دنیا کی پہلی تیرتی ہوئی مسجد کا افتتاح کیا تھا۔ یہ مسجد یونان کے ایک کروڑ پتی شخص پر ملیسل کے ایک بحری جہاز میں تعمیر کی گئی ہے۔ بحری جہاز کا نام 'میریاتال' تھا اس مسجد میں ایک مذہبی تعلیمی ادارہ بھی قائم کیا گیا ہے اور رہائش کے لیے کئی کمرے بھی ہیں۔ اس تیرتی ہوئی مسجد میں بڑی تعداد میں نمازیوں کے لیے گنجائش ہے۔

مرسلہ: غازی عبدالصمد۔ پشاور

عمر دراز

مسز ثمینہ سلیم چاکی

اگر اُس دن عمر چار پاؤں چلنے کے بجائے سو گیا ہوتا تو......

''اُف! اتنی دیر ہوگئی اب تو بچوں کے رزلٹ بھی آ چکے ہوں گے۔'' دراصل آج بچوں کے سالانہ امتحان کا نتیجہ آنا تھا۔ جلدی جلدی گھر کے کام نمٹا کے میں جیسے



ہی اسکول پہنچی تو وہاں مائیک کے ذریعے اندر ہال کی ساری آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ تیسری جماعت کا رزلٹ اناؤنس ہو رہا تھا۔ میں تیز تیز قدموں سے ہال کی طرف چل دی۔ کیوں کہ میرا بیٹا عمر دراز تیسری جماعت میں ہی ہے۔ پہلے، تیسری پوزیشن آنے والے بچے کا نام پکارا گیا، اس کے بعد دوسرے نمبر پر آنے والے بچے کا نام، میرے دل کی دھڑکن اچانک بہت تیز ہو گئی۔ مِس نے اعلان کیا کہ ''پہلی پوزیشن پر آئے ہیں کلاس تھرڈ کے محمد عمر دراز ولد محمد سلیم۔'' یہی نہیں اسکول کے بہترین اسٹوڈنٹ کا ایوارڈ بھی میرے عمر دراز کو دیا گیا۔ شکرانے کے طور پر میری آنکھیں چھلک پڑیں۔

شیلڈ اور ٹرافی لے کر عمر میرے قریب آیا تو میں اسے گلے لگا کر بے اختیار رونے لگی۔ میں اپنے رب کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ جس نے مجھے آج یہ دن دکھایا۔ میں سوچ رہی ہوں اگر اُس دن عمر کو کچھ ہو جاتا تو کیا آج یہ دن آتا؟ میں یہ خوشی مناسکتی؟'' واقعی میرا رب رحیم ہے۔

جب عمر دراز پیدا ہوا تو سب نے مختلف نام تجویز کیے مگر کیونکہ عمر دراز ستوانسا ہونے کے بہت کی کمزور تھا اس لیے میں نے کہا ''اس کا نام عمر دراز ہی ہونا چاہیے۔'' سب نے اس نام کی مخالفت کی کہ کچھ عجیب سا ہے۔ مگر میں نہیں مانی یہاں تک کہ اس کے ابو نے بھی مجھے سمجھایا کہ یہ تو بہت الگ

نام ہے۔ مگر میں نے اپنے بچے کا نام زبردستی عمر دراز رکھا۔ اور وقت نے یہ بتایا کہ میرا یہ نام رکھنے کا طفیل ہی اللہ پاک نے میرے بیٹے کو نئی زندگی بخش دی تھی۔

☆......☆......☆

میری نند مرحومہ ذہنی مریضہ تھیں۔ جب ٹھیک ہوتیں تو ٹھیک ورنہ انہیں نیند نہیں آتی تھی۔ ڈاکٹر نے انہیں دوسری دواؤں کے علاوہ نیند کی گولیوں کی تجویز کی تھیں۔ نیند کی یہ گولیاں اتنی High doze کی ہوتی تھیں کہ ایک گولی لینے پر میری نند تقریباً بارہ گھنٹے تک سوتی رہتی۔ جب تک امی (ساس) حیات تھیں، وہی میری نند کو دوائیں دیتی تھیں۔ ان کے بعد، میں ان کو دوائیں دیتی تھی۔ یہ ساری دوائیں میں نے اپنے ٹی وی ٹرالی کے دراز میں رکھی تھیں۔

ایک دن عمر جب 14 سال کا تھا۔ میرا کمرہ گھر کے اوپر والی منزل پر تھا۔ میں نے عمر دراز کو کھیلنے کے لیے کچھ کھلونے دیے اور جب وہ کھیلنے میں معروف ہوگیا تو میں کمرے کے دروازے کو تھوڑا سا بھیڑ کر نیچے آگئی۔ نیچے والی منزل پر میری دیورانی کا کمرہ تھا۔ میں نے اسے کہا عمر دراز اوپر ہے نیچے اترے تو اس کا دھیان رکھنا۔ میں ہماری برابر والی گلی میں چچی ساس کے گھر کا کام کرنے جا رہی ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔'' تقریباً آدھے گھنٹے میں ہی میں لوٹ آئی۔ جیسے ہی میں گھر میں داخل ہوئی میں نے دیکھا کہ نیچے دیورانی کے کمرے کے باہر عمر دراز دونوں ہاتھوں اور پاؤں پر چل رہا تھا۔ جب کہ اسے چلنا آتا تھا۔ میں نے اسے پیار سے اسے گود میں لیا اور ہنسنے لگی۔ میری دیورانی بھی ہنس کر بولی۔

''بھائی صاحب کو بچپن یاد آرہا ہے۔ کب سے ایسے ہی چل رہا ہے۔ اوپر سے موٹو کسی بات کا جواب ہی نہیں دے رہا ہے۔ میں نے جیسے ہی اپنے لخت جگر کو گود سے اتار کر کھڑا کیا، وہ کٹی شاخ کی مانند لہرا کر زمین پر آن گرا۔ تب مجھے محسوس ہوا اسے کچھ ہو رہا ہے۔ میں نے اپنی دیورانی سے پوچھا یہ نیچے کب آیا۔ اس نے کہا بھابی! تقریباً پندرہ منٹ پہلے نیچے آیا ہے۔ اس کی آنکھیں خطرناک حد تک لال ہو رہی تھیں اور وہ ہنسے جا رہا تھا مگر کچھ عجیب انداز میں۔ میں نے سوچا ڈاکٹر کو دکھا کر لاتی ہوں۔ نجانے اسے کیا ہو رہا ہے۔ میں عمر دراز کو وہیں چھوڑ کر اوپر کمرے میں پرس لینے گئی تو اور وہاں جو کچھ دیکھا وہ مجھے شاک دینے کے لیے کافی تھا۔ شوکیس جس دراز میں دوائیاں رہتی ہیں وہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے لپک کر ساری دوائیاں اٹھائیں تو میری تو جان ہی نکل گئی کہ نیند کی گولیوں کا پورا پیکٹ خالی تھا۔ اس پیکٹ میں دس گولیاں ہوتی تھیں۔ گذشتہ رات میں اپنی نند کو اس میں سے ایک گولی دے چکی تھی۔ میں عمر کو قریبی کلینک لے گئی۔ گولیوں کا پتا دیکھ کر ڈاکٹر بولا یہ عام ڈاکٹر کا کام نہیں۔ اسے فوراً جناح اسپتال لے جاؤ اور اسے سونے بالکل مت دینا ورنہ اس کے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ میں نے اپنے شوہر یعنی عمر دراز کے پاپا کو فون کر دیا۔ وہ آئے، پھر ہم کھارادار کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں لے گئے۔ وہاں میرے معصوم بچے پر جو گزری وہ ایک الگ کہانی ہے۔

ناک کے ذریعے پائپ پیٹ میں اتار کر مصنوعی الٹیاں کرائی گئیں۔ ڈاکٹروں کی محنت اور رب کی مہربانی سے میرا بیٹا بچ گیا۔ ڈاکٹروں نے ہم سے کہا کہ یہ نیند کی گولیاں اتنی پاور فل تھیں کہ اگر کوئی نوجوان بھی اتنی مقدار میں کھاتا، تو نہ بچ پاتا مگر بچ ہے، بچانے والا تو وہی رب ہے۔

معدہ کو واش کر دیا گیا مگر تب تک کچھ اثر خون میں شامل ہو چکا تھا۔ دو دن عمر اسپتال میں رہا اور اس کے بعد بھی تقریباً دس دن وہ غنودگی میں رہا۔ ڈاکٹروں نے کہا اب اسے جتنا سونا ہے سونے دیں۔

☆......☆......☆

آج ماشاء اللہ عمر دس سال کا ہو گیا ہے مگر آج بھی میں اس واقعے کو یاد کر کے کانپ جاتی ہوں۔

اگر اس دن بجائے عمر دراز چار پاؤں چلنے کے بجائے سو گیا ہوتا تو کیا ہوتا۔

میری تمام والدین سے گزارش ہے، پلیز ساری دوائیں بچوں کی پہنچ سے دور رکھیں۔ اللہ کریم ساری ماؤں کی گود ٹھنڈی رکھے۔ آج میرے شوہر سب کو فخر سے بتاتے ہیں کہ یہ نام 'عمر دراز' میری بیگم نے رکھا ہے اور اس نام کی برکت سے رب کریم نے ہمارے بیٹے کی عمر دراز کی ہے۔

☆☆......☆☆☆

چپ کا کفن



عظمیٰ شکور

یک طرفہ محبت کی آگ میں جلتی، ایک دوشیزہ کی خاموش حسرتوں کا نوحہ، اسلام آباد سے



جانے وہ کب آنکھوں کے رستے سیدھا دل میں اتر گیا۔ بنا کسی آہٹ کے، چپ چاپ، ہونٹوں کی مسکراہٹ بن گیا تھا، میں بے خودی اس کی محبت میں پور پور ڈوب چکی تھی اور واقعی مجھے اس کے بنا کچھ بھائی نہ دیتا تھا۔

دن میں وہ، رات میں وہ، میری تو ہر بات میں وہ تھا۔ دل کی دھڑکنیں بہت احترام سے اس کا نام دہراتیں، دماغ سمجھایا کرتا کہ وہ تیرا نہیں پرایا ہے مگر دل فوراً سرزنش کرتا...... نہیں وہ تیرا ہے۔

وہ تجھ سے محبت کرتا ہے اور میں دل کی آواز پر ہی لبیک کہتی اور مطمئن ہو جایا کرتی۔ مگر دماغ طرح طرح کے وسوسے ڈال دیتا کہ تم مجھے میری ہی طرح چاہتے ہو۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ دل اس محبت کا گواہ بن جایا کرتا اور آنکھیں شکرانے میں سجدہ ریز ہو جاتیں۔ تمہارا ملنا شاید میری کسی نیکی کا صلہ تھا۔

☆......☆......☆

صرف ایک فون کال کے بعد یہ محبت وجود میں آئی تھی۔ مجھے ان کی کہانی کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔ جبھی میری انگلیوں نے تمہارا نمبر ڈائل کیا تھا

۔تمہاری آواز جیسے مجھ پر کوئی جادو کر رہی تھی۔

میں فون بند کرنا بھول گئی تھی اور آواز کے سحر میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ کہ اچانک فون بند ہو گیا اور میں موبائل کو دیر تک تکتی رہی تھی۔

یاد ہے میں نے تمہیں SMS کیا تھا پھر ایک کے بعد دوسرا پھر تیسرا مگر دل کو قرار نہ تھا۔ جب تمہارا SMS آیا تو دل کو قرار آیا تھا۔

☆......☆......☆

اور صرف چند گھنٹوں کی ریاضت میں ہم ایک دوسرے کے بن چکے تھے نہ کوئی قسمیں کھائی تھیں، نہ کوئی وعدے کیے تھے۔ صرف ایک محبت کے احساس نے ہم دونوں کو جوڑ دیا تھا اور ہم محبت کے حسین بندھن میں بندھ چکے تھے۔

یہ سب اتنا اچانک اور اتنا غیر ارادی فعل تھا کہ خود ہم کو خبر نہ ہوئی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہیں تھا۔ میں نے ایک بار پوچھا تھا کہ مجھے دیکھنے کو کیا دل نہیں چاہتا تھا۔؟''

تم فوراً تڑپ گئے تھے۔ تم نے دوری کو قصور وار ٹھہرایا تھا۔ اور میں تمہاری سادگی پر فریفتہ ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

تمہاری کال کا مجھے ہر وقت انتظار رہتا۔ موبائل کی ہر بیل مجھے اپنی طرف کھینچ لیا کرتی تھی کہ شاید تم ہو اور اس محبت پر میں مسکرا کر رہ جاتی۔ کبھی کبھی ڈر جایا کرتی تھی اتنی بے شمار محبتیں پا کر، سہم جاتی کہ کہیں یہ کوئی خواب تو نہیں؟

تم نے ایک بار کہا تھا'' مجھے اتنا نہ چاہو کہ میں مر ہی جاؤں'' اور میں تمہارے یوں کہنے پر تڑپ گئی تھی۔ اور جواب میں، میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ یہ بے پناہ محبتیں اور چاہتیں بس تمہارے ہی لیے ہیں اور تم نے خود یہ کہا تھا۔

''مجھے تم سے محبت ہے''

اور میں نے برجستہ جواب دیا تھا کہ میں جانتی ہوں۔''

تم مجھے اپنا نام دینا چاہتے تھے مگر رسموں کی زنجیریں تمہارے پاؤں جکڑے ہوئے تھیں۔ میں دور ہوتے ہوئے بھی تمہارے پاس، بہت پاس تھی۔

☆......☆......☆

مشرق سے طلوع ہونے والا سورج سرخی بکھیرتا آسمان کی وسعتوں میں جلوہ افروز تھا۔ سب کچھ معمول کے مطابق ہو رہا تھا۔ مگر میری زندگی میں آنے والا طوفان جیسے اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے گیا تھا۔ اور شاید میں بھی بہہ گئی تھی اس طوفان میں۔ آج اس کی باتوں نے مجھے خوابوں سے نکال کر حقیقت کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا تھا۔

وہ بولتا جا رہا تھا اور میں بت بنی سنتی جا رہی تھی۔ سماعتیں جیسے جواب دے رہی تھیں۔ موبائل میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔ موبائل پر اس کی آواز گونج رہی تھی۔ اس نے اپنی مجبوری کو محبتوں میں لپیٹ لپیٹ کر میری طرف اچھالا تھا۔

☆......☆......☆

وہ شادی شدہ تھا اور میری وجہ سے اپنی ذاتی زندگی میں کوئی تباہی نہ چاہتا تھا۔ مگر میں جانتی تھی کہ ایک دل میں، ایک وقت میں دو دو مکین نہیں رہا کرتے۔ اسے اپنی بیوی کے ہمراہ رہنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ میری بے پناہ محبتیں بھی نہیں اور ویسے بھی میں عورت ہونے کے ناتے کسی دوسری عورت پر ظلم نہیں کر سکتی۔

میری محبت ایسی نہیں تھی کہ میں کسی کی خوشیوں پر ڈاکا ڈالتی۔ میں نے اپنی محبت کو چپ کے کفن میں سُلا دیا تھا۔ مگر دفن نہ کر سکی تھی کہ محبت خود غرض نہیں ہوا کرتی، صلے نہیں مانگا کرتی۔ وہ بہت لڑا تھا مجھ سے۔

میری عدالت نے فیصلہ سنا دیا تھا۔ میں نے اُسے آزاد چھوڑ دیا تھا۔ مگر شاید خود عمر بھر کی قیدی بن گئی تھی کہ محبت کو خود سے الگ نہ کر پائی تھی۔

میں خوش فہمی اور خود فریبی کا شکار بن چکی تھی۔ کہیں میری طرح کوئی اور بھی اسی طرح کے سپنے بُننے میں غلطاں تو نہیں۔ مت بُنو ایسے سپنے جن کی تعبیریں مقدر نہیں بنتیں۔

☆☆......☆☆

کراچی سے ہی، چھٹی حکایت

عشق بے پروا

ندیا مسعود

والدین کی محبت سے دور چلے جانے والوں کے لیے ایک خصوصی کہانی

وقت کا پنچھی اپنی اڑان ہمیشہ بہت بلند رکھتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وقت ہمارے دامن میں عمر کی نقدی رکھتا اور ایک نسل کو دوسری نسل میں منتقل کرتا اپنا کام کرتا جاتا ہے۔ آج اچانک سے اس وقت نے مجھے اُس سرد رات کے پچھلے پہر لا کھڑا کیا ہے، جس میں دو پریمی اپنے عشق کی بت سے بے خبر، اپنی ہی رو میں بہے چلے جا رہے تھے۔

کرن اور شہریار کے بیٹے نوید کے ولیمے کے ریسپشن کا کارڈ میرے ہاتھوں میں ہے اور میرا ماضی میرے سامنے کسی روشن دن کی طرح طلوع ہو چکا ہے۔

''ان دونوں کو جلد از جلد یہاں سے چلے جانے کا کہو۔'' ابا کا حتمی فیصلہ امی کے سامنے رکھا تھا۔ وہ امی کو سمجھا رہے تھے کہ کسی بھی وقت پولیس گھر پر چھاپا مار سکتی ہے اور ہم



ایک فیصلہ تھا، جسے عشق کے قلم نے زندگی دی تھی۔ جسے محبت نے تھپک تھپک کر بہت سارے من چاہے خواب دکھائے تھے۔ اور جب محبت خواب دکھانے پر آ جائے تو وہی ہوتا ہے جو کبھی کسی کے گمان میں نہیں ہوتا۔

بلا وجہ مصیبت میں پھنس سکتے ہیں۔'' امی ڈری ڈری سی ان کی بات سن رہی تھیں اور اپنے اندر یہ ہمت پیدا کر رہی تھیں کہ کس طرح جا کر یہ فیصلہ ماسی سکینہ کو سنائیں۔ آخر انہیں سرونٹ کوارٹر میں جا کر یہ فیصلہ ماسی سکینہ کو سنانا ہی پڑا۔ اپنی

میں بنی ہوئی لڑکی اور اس کے شوہر جو کہ شکل سے امیرزادہ نظر آرہا تھا کے ساتھ سینہ سپر بنی کھڑی تھی۔

''بی بی جی بس رات کی مہلت دے دیں۔ ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔'' وہ ہاتھ جوڑ کر رحم طلب نظروں سے امی سے بولی تھی۔ امی نے مجبوراً اثبات میں سر ہلا کر اجازت دے دی۔

کرن (ماسی کی لڑکی) کی ماں ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ خوبصورت نیلی آنکھوں والی پٹھان عورت جو کہ جوانی میں اپنی بیٹی کی ہی طرح خوبصورت ہوگی، بیوہ ہوگئی تو اپنی بیٹی کے ساتھ ایک زمیندار کے گھر میں نوکری کی غرض سے آگئی۔ زمیندارنی نے ترس کھا کر اس کو اپنے گھر میں کام کی غرض سے رکھ لیا۔ ساتھ میں سرونٹ کوارٹر بھی دے دیا۔ سر چھپانے کی جگہ مل گئی اور شب و روز سکون سے گزرنے لگے۔

کرن اس وقت چھوٹی تھی مگر بہت ہی پیاری شکل و صورت کی تھی۔ اس کی دوستی زمیندار کے بیٹے شہریار سے ہو گئی۔ کھیلتے کھیلتے وہ جوان ہوگئے۔ اور یہ بچپن کی دوستی کب عشق میں بدل گئی پتا ہی نہیں چلا۔

زمیندار کی بیٹی کی شادی تھی۔ زمیندارنی نے ڈھولکی رکھ لی۔ کرن کو زبردست ڈھولکی بجانا آتی تھی۔ شادی کے موقع پر زمیندارنی نے فراخدلی دکھائی اور اپنی بیٹی کے پرانے کپڑے کرن کو دے دیے۔ کرن کے تو مزے آگئے۔ ہر روز نیا جوڑا پہن کر تیار ہو کر شادی کے کاموں میں حصہ لینے لگی۔

آج وہ پنک کلر کے جوڑے میں غضب ڈھا رہی تھی۔ شہریار اسے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اس کی نظریں بار بار کرن کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ خود اپنی اس بے خودی پر حیران تھا۔ نظروں کی تپش کرن نے بھی محسوس کر لی اور اس کا گلابی چہرہ مزید گلابی ہونے لگا۔ شرم سے لال سرخ ہوتی کرن اپنے آپ میں سمٹ کر ماں کے اور قریب ہوگئی۔ پھر تو پوری شادی میں یہ سلسلہ چلتا گیا اور عشق بڑھتا گیا۔

کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتا۔ شہریار کی بہن نے ان کو راز و نیاز کرتے پکڑ لیا۔ گھر میں ایک ادھم مچ گیا۔

زمیندار نے جب سنا تو غصے میں فوراً ان کو گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ ماسی سکینہ پر یہ خبر بجلی بن کر گری اور وہ رونے دھونے لگی۔ کرن کو خوب کوسا اور کرن ماں کی ڈانٹ اور مار کے ڈر سے ہر وہ چیز کرنے کو تیار تھی جس سے اس کی ماں کی عزت بچ جائے۔

مگر زمیندار کا بیٹا شہریار کسی بھی طرح کرن کا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ وہ سرونٹ کوارٹر میں گھس آیا۔ کرن اور اس کی ماں جو کہ ڈرے سہمے گھر چھوڑنے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے گھبرا گئے۔

ماسی سکینہ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر منت سماجت کی کہ تم یہاں سے جاؤ مگر شہریار پر تو عشق کا بھوت سوار تھا۔ اس نے دھمکی دی وہ بھی ساتھ جائے گا ورنہ وہ خودکشی کر لے گا۔ لہٰذا رات کی تاریکی میں پناہ کی تلاش میں ان تینوں نے ہمارے گھر کا رُخ کیا۔

کرن کی ماں نے کچھ عرصے پہلے ہمارے گھر میں بھی ملازمت کر لی تھی تاکہ آمدنی بڑھ سکے۔ اب وہ پناہ کی تلاش میں ہمارے گھر میں موجود تھی۔ مگر ہمارے ابا بڑے سمجھدار تھے۔ فوراً خطرے کی بُو سونگھ لی اور امی کو سختی سے حکم دیا کہ، ان کو فوراً یہاں سے جانے کا کہو۔ ورنہ ہم لوگ مشکل میں پھنس جائیں گے۔''

آخر ماسی سکینہ اپنی بیٹی کرن اور شہریار کے ساتھ رات کے اندھیرے میں ٹرین اسٹیشن پہنچے مگر زمیندار کے آدمی وہاں موجود تھے۔ یہ چھپتے چھپاتے بس اڈے پہنچے مگر وہاں بھی زمیندار کے آدمی موجود تھے۔ آخر میں شہریار نے اپنے ایک بڑے اچھے عزیز دوست کو فون کر کے ساری صورتحال سمجھائی تو وہ ان کی مدد کے لیے گندم کا ٹرک لے آیا اور اور گندم کی بوریوں کے درمیان ان کو بٹھا کر کسی نہ کسی طرح اسلام آباد لے گیا اور اپنے رشتے داروں کے گھر یہ کہہ کر ٹھہرا دیا کہ یہ ویزا لگوانے آئے ہیں۔ کچھ دن یہاں رہیں گے۔

شہریار یہ بات سن کر چونکا، گھر سے وہ کافی رقم لے کر آیا تھا۔ اس نے عزیز سے کہا تم نے بڑا اچھا آئیڈیا دیا ہے۔ ''اگر تمہارا کوئی جاننے والا پاسپورٹ آفس میں ہے تو ہم سب کے پاسپورٹ بنوا دو اور کہیں باہر کا ویزا لگوا دو۔ اس زمانے میں یہ کام اتنا مشکل نہیں ہوتا تھا۔ عزیز کے ایک دوست نے ان سب کاموں میں اس کی بھرپور مدد کی اور بالآخر لندن کا ویزا لگ گیا۔

سادگی سے نکاح ہوا اور یہ تینوں لندن پہنچ گئے۔ شہریار نے کافی جدوجہد کے بعد ایک اچھی نوکری تلاش کر لی ایک گھر کرائے پر لیا۔ اس طرح وقت گزرتا گیا۔ کرن اور شہریار کے تین بچے ہوگئے۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکے کی شادی کر دی، تیسرا لڑکا جو سب سے چھوٹا تھا اور لاڈلا تھا اچانک اماں ابا کے سامنے آ کھڑا ہو کہ ماما پاپا مجھے ایک انگریز لڑکی سے بے حد پسند ہے۔ میں اس سے محبت کرتا

ہوں۔اور وہ میری خاطر مسلمان ہونے کو بھی تیار ہے۔"

شہریار یہ سنتے ہی آپے سے باہر ہو گیا۔اپنے بیٹے کی جرأت اسے ذرا پسند نہیں آئی اور کہا ہرگز یہ شادی نہیں ہو سکتی۔

گھر کا ماحول کشیدہ ہو گیا۔کرن اور ماسی سکینہ یہ صورتحال دیکھ کر گھبرا گئی۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس معاملے کو کیسے حل کرے۔باپ بیٹے کی جنگ دیکھ دیکھ کر اسے ہول اٹھتے تھے کہ نہ جانے کس کی نظر لگ گئی ہے۔اور ہنستا بستا گھر میدانِ جنگ بن گیا۔

بیٹا اس لڑکی کی خاطر گھر چھوڑنے کو تیار تھا۔تب اچانک کرن کو اپنے ساس سسر یعنی شہریار کے ماں باپ کا خیال آیا۔جس کے بارے میں انہوں نے پلٹ کر یہ تک معلوم کرنے کی کوشش نہیں کہ وہ کس حال میں ہیں۔مر گئے یا زندہ ہیں۔رشتے داروں اور محلے والوں میں ان کی رسوائی اور بدنامی ہو گئی۔پس ایسے میں اللہ یاد آیا کہ اے رب تو رحمان ہے، مجھ پر کرم کر۔میں بڑی گناہ گار اور خطا کار ہوں۔" جائے نماز بچھا کر توبہ کا دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ایک ایک کر کے ماضی کے دروازے کھلتے چلے گئے۔تب احساس ہوا کہ اولاد کی محبت کیا ہوتی ہے؟ شہریار کے ماں باپ کس کرب سے گزرے ہوں گے۔اسی کا احساس دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس آزمائش میں ڈالا۔رو رو کر دعائیں مانگیں اور پھر وہ شہریار کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"شہریار کیا تم اپنی پچھلی زندگی بھول گئے ہو۔تم نے میرے عشق میں اپنے ماں باپ کا کتنا دل دکھایا تھا اور اس وقت تو تم کہتے تھے کہ پسند کی شادی کا اختیار تو اسلام نے دیا ہے۔زبردستی کی شادی اسلام میں منع ہے۔میں نے جو کیا وہ ٹھیک کیا۔اب وہ دعوے، وہ اسلام کے حقوق کہاں گئے؟ اٹھو اللہ کے سامنے جا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔بیٹے کو سمجھاؤ۔اللہ تعالیٰ نے اولاد کو سمجھانے کا حق دیا ہے۔سمجھ جائے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کو اپنی زندگی کا فیصلہ خود کرنے دو۔"

شہریار حیران و پریشان کرن کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا جو نڈر بن کر اپنے چھوٹے بیٹے نوید کی وکالت کر رہی تھی۔اپنے ماں باپ کی بے بسی اور محبت نے آنکھوں میں آنسو بھر دیے۔اور وہ بھی خدا کے حضور جا بیٹھا۔خدا سے معافی مانگی توبہ استغفار کی۔اس کے بعد اپنے بستر پر لیٹ کر بہت سوچا۔

اپنے بیٹے کو بلایا۔پیار کیا اور اپنے والدین کا نمبر دیا کہ فون ملاؤ اور اپنے دادا، دادی سے میری بات کرواؤ۔"

نوید نے ٹیلی فون ملایا۔گھنٹیاں بجتی رہیں آخر ایک نحیف سی آواز سنائی دی جو کہ غالباً شہریار کے والد (زمیندار) کی تھی۔نوید نے ان کا نام پوچھا اور بتایا کہ میں نوید بول رہا ہوں لندن سے۔میرے والد آپ سے بات کریں گے۔" شہریار نے فون لیا اور "ہیلو" کہا۔

دوسری طرف سے زمیندار کی کانپتی ہوئی آواز آئی "ارے شہریار یہ تو ہے۔" اور وہ بے تحاشا رونے لگے۔ادھر شہریار ہچکیاں لے لے کر باپ سے معافی طلب کر رہا تھا۔زمیندار اور زمیندارنی نے باری باری بات کی اور کہا کہ بیٹا تم نے بہت غلط کیا مگر ایک دفعہ بھی خوشامد اور پیار سے ہمیں منا لیتے تو ہم خود تمہاری شادی کر دیتے۔تم ہم کو چھوڑ کر اتنی دور جا کر بس گئے۔پلٹ کر پوچھا بھی نہیں۔"

دونوں طرف سے معافی تلافی ہوتی رہی۔اور نوید یہ سب دیکھ کر حیران تھا۔شہریار نے فون بند کر کے نوید سے کہا۔

"بیٹا ایک شرط پر تیری شادی تیری پسند سے کروں گا تو ولیمہ پاکستان میں اپنی دادی اور دادا کے ساتھ، ان کے پاس جا کر کرے گا۔" نوید خوشی سے باپ سے لپٹ گیا۔

کرن اور ماسی سکینہ کی آنکھوں میں ندامت اور خوشی کے ملے جلے آنسو تھے۔اللہ تعالیٰ کی اس رحمت پر حیران تھے جس نے توبہ قبول کر کے ان کو سیدھا راستہ دکھایا کہ خدا تو رحمان ہے ہی مگر مہربان ماں باپ بھی ہیں، جنھوں نے صبح کے بھولے کو قبول کر لیا۔

آج پاکستان میں نوید کا ولیمہ تھا۔دادا، دادی، باپ بہو، پوتا پوتی سب ایک چھت تلے جمع تھے۔اور خوشیوں کا سماں تھا۔ماں باپ کی بے لوث محبت خوشیاں بکھیر رہی تھی۔

مجھے یہ سب دیکھ کر انجانی سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔بعض رشتے کچھ نا ہو کر بھی سب کچھ ہو جایا کرتے ہیں۔لیکن یہ جو اولاد اور والدین کا رشتہ ہوتا ہے یہ بہت نازک بھی ہوتا ہے اور مضبوط بھی ہوتا ہے۔

کاش اولاد یہ سمجھ سکے کہ ماں باپ کی خوشامد اور ان کے پیار کو ہاتھ جوڑ کر، گود میں سر رکھ کر، پاؤں پکڑ کر پا لے تو یقیناً ان کا دل بھی موم ہو جائے گا مگر نئی نسل تو اپنا فیصلہ سنا دیتی ہے۔ماں باپ کو قائل کرنے منانے کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔

☆☆......☆☆

سیالکوٹ سے، ساتویں حکایت

میرا کالا ہے دلدار



ثانیہ بھٹی

سیالکوٹ سے، ایک کلوٹے کا قصہ، اُس کی دولت سے سب پیار کرتے تھے مگر......

''کبھی دل کرتا ہے گھر کے سب آئینے توڑ ڈالوں۔ آخر کیا دیتے ہیں یہ آئینے، اک درد، اک چبھن۔ آخر کیا فائدہ اس دولت کا؟ کیا فائدہ محل نما گھر کا، مجھے نہیں چاہیے یہ سب میری دولت سے پیار کرتے ہیں؟ آخر کوئی میرے دل میں کیوں نہیں جھانکتا؟ کوئی یہ کیوں نہیں سمجھتا کہ اس بدصورت چہرے کے پیچھے ایک پیار کرنے والا انسان چھپا ہے؟'' یہ کہہ کر یاسر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

☆......☆......☆

بیگم زبیدہ کے گھر جب یاسر پیدا ہوا تو وہ اس کی توے جیسی رنگت، موٹی سی ناک، چنی سی آنکھیں اور حد سے پھیلے ہوئے ہونٹ دیکھ کر سکتے میں رہ گئی تھیں ایک پل کو لگا غلطی سے کوئی افریقی بچہ ان کی گود میں ڈال دیا گیا ہے۔ وہ خود بھی سرخ سفید رنگت اور اچھے نقوش کی مالک تھی اور سہیل صاحب بھی اچھے نقشے کے مالک تھے پھر یہ یاسر کس پر چلا گیا تھا؟ پر کہتے ہیں ناں اولاد اولاد ہوتی ہے، چاہے جیسی بھی ہو۔ وہ اسے خدا کی مرضی سمجھ کر دل و جان سے اس کی پرورش کرنے لگیں اور بدقسمتی سے وہ دوبارہ ماں نہ بن سکیں۔

☆......☆......☆

''یار مجھے تیری گاڑی چاہیے کل'' احمد نے یاسر سے کہا۔

''لے جانا پر کہاں جانے کا ارادہ ہے۔''
''بس یار اپنی ایک دوست کو لے کر جانا ہے۔'' احمد نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔
''اوہ اچھا پر ذرا ٹائم سے واپس آ جانا ڈیڈی شام کو جلدی آ جاتے ہیں۔''
''او کے یار ڈونٹ وری۔'' احمد نے تسلی دی۔
''تو کیسی رہی ڈیٹ؟ کہاں کہاں گئے؟ کیا کھایا پیا؟'' یاسر نے بے چینی سے پوچھا۔
بہت انجوائے کیا۔ ہم سی ویو پہ گئے تھے، شام تک رہے۔ چل تو بھی کسی دن۔ ویسے بھی آج کل تو فارغ ہے نا تو۔''
''ہاں یار بس MBA کے رزلٹ کا انتظار ہے پھر پاپا کے ساتھ بزنس میں ساتھ دوں گا۔'' یاسر نے بتایا۔
''ارے تیری بھی کیا بورنگ لائف ہے۔ اگر کہے تو کوئی لڑکی سیٹ کرا دوں؟'' احمد نے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔
''نہیں یار اتنے بدصورت چہرے سے کون دوستی کرے گا؟ لڑکیاں تو میری شکل سے ہی خوف کھاتی ہیں۔'' یاسر نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔
''ابے ایسی بھی بات نہیں ہے، پیسے میں بہت کشش ہے۔ تو حکم کر لائن لگا دوں گا لڑکیوں کی۔'' احمد نے جوش سے کہا۔
''نہیں یار کیا فائدہ۔'' مجھے وہ پیار نہیں چاہیے جو دولت سے ملے، مجھے سچا پیار چاہیے جو مجھے دل سے محبت کرے نہ کہ میری دولت سے۔

☆......☆......☆

یاسر نے جب ہوش سنبھالا اپنے اردگرد عیش و آرام پایا۔ اس کی ہر خواہش منٹوں میں پوری ہو جاتی اس سب کے باوجود وہ خود کو تنہا محسوس کرتا۔ احساس کمتری کا آسیب بری طرح اس کی روح سے چپکا ہوا تھا لوگوں کی چبھتی نظریں اس کو مزید احساس کمتری میں مبتلا کر دیا کرتی تھی۔ اس نے دنیا سے الگ تھلگ رہنا شروع کر دیا تھا۔ ایسے حالات میں اس کے بچپن کا ساتھی احمد ہی اس کا سب کچھ تھا۔ احمد کا تعلق غریب گھرانے سے تھا۔ اس نے یاسر سے دوستی صرف مطلب کے لیے رکھی ہوئی تھی۔ اس کو اپنی آوارگیوں کے لیے یاسر کی ضرورت پڑتی تھی وہ یاسر کی دل جوئی کرتا تھا اور اپنا مطلب بھی نکالتا تھا۔ یاسر کی والدہ نے اُسے احمد سے ملنے کو منع بھی کیا تھا پر یاسر کو ان باتوں سے غرض نہ تھی۔ اسے بس ایسے ساتھی کی ضرورت تھی جو اس کے دکھ کو کم کر سکے اور وہ صرف احمد کا کندھا تھا۔

☆......☆......☆

''دیکھو سائرہ یہ رنگ کیسا ہے؟'' یاسر نے گولڈ کی رنگ سائرہ کی نازک نازک سی انگلی میں پہناتے ہوئے پوچھا۔
''نہیں یہ نہیں وہ والی۔'' سائرہ نے قدرے بڑی انگوٹھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شوخی سے کہا۔ ''او کے میڈم یہ والی لے لیں۔'' یاسر نے سائرہ کو پیار سے دیکھا۔
یاسر نے احمد کے کہنے پر سائرہ سے دوستی کر لی تھی اور یہ دوستی اسے بہت مہنگی پڑ رہی تھی۔ ہر دوسرے دن ایک نئی فرمائش یاسر کے لیے تیار...... پر یاسر کو پروانہ تھی۔ اسے بس اتنا پتا تھا کہ کوئی اس کی بدصورتی کے باوجود اس کے ساتھ ہے۔ وہ ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔

☆......☆......☆

''سائرہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم......؟'' یاسر نے سائرہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''ک...... ک...... کیا؟ شادی؟ اوہ آئی ایم سوری میں تمہیں بتانا بھول گئی۔ میری بچپن میں ہی بات طے ہو گئی تھی۔'' سائرہ نے نظریں چراتے ہوئے کہا یاسر کا دل چھن سے ٹوٹ گیا۔
''مجھے تنہا چھوڑ دو۔ نہیں چاہیے کسی کا ساتھ۔ تم سب مطلبی ہو، تم سب دولت سے پیار کرتے ہو۔ لے لو یہ دولت پر تنہا چھوڑ دو مجھے۔'' یاسر نے چلاتے ہوئے کہا احمد اس کا چہرہ تکے جا رہا تھا۔
''دیکھیں مسز سہیل! آپ کے بیٹے نے کسی بات کی بہت ٹینشن لی ہے۔ مجھ لگتا ہے کسی نے ان کو بہت گہری چوٹ دی ہے یہ کچھ دوائیاں آپ لے لیجیے کچھ دنوں بعد دوبارہ آئیے گا۔'' سائیکاٹرسٹ نے مسز سہیل کو پرچی تھماتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

یاسر نے سب سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ اب اس کو احمد کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جان گیا تھا کہ سب مطلب کے دوست ہیں۔ اب اس نے خود کو بزی کر لیا تھا۔ وہ ڈیڈی کے بزنس میں ڈوب گیا تھا......

اس دن موسم کافی خوشگوار تھا۔ آسمان کالے کالے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا جیسے ابھی یہ بادل برس جائیں

گے۔ یاسر حسب معمول دفتر سے واپس آیا تھا۔ ابھی آدھا راستہ ہی طے ہوا تھا کہ چھن چھن کر کے بارش برسنے لگی۔ لحہ بھر میں سڑک دریا کا منظر پیش کرنے لگیں۔ دور سے آتی ہوئی ایک لڑکی سڑک پار کر رہی تھی۔ یاسر نے بریک لگانے کی بہت کوشش کی مگر پھسلن کے باعث بریک نہ لگ پایا اور گاڑی اس لڑکی کو جا لگی۔

''مسٹر یاسر پیشنٹ کو ہوش آ گیا ہے، اب آپ اُن سے مل سکتے ہیں۔'' نرس نے آ کر اطلاع دی تو یاسر کی جان میں جان آئی۔ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا کرن سمٹ کر بیٹھ گئی اس کی آنکھوں میں ایک سوال تھا۔

''آئی ایم سوری...... میری وجہ سے آپ......'' یاسر نے کہنا چاہا تو کرن نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

''کیا ملا مجھے بچا کر......؟ میں زندہ کیوں ہوں۔ میں تو گھر سے مرنے کے لیا نکلی تھی پھر بچ کیسے گئی۔'' آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

''اگر آپ مر جاتیں تو میرے ہاتھوں خون ہو جاتا اور میں بھی مارا جاتا۔ وہ تو شکر ہے خدا کا دونوں بچ گئے۔'' یاسر نے گہری سانس لی۔

''پر آپ کیوں مرنا چاہتی ہیں؟ زندگی تو نعمت ہے اور آپ ناقدری کر رہی ہیں۔''

''پلیز یہ لیکچر بند کریں۔ کیا فائدہ ایسی زندگی کا جو دوسروں کے لیے بوجھ اور خود کے لیے بھی بوجھ بن جائے نہیں چاہیے مجھے ایسی زندگی۔'' اتنا کہہ کر کرن پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆......☆......☆

''کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گی کہ ایسا کیا ہوا ہے جو آپ زندگی سے خفا ہیں؟''

''کیا کریں گے جان کر۔ میں خود کو تماشا نہیں بنانا چاہتی اور ہاں مجھے بچا کر آپ نے احسان نہیں کیا۔ آپ جا سکتے ہیں۔'' کرن نے ناگواری سے کہا۔

''میں سمجھ سکتا ہوں۔ زندگی کبھی کبھی بوجھ لگتی ہے۔ موت ہی سب مسئلوں کا حل نظر آتی ہے۔ پر خودکشی سب سے بڑی بے وقوفی ہے۔ آپ مر جائیں گی تو کیا ہو گا۔ مسئلے حل ہو جائیں گے؟ کیا ہو گا آپ کی خودکشی سے؟ کسی کے مرنے سے دنیا نہیں رکتی، سب چلتا ہے، بس مرنے والا مرتا ہے، باقی سب جیتے ہیں یہ دنیا بس ہنسنے والوں کے ساتھ ہے۔ اگر اب بھی مرنا چاہتی ہیں تو شوق سے مریئے۔ میں بھی ایسی سچویشن سے گزر چکا ہوں جب زندگی بیزار ہو گئی تھی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ پر میں سنبھل گیا۔ اب مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔ میں جیسا بھی ہوں خود کے لیے ہوں۔ کوئی کسی کا نہیں بنتا یاد رکھیے گا۔ اب میں چلتا ہوں'' یاسر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

''سنیے کرن نے آہستگی سے پکارا۔

''جی فرمایئے۔'' یاسر نے مڑتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ مجھ سے شادی کریں گے؟ چھ سالوں لوگوں کے ہاتھوں رسوا ہوئی ہوں۔ جو مجھے دیکھنے آتا ایسے چیک کرتا جیسی وہ اپنی بہو نہیں کوئی کھلونا خریدنے آئے ہیں۔ ایسا کھلونا جوان کے بیٹے کا دل بہلا سکے یا نہیں۔ ہر دفعہ یہ کالی رنگت اور چھوٹا قد میری زندگی کو رسوا کر گیا۔ کتنی ہی بار میں ذلتوں کی گہرائی میں گھری ہوں۔ ہر کسی نے میری ذات میں کیڑے نکالے ہیں۔ کسی کو میری تعلیم، میری سیرت نظر نہیں آئی میری ساری قابلیتیں اس سیاہ رنگ میں دفن ہو گئی ہیں سب کو میرا ظاہر ہی نظر آتا ہے۔ کوئی بھی عورت اپنے بیٹے کے لیے کالی کلوٹی بہو لانا پسند نہیں کرتی، ہر دفعہ میرا معائنہ ہوتا ہے اور ہر دفعہ لا علاج کہہ کر فارغ کر دیا جاتا ہے۔ احساس کمتری اور ذلت کی تھاہ گہرائیوں میں میرا وجود دھنس چکا ہے اور پھر میں نے مرنے کا فیصلہ کیا اور آپ نے مجھے بچا لیا۔ آپ کا اور میرا دکھ ایک جیسا ہے۔ اللہ پاک نے ہر انسان کا جوڑا بنایا ہے۔ ہیرے کی قدر جوہری ہی کر سکتا ہے۔ کوئی خوبصورت لڑکا یا لڑکی ہماری قدر نہیں کر سکتے۔ جو جس کے لیے بنا ہے وہی ملتا ہے۔ کیوں نہ ہم ایک دوسرے کے درد بانٹ لیں؟'' کرن نے بھرائی آواز سے کہا۔

☆......☆......☆

''کیوں نہیں ایک پیاسا ہی پانی کی قدر جانتا ہے۔ مجھے امید ہے میرے بنجر جیون میں تم اپنے پیار کے سمندر سے جل تھل کر دو گی۔'' یاسر نے کرن کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

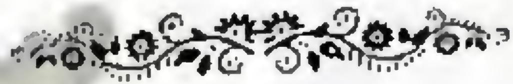
☆☆......☆☆

مغرب سے موصولہ، ایک حکایت

میڈل آف لو



احمد سجاد بابر



ملک روم سے اُس گلیڈی ایٹر کی خاص کہانی، جس نے صرف محبت کے لیے جان دے دی تھی

ایک کھٹکا سا ہوا، جیسے کوئی داخلی دروازے سے آ کر ٹکرایا ہو۔

"کون ہے دروازے پر؟" راہب اعظم نے چونک کر پوچھا۔

کلیسا کی دیواروں سے بادوباراں کا طوفان ٹکرا رہا



تھا، ہوائیں کسی وحشی سانڈ کی مانند سنگی دیواروں پر سر مارتیں اور بے دم ہو کر گر جاتیں، وقفے وقفے سے آسمان پر ایک روشن ٹیڑھی میڑھی لکیر نمودار ہوتی، جیسے آسمان میں دراڑ پڑ گئی ہو اور پھر ایک زوردار کڑاکا ماحول کی ہیبت میں اضافہ کر دیتا، مجموعی طور پر یہ ایک خوفناک رات تھی۔

"جانے کون بے چارہ ہے رات کے پچھلے پہر، یسوع مسیح اس پر اپنا کرم فرمائے۔" ضعیف راہب اعظم نے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے خود کلامی کی اور دروازے کی طرف بڑھے۔

دروازہ کھولنے پر کوئی دھم سے اندر آ گرا۔

راہب اعظم بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹے۔

یہ ایک بچہ تھا، عمر سات آٹھ سال کے لگ بھگ تھی اور چہرے پر نقاہت اور بے چینی مترشح تھی۔ اس وقت یقینی طور پر وہ بے ہوش تھا۔

"اوہ، لگتا ہے بے چارہ ہوش و حواس میں نہیں، مائی لٹل چائلڈ۔"

پریشانی راہب اعظم کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔

"ڈیوڈ، کہاں ہو تم، جلدی سے ادھر آؤ"

بوڑھے راہب نے چرچ کے خدمتگار کو آواز دی، فوراً اد میڑ عمر ڈیوڈ اندرونی ہال سے برآمد ہوا، بچے کو زمین پر بے سدھ دیکھ کر اس کے قدموں میں تیزی در آئی
''فادر، کون ہے یہ ننھی روح؟''
ڈیوڈ نے بے اختیار بچے کو بازوؤں میں اٹھالیا۔
''کسے معلوم ڈیوڈ! شاید آسمانوں سے ٹوٹا کوئی تارا، یا پھر شاید دریائے اردن کی مقدس فضاؤں میں اڑتا کوئی معصوم ابابیل۔'' راہب اعظم نے کھوئے لہجے میں کہا۔
بچہ بے ہوشی میں بھی سسکیاں لے رہا تھا۔
''سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں، سب نفرت کرتے ہیں۔ نہیں جینا چاہتا میں فادر''

☆......☆......☆

یہ نیا روم تھا، آج کا روم۔ بلند و بالا عمارات کے ساتھ پراسراریت کی دھند میں لپٹا شہر

۔ کرسمس کی وجہ سے شہر دلہن کی طرح جگمگا رہا تھا، سا
کلاز اپنے مخصوص کاسٹیوم پہنے بچوں میں تحائف تقسیم کر رہے تھے۔ کرسمس ٹری ماحول کو خوبصورت بنار ہے تھے۔ شہر کے قدیم کلیسا میں بھی ایک خاص تقریب شروع ہونے جا رہی تھی۔ یہ وہ تقریب تھی جو صدیوں سے جاری تھی۔ اس متبرک دن راہب اعظم شہر کے باسیوں میں محبت، امن، سکون کا باعث بننے والوں میں میڈل اور اعزاز تقسیم کرتے تھے۔ یہ اعزاز کسی بھی فرد کو اس کے ذاتی کارنامے پر بھی دیا جاتا تھا یا پھر اس کے بزرگوں میں اگر کسی نے کوئی ایسا کارنامہ سرانجام دیا ہو جسے محبت کا سرچشمہ قرار دیا جا سکے، تو اس کی بعد کی نسلوں کو بھی اس ایوارڈ کا حق دار قرار دیا جا سکتا تھا، یہ ایوارڈ عزت اور وقار کا سمبل بن چکا تھا۔ اسے ''میڈل آف لوو'' کا نام دیا گیا



تھا، ہر کسی کی خواہش ہوتی تھی کہ اس سال یہ اعزاز اس کے خاندان کا حصہ بنے، جس فیملی میں یہ میڈل آتا، اسے رشک کی نگاہوں سے دیکھا جاتا۔ تمام سرکاری اور نجی تقریبات میں اس خاندان کو خاص مہمان کے طور پر مدعو کیا جاتا تھا۔ شاہی تقریبات میں بھی اس خاندان کو اہمیت دی جاتی۔ یہ سنہری رنگ کا طلائی میڈل ہوتا تھا جو نیلے رنگ کے ربن میں بندھا ہوتا تھا۔ میڈل کی گولائی کے وسط میں ایک نقرئی رنگ کی صلیب اور درمیان میں ایک اڑنے کو تیار عقاب کی تصویر کندہ تھی۔

آج بھی وہی خاص دن تھا۔ کلو سیئم (Colosseum) کی قدیم عمارت شہر کے باسیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ یہ وہی عمارت تھی جس میں ہزاروں سال پہلے موت اور خون کا کھیل کھیلا جاتا تھا۔ فضا لوبان اور صندل کی خوشبو سے لبریز تھی۔ کلوسیئم کے اندر کا ماحول ویسا ہی بنایا گیا تھا جیسے قبل مسیح کے سیاہ دور میں ہوا کرتا تھا۔ شاہی خاندان سٹیج پر زرق برق لباس میں موجود تھا، کنگ بنفس نفیس موجود تھے، مگر اس تقریب کی سب سے اہم شخصیت راہبِ اعظم تھے، جن کا خاندان صدیوں سے اس قدیم اور بڑے کلیسا کا بشپ چلا آرہا تھا، راہبِ اعظم اس وقت اپنے مخصوص طلائی لبادے میں ملبوس تھے، سر پر سنہری ہڈ نما لمبوتری پگڑی، گلے میں صلیب، انگلی میں بشپ کی علامتی انگوٹھی اور ہاتھ میں دھاتی خمدار کروزیئر (خمدار دھاتی لاٹھی) تھی جو ان کو رعب دار بنا رہی تھی، ہال میں ہزاروں لوگ دم سادھے بیٹھے ہوئے تھے، سٹیج کے دائیں جانب میڈل کے انتخاب کی جیوری کے افراد اپنی منقش چوبی کرسیوں پر باوقار انداز میں براجمان تھے۔ جیوری کا انتخاب بھی شہر کے ذہین اور دانشور طبقے سے کیا جاتا تھا، جیوری کی رائے کے بعد حتمی فیصلہ راہب اعظم کو ہی کرنا ہوتا تھا۔

مذہبی رسومات کی ادائیگی کے بعد پنڈال میں سناٹا چھا گیا۔ سب کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ راہب اعظم میڈل کے اعلان کے لیے اپنی نشست سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

☆......☆......☆

''اس سال کے میڈل آف لود کے لیے بھی کئی لوگوں میں سخت مقابلہ تھا، بہت مشکل ہو چلا تھا فیصلہ کرنا، مگر فیصلہ تو کرنا ہی تھا۔ اور پھر فیصلہ ہو گیا۔''

راہب اعظم نے تجسس بھرے انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا، پنڈال میں بے چینی کی ایک لہر پیدا ہوئی، سامعین نے بے چینی سے پہلو بدلے۔

''میں اب ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کرنا چاہتا۔''

راہب اعظم نے پراسرار انداز میں کہا، ان کے چہرے پر ایک بھید بھری مسکراہٹ تھی۔

بہت سے لوگ آج کے میڈل کے لیے امید لے کر آئے تھے، ان کے چہرے ستے ہوئے اور آنکھوں میں امید ہلکورے لے رہی تھی۔ اس وقت سب سے زیادہ بے تابی انہی کے انداز سے ہویدا تھی۔

''میں ایک ایسے فرد کو بلانے لگا ہوں کہ بظاہر تو اس کی زندگی اور اس کے اجداد کی زندگی محبت سے خالی نظر آتی ہے مگر میرے وجدان نے میری رہنمائی کی ہے کہ اس سال کے میڈل آف لود کا اس سے بڑا حقدار کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں یہ میرے اندر کی آواز تھی جس نے مجھے بتایا، میری نگاہوں نے اس کے ماتھے پر جگمگاتی روشنی دیکھ لی تھی۔''

راہب اعظم نے ذرا سا توقف کیا، بے چینی کی ایک لہر کلوسیئم کے ایک کونے سے دوسرے تک پھیلتی چلی گئی

''ہمارے آج کے معزز مہمان کو سامنے لایا جائے۔''

راہب اعظم نے صلیب پر انگلی پھیرتے ہوئے بارعب آواز میں کہا۔

ہال میں ایک گہرا سکوت چھایا تھا، صرف بے چین سانسوں کی آواز تھی جو فضا میں گونج رہی تھی، ہزاروں نگاہیں اسٹیج کے عقب میں جمی تھیں جہاں سے آج کے مہمان کو آنا تھا۔

کلیسا کے خدمت گاروں کے دائرے میں زرق برق لباس میں ملبوس ایک بچے کو سٹیج پر لایا گیا۔

ہال میں گہرا سناٹا تھا، مہیب سناٹا۔!!

اچانک ہال میں سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ پیدا ہوئی جو تھوڑی دیر میں شور میں ڈھل گئی۔

''ہم نہیں مانتے اس فیصلے کو، یہ اس میڈل کی توہین ہے۔ یہ ہماری روایات کی توہین ہے۔''

کئی آوازیں ایک ساتھ ہال میں گونجیں، جیسے کسی نے ہال میں بم چلا دیا ہو، کبھی ایسے نہ ہوا تھا کہ کسی نے راہب اعظم کے فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہو، مگر آج انہونی ہو چکی تھی۔ شاہی خاندان بھی تذبذب کا شکار نظر آ رہا تھا، سارا ہی ہال احتجاج میں کھڑا ہو چکا تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

''یہ ظالم لوگوں کی نسل ہے، سنگدل اور پتھر دل لوگوں کا خون اس کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔''

کچھ آوازیں کلوسیئم کی سنگی دیواروں سے ٹکرائیں۔

''یہ غدار اسپارٹکس کی نسل سے ہے، جس نے بغاوت کی تھی، جس کی وجہ سے روما کی سلطنت تباہ ہوتے ہوتے بچی تھی۔''

چند مزید آوازوں کی بازگشت چمگادڑوں کی طرح چھت سے لٹک گئیں۔

''لوو میڈل کی اتنی توہین۔ گلیڈی ایٹرز کے خاندان میں جائے گا محبت کا پیغام۔ ارے ان کو کیا پتا کہ محبت کیا ہے۔ قاتل ہیں یہ قاتل۔''

آوازوں کے بگولے ہال میں چکرا رہے تھے، بچے کا چہرہ ذلت کے احساس سے سفید پڑ گیا تھا۔ ایک خدمت گار نے اسے محبت کے ساتھ خود سے لپٹا لیا تھا ورنہ وہ کب کا گر چکا ہوتا۔

''خاموش۔ میں کہتا ہوں چپ ہو جاؤ۔''

راہب اعظم کی پتھریلی آواز نے جیسے ان پر طلسم پھونک دیا، ہال میں پھر سے گہرا سکوت تھا مگر احتجاج کی لہر ابھی تک گردش میں تھی۔

''میں جانتا ہوں کہ تم لوگ کیا سوچ رہے ہو۔ اور ٹھیک ہی سوچ ہے تمہاری، کیونکہ تم نے ویسا سوچا جیسا تم نے سوچنا چاہا، چاہے حقیقت جو بھی تھی مگر تم حقائق سے آج تک نظریں چرا رہے ہو۔ اس کا خاندان قاتل کیسے

ایک قطعہ

ہر عریانی اور فحاشی ایک ہلاکت ہوتی ہے
ظلمتوں کی تمنا بھی ایک جہالت ہوتی ہے
ہٹ جائے گر مسلم جب راہِ شریعت سے عنبر
قہرِ خدا کی وہ بھی ایک علامت ہوتی ہے

معاویہ عنبر وٹو۔ ہڑپہ سٹی

ہوا جبکہ ان کو خونی درندے کے قتل یا اپنی بقا میں سے کسی ایک کو چننا تھا!!''

''یہ سچ ہے کہ اس بچے کی رگوں میں اسپارٹکس کا خون دوڑ رہا ہے، وہی اسپارٹکس جو باغی تھا۔ وہی اسپارٹکس جسے بغاوت کے جرم میں ہلاک کر دیا گیا تھا۔ وہی اسپارٹکس کہ جو اپنے وقتوں کا بہادر اور جری گلیڈی ایٹر تھا۔ ہاں یہ بچہ اسی خاندان سے ہے مگر کسے معلوم کہ سچ کیا ہے، کون جانتا ہے کہ وقت کی دھند کے پرے کیا ہوا تھا۔ تمہیں آج سننا پڑے گا، آج صرف سننے کا دن ہے تمہارا!!!''

راہب اعظم کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

''ہزاروں سال قبل جنوری کی ایک چمکیلی صبح تھی۔''

راہب اعظم کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی چھلک آئی

☆......☆......☆

''آج بڑا مقابلہ ہے کلوسیئم میں، سپائیگلس لڑے گا آج خونی شیر سے۔''

چربی سے روشن مشعل تھامے ہوئے قید خانے کے پہریدار نے پاس کھڑے دوسرے پہریدار سے سرگوشی کی۔

''ہاں۔ اور سنا ہے کہ شیر تین دن سے بھوکا ہے، اس کی خوفناک دھاڑ اور غراہٹ میں پاگل پن جھلکنے لگا ہے۔ دیوتا رحم کریں سپائیگلس پر۔''

پہرے دار کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں رقصاں تھیں۔

''لوگ بے چینی سے منتظر ہیں اس مقابلے کے، تین ماہ سے کوئی مقابلہ جو نہیں ہوا تھا۔''

پہلے پہرے دار نے دبے لہجے میں کہا۔

"اچھا چپ کر جاؤ، کوئی سن نہ لے۔" دوسرے پہرے دار نے خوفزدہ انداز میں پہلے کو گھر کا۔

سپائیکلس کا نام روم میں بہادری کی علامت بن چکا تھا۔ وہ ایک گلیڈی ایٹر تھا۔ اسپارٹکس کے خاندان کا گلیڈی ایٹر۔ ایک غلام ۔محض تفریح کا ذریعہ ۔کئی درندے اس کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔

وہ فاتحانہ انداز میں اکھاڑے میں اترتا، اس کے چہرے پر ایک پُرسکون مسکراہٹ ہوتی جس میں زمانوں کے بھید چھلک رہے ہوتے تھے۔ اکثر وہ پہلے چند منٹوں میں ہی خونی درندے کو چیر پھاڑ دیتا تھا، وہ عوام میں بہادری کے لیے تو مقبول تھا مگر لوگ اس کا خون دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کی تڑپتی لاش ان کے دل میں ٹھنڈک بن کر اتر سکتی تھی مگر ہر بار سپائیکلس ان کی امیدوں کا محل زمیں بوس کر دیا کرتا تھا۔ شاہی خاندان بھی درندے کی فتح چاہتا تھا مگر سپائیکلس ان کی خوشی کے لیے اپنا جیون داؤ پر نہیں لگانا چاہتا تھا، جیتنا اس کی زندگی کی ضمانت تھا، اسے ہر حال میں جیتنا ہوتا تھا، بہت طاقتور وجہ زندگی تھی اس کے پاس ۔!!

☆......☆......☆

یہ جنوری کی ایک چمکیلی صبح تھی ۔کلوسئیم میں انسانی اژدہام ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وحشت زدہ چہرے۔ چنگھاڑتے، جھاگ اڑاتے، درندگی سجائے ہوئے چہرے۔ خون دیکھنے کے لیے بے تاب چہرے۔ لاشوں پر تھرکنے کے انتظار میں بے کل چہرے۔ ایک ہی طرح کے ہزاروں چہرے کلوسئیم میں جمع تھے، وہ سپائیکلس کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ انہیں علم تھا کہ آج بھی غلام جیت جائے گا مگر امید کی ایک کرن کے تحت وہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ اس مرتبہ درندہ زیادہ خونخوار اور وحشی تھا، اکھاڑے کے ایک کونے میں شیر کا پنجرہ تھا، یہ ایک دیو ہیکل اور لمبے ڈیل ڈول والا درندہ تھا، اس کی آنکھوں میں غضب اور حرکات میں بجلی کے لپکتے کوندے سی پھرتی تھی ،ایسی پھرتی جس میں بے چینی اور وحشت جمع تھی، پنجرے کے پاس ایک غلام کھڑا تھا جس نے دروازہ کھول کر دوڑ جانا تھا، مقابلہ شروع ہونے والا تھا، کلوسئیم تماشائیوں اور درندے کی چنگھاڑ سے لرز رہا تھا، شاہی خاندان بالکونی میں براجمان تھا، شہزادے، شہزادیاں اور بادشاہِ وقت شوق انتظار میں پہلو بدل رہے تھے۔

آخر وہ لمحہ آن پہنچا جب سپائیکلس اکھاڑے میں داخل ہوا۔

لوگوں نے اس پر تھوکنا اور آوازیں کسنا شروع کر دیں۔ سپائیکلس چمکیلے مسلز والا لڑاکا تھا۔ جس کی رگ رگ سے توانائی اور زندگی پھوٹ رہی تھی، اس کا قد عام رومیوں سے ایک ہاتھ بلند تھا، اس کے ایک ہاتھ میں چمکدار تلوار تھی، سر پر حفاظتی خول تھا، سینے کے گرد آہنی لباس اور بائیں ہاتھ پر نوکیلا دستانہ تھا، وہ ڈھال استعمال نہیں کرتا تھا، اسے معلوم تھا کہ ڈھال صرف ایک نفسیاتی حوصلہ ہوتی ہے۔ ڈھال درندے کی ضرب کو روک نہیں سکتی۔ اس وقت سپائیکلس کی آنکھوں میں مخصوص فاتحانہ مسکراہٹ دوڑ رہی تھی۔ وہی مسکراہٹ جس سے لوگ چڑتے تھے، اسے معلوم تھا کہ ہر کوئی اسے گرا ہوا، بکھرا ہوا دیکھنا چاہتا ہے، اس کی خون میں لت پت لاش جانے کتنی آنکھوں میں ٹھنڈک بن کر اترے گی، وہ ہارنے سے پہلے نہیں ہارنا چاہتا تھا، وہ جینا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس کے جینے کی ٹھوس وجہ موجود تھی ۔اس وجہ سے اس کے چہرے پر مہربان اور حوصلہ بھری مسکراہٹ ہوتی تھی۔

وہ اکھاڑے میں تنہا کھڑا تھا۔

بادشاہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور غلام نے پنجرے کا ہک کھول کر دوڑ لگا دی۔

شیر ایک جست لگا کر باہر آیا اور ہوا میں زقند بھر کر سپائیکلس پر حملہ کیا جیسے اسے معلوم ہو کہ یہی وہ شخص ہے جس کو زیر نہ کرنے کا مطلب موت ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے موت ہوا میں تیرتی ہوئی چلی آ رہی ہو، تماشائیوں کے منہ سے لذت بھری چیخ نکلی، درندہ واقعی جلدی میں تھا، بھوک نے اس میں وحشت بھر دی تھی

سپائیکلس نے آخری لمحے میں زمین پر لڑھکنیاں کھا کر شیر کے ابتدائی حملے کو ناکام کیا، درندہ ایک دھاڑ کے

ساتھ زمین پر گرا اور پلک جھپکنے میں کھڑا ہو گیا، اس کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی، نوکیلے دانت ادھ کھلے منہ سے جھانک کر خوف پیدا کر رہے تھے، دونوں حریف پھر آمنے سامنے تھے، شیر کی دم بے چینی سے ہل رہی تھی، وہ عام شیروں سے دوگنی جسامت رکھتا تھا۔

شیر نے اس بار ہوا میں چھلانگ لگانے کی بجائے سپائیکلس پر براہ راست حملہ کیا، قریب تھا کہ اس کے دائیں پنجے کا وار سپائیکلس کا شانہ ادھیڑ دیتا کہ غلام لڑاکے نے پہلو بچاتے ہوئے شیر کی گردن پر تلوار سے وار کیا جو اچٹتا ہوا شیر کی بالوں بھری گردن پر محض خراش ہی ڈال سکا، کلوسئیم شیر کی دھاڑ اور تماشائیوں کی مغلظات سے گونج اٹھا، لوگ سپائیکلس کی لاش دیکھنا چاہتے تھے، شاہی بالکونی میں بھی بے چینی شروع ہو چکی تھی۔

سپائیکلس کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح بے پروائی تھی جو تماشائیوں کو بھڑکا رہی تھی۔

سپائیکلس کو یوں لگا جیسے ایک درندہ اکھاڑے میں اور ہزاروں باہر ہیں۔ وہ درندوں کے درمیان گھرا ہے، ہر کوئی اس کی موت چاہ رہا تھا، سبھی اس کی بوٹیاں نوچنا چاہتے تھے۔ شیر ایک بار پھر ہوا میں چھلانگ لگا چکا تھا، وہ سپائیکلس کو روند دینا چاہتا تھا!!

سپائیکلس نے اپنی تلوار سیدھی کی، وہ اس کھیل کو اسی لمحے ختم کر دینا چاہتا تھا، اسے معلوم تھا کہ بس اگلے لمحے وہ فاتح ہوگا۔ ہمیشہ کی طرح!!

اچانک بالکونی کی طرف سے ایک وحشت بھری آواز سنائی دی۔ ایک نسوانی آواز، جنون میں ڈوبی۔!!

''مر کیوں نہیں جاتے تم نیچ انسان۔''

سپائیکلس نے حیرت سے بالکونی کی طرف دیکھا، ایک لمحے کو اس کی نظریں اس دلکش وجود پر پڑیں۔ یہ شہزادی ٹریشا تھی۔ رنگ، ادا، خوبصورتی اور حسن کا شاہکار۔ اس وقت بے چینی سے مٹھیاں بھینچے اپنی نشست پر کھڑی ہو چکی تھی، اسی نے سپائیکلس کو الفاظ کا کوڑا مارا تھا!!

سپائیکلس جیسے پتھر کا ہو چکا تھا، اس کی تمام حسیات اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں، تلوار والا ہاتھ ہوا میں ساکت تھا۔ یہ بات ان ہونٹوں سے نکلی تھی جو اس کے لیے وجہ زندگی تھے، وہ جیت سکتا تھا مگر وہ جیتنا نہیں چاہتا تھا، اس کی آنکھوں میں درد سمٹ آیا، وہ محبت اس کی آنکھوں سے لہو بن کر بہہ رہی تھی جو اس نے شہزادی ٹریشا سے چپکے چپکے کی تھی۔ خاموش محبت۔ وہ تو اس کے لیے جیا کرتا تھا، وہ سمجھتا تھا کہ شہزادی باقیوں جیسی نہیں ہے، شہزادی اس کو جیتا دیکھنا چاہتی ہے، شہزادی اس کی ہر فتح پر خوش ہوتی ہے۔ مگر آج اس پر انکشاف ہوا کہ شہزادی درندے کے ساتھ ہے، شہزادی اس کی لاش دیکھنا چاہتی ہے، شہزادی اس وحشی مجمع کے ساتھ ہے۔ وہ تو غلام ہے اور غلام تنہا ہوتے ہیں۔ وہ ساکت کھڑا تھا۔ یہ ایک لمحہ تھا، اس لمحے میں جیسے شہزادی نے بھی اس کی آنکھوں کا کرب پڑھ لیا تھا، شہزادی کرسی پر ڈھے سی گئی!!!

تو فیصلہ ہو چکا تھا، اس ایک لمحے نے فیصلہ کر دیا تھا۔ شیر ایک دھاڑ کے ساتھ لڑاکا غلام پر گرا۔ اس کا ہاتھ اسی طرح فضا میں ساکت تھا اور نگاہیں بالکونی پر جمی تھیں، اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی، سینکڑوں درندوں کو ایک لمحے میں موت کے منہ پہنچانے والا خاموشی سے پیچھے ہٹ چکا تھا۔

تماشائیوں کے منہ سے چیخ نکلی۔ اس چیخ میں مسرت نہیں بلکہ درد تھا، کرب تھا اور تڑپ تھی۔ روم کے بہادر گلیڈی ایٹر نے جان دے دی۔ محبت پر جان دے دی۔ وہ یہ تو نہیں چاہتے تھے، وہ سپائیکلس کو مقابلہ کرتے دیکھنا چاہتے تھے مگر وہ کس کے لیے لڑتا۔ اس کی موت تو اس نے مانگی تھی جو وجہِ زندگی تھی!!

سپائیکلس کی بکھری لاش کے گرد سسکیوں کی گونج رقص کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

کلوسئیم میں سسکیاں گونج رہی تھیں، راہب اعظم کی سسکیاں۔ عوام کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی سسکیاں، جیوری اور شاہی خاندان کی سسکیاں!!

مجمع سر سے ہیٹ اتار کر ننھے مہمان کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو چکا تھا۔ عدم آباد میں سپائیکلس کی روح مسکرا رہی تھی!!!

☆☆......☆☆

مقدمہ خون کا



اقبال بانو



اقبال بانو کے جادوگر قلم سے، اُس بیٹے کا قصہ، جس نے بھری

عدالت میں باپ کو باپ تسلیم کرنے سے انکار کردیا تھا

کمرۂ عدالت میں سناٹا چھا گیا تھا جب شہباز ملک نے نہایت پتھریلے لہجے میں ملک سعادت علی کی طرف لہورنگ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ میرے والد نہیں۔''

کمرۂ عدالت میں موجود ہر شخص کی آنکھوں کی حیرتیں مہمان بن گئی تھیں۔ ملک رحمان خان کی ملکانی تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور ملک سعادت علی نے کٹہرے کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ یقیناً اُن کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں کہ بھری عدالت میں اُن کے 27 سالہ نوجوان بیٹے شہباز ملک نے بغیر کسی پس و پیش کے کہہ دیا تھا کہ ''یہ میرے والد نہیں ہیں۔''

چند لمحے خاموشی کی نذر ہوگئے۔ لگتا تھا جیسے کمرے میں کوئی موجود نہیں۔ آخر اس خاموشی کو سول جج (درجہ اوّل) خالد بٹ کی رعب دار آواز نے توڑا۔

''شہباز ملک صاحب! آپ کو پتا ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''جناب! مجھے معلوم ہے۔ میں باہوش و حواس یہ کہہ رہا ہوں کہ ملک سعادت علی میرے والد نہیں ہیں۔''

''پھر ملکانی سکینہ آپ کی کون ہے؟ کیا رشتہ ہے۔''

وکیل استغاثہ خدا بخش نے پوچھا۔

''ملکانی سکینہ میری ماں جیسی پھوپی ہیں۔'' اس نے نہایت اطمینان سے کہا۔

''اور اس سے انکار نہیں کہ ملکانی سکینہ ملک سعادت علی کی بہن ہے؟'' وکیل استغاثہ نے کہا تو شہباز ملک کے لبوں پر زہر خند پھیل گیا۔

''بالکل...... ! ملکانی سکینہ بہن ہیں سعادت علی کی۔'' شہباز نے اس لفظ کو اس طرح چبا چبا کر ادا کیا جیسے کچی بوٹیاں چبا رہا ہو۔

''پھر...... ! جب آپ انہیں ملک سعادت کی بہن مانتے ہیں تو......''

وکیل کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی شہباز بولا۔

''ضروری نہیں کہ ملکانی سکینہ کا بھائی میرا باپ بھی ہو۔''

''ابھی آپ نے کہا کہ ملکانی سکینہ آپ کی پھوپی ہے، اگر آپ ملک سعادت علی کے بیٹے نہیں تو پھر بتائیں کہ ملکانی سکینہ آپ کی پھوپی کس طرح ہوئیں؟''

''میں اس سوال کا کوئی جواب نہیں دینا چاہتا۔''

''آپ مقدمے کو الجھا رہے ہیں مسٹر ملک۔''

''الجھا میں نہیں رہا، آپ الجھا رہے ہیں جناب!

سیدھی سادی بات ہے اور سیدھا سا مقدمہ ہے کہ ملک سعادت علی کا دعویٰ ہے کہ میں ان کا بیٹا ہوں۔ مجھے عدالت نے حاضر ہونے کا حکم دیا اسی سوال کی جوابدہی کے لیے کہ...... آیا میں ان کا بیٹا ہوں یا نہیں۔ اور میں نے کہہ دیا کہ میں ان کا بیٹا نہیں ہوں...... بس فیصلہ ہو جانا چاہیے۔''

شہباز ملک نے نہایت نرم اور ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''دیکھیے...... ! شہادتیں ہیں کہ آپ ملک سعادت علی کے بیٹے ہیں۔''

''شہادتیں......؟ ہا......'' شہباز ملک ہنس دیا۔

''شہادتیں سچی نہیں ہوتی ہیں جی! دولت مند تو شہادتیں خریدتے ہیں...... اور ملک سعادت علی نے بھی خریدی ہیں شہادتیں۔''

''پھر انہوں نے ملکانی سکینہ کو بھی خریدا ہے۔ انہوں نے بھی کہا ہے کہ آپ ملک سعادت علی کے بیٹے ہیں اور......''

''میں ایسے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا...... جو مجھ سے متعلق نہ ہو۔'' اس نے نہایت بے زاری سے کہا۔

پھر وکیل استغاثہ نے اپنے علم کا سارا زور لگا دیا۔ برسوں کے تجربے کی روشنی میں انہوں نے شہباز ملک سے ایسے ایسے سوالات کیے کہ دوسرے لفظوں میں اُسے گھما کر رکھ دینا چاہا مگر اس نے تو خدا بخش کو گھما کر رکھ دیا تھا۔ اس کا تو بس ایک ہی جواب تھا کہ ''ملک سعادت علی میرے باپ نہیں ہیں۔''

آخر عدالت کا وقت ختم ہو گیا اور آئندہ پیشی پر اُسے



پھر حاضر ہونے کا حکم سنا دیا گیا۔ ایک ماہ بعد کی تاریخ تھی اور شہباز ملک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جج صاحب! آپ ایک ماہ تو کیا ایک صدی بعد بھی میرا یہی فیصلہ پائیں گے۔''

خالد بٹ نے دیکھا کہ سعادت علی کا چہرہ سرسوں کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار خالد بٹ کے دل کی تہوں میں عجیب سا درد اٹھا اور انہوں نے نظریں چرالیں۔

یہ عجیب ہی کیس تھا جس نے خالد بٹ کو پریشان کر دیا تھا۔ انہیں اپنے سات سالہ پروفیشن کے دوران ایسے حالات سے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا کہ ایک بیٹا اپنے باپ سے کہے کہ ''یہ میرا باپ نہیں ہے۔''

یا خدا! یہ کیا دنیا ہے تیری؟

یہ کیا اسرار ہے؟

☆......☆......☆

خالد بٹ کا ذہن منتشر تھا اور دل پارہ پارہ ہوا جا رہا تھا۔ وہ کورٹ سے آکر کھانا کھائے بغیر ہی بستر پر ڈھ گئے۔ اور یہ خلاف معمول ہی بات ہوئی تھی۔ ان کی بیوی حمیرا جو کار کی آواز سنتے ہی میز پر کھانا لگا دیا کرتی ہیں۔ آج کھانا لگانے کے بعد چند لمحے تو وہ انتظار کرتی رہیں کہ وہ ہمیشہ کی طرح منہ ہاتھ دھو کر آجائیں گے۔ مگر جب وہ نہ آئے تو حمیرا خواب گاہ میں آئیں۔ خالد بٹ چت لیٹے چھت کو گھور رہے تھے۔

''خالد...... کھانا لگا دیا ہے میں نے۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' انہوں نے بیوی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''خیر تو ہے! آج بھوک کہاں غائب ہوگئی؟''

''حمیرا......!'' خالد بٹ ایک دم ہی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ پھر بیوی کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت پُر سوچ لہجے میں بولے۔

''فرض کرو کسی روز عمیر یہ کہہ دے کہ میں اس کا باپ نہیں ہوں پھر......؟''

''کیا دماغ خراب ہوگیا ہے؟'' حمیرا نے تنک کر جواب دیا۔ ''اور بھلا کوئی بیٹا یہ کیوں کر کہہ سکتا ہے۔''

''آج ایسا ہی کیس میری عدالت میں آیا ہے...... لڑکے کو اس کی پھوپی نے پالا ہے۔ اب اس کا باپ اُسے واپس لینا چاہتا ہے۔ آپس میں بات طے نہیں ہوئی تو باپ نے مقدمہ کر دیا۔

''یعنی بھائی نے بہن پر مقدمہ کر دیا؟'' حمیرا نے جلدی سے کہا۔

''ہاں......! اور بیٹے نے باپ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔''

''بس! سیدھی سی بات ہے کہ وہ پھوپی کے ساتھ رہنا چاہتا ہے اور والد کے پاس نہیں جانا چاہتا۔'' حمیرا نے کہا۔

''سیدھی سی بات نہیں ہے حمیرا! اگر وہ باپ کے پاس نہیں جانا چاہتا تو کہہ سکتا ہے۔ عاقل و بالغ ہے وہ۔ ستائیس سال کا نوجوان ہے۔ ہاورڈ یونیورسٹی سے اس نے ایگری کلچر میں ایم ایس کیا ہے۔ وہ کوئی جاہل اجڈ لڑکا نہیں ہے اور نہ ہی بچہ ہے جو یہ بات کہہ دے یا کسی کے بہکانے میں آجائے۔ تم...... تم اندازہ نہیں کرسکتیں اس شخص کی کیفیت کا جسے اس نے باپ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ یقین کرو مجھے لگ رہا تھا جیسے ابھی اس کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔''

''کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہے خالد! جس کی وجہ سے لڑکا ایسا کر رہا ہے۔'' حمیرا نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

''ہاں...... کوئی بات ہے ضرور۔ وہی 'بات' تو سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ زنجیر مکمل ہے مگر ایک کڑی نہیں مل رہی ہے۔''

''اچھا تم ذہن پر بوجھ مت ڈالو...... کھانا کھالو پھر سوچتے رہنا۔ عمیر اور مریم میز پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' حمیرا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

خالد بٹ اٹھ کھڑے ہوئے اور بھوک نہ ہوتے ہوئے بھی وہ میز پر جانا چاہتے تھے کہ ان کے بچے شدت سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ اسکول سے آنے کے بعد وہ دونوں کھانا نہیں کھاتے تھے۔ خالد بٹ کورٹ سے آجاتے تب وہ بھی نوالہ توڑتے۔

وہ ہاتھ دھو کر ڈائننگ ہال میں آئے تو عمیر انہیں دیکھتے ہی بولا۔

''پاپا اتنی دیر......؟ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے

ہیں۔ اب فوراً ٹوٹ پڑیں کھانے پر۔'' عمیر نے تیزی سے کہا اور وہ ہنس دیے۔

کھانے کے دوران بھی ان کا ذہن شہباز ملک میں ہی الجھا رہا۔ ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا۔ روز ہی نت نئے کیسوں سے واسطہ پڑتا تھا۔

وہ فیملی کورٹ کے جج تھے۔ کتنے ہی مقدموں کے فیصلے انہوں نے کیے تھے اور ہمیشہ دل اور ضمیر مطمئن رہا تھا۔ مگر اب یہ پہلا موقع تھا جو ان کی زندگی میں زبردست ارتعاش پیدا ہوگیا تھا۔

بھلا کوئی بیٹا ایسا کہہ سکتا ہے؟ اگر کہا بھی ہے تو کوئی وجہ ضرور ہوگی......؟

اور وہ وہی وجہ چاہتے تھے۔

☆......☆......☆

ملک رحمان خان شہر کی معزز شخصیت تھے۔ انہیں ہر کوئی جانتا تھا۔ خالد بٹ بھی ان کے نام سے واقف تھے مگر روبرو ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ شہباز ملک رحمان خان کی بیوی کا بھتیجا ہے جسے انہوں نے پالا ہے اس لیے ان کا فون نمبر ملنے میں کچھ زیادہ دیر ہی نہ لگ سکتی تھی۔ ون سیون سے انہوں نے رحمان خان کا فون نمبر معلوم کر کے وہ نمبر ملایا۔

''ہیلو! ملک ہاؤس......'' دوسری جانب سے خوبصورت سی نسوانی آواز سنائی دی۔

''محترمہ! میں شہباز ملک سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''دیکھیں جی! اب اسے مزید دھمکیاں دینے کی آپ کوشش نہ کریں......اس کا جو فیصلہ ہے صحیح ہے...... چھبیس برس تک تو یہ خیال ماما جی کو نہ آیا کہ ان کا ایک اور بیٹا بھی ہے۔ اب ایک دم ہی محبت نے جوش مارا ہے۔ وہ کسی قسم کی دھمکی سے ڈرنے والا نہیں ہے۔ شرافت اسی میں ہے کہ عدالت کو فیصلہ کرنے دیں۔''

لڑکی بڑی روانی سے بول رہی تھی اور خالد بٹ نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ لڑکی سولہ سترہ برس سے زیادہ کی نہیں ہے۔

یہ عمر جذباتی سی ہوتی ہے......

بے دھڑک...... بلا سوچے سمجھے ہر بات کہہ دینے کو جی چاہتا ہے۔

''مگر محترمہ! میں تو شہباز کا دوست ہوں۔'' وہ اس کے خاموش ہوتے ہی بولے۔

''اوہ......! سوری۔'' وہ ایک دم ہی شرمندہ سی ہوگئی۔

''کوئی بات نہیں! آپ ذرا اسے بلا دیں۔''

''آپ دوسرے نمبر پر رنگ کرلیں۔ شہباز لالہ کے کمرے میں ہیں۔ میں اس وقت انہیں نہیں بلا سکتی۔'' اس نے کہا اور پھر نمبر نوٹ کروا دیا۔

خالد بٹ نے لڑکی کا بتایا ہوا نمبر ڈائل کیا...... تیسری گھنٹی پر دوسری طرف سے ریسیور اٹھایا گیا۔

''ہیلو جی...... !'' گھمبیر اور چھا جانے والی آواز ایئر پیس سے ہوتی ہوئی خالد بٹ کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

''خالد بٹ اسپیکنگ!''

''اوہ! جج صاحب! خیریت......'' وہ ہنسا۔

''خیریت ہی ہے شہباز ملک......! بس ذہن کافی الجھا ہوا ہے۔''

''اچھا......!''

''وجہ نہیں پوچھیں گے؟''

''آپ بتا دیں اگر پسند کریں تو۔''

''جو کچھ میں آپ سے پوچھوں گا آپ بتائیں گے؟''

''دیکھیے جج صاحب......''

''مجھے اپنا دوست سمجھو شہباز ملک!''

''شکریہ جی......! مگر میں نے جو کہنا تھا عدالت میں کہہ دیا ہے۔''

''یہی تو مجھے پریشانی ہے کہ آپ نے سچ کو جھوٹ کیوں کہا۔''

''ہم سچ کو جھوٹ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں جج صاحب۔''

''کیوں......؟''

''کبھی ہمیں مجبور کردیا جاتا ہے اور کبھی ہم اپنی نفرتوں کا لاوا جھوٹ بول کر بہا دیتے ہیں۔ مجھے بھی اس شخص سعادت علی سے سخت نفرت ہے اور......اور مجھ سے اسی نفرت نے یہ سب کچھ کہلوایا ہے۔ میں مرنا پسند کروں

گا مگر اس حقیقت کا اعتراف نہیں کروں گا کہ ملک سعادت علی میرا باپ ہے......'' وہ نپے تلے لہجے میں بول رہا تھا۔

''اس نفرت کی وجہ؟''

''بس! ہے وجہ۔''

''تم مجھے تو بتا دو شہباز! تم مجھے یہ نہ سمجھو کہ میں جج ہوں...... بلکہ اپنا دوست سمجھو...... بڑا بھائی سمجھو۔ بخدا میں اپنے بیٹے کی قسم کھاتا ہوں جو مجھے بے حد عزیز ہے کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔''

''میں بتادوں آپ کو بٹ صاحب......؟ اور آپ ساری دنیا کو بتائیں کہ مکافاتِ عمل بہت سخت ہوتا ہے...... عمل کا ردِعمل بہت شدید ہوتا ہے۔'' شہباز ملک کا لہجہ کانچ کی طرح ٹوٹا ہوا تھا۔

''تم میرے گھر آجاؤ یا کہیں باہر۔''

''آپ سلور سند آجائیں۔ میں بھی وہیں پہنچ جاتا ہوں۔'' شہباز ملک نے کہا اور پھر سلسلہ منقطع کر دیا۔

☆☆

ہوٹل سلور سند کے ڈائننگ ہال میں وہ دونوں کونے کی میز پر آمنے سامنے خاموش بیٹھے تھے اور ان کے سامنے رکھی کوفی میں سے اٹھتی بھاپ یہ احساس دلا رہی تھی کہ کوفی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

خالد بٹ خود بات چھیڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ شہباز ملک اپنے خیالات کو مجتمع کر کے ان کے سامنے بیان کرے گا۔ اور یہ حقیقت تھی۔

تبھی شہباز ملک نے کہنیاں میز پر ٹکا دیں اور خالد بٹ کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

''بڑے صاحب......! آپ مجھ سے تو پوچھ رہے ہیں کہ میں ملک سعادت علی کو اپنا باپ کیوں تسلیم نہیں کر رہا اور میرے پاس اس کا جواب ہے کہ آج سے چھبیس برس قبل جب میں نہ بول سکتا تھا، نہ ماں کے آنسو پونچھ سکتا تھا تب ملک سعادت علی نے ایک ایسی ہی عدالت میں کہا تھا۔

''شہباز میرا بیٹا نہیں ہے۔''

''اوہ......؟''

''میری پھوپی مجھے وہ کاغذات نہیں دیتیں۔ انہوں نے مجھے قسم دے رکھی ہے کہ میں عدالت میں یہ نہیں کہوں گا...... میری زبان کو باندھ دیا گیا ہے۔ اس وقت ملک سعادت علی نے میری ماں پر الزام لگایا تھا کہ زمیندار کی بیوی کہلانے کے لیے اور لڑکے کو جائیداد میں حصہ دلانے کے لیے زبردستی شہباز کو اس کے سر منڈھ رہی ہے وہ...... بقول اس کے اس نے میری ماں کو پہلی بار عدالت ہی میں دیکھا تھا...... ملک سعادت علی کے مزارعوں نے بھی یہی شہادت دی تھی کہ کنیز فاطمہ جھوٹی ہے۔ وہ کنیز فاطمہ جو ملک سعادت علی کی اس حویلی میں رہتی تھی۔ جو اس نے اپنی زمینوں پر بنوائی تھی...... ہر کوئی جانتا تھا۔ کنیز فاطمہ میری پیدائش سے ڈیڑھ سال پہلے اور میری پیدائش کے ایک سال بعد تک رہی تھی...... ڈھائی سال کچھ کم نہیں ہوتے مگر وہ مزارعے جو اس کی حویلی میں دودھ پہنچاتے تھے...... کنیز فاطمہ کے بیٹے کو کھلاتے تھے...... وہ کنیز فاطمہ جو ان کے گاؤں کی بیٹی تھی، عزت تھی...... بھری عدالت میں انہوں نے وہ عزت اچھال دی تھی...... صرف اس لیے کہ ان کا مالک مجھے تسلیم نہیں کر رہا تھا...... تصور کی آنکھ سے دیکھتا ہوں تو رگوں میں کھولتا خون منجمد ہونے لگتا ہے کہ...... کس طرح میرا بوڑھا نانا اپنی جوان بیٹی کو اپنے لرزتے قدموں سے عدالت سے لے گیا ہوگا۔ آپ...... آپ تصور کریں بٹ صاحب!''

خالد بٹ نے دیکھا۔ شہباز ملک کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں اور دکھوں سے اس کی آواز رندھنے لگی تھی۔

''بتائیں میں ایسے شخص کو کیسے باپ تسلیم کر لوں؟''

''مجھے پوری تفصیل بتاؤ کہ تم اپنی پھوپی کے پاس کیسے آئے؟''

''جج صاحب! بڑی عام سی کہانی ہے، ہزاروں کہانیوں جیسی کہانی ہے۔'' شہباز ملک نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

☆......☆......☆

ملک سعادت علی کپاس کی چنوائی کے دنوں میں غوث پور آئے تو ایک روز وہ صبح کی سیر سے واپس آ رہے تھے کہ کنیز فاطمہ سے ان کا ٹکراؤ ہو گیا۔ سولہ سترہ برس کی بھرپور دوشیزہ...... گنی جیسا رنگ...... سیاہ ہرنی جیسی آنکھیں...... یاقوت جیسے لب اور اناروں جیسے گال۔

ایک دم ہی وہ ملک سعادت علی کے دل کی تہوں کے اندر اتر گئی...... اتنی تیزی سے تو کبھی کوئی عورت ان کے دل میں نہیں اتری تھی۔

انہیں محسوس ہوا جیسے ان کی بیوی رابعہ بھی ان کے دل کے مکان میں اس جگہ نہیں پہنچ سکی تھی جہاں لمحوں میں کنیز فاطمہ پہنچ گئی تھی۔

جس طرح حویلیوں میں تہہ خانے ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح دل کے مکان میں بھی تہہ خانے ہوتے ہیں......اور رابعہ کو پانچ بچوں کی ماں ہونے کے باوجود تہہ خانے والا راستہ آج تک نہ مل سکا تھا جو کنیز فاطمہ نے ایک ہی لمحے میں پالیا تھا۔ ملک سعادت علی تو اس حسن کی شراب کو دیکھ کر پاگل ہی ہوگئے تھے۔ اپنے مقام اور رتبے کا خیال کیے بغیر انہوں نے چند لوگوں کی موجودگی میں کنیز فاطمہ سے نکاح کرلیا۔

کنیز فاطمہ کا باپ کرم دین ان کا مزارعہ تھا۔ بھلا وہ اپنے مالک کی بات کس طرح ٹال سکتا تھا...... بغیر کسی پس و پیش کے اس نے کنیز فاطمہ، ملک سعادت علی کے حوالے کردی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اسے پتا تھا کہ زمیندار لوگ اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا سکتے ہیں۔

وہ کنیز فاطمہ کو اٹھوا لینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ کرم دین نے اس بدنامی سے بچنے کے لیے اپنی پھولوں جیسی بیٹی سعادت علی سے بیاہ دی۔

ملک سعادت علی کنیز فاطمہ کو شدت سے چاہتے تھے۔ انہیں تو لگتا کہ اصل زندگی ہی اب شروع ہوئی ہے۔ کنیز فاطمہ بھی بہت خوش تھیں۔

ڈیڑھ سال بعد ہی ملک شہباز پیدا ہوا تو کنیز فاطمہ کی اہمیت سوا ہوگئی۔ شہباز، ملک سعادت علی کو اپنے پانچوں بچوں سے زیادہ پیارا تھا۔

سچ کہتے ہیں کہ دل والی عورت کی اولاد بھی بہت پیاری ہوتی ہے۔

وہ اپنے گھر میں خوش تھے، مطمئن تھے۔ ملک سعادت علی کی بہن سکینہ بیگم کو پتا تھا کہ ملک سعادت علی نے کنیز فاطمہ سے شادی کی ہے۔ وہ کئی کئی روز بھائی کے ہاں آکر رہتیں اور کنیز فاطمہ دل و جان سے ان کی خدمت کرتی۔

بہت خوش تھے وہ کہ بہت جلد ہی ان کی خوشیوں کو نظر لگ گئی۔ کسی طور ملک سعادت علی کے پہلے سسرال والوں کو ان کی شادی کی اطلاع مل گئی اور بس پھر طوفان ہی آگیا۔

رابعہ روٹھ کر میکے چلی گئی اور جواباً رابعہ کے بھائی احمد علی نے ملک سعادت علی کی بہن حاجرہ اور تینوں بچوں کو ان کے گھر بھیج دیا کہ دونوں بھائی بہن کی ادلے بدلے کی شادی تھی۔

سب نے چاہا کو تصفیہ ہوجائے مگر رابعہ تیار نہ ہوئی۔ وہ کہتی تھی کہ ملک سعادت علی انہیں چھوڑ دیں یا کنیز فاطمہ کو۔ ایک نیام میں دو تلواریں نہ رہ سکتی تھیں۔ ملک سعادت علی تو کسی صورت بھی کنیز فاطمہ کو نہیں چھوڑنا چاہتے تھے اور انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ رابعہ کو طلاق دے دیں گے۔ مگر ان کی بہن حاجرہ کے آنسو ان کے پیروں کی زنجیر بن گئے تھے۔

''میں اپنے گھر میں بسنا چاہتی ہوں لالا! مجھے مت اجاڑیں...... میرے معصوم بچوں کا خیال کریں۔''

اور انہوں نے حاجرہ کا کہا مان لیا تھا...... وہ رابعہ کو لے آئے اور کنیز فاطمہ کو طلاق دے دی۔

پھر شہباز کا مسئلہ تھا۔

وہ شہباز کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ مگر رابعہ بھلا سوکن کی اولاد کو کس طرح برداشت کرسکتی تھی۔ پھر اس کو یہ بھی خطرہ تھا کہ وہ بڑا ہو کر جائیداد میں حصہ مانگے گا۔ تب رابعہ نے یہ چال چلی کہ شہباز کو اس کی ماں لے لے۔

کنیز فاطمہ بھی بیٹے کو پاس ہی رکھنا چاہتی تھی۔ سب سے بڑھ کر سکینہ بیگم کی خواہش تھی کہ ان کی خالی گود شہباز سے بھر جائے۔ اور یہ سب کچھ انہوں نے قانونی طور پر کرنا چاہا...... شہباز کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے مقدمہ کردیا۔

مگر پتا نہیں کیوں اور کس مصلحت کے تحت ملک سعادت علی نے شہباز کو بیٹا تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔

یہ تو بعد میں پتا چلا تھا کہ ان کے سسر ملک دلاور خان کی خواہش پر انہوں نے عدالت میں کہا تھا کہ شہباز ملک ان کا بیٹا نہیں ہے۔

دھمکی بھی تو ملک دلاور خان نے ایسی دی تھی۔
اگر انہوں نے شہباز کو اپنا بیٹا تسلیم کیا تو وہ شہباز کو قتل کروا دیں گے۔ ملک سعادت علی کانپ کر رہ گئے۔ وہ ہر صورت اپنی محبت کی نشانی کو زندہ دیکھنا چاہتے تھے اور اسی لیے انہوں نے عدالت میں کہہ دیا۔

''شہباز میرا بیٹا نہیں ہے۔''

ان کی خواہش پر ان کے مزارعوں نے یہی بیان دیا کہ کنیز فاطمہ کو انہوں نے پہلی بار عدالت میں دیکھا ہے۔

نکاح تو شرعی تھا مگر نکاح نامہ نہ تھا جو کنیز فاطمہ اور کرم دین عدالت میں پیش کرتے۔ بس بدنامیوں کا طوق گلے میں ڈال کر رسوائیوں کے پتھروں سے جھولی بھر کر وہ چلے گئے۔ شہباز ملک کو سکینہ بیگم نے اپنی مہربان بانہوں میں چھپالیا۔

انہیں بھی پتا تھا کہ بھائی کو مجبور کر دیا گیا ہے تو انہوں نے اف تک نہ کی۔

ملک رحمان خان نے بھی بیوی کے فیصلے کو قبول کرلیا۔ وقت کا بے درد پنچھی محو پرواز تھا۔

شہباز ملک کو دیکھنے ملک سعادت علی کبھی بھی تو نہ آئے اور سکینہ بیگم نے بھی تو شہباز کی خاطر میکے سے ناتا توڑ لیا تھا۔

انہیں رابعہ ایک آنکھ نہ بھائی تھی اس لیے تو وہ وہاں نہیں جاتیں۔ خوشی اور غمی میں بھی وہ نہ جاتیں۔

انہوں نے شہباز کی شہزادوں کی طرح پرورش کی۔ گرائمر اسکول میں اسے تعلیم دلوائی۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے اُسے ابروڈ بھیجا۔ اور اسی دوران ملک رحمان خان نے شہباز ملک کو اپنی ساری جائیداد کا وارث بنا دیا۔

انہوں نے اپنی پینتالیس مربع اراضی شہباز کے نام کردی اور رابعہ بیگم کے سینے پر تو سانپ لوٹ گئے۔ وہ چاہتی تھیں شہباز کو ایک مرلہ زمین بھی نہ ملے۔ وہ تو ان کی اولاد سے زیادہ دولت مند ہو گیا تھا۔ پھر تعلیم بھی اس کی سب سے زیادہ تھی۔ ان کے اپنے بیٹے تو مڈل سے آگے نہ بڑھے تھے۔ بے تحاشا دولت اور بُری صحبت نے انہیں وقت سے پہلے ہی جوانی کے کرتوتوں سے لذت آشنا کر دیا تھا اور وہ کسی بھی طرح شہباز کو اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتی تھیں۔

تبھی تو اس نے اٹھتے بیٹھتے ملک سعادت سے یہ کہنا شروع کر دیا۔

''آپ شہباز کو لے آئیں۔''

''کیوں......؟''

''آخر ہمارا بیٹا ہے وہ۔''

''بہت جلد خیال آیا۔'' وہ طنز سے بولے۔

''انسان سے غلطیاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں سعادت! میرا ضمیر مجھے کچوکے دیتا ہے...... آپ اُسے لے آئیں۔''

پھر بیوی کے کہنے پر ایک دم ہی ان کے دل میں چھپی ہوئی محبت نے جوش مارا تو وہ برسوں بعد بہن کے دروازے پر پہنچے۔ شہباز ملک کو لینے، مگر اس کا فیصلہ تھا۔

''میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا۔''

شہباز نے تو ان سے بات بھی نہ کی تھی جب سکینہ بیگم نے اس سے کہا تھا۔

''تم لالہ کے ساتھ جاؤ گے؟''

تو شہباز کا انکار ملک سعادت علی کے دل کی تہوں میں ہلچل مچا گیا تھا۔ دل میں ایسا درد اٹھا کہ سنبھالنا مشکل ہو گیا...... اور اسی روز ان پر دل کا شدید دورہ پڑا اور اپنے غیر سب انہیں ہاسپٹل دیکھنے گئے مگر جس کے آنے کی خواہش تھی وہ نہ آیا۔

وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رابعہ بیگم نے اپنے بیٹوں کے نام جائیداد کروائی تو شہباز کا بھی اتنا ہی حصہ رکھوایا۔ شہباز نے کاغذات واپس بھجوا دیے۔

''جس نے میری پرورش پر ایک ٹکا خرچ نہ کیا ہو اس کی جائیداد میں سے میں اپنا حصہ لینے کا حق نہیں رکھتا۔''

شہباز نے نہایت سفا کی سے کہا۔

رابعہ بیگم ہر محاذ پر شکست کھا رہی تھیں اور پیر جلی بلی کی طرح بلبلا رہی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ شہباز ان کے ہتھے چڑھ جائے...... اور پھر وہ اپنی بھانجی مہ پارہ سے اس کا بیاہ کر دیں۔

مہ پارہ ملک فیملی کی سب سے زیادہ خوبصورت لڑکی تھی۔ مگر اس کا حسن شہباز پر کبھی بھی اثر انداز نہیں ہو سکتا تھا۔

آخر رابعہ بیگم کی ہی خواہش پر ملک سعادت علی نے

عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ملک دلاور خان کے کہنے پر انہوں نے سکینہ بیگم پر مقدمہ کیا۔ وہ بیٹا واپس لینا چاہتے تھے اور عدالت نے شہباز ملک کو عدالت میں پیش ہونے کا حکم دیا تو سب نے سنا کہ شہباز ملک نے کہہ دیا۔
''ملک سعادت علی میرے باپ نہیں ہیں۔''

☆☆☆

''بتائیں بٹ صاحب! میرا فیصلہ ٹھیک ہے نا؟ میں کس طرح اس شخص کو باپ مانوں جس کا لمس آشنا میرا پنڈا نہیں ہے؟''
شہباز نے خالد بٹ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
''اب مجھے دھمکیاں دی جاتی ہیں کہ
اگر میں ملک سعادت علی کی طرف نہیں لوٹا تو میرا انجام بُرا ہوگا۔ اگر میں نے مہ پارہ ملک سے شادی نہیں کی تو میرا گھر کبھی نہ بس سکے گا۔ میرا دشمن پاگل ہوگیا ہے بٹ صاحب......! اور مجھے خوشی ہے اس کے پاگل پن پر...... مگر میں ان کی خواہش پوری نہیں کروں گا...... مرتے دم تک نہیں کروں گا۔''
اس کا لہجہ پُرعزم تھا۔ خالد بٹ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔
''تمہارا دکھ ہی ایسا ہے شہباز......! مگر یہ یاد رکھو کہ مجھے لگتا ہے۔ باپ کو آخری عمر میں تمہیں سنبھالنا ہے۔ اگر وہ آجائیں تو تم انکار نہ کرنا شہباز......! کہ پھر بھی آخر وہ تمہارا باپ ہے۔''
خالد بٹ نے سمجھایا تو وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

☆......☆......☆

آج پھر کمرۂ عدالت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور وکیل خدا بخش نے آج پھر بحث کی۔ مگر شہباز کا وہی جواب تھا۔
''شہباز......! تم جو کچھ بھی کہو حق بجانب ہو...... مگر، مگر مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں...... مجھے...... مجھے وہ سب قبول نہیں کرتے...... ان کا کہنا ہے کہ اب تم میرے ساتھ آؤ گے تو پھر ہی میں ان کے گھر جا سکتا ہوں ورنہ نہیں...... بتاؤ......! میں کیا کروں۔''
ملک سعادت علی کی آواز بھرا گئی۔
''آپ...... آپ میرے ساتھ چلیں ملک سعادت علی...... ہاں! میرے ساتھ...... اس حیثیت سے نہیں کہ آپ میرے باپ ہیں بلکہ آپ اس عورت کے بھائی ہیں جس نے اپنی ساری خوشیاں مجھ پر وار دی ہیں...... آپ میرے ساتھ رہیں۔''
شہباز آگے بڑھا اور اس نے ملک سعادت علی کو بازوؤں سے تھام کر گلے سے لگا لیا۔
''آپ نے اُن کی خاطر مجھے چھوڑا تھا نا! آج میری خاطر انہیں چھوڑ دیں...... یقین کریں ساری زندگی میں آپ کی خدمت کرتا رہوں گا...... مگر جنہوں نے ہمیں جدا کیا تھا میں ان لوگوں کا وجود برداشت نہیں کروں گا۔''
شہباز کا لہجہ پتھریلا تھا۔
ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر ملک سعادت علی نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔
''میں ان سب کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ رہوں گا۔ مجھے پتا ہے...... انہیں میری نہیں میری دولت کی ضرورت ہے...... جو میں انہیں دے چکا ہوں۔ اب میں صرف تمہارے ساتھ رہوں گا۔''
ملک سعادت علی نے کہا۔
عدالت میں موجود اُن کے تینوں بیٹوں نے اُن کے اس فیصلے کے خلاف احتجاج بھی نہ کیا۔ یعنی وہ خود باپ سے خلاصی چاہتے تھے۔
تب ملک سعادت علی نے کہا۔
''اب تو کہہ دو کہ......''
''ہاں! آپ ہی تو میرے بابا جان ہیں۔'' شہباز ملک نے کہا۔
ملک سعادت علی نے اسے لپٹا کر اس کے چہرے پر بوسوں کی بارش کر دی۔
اور سکینہ بیگم نے پلو سے آنسو پونچھ لیے۔
آج کئی برس گزر گئے ہیں شہباز ملک کے دو پیارے پیارے بیٹے ہیں۔ ایک گڑیا سی بیٹی زارا ہے...... اور وہ تینوں اپنے دادو کو اتنے پیارے ہیں کہ ملک سعادت علی ان کے بنا جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔
مکافاتِ عمل سے گزرنے کے بعد انہوں نے منزل پائی...... اور وہ بہت ہی خوبصورت منزل ہے جس نے انہیں سکھ ہی سکھ دیے۔

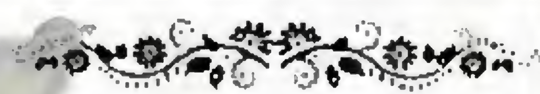
☆☆☆

دوسرا شعلہ

بے بی روم!

صدف آصف

کراچی سے ایک اسپتال کے بے بی روم کا سچا قصہ، جسے محبت کی دیوی کی ضرورت تھی




''باجی... کام کرنا ہے تو ڈھنگ سے کریں، ورنہ یہاں ورکرز کی کمی نہیں،'' ماہا کے پھول جیسے ہونٹوں سے شعلے برس رہے تھے، جس کی چنگاریاں، نصبین کے دل کو جلا کر خاک کر رہی تھیں۔

''یہ...... لاسٹ وارننگ ہے۔ میرے کاموں میں زرا بھی دخل اندازی کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر عارفین سے کہہ کر چھٹی کرادوں گی'' ماہا نے نازک موی انگلی اٹھا کر حقارت سے کہا۔ نصبین اسے دیکھتی ہی رہ گئی، وہ کھٹ کھٹ کرتی اپنے روم میں واپس چلی گئی۔

بڑی بڑی پرکشش آنکھیں، بوٹا سا قد، گندمی رنگت، تیکھے نقوش، چہرے پر معصومیت اور چال میں نزاکت، نصبین اسے جب بھی دیکھتی، نقص تلاشتی، مگر کہیں کوئی کمی دکھائی نہ دیتی، وہ خود کو ماہا کی متضاد سمجھتی، اسی لیے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتی، اتنی بے عزتی کے بعد تو اسے یہ نوکری چھوڑ دینی چاہیے تھی، مگر، یہاں سے نہ جانے کی سب سے بڑی وجہ ڈاکٹر عارفین تھے۔ بے بی سٹنگ روم سے بچوں کی رونے کی آوازیں تیز ہوئیں تو وہ افسردہ سی مڑ گئی، ایک بچے کا فیڈر بناتے ہوئے دکھی نگاہوں سے شیشے کے کیبن کے پار دیکھا جہاں ڈاکٹر عارفین ہنستے ہوئے، ماہا کے نزدیک آکر کچھ کہہ رہے تھے، نصبین نے آنکھیں میچ لیں۔

☆......☆......☆

نصبین وین سے اترنے کے بعد سست قدموں سے اپنے گھر کی طرف چل دی۔ وہ مقامی اسپتال کے ڈے کیئر سینٹر میں کام کرتی تھی۔ یہ سینٹر اس اسپتال میں اُن نوکری پیشہ خواتین کی سہولت کے لیے بنایا گیا تھا، جن کے بچے چھوٹے تھے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے کوئی دوسرا انتظام نہ تھا۔ اس میں لیڈی ڈاکٹر سے لے کر ایڈمنسٹریشن کے عملے تک میں خواتین کی بڑی تعداد شامل تھی، جو نوکری کے اوقات میں اپنے گود کے یا چھوٹے بچوں کو کم پیسوں میں یہاں آٹھ سے نو گھنٹوں کے لیے چھوڑ دیتیں، جب ان کی نوکری کے اوقات کار ختم ہوتے تو بچوں کو اپنے ساتھ گھر لے جاتیں۔

نصبین کو شروع سے چھوٹے بچوں سے بہت لگاؤ تھا، اسی لیے یہ جاب کرنے میں اسے کوئی قباحت محسوس نہیں ہوئی۔ ویسے بھی وہ اپنے حالات کی وجہ سے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتی تھی۔ مگر مسئلہ اس وقت سے شروع ہونے لگا جب وہ اپنی انچارج ماہا کے غلط کاموں کے آڑے آتی۔ ماہا اسے دھمکیوں سے نوازتی، خوب چیختی

چلاتی۔ تن فن کرتی اس کے سر پر سوار رہتی، ماہا کو اس اسپتال میں کام کرتے تین سال ہو چکے تھے، جبکہ نصیبن کو صرف تین ماہ، اس طرح ابھی اس کے قدم ابھی اتنے مضبوط نہیں ہو پائے تھے کہ وہ ماہا کے خلاف کوئی مدافعت کر پاتی، یہ ہی وجہ تھی کہ آئے دن بلاوجہ وہ قصوروار ٹھہرائی جاتی۔

ماہا کا مزاج بہت شاہانہ تھا، اس کی خوبصورتی اس کا سب سے بڑا ہتھیار تھا، حالانکہ وہ بھی اس سینٹر کی ایک معمولی سی انچارج تھی، مگر سب پر حکم یوں چلاتی جیسے باس ہو، اس کی ایک وجہ ڈاکٹر عارفین بھی تھے، جو اسپتال کے ایڈمنسٹریٹر تھے۔ ماہا کو ان کی بے جا حمایت حاصل تھی۔

وہ بے بی روم میں کم اور ڈاکٹر عارفین کے کیبن میں زیادہ دکھائی دیتی، نچلے اسٹاف میں تو ان دونوں کے حوالے سے کافی چہ میگوئیاں بھی کی جاتیں، جسے سن سن کر نصیبن کا دل جل جاتا، مگر اس مقام پر آ کر وہ مجبور ہو جاتی۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر عارفین پُر وقار شخصیت کے مالک تھے، اس پر ان کی خوش اخلاقی اور نرم مزاجی نے نصیبن پر جادو سا کر دیا تھا۔۔۔ اس سے اتنی خوش خلقی سے بات کرتے کہ نصیبن حیران رہ جاتی۔ اب تک اپنی معمولی شکل و صورت کی وجہ سے اسے ہر مقام پر ٹھوکریں نصیب ہوئی، کوئی اس کی جانب نظر بھر کر نہیں دیکھتا، اس میں دیکھنے کے لیے کچھ ایسا تھا بھی نہیں، کالی رنگت، اس پر سفید بڑے بڑے دانت، پودینے کی گڈی جیسے بال، قدرے فربہی مائل جسم، وہ اپنی عمر سے کہیں بڑی لگتی، یہاں تک کہ اب تو اس سے دو تین سال بڑی لڑکیاں بھی اُسے آپا یا باجی جیسے خطابات سے نوازتیں، اس کے اپنے بھائی بہن اسے کالی مائی کہہ کر چھیڑتے۔ وہ شدید قسم کے احساس کمتری کا شکار تھی، اسی وجہ سے لوگوں سے محتاط رہنے لگی، مگر پہلی دفعہ ڈاکٹر عارفین کی وجہ سے اس پر بے اختیاری سی چھائی۔ انہوں نے کبھی اس کی کم صورتی پر اسے مذاق کا نشانہ نہیں بنایا۔ وہ جس دن رک کر نصیبن کا حال احوال پوچھ لیتے، اس کا سرشاری کا عالم نہ پوچھنے والا ہوتا۔ دل ہی دل میں ان سے ہزاروں باتیں کر لی مگر جب بھی ان دونوں کا سامنا ہوتا، اس کا رواں رواں کانپ اٹھتا، نگاہیں ملا کر بات نہیں کی جاتی، ہاتھ لرزنے لگتے۔ وہ اپنے اس جذبے کو کوئی نام نہ دے سکی، مگر ان سے انسیت کی کوئی حد نہ تھی، اس ماہا کا، جو اسے کاٹنے کی طرح



چبھتا، جو عارفین کی منظورِ نظر بنی ہوئی تھی۔

''عارفین صاحب! میں ایک دن تمہیں اس چڑیل سے بچا کر رہوں گی۔'' وہ روزانہ سونے سے قبل یہ عہد دل ہی دل میں دہرانی اور اس کے بعد سو جاتی۔

☆......☆......☆

''نصیبن......پلیز......آپ کی بہت کمپلین آ رہی ہیں۔ ایسا کب تک چلے گا؟'' عارفین کے بلاوے پر جب وہ خوشی خوشی اُن کے کیبن میں گئی تو اس کے لہجے کی سختی سے جذبوں پر اوس پڑ گئی۔

''سر! میں نے کیا کیا؟'' نصیبن نے درد بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ کر قصور پوچھا۔

''بھئی! آپ کی سینئر کو آپ سے اتنی شکایت پیدا ہو رہی ہیں۔ آپ ان کی بات کیوں نہیں مانتی ہو۔'' عارفین نے اس بار مسکرا کر نرمی سے کہا، شاید اس کی اتری صورت پر ترس آ گیا۔

''سر ماہا میڈم! بچوں کی مکمل کیئر نہیں کرتیں۔ اکثر انہیں سلانے کے لیے نیند کی دوا پلا دیتی ہیں۔ بچوں کو ٹائم پر لنچ یا فیڈر نہیں دیا جاتا۔ یہاں تک کہ جو بچہ بہت زیادہ روتا ہے، اسے مارنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ بس میں تو ان تمام معاملات کو درست کرنا چاہتی ہوں۔ جس پر وہ آگ بگولا ہو جاتی ہیں'' نصیبن نے دل کی بھڑاس نکالی، مگر اس کی توقع کے خلاف عارفین پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا، شاید ماہا کے حسن کا اثر زیادہ تھا۔

''سر! کیا یہ ساری باتیں غلط نہیں؟'' نصیبن نے زور دے کر پوچھا۔

''اوکے اوکے! آپ جائیں۔ میں اسے سمجھاؤں گا'' عارفین نے جھنجھلا کر کہا۔

''اچھا سنیں! اس بات کا ذکر کسی اور سے مت کریئے گا'' نصیبن نے دروازے کا ہینڈل دبایا، کہ عارفین نے ہدایت دی۔ اس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا اور باہر نکل گئی۔ اتنے میں اس کے بستے سے موبائل فون کی بیل بجی۔

''ہیلو! ہاں بولو'' نصیبن نے نمبر دیکھا تو خوش ہو گئی، اس کے کزن شاہد کی کال تھی۔

''چلو موبائل۔ آج رات کو گھر پہنچا دینا۔'' نصیبن نے تھوڑی دیر بات کرنے کے بعد سرشار ہو کر فون بند کر دیا۔ اس نے شاہد سے ایک دو دن کے لیے کیمرے والا

فون مستعار مانگا تھا، وہ راضی ہو گیا۔ نصیبن گنگناتی ہوئی بے بی روم کی جانب بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

''ماہا! پلیز دیکھو میری بے بی کے گال پر یہ نیلا نشان کیسا ہے؟'' ڈاکٹر نادیہ نے اپنی چھ ماں کی سونیا کو گود میں لیا تو ماہا سے پوچھا۔ وہ چھٹی کے وقت اپنی دونوں بیٹیوں کو لینے آئی تھیں، اس کی ایک ڈھائی سال کی بچی زینیا بھی یہاں داخل تھی۔

''میم! مجھے نہیں پتا۔'' ماہا نے روکھے پن سے جواب دیا۔

''کیا یہ گری تھی؟'' نادیہ کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ کچھ تو گڑبڑ تھی، مگر کیا اس کے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''نہیں میم! کیا سمجھا ہوا ہے؟ ہم پورے دن آپ کے بچوں کو یہاں اتنی محبت سے سنبھالتے ہیں، ان کی کیئر کرتے ہیں۔ آپ لوگ ایک منٹ میں الزام دھر دیتی ہیں۔'' ماہا ایک دم تیز لہجے میں بولی۔ ڈاکٹر نادیہ چپ کی چپ سی رہ گئیں۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' نادیہ نے دھیرے سے کہا اور سوچتی ہوئی بچیوں کو لے کر اپنی گاڑی کی جانب بڑھنے لگی۔ وہ بغیر کسی ثبوت کے ان لوگوں سے بگاڑ بھی پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں دونوں بچیوں کو رکھنے کی وجہ سے اسے نوکری کی سہولت حاصل تھی، ورنہ یہ ایک بہت بڑا مسئلہ کھڑا ہو جاتا۔ اسے مسئلہ کو دوسرے انداز میں ہینڈل کرنا تھا۔

☆......☆......☆

''مما۔۔۔انتی۔۔گندی۔۔۔بے بی کو مالتی'' زینیا نے تتلا کر کچھ سمجھانا چاہا، گاڑی اسٹارٹ کرتی نادیہ کا ہاتھ کپکپا اٹھا۔

''بیٹا! آپ کیا کہہ رہی ہو......کون مارتا ہے؟'' نادیہ نے چابی اگنیشن میں لگی چھوڑ دی اور زینیا کو گود میں بٹھا کر پیار سے پوچھا۔

''نئی بتاتی۔۔ انتی مالیں گی۔'' زینیا نے خوف زدہ ہو کر اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے منہ بند کر لیا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی لکیر تھی۔

''اچھا قطعاً میری بیٹی! یہ چپس اور جوس پیے گی، پھر ماما کو بتائے گی نا'' نادیہ نے بچی کا دھیان بٹایا پھر ڈیش بورڈ سے چپس کا پیکٹ اور جوس اٹھا کر پہلے زینیا کو پکڑایا،

پھر چھوٹی سونیا کو دیکھا جو اب مزے سے سو رہی تھی۔

☆......☆......☆

"ماما...... وہ انتی...... بے بی کو مالتی...... مجھے بھی مالتی...... گندی...... سب بچوں کو مالتی......" زمینا نے جوس پیتے ہوئے ماں کے سامنے سچائی کھول کر رکھ دی۔

"اچھا...... تو یہ بات ہے......" نادیہ کا دل ایک دم گھبرانے لگا...... اسے احساس ہوا کہ بے بی روم میں کچھ تو غلط ہو رہا ہے۔ اس سے قبل ایک اور ورکر نے بھی اپنے بچے کی پیٹھ پر لال چٹکی کاٹنے کا نشان دیکھا تھا، پوچھنے پر ماما سے کافی بحث مباحثہ ہوا۔ ایک اور ڈاکٹر نے نادیہ سے برسبیل تذکرہ ذکر کیا تھا کہ اس کی بیٹی تو جب بے بی روم میں دیکھنے جاؤ سوتی ہوئی ملتی ہے...... نادیہ کا دماغ تیزی سے کام کرنے لگا۔

☆......☆......☆

"ڈاکٹر نادیہ...... کیسی ہیں؟ کیا بات ہے دو دن سے بچیاں نہیں آ رہیں؟" نصیبن نے خاص طور پر نادیہ کو روک کر پوچھا۔ وہ اس سے بات کرنے کے لیے موقع کی تلاش میں تھی، اتفاق سے آج ماما نہیں آئی تو اس نے فوراً نادیہ سے رابطہ کیا۔

"ہاں...... میں کچھ دنوں کے لیے اپنی امی کو گھر لے آئی ہوں" نادیہ کچھ چڑچڑی سی لگ رہی تھی۔

"اچھا۔ خیر ہے نا۔" نصیبن نے ٹٹولتی نظروں سے اسے دیکھا، وہ چاہتی تھی نادیہ خود بات شروع کرے۔

"ہاں...... سب ٹھیک ہے۔" نادیہ نے سر ہلایا، وہ خود اس معاملے میں محتاط تھی، کوئی ثبوت ہاتھ میں نہیں تھا، اتنی چھوٹی بچی کی بات پر کیسے کوئی قدم اٹھاتی۔

"ہوں ں۔" اب بات کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا، نصیبن مایوسی سے مڑنے والی تھی۔

"سنو...... ایک بات پوچھوں...... سچ بتاؤ گی" نادیہ نے تھک کر جوا کھیلا۔

"جی...... پوچھیں نا۔" نصیبن کے انداز میں کچھ خاص تھا۔

"بے بی روم میں کیا کچھ غلط ہو رہا ہے۔" نادیہ کی آواز دھیمی ہوئی۔

"اگر میرا نام نہ آئے تو...... بولوں۔" نصیبن نے یقین دہانی چاہی۔

"اس بارے میں بے فکر ہو جاؤ۔ تمہاری نوکری کو آنچ نہیں آنے دوں گی۔" نادیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"کچھ نہیں...... بہت کچھ غلط ہوتا ہے۔" نصیبن نے اقرار کیا۔

"اوہ! اچھا۔ یہاں کھڑے ہو کر بات نہیں ہو سکتی۔ میں پانچ بجے آف کروں گی، تم آج بس سے نہیں میرے ساتھ جانا۔" نادیہ نے کچھ سوچ کر کہا اور وارڈ کی جانب مڑ گئی۔

نصیبن کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی، اس نے شاہد کے دیے ہوئے اسمارٹ فون کو مضبوطی سے تھام لیا۔

☆......☆......☆

"دفع ہو جاؤ یہاں سے ریں ریں کر کے میرا دماغ خراب کر دیا ہے" ماما ٹہل ٹہل کر بچوں کو باتیں سنا رہی تھی۔ یہ ساؤنڈ پروف، روم تھا، یہاں بچوں کے آرام کی خاطر ایئر کنڈیشن بھی لگا ہوا تھا، اس لیے کھڑکی دروازے سب بند رہتے تھے۔ اس لیے وہ کھل کر اپنا کھیل کھیلتی۔

"میڈم! یہ جو ریپشنسٹ کا بچہ ہے نا کل سے اتنے موشن کر رہا ہے۔ میرا تو پیمپر بدل بدل کر حال برا ہے۔" بانو نے پان چباتے ہوئے غصے سے کہا۔ یہاں نصیبن کے علاوہ ایک آیا بھی تھی جو، بچوں کی نیپی اور پیمپرز کی تبدیلی کا کام کرتی تھی۔

"بانو آپا! جب ان کی ماؤں کو خیال نہیں تو ہم کیا کریں۔ بس شام کو ایک دفعہ پیمپر بدلا کریں" ماما نے سر پر ہاتھ مار کر کہا۔

"اس طرح تو بچوں کے ریشز ہو جائیں گے" نصیبن جو بہت دیر سے ان لوگوں کی فضول باتیں برداشت کر رہی تھی، ایک دم بول پڑی۔

"یہ تو ہے۔ بس کل سے تم ان بچوں کے پیمپرز چینج کرنا" ماما نے آنکھ نکال کر اسے گھورا۔ ویسے بھی بانو، اس کی منہ چڑھی تھی۔

"مجھے۔ اس کام کے لیے نہیں رکھا گیا ہے۔ جس کا فرض ہے۔ اسے نبھانا چاہیے۔" نصیبن نے بڑے آرام سے جواب دیا۔

"مجھ سے زبان لڑاتی ہو۔ اپنی سینئر سے شرم کرو بس اس اسپتال میں یہ مہینہ تمہارا آخری ہی ہوگا۔" ماما قابو سے باہر ہونے لگی۔

''اچھا!! دیکھتے ہیں''نصیبن نے بھی چیلنج کیا۔
''توبہ۔ مجھے کتنے سال ہوگئے بی بی جی کے ساتھ مجال ہے جو ایسے ڈھٹائی دکھائی ہو۔ تم بھی۔ بڑی بے حیا نکلیں۔'' بانو نے بھی وفاداری نبھائی۔ نصیبن نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا، موبائل فون سے کھیلتے ہوئے باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

''ڈاکٹر عارفین میں کہتا ہوں۔ آپ کی موجودگی میں ایسا ہوا کیسے؟'' وقارالحسن جو اس اسپتال کے مالک تھے سر تھامے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے کرسیوں پر نادیہ، ماہا اور ڈاکٹر عارفین بیٹھے تھے۔
''وہ سر!! غلطی ہوگئی۔ ان سب باتوں کا۔ مجھے پتا ہی نہیں تھا۔'' عارفین نے جھوٹ بولتے ہوئے اپنی جاب بچانے کی کوشش کی۔
''غلطی غلطی...... یہ جرم کہلاتا ہے۔ وہ بھی ناقابل معافی جرم'' وقارالحسن نے دانت کچکچائے، عارفین نے پہلو بدلا۔ ماہا کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر نادیہ البتہ فاتحانہ انداز میں ساری کارروائی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔
''سر آخری بار معاف کردیں۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا'' ماہا نے عارفین کے اشارے پر معافی مانگنی چاہی۔
''بی بی! اب تو ہم آپ کا سایا بھی بے بی روم پر پڑنے نہیں دیں گے۔ کچھ خیال بھی ہے۔ اگر کسی بچے کو کچھ ہو جاتا تو؟'' وقارالحسن گرجے۔
''پلیز سر'' ماہا ایک دم ڈھے گئی پاؤں پڑنے کی کسر رہ گئی تھی۔
''نو ناٹ اگین! آپ شکر کریں کہ ہم ایسے ہی چھوڑ رہے ہیں۔ پولیس کے حوالے نہیں کیا۔ بھئی یہ ہمارے اسپتال کی عزت کا سوال ہے۔'' وقارالحسن نے اسے ہری جھنڈی دکھا کر باہر کا راستہ دکھایا۔
''ڈاکٹر عارفین۔ آپ کو لاسٹ وارننگ ہے۔ امید ہے کہ آپ اپنے ذاتی تعلقات کی وجہ سے ہمارے ہاسپٹل کو مزید کوئی زک نہیں پہنچائیں گے۔'' وقارالحسن کے انداز میں جو کچھ تھا، ڈاکٹر عارفین شرم سے پانی پانی ہوگئے۔
''وہ جو لڑکی نصیبن ہے۔ اب سے وہ ڈے کیئر سینٹر کی نئی انچارج ہے۔ میں نے اس کے پروموشن لیٹر پر سائن کردیے ہیں۔'' وقارالحسن کے لہجے کی سختی برقرار تھی، ڈاکٹر عارفین نے سر ہلانے میں ہی عافیت جانی۔

☆......☆......☆

''مبارک ہو نصیبن! امید ہے کہ اب میری دونوں بچیاں یہاں سکون سے وقت گزاریں گی۔'' نادیہ نے خوشی سے سونیا اور زینیا کو نصیبن کے حوالے کیا۔
''ڈاکٹر! اب آپ بے فکر ہو جائیں''، نصیبن نے نرمی سے زینیا کو تھاما۔
''ویسے شکریہ! اگر تم مجھے ماہا کی بچوں کو مارنے والی وڈیو نہیں دکھاتیں تو میں کبھی اتنے اعتماد سے مالکان سے بات نہیں کر پاتی۔'' ڈاکٹر نادیہ نے اس کا شکر ادا کیا۔
''ارے! آپ تو شرمندہ کر رہی ہیں۔''، نصیبن نے مسکرا کر جواب دیا۔
''نہیں سچ۔ میری شکایت کے بعد جب وقارالحسن صاحب نے۔ ڈنڈا گھمایا تو اس کے بعد تو اوپر سے نیچے تک پورا اسٹاف ہل گیا۔ پھر تو سارے کیمرے چیک کیے گئے۔ بے بی روم میں لگے کیمرے سے پچھلی ریکارڈنگ نکلوا کر چیک کیا گیا تو ماہا کے جرم کی ایک بڑی داستان سامنے آئی۔ میری بے بی کے گال پر بھی اس نے اپنا موبائل مارا تھا۔
''چلیں جی خس کم جہاں پاک۔''، نصیبن نے جلدی سے جان چھڑانا چاہی۔ اس کی نگاہیں، عارفین کے کیبن کے آس پاس بھٹک رہی تھیں، وہ اپنی کرسی پر اداس بیٹھا دکھائی دیا۔ نصیبن تو اپنی راہ کے کانٹے نکال چکی تھی۔ اب محبوب کی دل جوئی ضروری تھی۔ یکطرفہ ہی سہی یہ بھی تو محبت کا ہی ایک رنگ تھا۔

☆......☆......☆

''سر آپ کو مجھ سے کوئی شکایت تو نہیں۔''، نصیبن ڈاکٹر عارفین کے کمرے میں انتہائی قربت کی گھڑیاں بانٹ رہی تھی۔
''ارے! میری جان! تم ہو نا میرے ہر درد کا درماں! مجھے تو بس محبت ہے تم سے۔ تم مجھے بے بی ڈول لگتی ہو۔'' اور وہ جھوم کر اُن کی آغوش میں جھولتی چلی گئی۔
بے بی روم آباد ہو چکا تھا۔ اب وہاں نصیبن ڈاکٹر عارفین اور بچوں پر اپنی محبت کے دریا لنڈھا رہی تھی۔

☆......☆......☆

تیسرا شعلہ

قطرہ قطرہ پگھلا ہوں

نسیم سحر

زندگی کے ہاتھوں، مجبوریوں کی دیمک سے ختم ہونے والے نوجوان کی عبرت سامانی، کراچی سے

''ثنائی پھر کیا سوچا تم نے؟'' فائزہ نے سوال کیا۔
''کس بارے میں؟'' ثانیہ نے اسی سے سوال کر دیا۔

''زیادہ بنو نہیں۔ خالہ پوچھ رہی ہیں۔'' فائزہ نے اُس کو جھاڑا۔



''میں جواب دے چکی ہوں۔'' ثانیہ نے بھی اسی کے ہی انداز میں جواب دیا۔

''پاگل نہ بنو! کیوں اپنی زندگی برباد کر رہی ہو؟'' فائزہ نے لتاڑا۔

''اُس نے بھی تو کر لی۔ پھر میں کیسے خود کو آباد کر لوں؟''

''دیکھو ثانیہ! ہمارے معاشرے میں لوگ عورت کو اکیلا جینے نہیں دیتے۔ آج خالہ موجود ہیں کل کو خدانخواستہ وہ نہ رہیں پھر؟ اچھے رشتے بار بار نہیں ملتے۔ پلیز یار اپنی ماں کا ہی خیال کر لو۔'' فائزہ سے اُسے سمجھایا۔

''امی سے کہنا میری فکر نہ کریں میں ٹھیک ہوں۔'' ثانیہ نے حتمی لہجے میں کہا۔

☆......☆......☆

''بیٹا! آج ٹیوشن والوں سے کہنا فیس دے دیں۔ تمہارے ابو کی دوائیاں لانی ہیں۔'' امی نے باہر نکلتے ہوئے فیصل سے کہا۔

''جی امی ضرور۔'' فیصل نے جواب دیا اور کمرے سے نکل گیا۔

''ارے کیوں پریشان کرتی ہو بیچارے کو۔ اُس کی فیس تو اُس کے اپنے کام ہی آتی ہے۔''

ابا نے کھانستے ہوئے کہا۔ ''میرا کیا ہے صبح کھانسی کا سیرپ پی لیا تھا۔ ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

''سیرپ سے ٹھیک ہونا ہوتا تو آپ کب کے ٹھیک ہو جاتے۔ مگر آپ کی کھانسی تو بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اسی لیے کہہ رہی ہوں ایک دفعہ کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا دیں۔'' اماں نے کہا۔

''ہاں سوچتا تو ہوں پر ہمت نہیں ہوتی ڈاکٹر کو اتنے سارے پیسے دینے کی۔ ان پیسوں سے تو گھر کی بہت ساری چیزیں آ جاتی ہیں۔'' ابا نے افسردگی سے کہا۔

''اچھا اچھا آپ پریشان نہ ہوں ابھی اُن لوگوں کی فیسوں میں ٹائم ہے۔ اس ماہ آپ کی دوائی لے لیں گے۔'' اماں نے ابا کو تسلی دی۔

☆......☆......☆

''یہ میں نے کیا کر لیا اب تو مجھے خود سے نظریں ملاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ سارا سارا دن کمرے میں سگریٹیں پھونکتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ کیا ہوگا اس کا انجام۔ میں چھوڑ دوں گا یہ سب۔ بس اور نہیں۔'' اُس نے جیسے خود سے کہا۔

☆......☆......☆

''ایکسکیوز می! یہ اکنامکس ڈیپارٹمنٹ کہاں ہے؟''

آواز پر شاہ میر نے پلٹ کے دیکھا۔ شلوار قمیض پہنے ایک سائیڈ پر دوپٹہ اور دوسری سائیڈ سے بال آگے کیے وہ لڑکی سیدھے شاہ میر کے دل میں اتر گئی۔

''او ہیلو۔'' ثانیہ نے ہاتھ لہرایا۔

''اگر آپ کو نہیں پتا تو......'' وہ مڑنے ہی لگی تھی کہ شاہ میر جیسے ہوش میں آ گیا۔

''جی جی پتا ہے آئیں میرے ساتھ۔''

''جی۔'' ثانیہ حیران ہوئی۔

''میرا مطلب ہے میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔ آپ میرے ساتھ ہی چلیں۔''

☆......☆......☆

''کیا ہوا بیٹا فیس ملی۔ دوائیں لائے؟'' فیصل نے گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ اماں نے سوال کر دیے۔ فیصل شرمندہ سا ہو گیا۔

''نہیں اماں وہ کہہ رہے تھے کہ ابھی اُن کو تنخواہ نہیں ملی۔''

''ارے یہ کیا بات ہوئی۔ اُن جیسے لوگ بھی تنخواہ کا انتظار کرنے لگے۔ جھوٹ بول رہے ہیں، اب تو لوگوں میں ذرا بھی انسانیت نہیں رہی۔ چار دن پہلے اگر دے دیتے تو کیا بگڑ جاتا، مگر کیا کریں احساس ہی نہیں۔'' اماں نے غصے سے کہا اور دل مسوس کے رہ گئیں۔

''تیرے ابا کو بہت کھانسی ہے مجھے ڈر ہے کہ......؟'' اماں رُک گئیں وہ اپنے خدشے زبان پر لانا نہ چاہ رہی تھیں۔

''نہیں نہیں اماں کچھ نہیں ہوگا ابا کو۔'' فیصل نے اماں کو تسلی دی۔

''کل پھر کوشش کروں گا۔''

☆......☆......☆

ابا کی فکریں بڑھتی جا رہی تھیں۔ دو جوان بیٹیاں کس طرح بیاہی جائیں گی؟ کرائے کا گھر اور تینوں بچے زیر تعلیم۔ وہ تو بیچارہ فیصل میٹرک کے بعد سے ہی ٹیوشن پڑھانے لگ گیا تھا تو اپنی اور بہنوں کی فیس نکال لیتا تھا۔ مگر ٹیوشن تو بس گزارہ ہی ہے۔ اتنی بڑھتی مہنگائی میں دو چار ٹیوشن سے کیا ہوتا ہے؟ بس فیصل کا B.S پورا ہو جائے تو اُسے اچھی سی نوکری مل جائے گی۔ ابا کی واحد اُمید بس یہی تھی۔ ابا کو کھانسی مستقل رہنے لگی تھی۔ اب تو کبھی کبھی خون بھی آ جاتا۔ جس کو وہ بچوں سے تو چھپا گئے تھے مگر اماں نے دیکھ لیا تھا۔ جب سے اُن کا اصرار تھا کہ کسی اچھے ڈاکٹر سے لگ کے علاج کرائیں۔ مگر ابا ہر بار ڈاکٹر کے پاس جانے کے بجائے گھر کے لیے راشن لے آتے۔

☆......☆......☆

''شاہ میر تمہارا آگے کیا پروگرام ہے؟'' ثانیہ نے چنے پھانکتے ہوئے پوچھا۔ وہ دونوں اس وقت ڈیپارٹمنٹ کے باہر بیٹھے ہوئے تھے۔

''کرنا کیا ہے نوکری اور کیا۔'' شاہ میر نے کنکر اٹھا کے دور پھینکتے ہوئے کہا۔

''اور تم؟'' شاہ میر نے اُسے دیکھا۔ تھوڑے سے دن میں ہی وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ ثانیہ B.S کے فرسٹ ایئر میں اور شاہ میر تھرڈ ایئر میں تھے۔

''ہاں میرا بھی کچھ ایسا ہی ارادہ ہے۔'' ہم جیسے لوگوں کے خواب کہاں ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس صرف حقیقتیں ہوتی ہیں اور حقیقت یہ کہ تمہاری طرح مجھے بھی نوکری کی ضرورت ہے۔ ہمارا تو کوئی بھائی بھی نہیں۔ اماں نے بڑی مشکل سے مجھے B.S کرنے کی اجازت دی ہے تاکہ اچھی جگہ جاب مل جائے۔'' ثانیہ نے تفصیل سے بتایا۔

''ابا کا انتقال ہونے کے بعد ہم چچا کے گھر چلے گئے۔ چچا کا احسان ہے کہ انہوں نے ہمیں سہولت سے رکھا اور ابا کی پنشن ہمارے پڑھنے کے کام آ گئی ورنہ تو تمہیں پتا ہے کہ اس دور میں جینا کتنا مشکل ہے، ایک بیوہ کے لیے تین تین بیٹیوں کو پالنا۔'' ثانی نے آہ بھری۔

''ہاں یار جانتا ہوں بس تم تسلی رکھو اور دعا کیا کرو۔'' شاہ میر نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ سادہ مزاج لڑکی اُس کی ہم سفر بننے کے قابل تھی۔

☆......☆......☆

''کیا تمہیں اور ٹیوشن کی ضرورت ہے؟'' مسز نوید نے فیصل سے پوچھا جو اُن کے بچوں کو پڑھا رہا تھا۔

''جی، جی۔'' فیصل نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے یہ کارڈ رکھ لو۔ اُن سے بات کر لینا ڈیفنس میں رہتے ہیں۔'' انہوں نے ایک کارڈ اُس کی طرف بڑھایا۔

''مگر ڈیفنس تو بہت دور ہے۔ میرے لیے مشکل ہو جائے گا اتنی دور جانا۔'' اُس نے کارڈ لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو کیا ہوا کام کے لیے تو بندے کو کہیں بھی جانا پڑ سکتا ہے۔ تم نے مجھے کہا تھا کہ اور ٹیوشن چاہیے تو میں نے بتا دیا اب میرے تو دو بچے ہی ہیں اور کہاں سے لاؤں۔'' انہوں نے عجیب فضول سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''جی میں دیکھ لوں گا۔'' اُس نے کارڈ جیب میں رکھ لیا۔ اُسے مسز نوید نہایت فضول سی عورت لگتی تھی۔ مگر مجبوری تھی لیکن اُس کا ڈیفنس جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

☆......☆......☆

ثانیہ کو لگتا وہ اُس کے بنا جی نہیں پائے گی۔ وہ خاموش خاموش مگر بولتی آنکھوں والا شاہ میر جب اس کے ساتھ ہوتا تو وہ خود کو ایک انجانی خوبصورت سی دنیا میں تصور کرتی۔ وہ جانتی تھی ابھی اُس پر ذمہ داریاں ہیں اور ایسی کوئی بات ابھی ان کے درمیان ہوئی بھی نہیں۔ خود ثانیہ بھی تو جاب کر کے اپنی دو بہنوں کو اپنے گھر کا کرنا چاہ رہی تھی۔ اُسے اندازہ تھا کہ شاہ میر بھی اُسے پسند کرتا ہے۔ پورے کالج میں وہ کسی لڑکی کے ساتھ کبھی دیکھا نہ گیا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ بورنگ تھا مگر گھریلو ذمہ داریوں نے اُسے تھوڑا سنجیدہ کر دیا تھا۔ پھر بھی ثانیہ کا ساتھ تو اُسے بھی پسند تھا۔

☆......☆......☆

''بھائی! ابا کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ان کو

کھانسی میں خون آیا تھا۔ اماں اسپتال لے گئی ہیں۔ آپ بھی جائیں۔" فیصل نے جیسے ہی گھر میں قدم رکھا، گڑیا بوکھلائی ہوئی آواز میں بولی۔ فیصل الٹے قدموں گھر سے واپس اسپتال کی طرف بھاگا۔ ابا کو ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ اماں فیصل کو دیکھتے ہی رونے لگیں۔ فیصل نے انہیں تسلی دی اور ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"بیٹا تیرے ابا ٹھیک تو ہو جائیں گے نا؟"

"ہاں اماں کیوں نہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ڈاکٹر سے مل کے آتا ہوں۔" فیصل نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا اور خود ڈاکٹر کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"آپ کے والد کو ٹی بی ہے۔ یہ دوائیں میں نے لکھ دی ہیں۔ لگ کر علاج کرائیں۔ ٹھیک ہو جائیں گے اور ہاں غذا کا خاص خیال رکھیں۔ دودھ پھل وغیرہ باقاعدگی سے دیں۔ ویسے ان کے گردے میں بھی پرابلم ہے۔ بس آپ خیال رکھیں۔" ڈاکٹر نے سمجھایا اور نسخہ فیصل کے ہاتھ میں تھما دیا۔

☆......☆......☆

"شاہ میر تمہاری زندگی میں میری کیا اہمیت ہے؟" آج وہ دونوں پھر کلاس کے بعد باہر بیٹھے تھے۔ شاہ میر کی آنکھوں میں اس کا عکس بہت واضح تھا۔ مگر پھر بھی وہ اُس کے منہ سے کچھ سننا چاہتی تھی۔ لڑکی تھی نا اپنے لیے اُمید کا جگنو مٹھی میں رکھنا چاہتی تھی۔ وہ جگنو جو آگے اندھیرے میں اس کو روشنی دے سکے۔

"جیسی پھول کے لیے خوشبو کی۔" شاہ میر کا جواب نپا تلا اور مکمل تھا۔

☆......☆......☆

شاندار سے ڈرائنگ روم میں بیٹھا وہ چاروں طرف حیران ہو کے دیکھ رہا تھا۔ وہاں ایک ایک ڈیکوریشن پیس ان کے گھر کے ماہانہ خرچ سے بھی زیادہ کی قیمت کا لگ رہا تھا۔

"آخر تم آ ہی گئے۔" آواز سُن کے وہ چونکا اور کھڑا ہو گیا۔

"السلام وعلیکم!"

"ہوں۔" سلکی ساڑی، رنگے ہوئے بال اور خوب میک اپ کیے ایک نہایت ماڈرن عورت اس کے سامنے کھڑی تھی۔ "بیٹھو۔" کہہ کر وہ بھی اس کے سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کیا لو گے؟" اُس کی مترنم آواز آئی۔

"جی کچھ نہیں۔ شکریہ۔" اُس نے نظریں نیچی ہی رکھیں۔

"ہاہاہاہا۔" بڑا جاندار قہقہہ تھا۔

"کیا فری میں سروس دو گے؟" اُس نے فیصل کے آگے جھکتے ہوئے کہا۔ "اتنی دور ایسے ہی تو نہیں آ گئے نا؟"

"جی سوری میں سمجھا نہیں۔" وہ پہلو بدل کر بولا۔ وہ عورت اُسے اچھی نہیں لگ رہی تھی، پر مجبوری تھی۔ مسز نوید کی بھی ٹیوشن ختم ہو گئی تھی۔ وہ دو ماہ کے لیے ملک سے باہر گئی ہوئی تھیں۔

"ارے بھئی بہت بیوقوف ہو، چلو چھوڑو یہ باتیں جوس پیو۔" اُس نے ملازم کو اشارہ کیا جو ٹرے لیے کھڑا تھا۔ فیصل نے جوس کا گلاس اُٹھا لیا۔

☆......☆......☆

"کیا بات ہے؟ شاہ میر نظر نہیں آ رہا۔ کافی دنوں سے۔" فائزہ نے ثانیہ کو اکیلا بیٹھا دیکھ کر پوچھا۔

"ہونہہ۔" ثانیہ خاموش رہی۔

"تم فون کر لونا۔" فائزہ نے مشورہ دیا۔

"نہیں اُٹھا رہا۔" ثانیہ نے پھر مختصر جواب دیا۔

"یار! پریشانی کی بات تو ہے وہ کبھی چھٹی نہیں کرتا۔"

"خیر تم پریشان نہ ہو ایک دو دن اور دیکھتے ہی پھر اُس کے گھر چلیں گے۔" فائزہ نے تھپکا اور ساتھ ہی مشورہ بھی دے دیا۔ ثانیہ خاموش رہی۔ اُسے تو آج شدت سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ تو اُس کے بنا رہ نہیں پائے گی، اُس کی ایک ہفتے کی غیر حاضری نے ثانیہ کو اُس سے محبت کا یقین دلا دیا تھا۔

☆......☆......☆

جب اُسے ہوش آیا تو وہ خاصی نازیبا حالت میں تھا۔ ایک دم گھبرا کے کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہوا میری جان؟" پیچھے سے کسی نے اپنی بانہیں اس کے گلے میں حمائل کیں، وہ کرنٹ کھا کے پلٹا۔

"آپ؟ اور میں یہاں؟" اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔
"یہ سب کچھ۔"
"کیوں گھبرا رہے ہو لگتا ہے پہلی بار ہے۔" اس کا بے باک تہقہہ کمرے میں گونجا۔ AC کی ٹھنڈک میں بھی اُس کے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ عورت اتنی ہی بے باک تھی۔ وہ جلدی سے باتھ روم میں گھس گیا۔ باہر نکلا تو نوٹوں کی گڈی اُس کے سامنے آ گئی۔
"یہ رکھو۔"
"میں لعنت بھیجتا ہوں۔" اس نے ہاتھ جھٹکا اور دروازے کی طرف بڑھا۔
"ایسا نہ کہو جان! تم نے میری ضرورت پوری کی۔ میں تمہاری کروں گی۔" اُس نے گڈی پھر آگے کی اُس نے گڈی پھینکی اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

☆......☆......☆

اچھی غذا کہاں سے کھاتے؟ اُس گھر میں کھانے والے صرف وہی تو نہیں تھے۔ بچوں کو پریشان کر کے خود پھل یا دودھ اپنے لیے کیسے لاتے؟ خالی دوائیاں کہاں تک ٹھیک کرتیں؟ نتیجتاً بیماری گھٹی نہیں بلکہ بڑھنے لگی۔ دو تین دفعہ کھانسی کے ساتھ خون کی اُلٹی نے بالآخر ابا کو موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ یونیورسٹی کے کافی سارے دوست ابا کی تعزیت کے لیے آئے تھے۔
"حوصلہ رکھو یار۔" سب دوست دلاسہ دے کے گئے تھے۔ ثانیہ خاموش سی اُس کے پاس بیٹھی تھی۔ الفاظ ختم ہو گئے تھے۔ وہ بس اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھے خود بھی رو رہی تھی۔

☆......☆......☆

"تمہیں پتا ہے راحیل اگلے مہینے آ رہا ہے۔" فائزہ نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا۔
"اچھا واقعی۔" ثانیہ بھی خوش ہو گئی۔
"پھر کیا پروگرام ہے جناب کا؟"
"اس دفعہ منگنی بھی BS کے بعد شادی۔" فائزہ نے اپنا پروگرام بتایا۔
"تم بتاؤ۔" اس نے ثانیہ سے پوچھا۔ "ہوں میرا کیا پروگرام یار؟ BS کے بعد جاب کروں گی اور شائستہ اور سدرہ کی شادیاں۔" ثانیہ نے جواب دیا۔
"کیا؟ اور تم؟ تمہارا کوئی ارادہ نہیں شادی کا۔" فائزہ حیران ہوئی۔
"ہاں بھئی کروں گی مگر پہلے بہنوں کی۔ تمہیں پتا ہے نا شاہ میر کی بھی بہنیں ہیں۔ اس دوران وہ بھی اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہو جائے گا اور بس پھر ہم بھی کرلیں گے۔" ثانیہ نے اپنا پروگرام واضح کیا۔
"کیا اُس نے تم سے یہ سب ڈسکس کیا ہے؟" فائزہ نے سوال پوچھا۔
"نہیں۔ مگر میں جانتی ہوں میں نے اُس کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھا ہے۔" ثانیہ نے شاہ میر کا تصور کرتے ہوئے کہا۔
"مگر یار پھر بھی اُسے کچھ کہنا تو چاہیے نا۔ تم ایسے ہی ہوائی قلعے بنا رہی ہو؟" فائزہ کچھ اُلجھی ہوئی تھی۔
"ارے! تم پریشان نہ ہو تمہیں پتا تو ہے وہ کتنا خاموش طبع ہے۔" ثانیہ نے وکالت کی۔
"جب وقت آئے گا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

☆......☆......☆

ابا کے انتقال کے بعد پتا چلا کہ ابا کس طرح محدود سی آمدنی میں گھر کو چلا رہے تھے۔ یہی فکریں ان کی جان لے گئی تھیں۔ فیصل کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ نوکری نہیں، ٹیوشن نہیں۔ سب کی پڑھائی نامکمل گھر کے کرائے کو تین ماہ ہو گئے تھے۔
"بیٹا! وہ تمہارے ابا کی کمپنی سے ایک آدمی آیا تھا۔" اماں نے فیصل کو بتایا۔
"کہہ رہا تھا کہ تمہارے ابا نے اُس کا قرضہ دینا ہے۔" فیصل نے سر پکڑ لیا۔
"بس بیٹا حوصلہ کرو یہ آزمائش سے گزر جائے گی۔ میں نے ابھی ٹال دیا ہے۔ تم کوئی نوکری ڈھونڈنے کی کوشش کرو۔"
"جی اماں! کر رہا ہوں۔" فیصل نے آہستہ سے تھکے لہجے میں کہا۔

☆......☆......☆

شاہ میر کافی دن سے یونیورسٹی نہیں آ رہا تھا۔ ثانیہ کافی پریشان تھی۔ فون پر بس اتنا ہی کہتا کہ مصروف

ہوں۔ ثانیہ فکر مند تھی۔ فائنل ایئر تھا اور وہ غائب اُس کے بار بار یاد دلانے پر ایک دن چڑ کر کہنے لگا۔

''کیا تیر مار لوں گا BS کر کے ،نوکری تو ملنی نہیں۔'' ایسا کیوں کہہ رہے ہو شاہ میر اللہ پر بھروسہ رکھو۔'' وہ حیران تھی۔ اُس جیسا کول مائنڈ اور سلجھا ہوا انسان اتنی مایوسی سے بات کرے۔ یقیناً وہ اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے فکر مند اور پریشان تھا۔ ثانیہ دل مسوس کر رہ گئی۔

☆......☆......☆

اب وہ لوگوں سے ملنے سے کترانے لگا تھا۔ گھر میں ہوتا تو کمرے میں بند رہتا۔

''بھائی کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے؟ بالکل بدل گئے ہیں۔'' گڑیا رونے جیسی آواز میں بولی۔

''بھائی نے ابو کی موت کا بہت صدمہ لیا ہے۔'' ہما کو بھی دکھ تھا۔

''حالانکہ اب تو بھائی کو نوکری بھی مل گئی ہے۔''

''ہاں میرا بچہ شروع سے حساس ہے۔ چھوٹی عمر سے ہی باپ کا ہاتھ بٹانے کے لیے ٹیوشن شروع کر دی تھی۔'' اماں کے لہجے میں بیٹے کے لیے پیار ہی پیار تھا۔ ''بس گڑیا کے فرض سے سبکدوش ہو لوں تو پھر اُس کے لیے بھی کوشش کرتی ہوں۔ ورنہ تو یونہی اپنے آپ کو تنہا اور پریشان رکھے گا۔''

''اماں آپ کو وہ لڑکی یاد ہے جو ابا کے انتقال پر آئی تھی؟'' گڑیا کو اچانک ثانیہ کا خیال آ گیا۔

''بھائی کو بہت تسلی دے رہی تھی۔''

''ہاں ہاں وہ سب سے آخر میں گئی تھی۔'' ہما کو بھی یاد آ گئی۔

''وہ تو بہت پیاری ہیں۔ بھائی کو پسند کرتی ہوں گی جب ہی تو اکثر فون بھی آتا ہے اُن کا۔'' ہما کو سب خبر تھی۔

''ارے ہاں ہاں کیوں نہیں میرا افیصل بھی تو لاکھوں میں ایک ہے۔ اگر اُسے وہ پسند ہے تو ضرور اپنے بیٹے کی خوشی پوری کروں گی۔'' اماں فوراً راضی ہو گئیں۔

''مگر اماں بھائی تو کچھ بولتے ہی نہیں۔'' گڑیا کو پھر تشویش ہوئی۔

''اچھا فکر نہ کرو وہ تم لوگوں کی وجہ سے بھی پریشان ہے۔ اللہ اللہ کر کے تیرے ابا کا قرضہ اُترا ہے۔ تمہاری شادی کی تیاری ہو گئی ہے۔ ذرا ہاتھ ہلکا ہو تو پھر بات کروں گی۔'' اماں نے دونوں کو تسلی دی حالانکہ وہ خود بھی فیصل کی خاموشی سے اداس اور پریشان تھیں۔

☆......☆......☆

آخری پیپر والے دن ثانیہ پورا وقت اُس کی کلاس کے باہر کھڑی رہی وہ جیسے ہی کلاس روم سے باہر آیا۔ ''شاہ میر'' آواز پر وہ چونک کر مڑا۔ وہ جتنا بچنا چاہ رہا تھا۔ مگر آج تو وہ کسی بھی قیمت پر اُسے جانے نہیں دے سکتی تھی۔ پھر پتا نہیں کب ملاقات ہو۔ وہ اُسے زبردستی کینٹین لے آئی۔ ''شاہ میر۔'' اُس نے بات شروع کی۔

''مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ تم مجھے اگنور کر رہے ہو۔'' ثانیہ آج ہر حال میں وجہ جاننا چاہتی تھی۔

''ایسا نہیں ہے۔'' اُس نے مختصر جواب دیا۔

''پھر؟'' ثانیہ نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا نجانے کیوں وہ نظریں بھی نہیں ملا رہا تھا۔

''تم نے شاید نوکری بھی کر لی اور مجھے بتایا بھی نہیں۔'' ثانیہ کے لہجے میں شکوہ تھا۔

''تمہیں کس نے بتایا؟'' وہ چونکا۔

''اُس دن تمہیں فون کیا تھا تو گڑیا نے بتایا۔''

''ہاں وہ بس خیال نہیں رہا۔'' وہ پھر مختصر جواب دے کر چپ ہو گیا۔

''کوئی اُلجھن ہے تو تم مجھ سے شیئر کر سکتے ہو۔'' اُس کی مسلسل خاموشی سے وہ چڑ کر بولی۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ پھر خاموش ہو گیا۔

''شاہ میر تم مجھ سے رابطہ رکھو گے نا؟'' ثانی نے آس بھرے لہجے میں پوچھا۔ شاہ میر نے چونک کر ثانیہ کو دیکھا۔ اس کی عدم توجہ نے اُس کے پھول جیسے چہرے کو کملا دیا تھا۔ شاہ میر کے دل کو کچھ ہوا۔

''نہیں ثانی! پریشان مت ہو۔'' اُس نے ثانی

کے میز پر رکھے ہاتھ کو چھوا۔ ''میں ساتھ ہوں تمہارے۔ بس دعا کرو ہم لوگوں کے مسئلے حل ہو جائیں تو پھر...'' شاہ میر رک گیا۔

''ہاں ہاں کہونا۔'' ثانی بے تابی سے بولی۔ اُس کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ ثانیہ کی جان میں جان آئی آج وہ پہلے والا شاہ میر لگ رہا تھا۔

''شکر ہے۔'' اُس نے دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔

☆......☆......☆

''مجھے یقین تھا کہ تم ضرور واپس آؤ گے۔'' وہ اب بھی اسی طرح تیار تھی۔ ''پیسہ چیز ہی ایسی ہے میری جان بڑے بڑوں کے ایمان ڈانواڈول ہو جاتے ہیں۔ مجھے دیکھو! میں نے بھی یہاں تک پہنچنے میں نہ جانے کون کون سے پل صراط عبور کیے ہیں؟'' آج اُس کے قہقہوں میں نمی گھلی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اُس نے نیم برہنہ کپڑوں سے جھلکتے پوشیدہ اعضاء کو قطعاً شاہ میر سے چھپانے کی کوشش نہ کی تھی۔ اور کچھ ہی دیر میں شاہ میر کی مجبوریوں نے اُسے برہنہ کر کے اُس کے روبرو کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

اُسے جاب کرتے ہوئے چار سال ہو گئے تھے۔ اس عرصے میں اس نے اپنے سے چھوٹی دونوں بہنوں کی شادیاں کر دی تھیں۔ اماں کے لاکھ اصرار کے باوجود وہ آج بھی شاہ میر کی منتظر تھی۔ جو نجانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ وہ اُس کے گھر بھی گئی مگر معلوم ہوا وہ لوگ گھر چھوڑ گئے ہیں۔ اس کی بھی دونوں بہنوں کی شادیاں ہو گئی تھیں اور وہ خود کہاں تھا؟ کیا کر رہا تھا؟ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

☆......☆......☆

''فیصل۔'' اماں نے آواز دی۔

''آؤ کھانا کھالو۔''

''جی اماں۔'' وہ ہاتھ دھو کر کھانے کے لیے بیٹھا۔

''بیٹا پھر تم نے کیا سوچا؟ کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ شادی کر لو۔ تمہیں اس طرح تنہا اور اُداس دیکھ کر میرا دل کڑھتا ہے۔'' اماں نے آج پھر اُس سے بات کی۔ اس کے خاموش رہنے پر

وہاں بچھو ڈنک نہیں مارتے

یو پی (بھارت) کے ایک شہر امروہہ میں ایک بزرگ حضرت سید حسین شرف الدین شاہ ولایت کا مزار ہے' ان کے مزار پر بے شمار زہریلے اور خطرناک بچھو دوڑتے رہتے ہیں۔ لیکن آپ یہ سن کر یقیناً حیران ہوں گے کہ وہ احاطۂ مزار میں ڈنک نہیں مارتے حتیٰ کہ اگر آپ ان کو پکڑ لیں تب بھی وہ ڈنک نہیں مارتے اور ان کو پکڑنے سے کوئی تکلیف بھی نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ باہر سے اگر زہریلے بچھو لا کر مزار مبارک کے قریب چھوڑ دیے جائیں تو وہ بھی بے ضرر ہو جاتے ہیں اور اپنی فطرت کے خلاف ڈنک مارنے کے بجائے ڈنک کو سکیڑ لیتے ہیں۔ یہ ان بزرگ کی کرامت اور سائنسدانوں اور تحقیق کرنے والوں کے لیے دعوتِ فکر ہے۔

حسنِ انتخاب: عاشر عتیق، شاعر عتیق۔ کراچی

دوبارہ بولیں۔

''بیٹا! میں جانتی ہوں تم نے ہم سب کے لیے بہت کچھ کیا۔ پر بیٹا! تمہاری زندگی پر تمہارا بھی تو حق ہے نا۔ گڑیا اور ہما اپنے گھروں میں خوش ہیں، اب تم بھی گھر بسا لو۔ میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں بیٹا۔ میں تمہیں بھی آباد دیکھنا چاہتی ہوں۔'' اماں روہانسی ہو گئیں۔

''اماں ایسا کیوں کہہ رہی ہیں؟ میں نے جو بھی کیا وہ میرا فرض تھا۔ اللہ آپ کو زندگی دے۔ اماں میرے لیے آپ کا ساتھ کافی ہے ماں۔'' فیصل نے اماں کے ہاتھ تھام لیے۔

''وہ لڑکی تھی نا جو تمہارے ابو کے انتقال پر آئی تھی۔'' اماں کو کچھ یاد آیا۔

"بڑی پیاری بچی تھی۔ میرا خیال ہے تمہیں پسند کرتی ہے۔" اماں اس کے دل کا راز پا گئی تھیں۔

"میں اُسے دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔" فیصل کے منہ سے بے ساختہ ہی نکلا۔

"دھوکہ! کیسا دھوکہ؟" اماں چونکیں۔

"کچھ نہیں۔" فیصل دسترخوان سے اُٹھ گیا۔ اماں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

☆......☆......☆

"اُس نے میری بہت مدد کی۔ گڑیا اور ہما کی شادی کروائی۔ مکان کا بندوبست کیا۔ ابا کا سارا قرضہ اُتارا۔ میں جانتا تھا کہ میں غلط کر رہا ہوں۔ مگر میں مجبور ہو گیا تھا۔ کوشش کے باوجود نوکری نہ ملی۔ ابا کا قرضہ، مکان کا کرایہ اور بہنوں کی شادیاں کہاں سے کرتا۔ اس کا کروڑوں کا بزنس تھا اور وہ اکیلی۔ شوہر چھوڑ کر جا چکا تھا۔ بچے بھی نہ تھے۔ میں تمہارے قابل نہیں رہا ثانی، مجھے معاف کر دو۔ میں تمہیں کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا اس لیے تمہارے سامنے نہیں آیا۔"

وہ مجرم کی طرح سر جھکائے سامنے بیٹھا تھا اور ثانیہ کو آج اتنے دنوں بعد وہ ملا بھی تو اس کے ارمانوں کا خون کر دیا۔ آفس سے نکلتے ہوئے سامنے سپر اسٹور سے اُسے شاہ میر نکلتا نظر آیا اور وہ بھاگ کے اس کے پاس جا پہنچی۔

"شاہ میر۔" اور اب وہ اُسے لیے ایک کیفے میں بیٹھا اعترافِ جرم کر رہا تھا یا اُسے سزا سنا رہا تھا۔

"تم اب بھی تو اُسے چھوڑ سکتے ہو۔" ایک مبہم سی اُمید لیے اُس نے پوچھا۔

"تم اب بھی۔" وہ حیران تھا۔

"ہاں میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔" وہ رو پڑی۔

☆......☆......☆

"انہیں خون کی ضرورت ہے آپ فوری انتظام کریں۔" ڈاکٹر یہ کہہ کر آپریشن تھیٹر میں چلا گیا۔

"جی میرا خون لے لیں۔ میرا بلڈ گروپ بھی وہی ہے جو اماں کا ہے۔" اُس نے لیب والے سے کہا۔

"آیئے میرے ساتھ۔" وہ لوگ اسے لیب میں لے گئے۔

"آئی ایم سوری مسٹر شاہ میر۔ ہم آپ کی والدہ کو نہیں بچا سکے۔ انہیں بروقت خون نہ مل سکا۔" ڈاکٹر کے الفاظ ہتھوڑا بن کر اُس کے دماغ سے ٹکرائے۔

"کیا یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ میرا ابھی تو خون لیا تھا آپ لوگوں نے۔" وہ چلایا اماں ہی تو تھیں۔ اس کے ساتھ دونوں بہنیں تو باہر چلی گئی تھیں۔

"حوصلہ رکھیں آپ تدفین سے فارغ ہوں تو پھر میرے پاس آیئے گا۔ آپ سے ضروری بات کرنا ہے۔" ڈاکٹر اُسے تسلی دے کر چلا گیا اور وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ اب کیا بچا تھا اس کے پاس؟ اماں کافی دن سے شکایت تو کر رہی تھیں کہ اُن کے سینے میں درد رہتا ہے اور بی پی بھی ہائی رہنے لگا تھا۔ ڈاکٹر سے رابطے میں تو تھے مگر قدرت کے کاموں میں کس کا دخل تھا۔

"اماں۔" وہ درد سے چلایا۔ "کیوں چلی گئیں چھوڑ کے؟ ابھی تو مجھے آپ کو خوشخبری دینا تھی۔ ثانیہ مان گئی تھی۔ آپ کو کتنا ارمان تھا میری شادی کا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

☆......☆......☆

کئی بار فون کرنے پر بھی وہ نہیں اٹھا رہا تھا۔ گھر کا معلوم نہیں تھا، نہ آفس کا۔

"شاہ میر کیوں مجھے آزمائش میں رکھتے ہو؟" وہ دل میں اُس سے مخاطب تھی۔ برسوں بعد ملے اور میری زندگی میں اُمید کا جگنو جگا کر پھر غائب ہو گئے۔ کہاں ڈھونڈوں میں تمہیں؟ اماں اُسے شادی کا کہہ کہہ کر تھک گئی تھیں اور اب کچھ نہ کہتی تھیں صرف کڑھتی رہتی تھیں۔

☆......☆......☆

"فیصل یہ تم ہو نا؟" آواز پر شاہ میر عرف فیصل نے نظریں اٹھائیں۔ سامنے فائزہ کھڑی تھی۔ وہ اسٹور سے کچھ سامان لے کر نکلا تھا اور فائزہ اندر جا رہی تھی کہ فیصل کو اچانک سامنے دیکھ کر رک گئی۔

"کہاں غائب ہو جاتے ہو؟ تمہیں ذرا شرم نہیں

ہے۔ جب ملتے ہو اسے اُمید دلا کر غائب ہو جاتے ہو۔ تمہیں پتا ہے اس کی حالت کیا ہوگئی ہے؟'' فائزہ نے آج اُسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ وہ چپ چاپ سر جھکا کر کھڑا رہا۔

''فیصل آخر بات کیا ہے؟ تم ایک ہی بار کیوں نہیں بتا دیتے۔'' فیصل نے کچھ نہیں کہا بس اپنا ایڈریس دیتے ہوئے کہا۔

''یہ اُسے دے دینا۔'' اور تیزی سے آگے نکل گیا۔

☆......☆......☆

کافی دن سے طبیعت عجیب مضمحل سی تھی۔ کہیں آنے جانے کا دل نہیں کر رہا تھا۔ چیک کیا تو بخار بھی تھا۔ اماں کے جانے کے بعد سے تو اُس کا کھانے پینے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ کئی کئی دن گھر میں پڑا رہتا۔ سگریٹیں پھونکتا رہتا۔ اب بھوک بھی لگ رہی تھی اور اٹھنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔

''چلو ڈاکٹر کے پاس جاتا ہوں۔ ورنہ تو طبیعت مزید خراب ہو جائے گی۔'' یہی سوچ کر اٹھا اور کلینک کی طرف چل پڑا۔

''آیئے مسٹر شاہ میر! بیٹھیے بہت دنوں بعد آئے آپ۔'' ڈاکٹر اُسے دیکھتے ہی بولا۔

''جی! کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اب بھی بخار ہے تو اسی لیے چلا آیا۔'' اُس نے تھکے تھکے انداز میں جواب دیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ چیک اپ اور میڈیسن لینے کے بعد وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ ڈاکٹر نے روک لیا۔

''آپ سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔''

''جی کہیے۔'' شاہ میر چونکا۔

''آپ کی والدہ کی ڈیتھ آپریشن کے دوران زیادہ خون بہنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔'' ڈاکٹر بتانے لگا۔

''اور بروقت خون کا انتظام نہ ہو سکا تھا۔''

''مگر ڈاکٹر صاحب میرا بھی تو وہی گروپ تھا جو اماں کا تھا اور میں نے خون دیا بھی تھا۔'' شاہ میر نے جواب دیا۔

''ہاں مگر ہم آپ کا خون نہیں لگا سکتے تھے۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔

''مگر کیوں؟'' شاہ میر اُلجھن میں تھا۔

''اِس لیے کہ آپ کو ایڈز ہے۔'' ڈاکٹر کے انکشاف نے شاہ میر کو سُن کر دیا۔

☆......☆......☆

منظور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

ثانیہ ہکا بکا بیٹھی اُس انسان کو دیکھ رہی تھی جسے اُس نے خود سے بھی زیادہ چاہا تھا۔ فائزہ کے ایڈریس دیتے ہی وہ فوراً اُس سے ملنے آ گئی تھی۔ وہ ایک معقول سے علاقے میں معقول سا فلیٹ تھا۔ اُس کے سامنے بیٹھا شاہ میر برسوں کا مریض لگ رہا تھا۔ کافی مہینوں بعد اُس نے دیکھا تھا۔

''شاہ میر! یہ تم نے کیا حالت بنالی اپنی؟'' وہ اُس کے ہاتھوں پر سر رکھے رو پڑی۔

''ایسا کیوں کیا تم نے؟ تمہیں میرا خیال کیوں نہیں آیا؟'' وہ چیخ پڑی۔

''اب میں کیا کروں گی۔ تم نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا شاہ میر!''

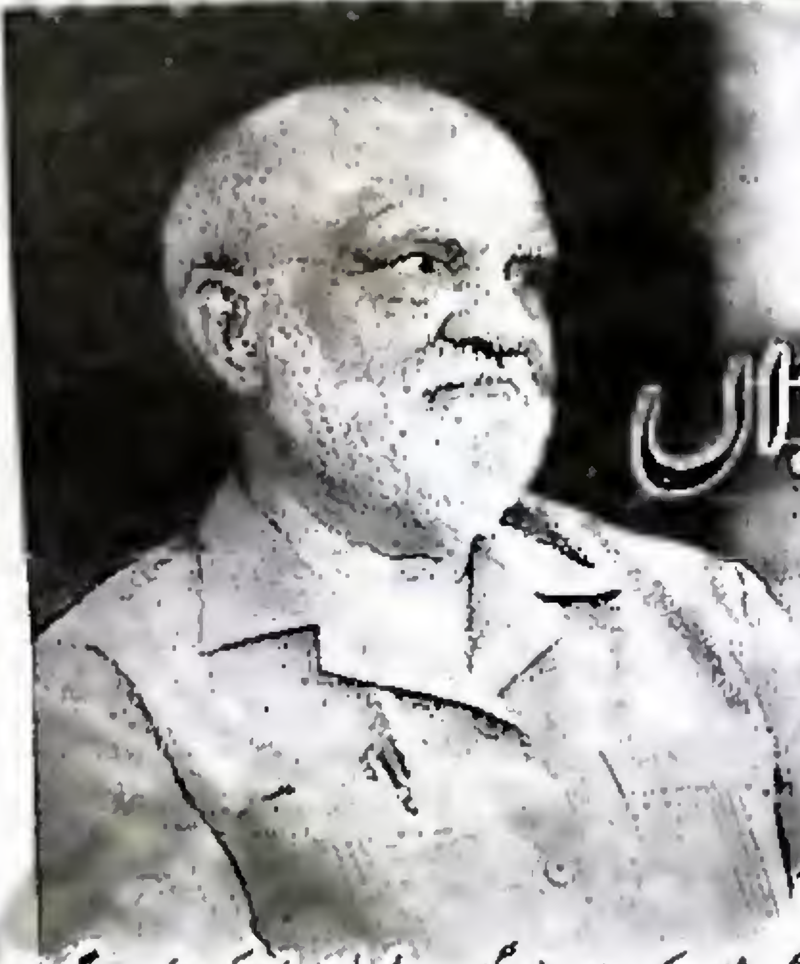
''ثانی مجھے معاف کر دو۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں اِس دلدل میں سے کبھی نہ نکل سکوں گا۔ جب ابا کا قرضہ اُتار دیا اور گڑیا کی شادی ہوگئی تو میں نے اُس سے رابطہ ختم کرنے کی کوشش کی۔ مگر اُس نے مجھے ایسے جال میں پھنسا لیا تھا کہ میں نکل نہ سکا۔ پھر ہما کی شادی کے بعد جب تم مجھے ملیں تھیں، میں نے اُسی وقت سوچ لیا تھا کہ اب کبھی اِس دلدل میں نہیں جاؤں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ اماں کی طبیعت خراب ہونے پر مجھے خون دینا پڑا۔ جب ہی مجھے پتا چلا۔''

وہ اتنا بہادر اور مضبوط لڑکا پھوٹ پھوٹ کر رو دیا اور ثانیہ کے پاس اب واپسی کے علاوہ کوئی راستہ ہی نہیں بچا تھا۔

شاہ میر کو اس کی مجبوریوں نے دیمک کی طرح بھری جوانی میں چاٹ لیا تھا۔ کسی وقت بھی وہ ٹوٹ کر زمیں بوس ہونے والا تھا۔

☆☆......☆☆

سفرنامہ



برطانیہ میں خزاں

محمود شام

برٹش ٹورسٹ اتھارٹی کی دعوت پر، عظیم صحافی اور شاعر محمود شام کے برطانیہ میں گزرے اُن لمحات کا ذکر جو اَمر ہوگئے

ایسا سفرنامہ جسے پڑھ کر قاری خود کو اُن ہی مناظر کا حصّہ محسوس کرتا ہے

پانچواں حصہ

چرچل کی کالی بطخیں

اتنے خوبصورت فطری مناظر کے درمیان رہتے ہوئے سانس لیتے ہوئے، سوچتے ہوئے۔ چرچل جیسی عظیم شخصیت کی بصیرت اور تدبر اور تابدار ہوجاتا ہوگا۔

کینٹ کے علاقے میں غاریں ہیں اور کانیں بھی۔ عالمی جنگوں کے دوران شاہی زیورات اور ہیرے وغیرہ یہاں چھپادیے گئے تھے۔ کافی بڑی آبادی لندن سے چالیس پچاس میل دور مضافات میں رہنا پسند کرتی ہے۔ لندن جانے کے لیے بسیں اور ریلیں ہر چند منٹ بعد دستیاب ہیں۔ شوہر اور اگر بیوی بھی کام کرتی ہے تو وہ لندن چلے جاتے ہیں۔ بچے اسکولوں میں۔ چھوٹے بچوں کے لیے بھی نرسریاں موجود ہیں۔

ان ہی باغات اور دیہات میں سے ہوتے ہم چارٹ ویل پہنچ گئے ہیں، جہاں چرچل کی رہائش گاہ ہے۔ برطانوی تاریخ کی اس عظیم سیاسی شخصیت نے برطانیہ پر، اس کی سیاست پر، تاریخ پر اپنے گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ جنگِ عظیم کے دوران ان کی سیاسی بصیرت اور حکمت عملی نے شہریوں کے حوصلے بلند رکھے۔ اور جرمنی کے مقابلے میں فوجی کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ چرچل کا خاندان اب بھی سیاست میں اسی طرح سرگرم ہے۔ چرچل کے ایک پوتے پارلیمنٹ کے ایک اہم رکن ہیں۔

برطانوی قوم اپنے ہیروز کو بڑے احترام اور محبت سے یاد رکھتی ہے۔ یہ پورا علاقہ اب ایک قومی یادگار ہے۔ سیکڑوں لوگ روزانہ یہاں کی سیاحت کے لیے آتے ہیں۔ شاہ بلوط کے خوبصورت درختوں میں گھری ہوئی وادی حسنِ فطرت سے مالا مال ہے۔ چارٹ ویل گارڈن میں داخل ہوتے ہی پہلے آپ کے لیے پارکنگ کا انتظام ہے۔ لانبے لانبے پیڑوں اور رنگ برنگ پھولوں کی روشنیوں کے درمیان گاڑی کھڑی کیجیے۔ اور ہری ہری گھاس پر آگے بڑھیے۔ ادھر ریستوران ہے۔ کھانے کا وقت ہے کھایئے، ستایئے۔ کولڈ ڈرنکس، ہارڈ ڈرنکس۔

اس یادگار کی حفاظت نیشنل ٹرسٹ کے ذمے ہے۔ سیاحوں کے ٹکٹوں سے جو آمدنی ہوتی ہے۔ اس سے ان یادگاروں کے اخراجات کا اہتمام ہوتا

ہے۔ ایک طرف گہرائی میں جھیل ہے۔ دوسری طرف چرچل کی رہائش گاہ۔ اتنے خوبصورت فطری منظر کے درمیان رہتے ہوئے، سانس لیتے ہوئے سوچتے ہوئے۔ چرچل جیسی عظیم شخصیت کی بصیرت اور بدبراور تابدار ہو جاتا ہوگا۔

سیاحوں کی ایک طویل قطار چرچل کی رہائش گاہ کے اندر جانے کی منتظر ہے۔ سرخ اینٹوں سے بنی دیواروں پر بیلیں لپٹی ہوئی ہیں۔ دور دور تک ایک سکوت ہے۔ ملکوتی سکوت۔ ہر طرف ہریالی ہے۔ دور دور تک سرسبز وادیاں دکھائی دے رہی ہیں۔

سرونسٹن چرچل کی یہ رہائش گاہ ان کے کچھ احباب نے ۱۹۴۷ء میں خرید کر وی نیشنل ٹرسٹ کو یادگار بنانے کے لیے پیش کی تھی۔

چارٹ ویل مینور۔ خود سرونسٹن چرچل نے میجر کیمپل کولکوہن سے ۱۹۲۲ء میں خریدا تھا۔ جس کا خاندان ۱۸۴۸ء سے وہاں رہائش پذیر تھا۔ سرونسٹن چرچل نے اس رہائش گاہ میں بڑی تبدیلیاں کیں۔ جن میں ایسٹ ونگ کا اضافہ بھی ہے۔ جس میں اب ڈائننگ ردم۔ ڈرائنگ روم اور لیڈی چرچل کا بیڈ روم بھی ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد چارٹ ویل کے اندر مزید تبدیلیاں کی گئیں تاکہ اس کو کم اسٹاف کے ساتھ چلایا جاسکے۔ بعض کمروں کا استعمال ہی یکسر تبدیل کردیا گیا۔ جیسے نیچے کا ڈائننگ روم ۱۹۴۵ء سے سرونسٹن کی موت تک سینما کے طور پر استعمال کیا گیا۔ کوشش یہ کی گئی کہ چارٹ ویل میں زیادہ سے زیادہ ۱۹۳۰ء کے عشرے کا ماحول پیدا کیا جائے۔ آرائش وزیبائش، پردے، اور غلاف وغیرہ پرانے دور کے محفوظ کیے گئے یا پرانے والوں کی ہو بہو نقل کی گئی۔ اور تقریباً سارا فرنیچر اسی طرح ہے جیسا یہ سرونسٹن کی زندگی میں ہی تھا۔ کئی اشیاء اور چرچل کی کئی پینٹنگز یہاں لیڈی چرچل کی وریادلی کے بحث موجود ہیں۔

چارٹ ویل چرچل کی کئی قد آدم پینٹنگز کا ایک طرح سے عجائب گھر بنا ہوا ہے۔ آپ کے داخل ہوتے ہی سامنے جو نظر آتی ہے۔ یہ سرونسٹن نے خو[د] بنائی تھی۔ اندر کے ہال میں ایک تصویر موجود ہے۔ جو سرونسٹن چرچل کو اینٹ وارپ کے شکر گزا[ر] شہریوں نے اپنے شہر کی آزادی پر ۱۹۴۵ء میں پیش کی تھی۔ ۱۹۴۲ء سے استعمال کی جانے والی ملاقاتیوں کی کتاب کے ساتھ ایک صحت مند گھوڑے کا مجسمہ رکھا ہوا ہے۔ جو امریکی مجسمہ ساز ہربرٹ ہیشائن نے سرونسٹن کو پیش کیا تھا۔

لیڈی چرچل کا یہ پورٹریٹ 1946ء میں ڈگلس کینڈر رو نے پینٹ کیا تھا۔ آتشدان کے اوپر کی تصویر سرونسٹن کے گھوڑے کرلونسٹ II کی ہے۔ جس نے اپنے مالک کے لیے کئی دوڑیں جیتیں یہ تصویر راؤل ملائیس کے اعجاز قلم کا نتیجہ ہے۔

اور کئی فن پارے بھی اس کمرے میں آویزاں ہیں جو سرونسٹن کی اپنی فن کاری کا نمونہ ہیں۔ یہ آئینہ جنرل ڈیگال کی طرف سے لیڈی چرچل کے لیے ایک تحفہ ہے۔ سرونسٹن اس کمرے کے آخر میں لیڈی چرچل کے ساتھ شطرنج کھیلنے بیٹھتے تھے۔ اس کی یاد میں ایک میزاب بھی یہاں محفوظ ہے۔

لائبریری بھی اپنی جگہ ایک تاریخی مقام ہے۔ کتابوں کے درمیان ایک ماڈل ہے۔ یہاں آرومینشنز پر ملبری ہاربر کا جو جیسے وہ جنگ عظیم کے اہم ترین دن ۲۳ ستمبر ۱۹۴۴ء کو تھی۔ یہاں بھی آتشدان پر سرونسٹن چرچل کی ایک پینٹنگ نظر آرہی ہے۔ جو دوسری جنگ عظیم دوم کے دوران فرینک سالسبری نے بنائی تھی۔ جنگ ہو یا امن مصور اپنے فن کی مشق جاری رکھتے ہیں۔

لیڈی چرچل کی خواب گاہ۔ جس کی بیضوی چھت ہے۔ سرونسٹن کے آخری دنوں میں ڈائننگ روم کے طور پر استعمال ہورہی تھی۔ نپولین اور اس کے افسروں کی چینی کی بنی ہوئی مورتیاں آنجہانی لارڈ بریکن نے لیڈی چرچل کے لیے چھوڑی تھیں۔ کپڑوں کی الماری سے آگے دوا اسکیچ ان کی بیٹی آڈولے کے بنائے ہوئے ہیں۔ جو کیلی فورنیا کے مالی بو ساحل کی صبح اور شام کی تصویر پیش کرتے ہیں۔

ساتھ کے کمرے میں سرونسٹن کے جمع کردہ نوادرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔

مہمانوں کے لیے مخصوص تین خواب گاہوں کو میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ان میں وہ ٹرافیاں اور تحائف موجود ہیں جو چرچل کو ان کی زندگی کے دوران مختلف افراد اور ممالک کی طرف سے دیے گئے۔ یہاں ان کی بعض وردیاں بھی سجی ہوئی ہیں۔ ان کی عم زاد مسز کلیئر شیریڈان کا بنایا ہوا سرونسٹن کا ایک چھوٹا سا مجسمہ بھی یہاں داد طلب نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔

یہ کمرہ چارٹ ویل کا قلب ہے۔ صرف جنگ کے دنوں کے علاوہ چرچل نے مسلسل 40 برس تک اس خواب گاہ کو استعمال کیا۔ ان کی زیادہ تر تحریریں اس کمرے میں اپنی تکمیل کو پہنچیں۔ یہ کمرہ قریباً اسی حالت میں ہے جس میں انھوں نے اکتوبر 1964ء میں چھوڑا۔ مغربی دیوار کے سامنے لگی کام کی میز چرچل کے بچوں نے 1949ء میں انھیں تحفہ پیش کیا گیا تھا۔ یہ ان کی اپنی تراشیدہ اور بغیر وارنش کی ایک میز کی نقل تھی۔

اوپر لیڈی چرچل کی ایک پینٹنگ آویزاں ہے۔ جو سر جان لیوی نے پہلی جنگ عظیم کے دوران بنائی تھی۔ آتشدان کے اوپر کی تصویر سرونسٹن کی جائے پیدائش بیلنہا م پیلس کی ہے۔ اس کا مصور نامعلوم ہے۔ اس کے نیچے چرچل کے والد لارڈ رینڈ ولف چرچل ہیں۔ یہ پورٹریٹ چرچل کو بہت پسند تھا۔ آتشدان کے دونوں طرف چرچل کے اسکیچ ہیں جو لیڈی آڈلے نے بنائے۔ یہیں ایک پینٹنگ ان کی والدہ لیڈی رینڈ ولف کی بھی ہے۔ جس کے آرٹسٹ جے ایس سارجنٹ ہیں۔

شاہ ایران کی طرف سے تحفے میں پیش کیا گیا قالین بھی یہاں آویزاں ہے۔ یہ تحفہ سرونسٹن چرچل کو ان کی 69ویں سالگرہ پر ملا تھا جو انھوں نے تہران میں گزاری تھی۔

یہ جو وہیل چیئر نظر آ رہی ہے یہ مسلح افواج کے معذور افراد کی ایسوسی ایشن نے چرچل کو 80 ویں سالگرہ پر دی تھی۔ ڈائننگ روم میں سرونسٹن کی اپنی بنائی ہوئی مکمل اور نامکمل تصویریں ہیں۔

یہ خوبصورت عمارت چاروں طرف سے فطرت کے لازوال حسن میں گھری ہوئی ہے۔ ایک چمن ہے۔ ایک گلستان ہے جس نے چرچل کی رہائش گاہ کو اپنی بانہوں میں سکیڑا ہوا ہے۔ ایک ندی گنگناتی ہوئی بہہ رہی ہے۔ یہ چارٹ ویل میں داخلہ کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ خاموشی سے جھیلوں کی طرف رخ کرتی چلی جاتی ہے۔ مچھلی کے تالاب سب سے پہلے ہیں جہاں بیٹھنے کے لیے بینچ موجود ہے۔ ساتھ ہی مچھلی کی خوراک کا ایک بکس بھی دھرا ہے۔ چرچل اسی بنچ پر اکثر بیٹھتے تھے۔ چرچل نے نہانے کے لیے تالاب بھی بڑی ندرت سے بنایا تھا۔ نیچے کی دو جھیلوں کو ڈیم بنا کر الگ کر دیا۔ اور باقاعدہ ایک جزیرہ نما قائم کیا۔ ایک جھیل میں کالی بطخیں تیر رہی ہیں۔ جو آسٹریلیا سے ایک تحفہ تھا۔ چرچل کو ان سے بہت لگاؤ تھا۔

ایک طرف باغ میں سرونسٹن کا اسٹوڈیو بھی ہے۔ یہاں تصویریں بنانے کا ایزل بھی ہے۔ ہنٹ بکس بھی اور کرسی بھی جس پر چرچل بیٹھ کر مصوری کرتے تھے۔ دیواروں پر چرچل کے کینوس لٹکے ہیں۔ ان میں سے کئی نامکمل ہیں۔ ساتھ کے کاٹیج میں چرچل اور ان کی بیگم جنگ کے زمانے میں مختلف وقفوں سے رہے۔ یہ کاٹیج انھوں نے قدیم اصطبلوں کو توڑ کر بنائی تھی۔

آس پاس اور کاٹیج جو چرچل نے اپنی بیٹیوں کے لیے بنائے یہیں اس فاختہ کا مزار بھی ہے جو لیڈی چرچل 1936ء میں بالی سے لائی تھیں۔ اس فاختہ کا کتبہ بھی بڑا دردناک ہے۔

ایسا حسین روح پرور فطری ماحول ہی چرچل جیسے عظیم مدبر کی صلاحیتوں کو جلا دے سکتا تھا۔ کتنا سکون ہے اس سرسبز خطے میں۔ اس عجب سحر انگیز کیفیت ہے۔

کتنے عظیم ہیں وہ لوگ جنھوں نے اپنی قوم کے ایک محسن کی رہائش گاہ کو یادگار میں تبدیل کر کے عوام

کے لیے کھول دیا ہے۔ عوام کو ایک ایک قدم پر اپنے اس وزیراعظم کی یاد آتی ہے۔ جس نے جنگ کے دوران اپنی قوم کی بہترین رہنمائی کی۔ اور شکست کو فتح میں تبدیل کردیا۔ برطانوی قوم کی خدمت دوسرے وزرائے اعظم نے بھی اسی طرح کی ہوگی۔ لیکن چرچل کو ان سب میں اہمیت حاصل ہے۔ اہل برطانیہ ان کی ہر یاد کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔

اپنے محسنوں اور اپنے سیاستدانوں کو اس محبت اور خلوص سے یاد کرکے ہی ملک کی جمہوری اور سیاسی اداروں کو تقویت پہنچائی جاسکتی ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے روشنی کا ایک سرچشمہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

ہم چرچل کی یادیں چارٹ ویل میں چھوڑ کر کچھ اپنے ذہن میں بسا کر رخصت ہورہے ہیں۔

ہیورکیسل میں بے چین روحیں

ایک عشق جس سے انگلینڈ کی بادشاہت کو روم کی بادشاہت کی بالادستی اور دوسری طرف پوپ کی مذہبی برتری سے آزادی مل گئی۔
یہ ہے تاریخ کے اوراق میں چھپا ہوا ایک سچ

چارٹ ویل سے واپسی کا راستہ پہلے سے بھی خوبصورت ہے۔ یوکلپٹس اور دیودار کے پیڑ ہمیں اپنی امان میں لیے منزل کی طرف لے جارہے ہیں۔

کینٹ کی اس دلکش وادی سے ہماری منزل ''ہیورکیسل'' ہے۔ ہیور کا قلعہ جس کی عمر ۷۰۰ برس ہوچکی ہے۔

اس قلعے کا سب سے قدیم حصہ ۱۲۷۰ میں تعمیر ہوا تھا۔ جس کا چوبی پھاٹک بہت بڑا تھا۔ اور اس تک پہنچنے کے لیے لکڑی کے ایک پل کو استعمال کرنا پڑتا تھا۔ دو سو سال بعد ۱۵۰۰ عیسوی میں بولٹن خاندان نے اس میں ٹیوڈور کی روایت کے مطابق حفاظتی چار دیواری کے اندر ہی ایک بڑی رہائش گاہ تعمیر کروائی۔ یہ ایک آرام دہ اضافہ تھا۔ بالآخر ۱۹۰۳ء میں ایک امریکی ولیم والڈورف آسٹر نے اس قلعے کی اہمیت جانی۔ اس نے اس قلعے کو اس کے اردگرد کی ۳۵۰۰ ایکٹرز زمین سمیت خرید لیا۔ اور اس پر لاکھوں ڈالر فراخدلی سے خرچ کرکے اس کی تزئین و آرائش کی۔ بلکہ اس میں کئی قیمتی نوادرات کا اضافہ بھی کیا۔ ٹیوڈور رہائش گاہ کو ایک وسیع وعریض گاؤں میں منتقل کیا جہاں اب تقریباً ۱۰۰ گھر موجود ہیں۔ جہاں ہم مہمان قیام بھی کرسکتے ہیں۔ آسٹر نے آس پاس کے دلدلی علاقے اور جھاڑیوں سے بھرے میدانوں کو صاف کرکے اس کو گل وگلزار کردیا اور جھیلیں بھی تخلیق کیں۔ آج غیر ملکی سیاح یا اہل برطانیہ اس قلعے میں جو کچھ دیکھتے ہیں۔ جو رنگینیاں اور بوقلمونیاں یہاں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ سب آسٹر کے تخیل، تکمیل کے مصمم عزائم اور بے شک پیسے کا کھیل ہے۔

قلعوں میں نہ جانے کتنی رومانی داستانیں سانس لیتی ہیں۔ کتنی سازشوں کے بھیانک کرداروں کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ ان اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے نہ جانے کتنے جیتے جاگتے چمکتے نصیب اچانک ابدی نیند سلادیے جاتے ہیں۔ نہ جانے کتنی عشرت گاہیں ان بلند فصیلوں کے حصار میں تحفظ پاتی رہی ہیں۔ نہ جانے کتنے عقوبت خانے یہاں ہر دور میں انسانی حقوق اور عزتِ نفس کو پامال کرتے رہے ہیں۔

ہیور کے در و دیوار بھی ایسی ہی کہانیاں سناتے ہیں۔ بے گناہوں کے لہو کی بُو اب بھی آپ کا راستہ روک لیتی ہے۔

ہیور کا قلعہ ایک کشادگی کا احساس دلاتا ہے۔ پھر اس کی تصویریں۔ دیواروں پر لگی پینٹنگز صدیوں پرانا فرنیچر اور اس کے اندر گونجتا سناٹا آپ پر ایک دہشت اور ہیبت قائم کردیتا ہے۔

ملکہ این بولین ملکوتی حسن کی مالک تھی۔ اس کا مرمر پیکر نہ جانے کتنے شہزادوں، جاگیرداروں اور بہادروں کو سانس روک لینے پر مجبور کردیتا تھا۔ اس کی بے تاب روح آج بھی اس قلعے کی چار دیواری میں تڑپتی ہوئی گھوم رہی ہے۔ آپ کے کانوں میں

سرگوشیاں کرتی ہے۔ کتنے ظالم ہوتے ہیں یہ اہل اقتدار ایسے پری چہرہ لوگ بھی ان کے ستم کا ہدف بن جاتے ہیں۔ پہلے اس کافر ادا کی زلف کا اسیر اور پھر اس کی گردن مارنے کا حکم دینے والا ایک ہی شخص تھا۔ شاہ ہنری ہشتم۔

شاہ ہنری ہشتم کو شادیوں کا بہت شوق تھا اور شاہ ایران کی طرح ایک وارث کی تلاش تھی۔ این بولین کی بڑی بہن میری ہنری کی مسٹریس تھی۔ لیکن ہنری ۱۸ سالہ این کے حسن کا دیوانہ ہوگیا اور اس نے ہیور قلعے کے پھیرے لگانے شروع کر دیئے۔ یہ ۱۵۲۵ کی بات ہے جب بابر ہندوستان پر فوج کشی کی تیاری کر رہا تھا۔ این بولین کو جب بادشاہ وقت نے شادی کی پیشکش کی تو اس نے جواب دیا کہ بادشاہ کے پاس پہلے سے ایک ملکہ موجود ہے۔ اس لیے میں آپ کی بیوی نہیں بن سکتی اور آپ کی مسٹریس میں بننا نہیں چاہتی۔

اس جواب سے شاہ ہنری اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنی ملکہ کیتھرائن سے شادی منسوخ کرنے کے پروگرام پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ ان کوششوں نے ایک اور تاریخی فیصلے کو جنم دیا۔ جس کے تحت انگلینڈ کی بادشاہت کو روم کی بادشاہت کی بالادستی سے اور دوسری طرف پوپ کی مذہبی قیادت سے آزادی مل گئی۔ کیتھرائن سے شادی کی تنسیخ کے سلسلے میں جب بادشاہ نے اپنے چانسلر ولز سے مشورہ کیا۔ تو اس نے کہا کہ یہ مقدس شہنشاہ روم (اسپین کے کنگ چارلس پنجم) اور پوپ (کلمنٹ ہفتم) کی منظوری کے بغیر ممکن نہیں ہوگا۔ ہنری نے ولز کو نظر انداز کرتے ہوئے اعلان کر دیا کہ کیتھرائن سے ان کی ۱۸ سال تک رہنے والی شادی ہمیشہ ہی غیر قانونی تھی۔ اور اب وہ این سے شادی کرنے جا رہا ہے۔ بے شک کوئی کچھ کہتا رہے۔ تاہم پوپ کے پاس ایک ایلچی بھیجا گیا۔ اس نے ہنری کے ارادوں کو منظوری دینے یا طلاق پر غور کرنے سے انکار کر دیا۔ مقدس شہنشاہ روم نے بھی یہی موقف اختیار کیا کیوں کہ وہ کیتھرائن کا بھتیجا تھا۔

شاہ ہنری نے اپنے دور کا سب سے ڈرامائی اور دور رس قدم اٹھایا۔ اس نے انگلینڈ کو پوپ کے دائرہ اختیار سے مکمل طور پر باہر نکال لیا۔ چرچ آف انگلینڈ (کلیسائے برطانیہ) کی بنیاد ڈالی۔ اور خود اس کا سربراہ بن گیا۔ اور انقلابی مذہبی اصلاحات کا آغاز کر دیا۔ کس خوشی میں اور کس وجہ سے' صرف ہیور کیسل کی چار دیواری میں موجود اپنی محبوبہ این بولین کی محبت کی خاطر۔

یہ ہے تاریخ کے اوراق میں چھپا ہوا سچ! اتنے عظیم فیصلے اور دور رس اقدامات کا محرک ایک عشق تھا۔

۱۵۳۳ء میں این (جو پہلے سے امید سے تھی) اور ہنری کی شادی ہوگئی۔ اگرچہ کیتھرائن سے طلاق کے معاملات نئے قوانین کے تحت طے ہونے میں بھی اس کے بعد چھ ماہ لگ گئے۔ این بولین نے اپنی نئی شناخت اور وقار کی خاطر اب این یولین کہلوانا پسند کیا۔ یکم جون ۱۵۳۳ء کو ویسٹ منسٹر ایبے میں این کی ملکہ انگلستان کی حیثیت سے تاجپوشی کی رسم ادا کی گئی۔ ۷ ستمبر کو اس کے ہاں ولادت ہوئی۔ لیکن شومئی قسمت کہ ہنری اور ملک بھر کی خواہشات کے برعکس یہ بیٹی تھی۔ جس کے مقدر میں ملکہ الزبتھ اول بننا لکھا تھا۔ این کو ملکہ بننا تو میسر آ گیا۔ لیکن خوشیاں اس کی قسمت میں نہیں لکھی تھیں۔ ایک کے بعد ایک مصیبت آتی چلی گئی۔ ۱۵۳۴ء میں حمل گر گیا۔ پھر ایک مردہ بیٹا ہوا اور بالآخر ایک اور اسقاط حمل ' ہنری ہر قیمت پر ایک بیٹے کا خواہش مند تھا اس لیے اس نے قوانین تک بدل ڈالے تھے۔ اپنی روح گروی رکھ دی تھی۔ انگلینڈ کی روح بھی اس نے رہن رکھ دی تھی۔ پھر اس کی مایوسی وحشت میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ شادی کے چوتھے سال دو مئی ۱۵۳۶ء کو این پر مختلف الزامات عائد کر کے حراست میں لے لیا گیا اور ٹاور آف لندن میں قید کر دیا گیا۔ اس پر غداری کا الزام بھی تراشا گیا اور پانچ افراد کے ساتھ ناجائز تعلقات کے جرم کا مرتکب قرار دیا۔ ان افراد میں این کا بھائی جارج لارڈ وس فورڈ بھی شامل

تھا۔ این نے بادشاہ کی محبت بھی دیکھی۔ اب اس کا قہر بھی اس نے دیکھا۔ دو ہفتے تک ایک عدالت نے سماعت کی (تیز رفتار سماعت کی عدالتیں اس وقت بھی تھیں) اس کی گردن اتارنے کے لیے ایک جلاد کو خاص طور پر فرانس سے بلوایا گیا۔ ایک ہزار دن پورے ہوگئے تھے۔ شاہ ہنری نے فوراً ہی جین سیمور سے شادی کرلی۔ جو این بولین کی سیکریٹری تھی۔

ہنری کی چھ بیگمات کے بارے میں عوام میں یہ گیت زبان زد تھا۔

طلاق ہوئی، کیتھرائن آف آرگان کو۔
سر قلم ہوا این بولین کا
اپنی موت مری، جین سیمور
طلاق ہوئی این آف کلیوز کو
سر قلم ہوا، کیتھرائن ہارورڈ کا
بچ گئی کیتھرائن پار

ہیور کیسل بعد میں شاہ ہنری نے ۱۵۴۰ء میں بدقسمت این آف کلیوز کے نام کر دیا۔ این آف کلیوز





برطانوی تاریخ کی عظیم سیاسی شخصیت سر ونسٹن چرچل اپنی جوانی اور بڑھاپے میں

سے سیاسی بنیادوں پر کی جانے والی شادی سیاسی حالات بدل جانے پر طلاق پر منتج ہوئی۔ بعد میں مزید سترہ سال تک این آف کلیوز اس قلعے کی مالک رہی۔

۱۵۵۷ء میں این آف کلیوز کی موت کے بعد والڈی گریوز کے خاندان نے ہیور کیسل کو خرید لیا۔ اس خاندان کے لیے یہ قلعہ خوش بختی کا باعث بنا اور وہ ۱۶۰ سال تک اس کے مالک رہے۔ ۱۶۴۲ء میں سر ایڈورڈ والڈی گریو کو ہیور کیسل کے بیرن کا خطاب ملا۔ انھوں نے ۱۷۰۰ء میں اسے فروخت کردیا۔ مختلف خاندانوں کے ہاتھوں میں اس کی ملکیت منتقل ہوتی رہی۔ تاآنکہ ۱۹۰۳ء میں ولیم والڈرف آسٹر اس کی تقدیر بدلنے آگئے۔ اس خاندان کو خاک سے عرش پر پہنچنا نصیب ہوا۔ ۱۷۸۳ء میں ایک قصائی کا بیٹا جان جیکب آسٹر جرمنی کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے نکل کر امریکہ چلا گیا۔ جہاں اس نے جانوروں کی کھالیں بیچنے کا کاروبار شروع کردیا۔ قسمت نے اس کا ساتھ دیا۔ صدی کے آخر میں تجارتی بحری جہازوں کا ایک فلیٹ اس کی ملکیت میں تھا۔ ۱۸۴۶ء میں وہ امریکہ کا امیر ترین آدمی تھا۔ ولیم والڈروف جیکب کا پڑپوتا تھا۔ وہ یورپ کی محبت کا اسیر تھا۔ ۱۸۸۲ء سے ۱۸۸۵ء تک وہ اٹلی میں امریکی سفیر رہا۔ یہاں یورپ سے اس کی محبت میں اور شدت آگئی۔ ۱۸۹۰ء میں وہ یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ امریکہ شریف آدمیوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے، اس سے ظاہر ہے کہ اس کے ہم وطنوں نے اسے ناپسند کیا۔ پھر وہ اپنے ساتھ ایک ملین ڈالر

بھی لے آیا تھا۔ جو اس زمانے کے اعتبار سے اور آج کے لحاظ سے بھی بڑی رقم تھی۔ اس نے امریکہ کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہا اور انگلینڈ چلا آیا۔ جہاں اس نے شہرت حاصل کی اور اپنے آپ کو مکمل انگلینڈ کے لیے وقف کردیا۔ ۱۸۹۳ء میں اس نے ویسٹ منسٹر سے کلیوڈن کا سودا کیا۔ اور دس سال بعد میڈے والڈوز خاندان سے ہیور کیسل خرید لیا۔

ہیور کیسل آج جو کچھ ہے وہ آسٹر کی محبت، خیال آرائی اور دولت کے خرچ کا اظہار ہے۔ ۱۹۸۱ء تک آسٹر خاندان نے اس قلعے کو دنیا بھر کے تاریخی نوادرات سے، تحائف سے قالینوں سے معمور کیا۔ وہ دنیا بھر میں گھومتے تھے۔ انتہائی تاریخی اور قیمتی اشیاء ڈھونڈتے تھے۔ اور انھیں ہیور کیسل کی زینت بناتے تھے۔

۱۹۸۱ء میں آسٹر خاندان نے ہیور کیسل کو بیچنے کا فیصلہ کیا۔ یارک شائر کی ایک پرائیویٹ کمپنی براڈ لینڈ پراپرٹیز لمیٹڈ نے اسے ۱۹۸۳ء میں تمام باغات اور ملحقہ زمینوں سمیت خرید لیا، اب یہ انھی کی تحویل میں ہے اور وہ اسے عوام کے لیے کھولے رکھنے کے فیصلے پر قائم ہیں۔

ہیور قلعے کی یہ روداد برطانیہ کے اکثر قلعوں کی روداد ہے۔ مختلف خاندانوں نے ان روایاتی عمارات کو اپنے سرمایے اور شوق سے محفوظ رکھا ہے اور انھیں تاریخ کے اوراق میں تبدیل کردیا ہے۔

اب آیئے آپ کو جلدی جلدی یہ قلعہ دکھا بھی دیں۔ جہاں این بولین کی روح کی سسکیاں اب بھی سنائی دیتی ہیں۔ لکڑی کے پل کو عبور کرکے لکڑی کے ایک دیوہیکل پھاٹک اور انتہائی کشادہ ڈیوڑھی سے ہوتے ہوئے جب اندر داخل ہوتے ہیں تو تیرھویں اور پندرھویں صدی دونوں کی دیواریں موجود ہیں۔ یہ ڈرائنگ روم ہے۔ دیواروں پر لکڑی کی حاشیہ آرائی ہے۔ ڈرائنگ روم کے فرنیچر کے ڈیزائنوں میں مختلف صدیاں اپنی جھلک دکھا رہی ہیں۔ اب بھی ایک ایک کرسی، ایک ایک صوفہ گلدان اس احتیاط سے قرینے میں رکھے ہوئے ہیں۔ جیسے بادشاہ سلامت اپنی ملکہ کی کمر میں ہاتھ ڈالے ابھی تشریف لانے والے ہیں۔ فرنیچر چمک رہا ہے۔ گلدانوں میں پھول تروتازہ ہیں۔

ڈرائنگ روم سے آگے سیڑھیوں پر ایک مختصری گیلری ہے۔ جہاں نامور آرٹسٹوں کے بنائے ہوئے شاہ ہنری ہشتم، این بولین کی بہن میری، ایڈورڈ ششم، اسپین کے فلوپ دوم ہیں۔ انھی میں خود ہیور کیسل کی خوب صورت پینٹنگز بھی ہیں۔

داخلہ ہال میں سے ہوتے ہوئے جب اس قلعے کے ڈائننگ روم میں داخل ہوتے ہیں تو اس کی شان وشوکت دیکھ کر قدم رک جاتے ہیں۔ یہاں لکڑی پر نقاشی چھت' دیوار گیر حاشیہ آرائی ایک طرف پوری دیوار کو چھپائے ہوئے ایک قالین جس پر شکار کا منظر کڑھا ہوا ہے۔ یہ قالین تبریز ایران کا بنایا ہوا ہے۔

ڈائننگ ہال کی نشستیں میز سب ہی ایک شکوہ اور ایک وقار کی علامت ہیں۔ ۷ افٹ طویل ڈائننگ ٹیبل ۱۶۰۰ء کی ہے۔ ڈائننگ ہال کے تالے شاہ ہنری ہفتم کے تالوں کی نقل بمطابق اصل ہیں۔ یہ تالے ہنری جہاں جاتا اپنے ساتھ لے کر جاتا تھا۔ وہ اپنے ذاتی تالا ساز کو ساتھ رکھتا تھا اور جہاں بھی بادشاہ کو آرام کرنا ہوتا اس کمرے کے تالے یہی تالا ساز نصب کردیتا تھا۔ یہ اس زمانے کی سیکیورٹی کے اقدامات کا ضروری حصہ تھا۔

قلعے کی لائبریری بڑھئی کے کمال فن کا مظہر ہے۔ برطانیہ میں یہ سب سے بہتر دراز سازی ہے۔ لکڑی پر تراش خراش کا عمل انتہائی خوب صورت ہے۔ ۲۵۰۰ء کتابیں مراکش کے چمڑے کی جلدوں میں ہیں۔ لائبریری میں کرمان کے دو ایرانی قالین بھی مرکز نگاہ بنتے ہیں۔

یہ صبح کا کمرہ ہے۔ جہاں سورج کی پہلی کرنیں براہ راست در آتی ہیں۔ یہاں مصنوعی روشنی کی ضرورت نہیں رہتی۔ تین ٹانگوں والی کرسیاں یہاں کی ایک خاص دلچسپی ہیں۔ یہ اسکینڈے نیویا سے آئی ہوئی دیودار کی لکڑی سے بنی ہیں۔ دلکش میزیں

بھی سترھویں صدی کی ہیں۔
یہ ہے اس مظلوم خاتون این بولین کی خواب گاہ جو بچپن سے ہی اس کی تمناؤں اور خوابوں کا مرکز تھی۔ یہ اس کا اپنا کمرہ تھا۔ یہیں اس نے بلندیوں تک پہنچنے کے خواب دیکھے، ملکہ بننے کی تمنا کی۔ پھر وہ ملکہ کی حیثیت سے یہاں رونق افروز بھی رہی۔ جب شاہ ہنری اس کی ایک جنبش نظر پہ ملک کا آئین بدل دیتا تھا۔ اس کمرے میں اس کی خوب صورت تصویریں آویزاں ہیں۔ شیشے کے ایک بکس میں اس کی دعاؤں کی کتاب محفوظ ہے۔ این یہ کتاب ہمیشہ اپنے پاس رکھتی تھی۔ وہ اسے اپنی گردن زنی کے وقت بھی ساتھ لے گئی تھی۔ اس پر اس کے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا ہے۔
جب آپ دعا کریں تو مجھے ضرور یاد رکھیں۔
امید ہی ایک دن سے دوسرے دن کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔
اس خواب گاہ کی ایک ایک چیز سے ایک حسرت ٹپکتی ہے۔ یاد ایام عشرت فانی، ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے، دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے۔
اس کے بعد ایک برآمدہ این آف کلیوز کے کمرے کی طرف لے جاتا ہے۔
سیڑھیوں پر گیلری میں بھی پورٹریٹ اور پینٹنگز اپنی طرف بلاتی ہیں۔
روشفورڈ روم این بولین کے بھائی کی یاد دلاتا ہے۔ جس کا سر این بولین سے بھی پہلے قلم کر دیا گیا تھا۔ شاہ ہنری نے این بولین پر یہ تہمت بھی لگائی تھی کہ اس کے اپنے بھائی سے بھی ناجائز تعلقات تھے۔
یہ قلعہ این بولین کے خاندان کا ہی تھا۔ شاہ ہنری تو این کے عشق میں یہاں کے پھیرے لگایا کرتا تھا۔
ستم ظریفی دیکھیے کہ روشفورڈ روم کے ساتھ ہی ہنری ہشتم کا کمرہ ہے۔ قاتل مقتول دیوار بہ دیوار شاہ ہنری کے کمرے کی چھت اور لکڑی کے حاشیے ۱۴۶۲ء اور ۱۵۶۵ء کے ہیں۔
لانگ گیلری میں شاہ ہنری اور این بولین کے دور رفاقت کی تلخ وشیریں یادوں پر مبنی قدم آدم پینٹنگز ہیں۔ یہ ایک طرح سے نمائش ہے اس دور کی۔ شادمانی اور مسرت کے مناظر میں سے ہوتے ہوئے سیاح این، اس کے بھائیوں اور دوستوں کی سزائے موت اور اس پر عملدرآمد کے بھیانک مناظر بھی دیکھتے ہیں۔ این بولین کے عروج وزوال کی کہانی، مسکراہٹوں، قہقہوں اور سسکیوں کی کہانی۔
یہاں آسٹر خاندان نے اپنی چار نسلوں کی میراث بھی نمائش کے لیے رکھی ہوئی ہے۔ جن میں اہم شخصیتوں کے خطوط اور تحائف بھی شامل ہیں۔ قلعے کی موجودہ مالک کمپنی نے ان اہم سوغاتوں کے لیے آسٹر خاندان کا شکریہ بھی ادا کیا ہے۔
آسٹر خاندان کے وارثوں کی نمائش کے بعد ۱۲۷۰ء کے اصل آہنی پھاٹکوں سے گزرتے ہوئے قلعے کا اسلحہ خانہ آ جاتا ہے۔ یہ برطانیہ کے چند


چارٹ ویل میں واقع چرچل کی رہائش گاہ، جو سیاحوں کے لیے آج بھی طلسم کدہ ہے

اہم اسلحہ میوزیم میں سے ہے۔
تنگ سی سیڑھیوں سے ہوتے ہوئے آپ کے سامنے قلعے کا عقوبت خانہ آجاتا ہے۔ ٹیلی ویژن پر کراچی کے جو عقوبت خانے دکھائے گئے تھے۔ یہاں ان کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ انسان نے انسان کو ایذائیں پہنچانے کے لیے کیسے کیسے خوفناک آلات ایجاد کیے ہیں۔ اس عقوبت خانے کا نام کونسل چیمبر ہے۔ جو پہلے سرکاری میٹنگوں او رفیصلوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ ٹوڈور کے زمانے میں ٹیوڈور رہائش گاہ اور گاؤں بنانے سے پہلے یہ قلعے کا مرکزی حصہ بھی تھا جہاں اہلِ خانہ زیادہ شامیں گزارتے تھے۔
اب کونسل چیمبر میں تشدد وایذا رسانی کے آلات رکھے گئے ہیں۔ ان سے باغیوں اور سرکشوں کو نظم وضبط اور سبق بھی سکھایا جاتا تھا۔ ان میں انگلیوں کو توڑ دینے والے شکنجے بھی ہیں۔ زنجیروں میں بندھے پتھر بھی۔ جن سے سرکشوں کو باندھ کر لٹکا جاتا تھا۔ پیروں اور ٹانگوں میں کسے جانے والے شکنجے بھی ہیں۔ چہرہ چھپانے والے نقاب بھی۔ چھوٹے خنجر، کلہاڑی ڈرلنگ مشین، پاؤں میں کسا جانے والا شکنجہ اور اس کی زنجیر اور اسی طرح کے دیگر شرمناک آلات۔
بادشاہتیں اسی طرح چلتی تھیں۔ کتنے ہی باغیوں اور سرکشوں کو اذیتیں پہنچا پہنچا کر اپنے حق میں قائل کیا جاتا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا یہ خطرناک اور دل ہلا دینے والے آلات اگر انسان کو جھکنے پر مجبور نہ کرسکتے، تو پھر اسے موت کی نیند سلادیا جاتا۔
یہ عقوبت خانہ انسانوں کے لیے ایک مقام عبرت ہے کہ انسان انسان سے کس طرح انتقام لیتا ہے، دوسرے کی بے بسی سے کس طرح فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔
حضرت انسان اپنے ہی ساتھی انسانوں کو اذیت میں چیختا چلاتا کراہتا دیکھ کر کتنا خوش ہوتا ہے۔ کتنی تسکین پاتا ہے۔ ان قلعوں کے اندر انسانوں پر یہ ظلم توڑے جاتے ہیں۔ انسانوں کی خواہشات کا خون کیا جاتا ہے۔ عزت اور وقار کو پامال کیا جاتا ہے۔ لیکن باہر وسیع وعریض سبزہ زار ہیں۔ پھولوں بھری روشیں ہیں۔ دور دور تک پھیلے پیڑوں کے چھتنار ہیں، جھیلیں ہیں۔ باہر اجالے ہیں۔ اندر اندھیرے ہیں۔
ہور کیسل میں ہم نے دو گھنٹے ہی گزارے ہیں۔ لیکن یوں محسوس ہورہا ہے کہ ہم صدیاں گزار آئے ہیں۔ یا صدیاں ہم میں سے گزر گئی ہیں۔ ہم آئے تو ہلکی ہلکی بارش ہورہی تھی۔ مگر اب مطلع صاف ہوگیا ہے۔ بادل چھٹ گئے ہیں۔ موسم کھل گیا ہے۔

زیرزمین ٹرینوں میں ناول

یہ دنیا کی سب سے بڑی شہری ریلوے ہے۔ جو گریٹر لندن اور اس کے اردگرد ۲۷۳ ا سٹیشنوں سے مسافر اٹھاتی اور تارتی ہے۔
۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۱ء کے درمیان ۷۷ کروڑ سے زیادہ سفر کیے گئے۔

لندن واپسی کا سفر ان ہی خوبصورت وادیوں میں سے ہے۔ جہاں آنکھوں کو طراوت ملتی ہے۔ حسنِ فطرت نگاہوں کو مالا مال کرتا ہے۔
میل اور کیٹی کی باتیں ختم ہونے میں نہیں آرہی ہیں۔ لگتا ہے کہ وہ برسوں بعد ملے ہیں۔ اور شاید پھر برسوں بعد ملیں۔ اس لیے وہ آج ہی سب موضوعات کا احاطہ کرلینا چاہتے ہیں۔
آج برٹش ٹورسٹ اتھارٹی کی میزبان کا دن غروب ہورہا ہے۔ پھر صرف ایک رات۔ ''آج رات کا کھانا کھائیں گے''
''کھانا یورپین ہونا چاہیے، یہ سب کی رائے ہے۔''
کیٹی ہمیں کمینڈن لے جانے کا فیصلہ کرتی ہے۔ چھوٹا سا خوبصورت ریستوراں۔ ایرانیوں کے ہوٹلوں جیسا۔ میزبان خواتین حسن وجمال کا پیکر۔
یہ ریستوران یونانی کھانوں کے لیے مشہور ہے۔

برطانیہ میں کیا ہو رہا ہے۔ ناول کون سا اچھا ہے سب سے۔ شاعری۔ متحدہ یورپ۔

میزبان خواتین کی آواز اور مسکراہٹ بار بار گفتگو منقطع کر دیتی ہے۔

کیٹی کے اپارٹمنٹ میں پاکستانی خاندان کرائے پر رہتے ہیں۔ اس کی پراپرٹی ایجنٹ ایک ایشیائی خاتون ہے۔ خوبصورت سروقامت سندھ سے آنے والے زمیندار، اپارٹمنٹ سے زیادہ پراپرٹی ایجنٹ میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ سندھ کے کھلے کھلے قمیضوں اور شلواروں کے لیے اس نے بڑی خوبصورت ترکیب استعمال کی ہے۔ Floating Drsses تیرتے ہوئے یا لہراتے ہوئے لباس۔ ایک اور طویل دن اپنے انجام پر ہے۔

رات خاصی بھیگ چکی ہے۔ اتوار کی رات۔

آج چھٹیاں ختم ہو جائیں گی۔ کل صبح سے برطانیہ کے لوگ پھر مشین کا پرزہ بن جائیں گے۔ پانچ روز تک مشینیں رواں رہیں گی، پرزے گھومتے رہیں گے۔

برٹش ٹورسٹ اتھارٹی کی میزبانی ختم ہو گئی ہے۔

ہمارے کچھ ساتھی وطن واپس جا رہے ہیں۔ کیٹی انھیں لینے آئی ہیں۔

آج وہ رات تک وطن واپس پہنچ جائیں گے۔

ہمیں سات دن اب اپنے طور پر رہنا ہے۔ دیکھنا ہے پاکستانی کیسے رہتے ہیں۔

ناشتے پر انتظار نہیں ہے، جو اتوار کی صبح تھا۔ اکثر سیاح واپس جا چکے ہیں۔ آج جلدی جگہ مل گئی ہے۔ آج کی میزبان خاتون کافی ''ہتھ چھٹ'' ہے۔ پوچھنے آئی ہے۔ ناشتے میں کیا چاہیے۔ تو کندھے پر ہاتھ مار رہی ہے۔ پانی رکھنے آئی ہے۔ تو گال تھپتھپا رہی ہے۔



چارٹ ویل گارڈن کا ایک دلربا نظارہ

''تمہارا نام کیا ہے حسین خاتون۔''

''کیوں مذاق کرتے ہیں''

''نہیں تم بہت گریس فل ہو۔''

اب دوسری گال پر بھی ہاتھ۔

ناشتے میں سب سے اہم کوشش ہوتی ہے۔ بیکن اور ہیم سے بچنے کی۔ لیکن اب کوشش ہے اس حسین خاتون سے بچنے کی۔ وہ آملیٹ وغیرہ لے کر آئی ہے۔ تو اس کے ہاتھ میں شفقت کچھ زیادہ ہی وزنی ہو گئی ہے۔ لطف اٹھائیے ناشتے کا۔ اور یہ میرے ہاتھ کا بُرا نہ مانیے۔ اسے عادت ہے خود بخود اٹھنے کی۔

باہر لابی میں کیٹی ہماری منتظر ہے۔ عظمت انصاری اور خالد عزیز واپس پاکستان جا رہے ہیں، فاروق معین لیڈز جا رہے ہیں۔ میں اور مجید عباسی ایک ہفتہ مزید ٹھہریں گے۔

اسلام آباد میں اچانک ہماری ملاقات جام معشوق علی کے ہاں گوگی سے ہوگئی تھی۔ جن کا یہاں لندن میں کاروبار ہے۔ انھوں نے اپنے ہاں قیام کی پیشکش کردی تھی۔ جس سے انکار کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔

گوگی کے اسٹاف میں سے ناصر اور سی ہمیں لینے آرہے ہیں۔

وائٹ ہاؤس ہوٹل۔ الوداع۔

ملائیشیا۔ اور رویت نام الوداع۔

برٹش ٹورسٹ اتھارٹی الوداع۔

اب ہماری منزل اسٹاک ویل ہے۔ سردیاں آنے والی ہیں۔ برف باری بھی ان کے بہت زیادہ متوقع ہے۔ اس لیے ''اسٹاک ویل'' چیزیں اچھی طرح جمع کرلو۔ ہمیں بھی پاکستان لے جانے کے لیے چیزیں اچھی طرح جمع کرلینی چاہئیں لیکن اس کے لیے ڈالر چاہئیں۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ مجھے یادیں جمع کرلینی چاہئیں۔ برٹش ایرویز کی دیسی اور بدیسی ائیر ہوسٹسوں کی۔ مانچسٹر کے تاریخی اوراق کی، بریڈفورڈ کی ماریا اور سارہ کی، کیمین اور نارمن گھوڑوں کی۔ اسٹاک اون ٹرینٹ کی مارگریٹ کی۔ سوسن اور جیلی کی۔ آلٹن ٹاورز کے عجائبات اور بھوت گھر کی۔

ناصر گاڑی دوڑا رہا ہے۔ ''کیسا رہا سفر۔ انگلینڈ کیسا لگا۔ آپ نے تو بہت کچھ دیکھ لیا۔ اتنے دنوں میں۔

ان کے سوالات کے جوابات مجید عباسی دے رہے ہیں۔ میں تو گزشتہ چند دنوں کی یادوں میں کھویا ہوا ہوں۔

وہی جانے پہچانے راستے۔

کل ان ہی راستوں سے کیٹی ہمیں کینٹ لے گئی تھی۔ جہاں چرچل کا گھر ہے۔ جہاں ہیور کیسل ہے۔

آج پیر ہے۔ ہفتے کا پہلا ورکنگ ڈے۔ اس لیے ٹریفک عروج پر ہے۔ لندن سانس لے رہا ہے۔ لندن بھاگ رہا ہے۔ لندن شاپنگ کر رہا ہے۔

یہ ہے جی گوگی صاحب کی ایک شاپ۔ اس چھوٹی سی دکان میں کھانے پینے کی تمام اشیاء دستیاب ہیں۔ کاؤنٹر پر سرور موجود ہے۔ یہ سعودی عرب سے یہاں آئے تھے۔ ایک ایک کپ گرم چائے۔ اسٹاک ویل۔ بن فیلڈ روڈ۔ سٹرڈوک کورٹ۔

یہاں ہمیں چھ راتیں گزارنی ہیں۔ یہ تنہا لوگوں کا فلیٹ ہے۔ اس لیے ترتیب میں بھی بے ترتیبی ہے۔ اور بے ترتیبی میں بھی ایک ترتیب ہے۔ زندگی یہی ہے۔ جانے کتنے ہزاروں لوگ پاکستانی اس طرح زندگی گزارتے ہوں گے۔ اور اپنے وطن کو یاد کرتے ہوں گے۔

''اس سال پاکستان ضرور جاؤں گا۔''

''دو سال پہلے گیا تھا۔ اب کے فرصت ہی نہیں ملی۔''

''اب سرور ہمارے ساتھ ہیں۔''

''آپ جھنگ والے محمود شام ہیں۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ وہ 'جنگ' اخبار کا حوالہ دے رہے ہیں۔''

''میں اب صرف اخبار میں کالم لکھتا ہوں۔ اب 'جنگ' سے میرا باقاعدہ تعلق نہیں ہے۔''

''میرا مطلب ہے جھنگ مگھیانہ سے۔''

''اوہ۔ بالکل یقیناً۔''

''آپ کو کیسے علم ہے۔''

''میں بھی جھنگ شہر سے تعلق رکھتا ہوں۔''

''کس وارڈ سے۔''

''ہمارا گھر وارڈ نمبر ۸ میں ہے۔''

''بڑی خوشی ہوئی سرور تم سے مل کر۔ جھنگ کب چھوڑ دیا تھا۔''

''مجھے چھ سات سال ہوگئے ہیں جی۔ پہلے سعودی عرب میں محنت مزدوری کی۔ پھر گوگی بھائی جان نے یہاں بلالیا۔''

''یہاں کیسا لگتا ہے۔''

''اللہ کا شکر ہے جی۔ اپنا کام ہے۔ اچھا وقت

پاس ہو جاتا ہے۔''

''گھر کی یاد ستاتی ہے۔''

''بہت۔''

''پھر کیا کرتے ہو۔''

''پنجابی گانے سنتا ہوں۔ ہیر وارث شاہ پڑھنے لگتا ہوں۔''

''لو جی یہ ریلوے اسٹیشن آ گیا۔ آپ دونوں کے ایک ایک ہفتے کی ٹریول پاس بنا لیتے ہیں۔''

''دو دو تصویریں پلیز''

اسٹاک ویل ریلوے اسٹیشن کی کھڑکی پر موجود سیاہ فام خاتون کی آواز ہے۔

یہ ہے ٹریول پاس لندن اور مضافات میں کسی بھی ٹرین سے، کسی بھی بس سے جہاں چاہے سفر کیجیے۔ یہی پاس چلے گا۔

اب ہمیں لندن کی سیاحت پر اپنے طور پر نکلنا ہے۔

دوست بہت ہیں اس شہر میں، جاننے والے بھی بہت ہیں۔ لیکن ہمیں اجنبی بن کے لندن میں آوارگی کرنا ہے۔ لندن کو ایک بار پھر دریافت کرنا ہے۔ اسٹاک ویل ریلوے اسٹیشن ہماری عارضی قیام گاہ سے چند قدم کے فاصلے پر ہے۔

پہلے لندن کے عین قلب میں پکاڈلی۔ جس نے پکاڈلی نہیں دیکھی۔ لندن نہیں دیکھا۔ پکاڈلی کے نیون سائین کبھی دنیا بھر میں منفرد اور پرکشش تھے۔ عالمی سیاح یہاں آ کر پہروں گھومتے تھے۔ انھیں صرف نیون سائن ہی نہیں اور بہت سی دلچسپیاں یہاں کھینچ لاتی تھیں۔

لندن کی زیر زمین ریلوے۔ انسان کے تخیل۔ اور تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار ہے۔ زندگی کو آسان سے آسان تر بنانے کی ایک اور کامیاب کوشش۔

اسٹاک ویل سے ہمیں پکاڈلی پہنچنا ہے۔ آسمانی رنگ کی لائن ہمیں منزلِ مقصود پر لے جائے گی۔ جسے وکٹوریہ لائن کہتے ہیں۔ لندن میں ایشیائی لاکھوں کی تعداد میں ہیں جن میں پڑھے لکھے بھی نہیں ہوتے ہیں۔ خاص طور پر انگریزی سے اکثر ناآشنا ہوتے ہیں۔ اس لیے ان لائنوں کے ناموں کے ساتھ ساتھ مختلف رنگ بھی مختص کر دیے گئے ہیں۔ تاکہ راستوں کی شناخت میں کوئی مشکل نہ ہو۔



چارٹ ویل گارڈن کا دل موہ لینے والا منظر

ریلوے اسٹیشن پر بہت سے پلیٹ فارم ہیں۔ اوپر سے ہی آپ کو پتا چلتا رہتا ہے کہ کس طرف جانا ہے۔ ہر جگہ واضح نشانات ہیں۔ اشارے ہیں۔ داخلے کے ٹرمینل پر اپنا پاس خودکار مشین کے حوالے کرتے ہیں۔ راستہ کھل جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی پاس مشین میں سے ہوتا ہوا اگلے سوراخ سے باہر برآمد ہو جاتا ہے۔ تیز رفتار سیڑھیاں زیر زمین لے جاتی ہیں۔ پلیٹ فارم پر برقی بورڈ اعلان کر رہے ہیں۔ پکاڈلی کے لیے گاڑی آئندہ سات منٹ میں پہنچ رہی ہے۔ پلیٹ فارم مسافروں سے بھرے ہیں۔ اس علاقے میں شاید سیاہ فام اور ایشیائی زیادہ تعداد میں رہتے ہیں۔ پلیٹ فارموں میں ان ہی کی اکثریت ہے۔ کسی کو کسی سے بات کرنے کی فرصت نہیں ہے۔ ٹرین کے انتظار میں کئی نوجوان ناولوں کے مطالعے

میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ان میں خواتین بھی شامل ہیں۔

ہم لندن دریافت کرنے نکلے ہیں۔اس لیے ہر چہرے پر نظر رک جاتی ہے۔ہم ہر چہرے کو پڑھنا چاہتے ہیں۔لیکن یہ خوبصورت چہرے ناول پڑھنے میں مگن ہیں۔

ٹرین آ گئی ہے۔دروازے خود بخود کھل رہے ہیں۔دروازے کے ایک حصے سے اترنے والے اتر رہے ہیں دوسرے حصے سے سوار ہونے والے سوار ہو رہے ہیں۔

ایک دنیا آ رہی ہے۔ایک جا رہی ہے۔

سنہری بالوں والی یہ حسینہ 'بیل جار' پڑھ رہی ہے۔نہ جانے کس کا لکھا ہوا ہے۔انہماک سے ظاہر ہو رہا ہے کہ ناول کی کہانی بہت زیادہ الجھائے رکھنے والی ہے۔ہمیں ابھی بیٹھنے کی جگہ نہیں ملی ہے۔اس لیے پورے کمپارٹمنٹ کا جائزہ لے سکتے ہیں۔سفید فام خواتین کی اکثریت کتابوں میں سر جھکائے ہوئے ہے۔ان میں ناول ہی کچھ زیادہ لگتے ہیں۔

زیر زمین ریلوں کو لندن میں بالعموم ٹیوب کہا جاتا ہے۔جن کا انتظام لندن انڈر گراؤنڈ لمیٹڈ کے ذمے ہے۔جو لندن ریجنل ٹرانسپورٹ کا ایک ذیلی ادارہ ہے۔ٹیوب مسلسل زیر زمین سرنگوں میں سے گزرتی رہتی ہے۔جن کی گہرائی کا اندازہ پلیٹ فارم پر اتر کے اوپر شہر کے متعلقہ حصے تک مختلف سیڑھیاں عبور کرنے سے ہوتا ہے کہ ہم کتنے فٹ زمین کے اندر چلے گئے تھے۔

مجید عباسی کو ایک سیٹ مل گئی ہے۔ایک سیاہ فام حسینہ کے پاس خالی ہوئی ہے۔اس لیے موقع غنیمت جان کر فوراً نشست سنبھالی۔اگر کسی صاحب کے پاس جگہ خالی ہوتی تو وہ میری سنیارٹی کا خیال کرتے ہوئے بڑے احترام سے مجھے بٹھاتے۔

ٹرین کے ہر کمپارٹمنٹ میں پورا روٹ بنا ہوا ہے۔راستے کے اسٹیشنوں کے نام جلی حروف میں لکھے ہیں۔بھٹکنے یا گم ہونے کی گنجائش بہت مشکل ہے۔

''ٹیوب'' یا لندن انڈر گراؤنڈ دنیا کی سب سے پہلی زیر زمین شہری ریلوے ہے۔اس کا آغاز ۱۸۶۳ء میں ہوا تھا۔جب میٹروپولیٹن ریلوے نے پیڈنگٹن اور فیرنگڈن کے درمیان ایک ایک لائن کھولی۔اب یہ دنیا کی سب سے بڑی شہری ریلوے ہے۔جو عظیم تر لندن اور اس کے اردگرد ۲۷۳ اسٹیشنوں سے مسافر اٹھاتی اور اتارتی ہیں۔۱۹۹۰ء کے درمیان ۷۷ کروڑ سے زیادہ سفر کیے گئے۔

گرین پارک آ گیا ہے۔اب یہاں سے ہمیں گہرے نیلے رنگ والی لائن پکاڈلی لائن لینی ہے۔جو ہمیں پکاڈلی تک پہنچائے گی۔صرف ایک اسٹیشن اور لندن انڈر گراؤنڈ کی دوسری لائنیں ہیں بیکر لیو۔(گہرا میرون رنگ) سینٹرل (ہلکا سرخ رنگ) سرکل (پیلی) ڈسٹرکٹ (سبز) ایسٹ لندن (اورنج) ہمیر سمتھ اینڈ سٹی (گلابی) جوبلی (گرے رنگ) نادرن (سیاہ) ڈک لینڈ لائٹ ریلوے (ڈبل نیلی لائن) نیٹ ورک ساؤتھ ایسٹ (گرے رنگ کی ڈبل لائن)

اس وقت ہم پکاڈلی لائن کی ایک ٹیوب پر کھڑے ہیں۔اس میں پہلی ٹرین سے بھی زیادہ رش ہے۔

لندن انڈر گراؤنڈ لمیٹڈ سے ۲۰ ہزار کے قریب ملازمین وابستہ ہیں۔

پکاڈلی ریلوے اسٹیشن پر رنگوں اور خوشبوؤں کا ہجوم ہے۔لیکن سب تیزی سے گزر رہے ہیں۔کسی کو فرصت نہیں ہے۔

''غریب بے گھر کی مدد کرو'' ایک سیاہ فام پلے کارڈ لیے پلیٹ فارم کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہے۔

اسی زیر زمین پلیٹ فارم کے ایک طویل برآمدے میں لمبے لمبے بالوں والے سفید فام نوجوان ایکارڈین لیے کچھ گا رہے ہیں۔ان کے کشکول نیچے رکھے ہوئے ہیں۔ان میں آتے جاتے مسافر پنس یا شلنگ ڈال رہے ہیں۔

انگریزوں کو ہاتھ پھیلائے دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ دنیا پر حکمرانی کرنے والے۔جس سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا اس سے تعلق رکھنے والے بھی

اب کالوں کے سامنے دست طلب دراز کر رہے ہیں۔

سیڑھیوں سے باہر نکلتے ہیں۔ پکاڈلی کے رنگ ہمارے سامنے بکھر گئے ہیں۔ نیون سائن اسی طرح جل بجھ رہے ہیں جیسے برسوں پہلے تھے۔ سب وے (زمین دوز راستے) کے کنارے پر لندن کے سووئنر بیچنے والا بوڑھا آج بھی اسی طرح مصروف ہے۔ مارگریٹ تھیچر نہ اس کے حالات بدل سکی نہ جان میجر۔ روس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے سے بھی اسے کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔

ایک طرف کا راستہ پولیس نے روک رکھا ہے۔ میں اس سوغات بیچنے والے بزرگ سے پوچھتا ہوں۔ کیا ہوا ہے۔

”ابھی ابھی بم پھٹا ہے۔“

”کوئی ہلاکت تو نہیں ہوئی۔“

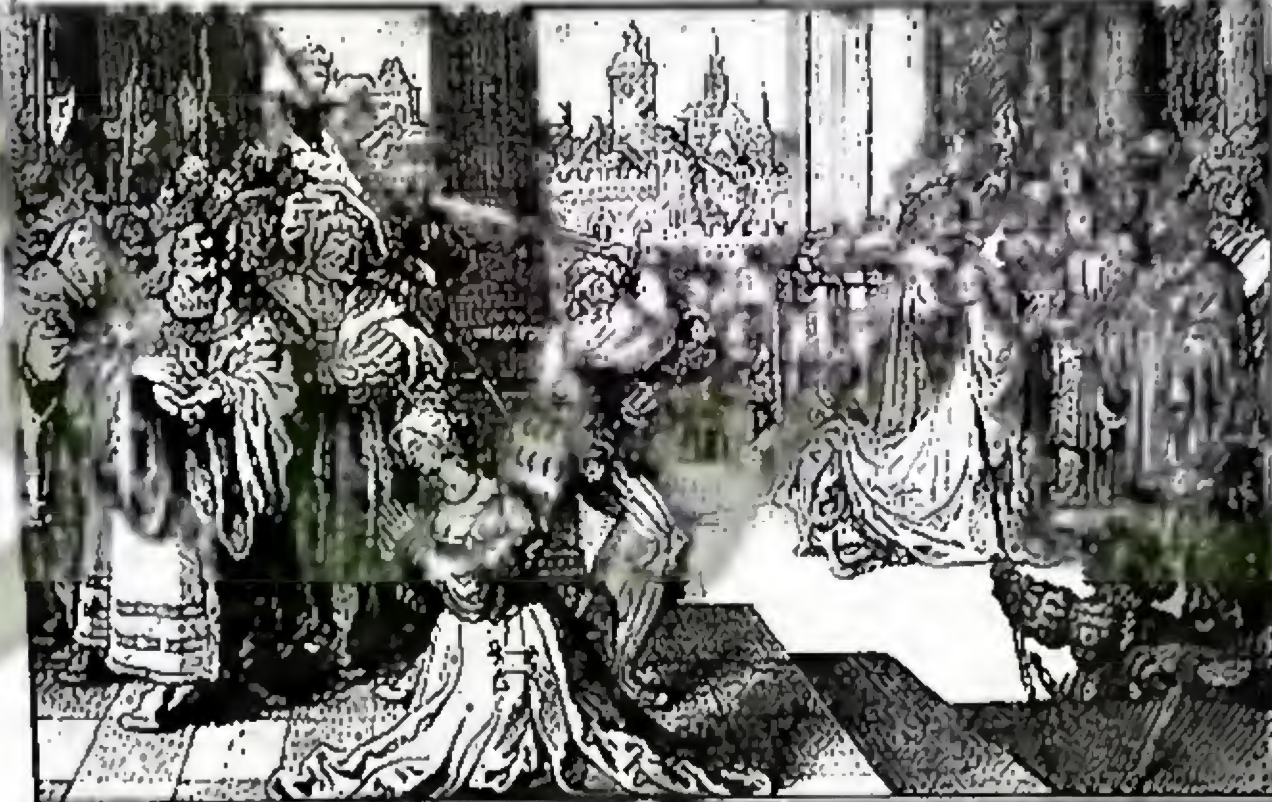
”آئی آر اے والے ایسا نہیں کرتے۔ وہ پہلے سے پولیس کو خبردار کر دیتے ہیں۔“

سائرن بج رہے ہیں۔ پولیس ابھی پہنچ رہی ہے۔ پیلے ٹیپ سے بم دھماکے والے علاقوں کو پولیس نے حصار میں لے رکھا ہے۔ عام تاثر یہ ہے کہ یہ دھماکے کرسمس تک جاری رہیں گے۔ یہ ہر سال کا معمول ہے۔

ہمیں ریجنٹ پیلس پہنچنا ہے۔ ہوٹل کی لابی میں حبیب الرحمن انتظار کر رہے ہوں گے۔

لندن کے وسط میں واقع یہ ہوٹل ۱۳۰۰ سے زیادہ کمرے رکھتا ہے۔ یورپ کے سیاحوں کی بڑی تعداد یہاں ٹھہرنا پسند کرتی ہے کیونکہ یہاں سے شہر کے کسی بھی حصے میں یا شہر کے باہر جانے کے لیے ہر قسم کی ٹرانسپورٹ مل سکتی ہے۔ اگر نہیں گھومنا ہے۔ تب بھی بہت اچھی جگہ ہے۔ سب کچھ پاس موجود ہے۔ شاپنگ کے لیے بھی اور آنکھوں میں نظارے بسانے کے لیے بھی۔

لابی میں بالکل جگہ نہیں ہے۔ ابھی ابھی آنے والے سیاح کمروں کی بکنگ کے انتظار میں ہیں۔ لابی کے علاوہ دوسری جگہ بار ہو سکتی ہے۔ جہاں ملاقات کا وقت دینے والے ملتے ہیں۔ بار بہت وسیع ہے۔ سیلف سروس ہے ٹی وی بھی لگے ہوئے ہیں۔ موسیقی کی دھنیں بلند ہو رہی ہیں۔ ہمیں ٹائیلٹ جانے کی جلدی ہے۔ ٹائیلٹ کا راستہ پوچھ کر وہاں پہنچتے ہیں تو ایک اعلان ہمیں مایوس واپس لوٹنے پر



شاہ ہنری کی ملکہ این بولین کے سر قلم ہونے سے پہلے دربار کا

مجبور کر دیتا ہے۔ سیکیورٹی کی وجہ سے ٹائیلٹ بند ہیں۔ معافی چاہتے ہیں۔ اوپر پہلی منزل پر چلے جائیے۔

ہم کراچی والوں کا امن و امان کی صورت حال تعاقب کرتی رہتی ہے۔ ہم جہاں جاتے ہیں ہنگامے، تخریب کاری ساتھ لے جاتے ہیں۔ بار سے باہر نکلتے ہیں تو حبیب الرحمن صاحب ہوٹل کے مین گیٹ سے آگے دکھائی دیتے ہیں۔

☆☆......☆☆

چرچل کی کالی بطخوں، ہیور کیسل کی بے چین روحوں اور زیر زمین ٹرینوں کی سیر کے بعد اگلے ماہ سوہو کی سرخ روشنی اور برطانیہ کی دیگر دلچسپیوں کا حال ماہ جولائی میں ملاحظہ فرمائیں۔

کارِ جہاں دراز ہے

سنگلاخ دیواروں کے پیچھے سے جرم کی کوکھ میں پل کر مجرم بننے والوں کی عبرت ساماں
دل سوز تحریریں، جن میں آنسوؤں کی نمی بھی ہے اور سسکتی ہوئی زندگی کے نوحے بھی

ایک تھی رابعہ

جاوید راہی

اُس مظلوم پر تو ابھی جوانی بھی پوری نہیں آئی تھی کہ اُسے بھنبھوڑ دیا گیا

احساس کے رنگوں کو ریزہ ریزہ تحلیل ہونے کے عمل کو محسوس کرنے کی ضرورت کو دِل سے چھونے کی جو مٹھاس ذہن کے دریچوں سے تھرکتی ہوئی پورے وجود کو سرشار کرتی، کئی راستوں کی شکل اختیار کرتے قریب سے یوں گزر جائے جیسے بہت سے سوالوں کا بس ایک ہی جواب کہ یہ سب معاشرتی پرابلم ہیں۔ جس طرح عارفانہ مسکراہٹ کے آثار دیکھنے والی آنکھوں کو بھلے لگتے ہیں۔ اس طرح کئی سفاک اور مکار چہروں کی عیارانہ مسکراہٹیں کسی بھی احساس سے عاری دکھائی دیتی ہے۔ رابعہ کی عمر گیارہ بارہ سال ہے۔ معصوم سا مسکراتا چہرہ، روشن آنکھیں، گاؤں سے شہر آئی تھی۔ اپنے والدین کی غربت میں ڈوبی زندگی کا سہارا بنے مگر حالات نے اس کے ہنستے مسکراتے چہرے کے تمام رنگ نوچ کر اُس کے چہرے پر بسنت رُت کی پیلاہٹ بھر دی۔ اس کی روشن آنکھوں کے قمقمے بجھا کر ان کی جگہ گہری تاریکی بھر دی۔ رابعہ رائے رضا حسین کھرل کے گھر رہنے کے لیے آئی۔ گاؤں کی کھلی فضا میں سانس لینے والی شرمیلی سی لڑکی آہستہ آہستہ شہری زندگی سے مانوس ہوتی گئی۔ محلّہ کی اُن شاپس پر جہاں سے وہ گھر کے لیے چھوٹی موٹی چیزیں خریدتی، وہ سب لوگ اُس کی ملنسار عادت کی بنا پر اُس بچی سے شفقت کرتے۔

رابعہ ایک دن گھر سے سودا سلف لینے نکلی اور تمام دن واپس نہ پلٹی۔ رات گئے تک تلاش بیسار کے بعد رائے رضا نے اس واقعے کے بارے میں بتایا کہ ان کی عزیزہ جو اُن کے گھر میں ہی رہتی تھی کو تلاش کرنے سے بعد جو دیگر واقعات درج تھے کہ ان کو چند چشم دید لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ رابعہ کو اُنہوں نے کباب ش ریسوڑنٹ کے دوسری جانب ریلوے لائن کی طرف جاتے دیکھا جہاں تسنیم نامی سکنہ ریشم پورہ اور اس کے ساتھ دو نا معلوم اشخاص موجود تھے۔ جن کے ساتھ رابعہ کو جاتے دیکھا گیا۔ بتانے والوں نے بتایا کہ وہ عورت اچھے کردار کی مالک نہیں لگتی تھی۔ کیونکہ وہ شہر کی بدنام عورتوں میں شمار ہوتی تھی۔

انسپکٹر عزیز احمد چیمہ نے اُس بدنصیب رابی کو تلاش کرنے کا بیڑہ اُٹھاتے ہوئے ایک ٹیم تیار کی اور تسنیم زوجہ اسلم کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔

اس کو حراست میں لے کر مختلف اڈوں سے اُس اغوا برائے زناکاری کے دیگر ملزمان کو قابو کیا اور معلوم ہوا رابی کو اغوا کرنے کے بعد ریشم پورہ، حسین کالونی رکھا گیا تھا، جہاں اس معصوم اور کم سن بچی پر ظلم کے پہاڑ

ٹوٹتے رہے۔ دورانِ تفتیش اغوا کاروں کی زبانی معلوم ہوا کہ رابعہ تسنیم کی بیٹی عائشہ عرف عاشی جو ملتان میں اپنے خاوند کی سرپرستی میں قحبہ خانہ چلاتی تھی رابعہ اُس کے پاس حبس بے جا میں ہے۔

پولیس پارٹی تعاقب کرتی ملتان پہنچ گئی۔ عاشی کو اطلاع ہو گئی اُس نے رابعہ کو اپنے اڈے سے نکال کر اپنے خاوند کی تحویل میں دے دیا، جو کئی گھنٹے تک اُسے موٹر سائیکل پر لیے ملتان کی سڑکوں پر سرگرداں رہا۔

پولیس پارٹی اور رائے رضا حسین مایوسی کے عالم میں ایک جگہ کھڑے تھے کہ اچانک رائے کی نظر رابعہ پر پڑی جو عاشی کے خاوند کی موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھی قریب سے گزر رہی تھی۔ انہوں نے انسپکٹر چیمہ کو خبردار کیا موٹر سائیکل کا پیچھا کرتے پولیس پارٹی نے اُسے موقع پر دبوچتے رابعہ کو اُس کے قبضہ سے چھڑا لیا۔

رابعہ کی نگاہ رائے صاحب پر پڑی تو وہ تڑپ کر ان سے لپٹ گئی۔ اجڑا بکھرا روپ معصومیت سے عاری چہرہ، لرزتی کانپتی وہ دھان پان سی بچی سہمے ہوئے انداز میں پولیس اور رائے رضا کے سائبان کی چھت نیچے یوں بیٹھی تھی جیسے وہ صدیوں کا سفر کرتے کرتے کسی گھنے سایہ دار درخت کی چھاؤں میں آن بیٹھی ہو۔

انسپکٹر عزیز احمد چیمہ نے عاشی سمیت اس کے ساتھیوں کو ملتان سے اُٹھایا اور واپس اپنے تھانہ اے ڈویژن آ گئے۔

یہاں پہنچ کر انہوں نے اغوا کاروں کے خلاف مقدمہ درج کرتے رابعہ کو ورثاء کے حوالے کیا اور ملزمان کو جیل روانہ کر دیا۔

اب قارئین! رابعہ پر جو بیتی وہ اُسی بچی کی زبانی آپ بھی پڑھیے اور جرم کے انوکھے رنگ کو دیکھ کر ششدر ہو جائیں۔

میں اکثر گھر کا سودا سلف بھائی بنوں کی دوکان سے خریدتی تھی۔ ایک تو اس کی چیزیں صحیح اور ریٹ مناسب ہوتا تھا۔ اُس دن میں دو ایک گھر کی ضروری چیزیں چینی پتی اور پیسٹ لینے گئی تو بنوں بھائی دوکان کے اندر پچھلے حصہ سے کوئی سامان لینے گئے ہوئے تھے اور دوکان کی حد بندی سے باہر ایک عورت اور لڑکا موجود تھے شاید ان کا ہی سامان لینے وہ اندر گیا ہوا تھا۔ بھائی بنوں کے بارے میں میرے پوچھنے پر اس عورت نے مجھے بتایا، اسی دوران اس نے میرے پہنے سوٹ کی تعریف کرتے پوچھا



کہ کتنے کا لیا تھا۔ جواب میں میں نے بتایا کہ یہ سوٹ میری مالکن کا تھا جو انہوں نے مجھے دے دیا۔ اسے میں نے اپنے سائز کا کروالیا۔ میں نے اُس عورت کو حقیقت بتائی۔ اس عورت نے لڑکے کے ہاتھ میں پکڑا شاپر لیا۔ اس میں سے مٹھی بھر خوبانیاں نکالتے میرے ہاتھ پر رکھ دیں۔ میں نے بہت انکار کیا مگر اس کی شفقت کے آگے بے بس ہوگئی۔

یہ تھی پنوں کی دوکان پر میری اس آنٹی سے پہلی ملاقات مگر اس تھوڑی سی بات چیت میں مجھے اس کا نام اور پتا اور اُسے میرا نام اور پتا چل گیا۔ نمبر اُس نے مجھے اس لیے لکھ دیا کہ اُسے بھی اپنے گھر کا کام کرنے والی ملازمہ کی ضرورت تھی اور اس نے کہا کہ اگر تمہیں دوسری جگہ ملازمت کی ضرورت پڑے یا کسی اور لڑکی کو ملازمت کرنی ہو تو مجھے کال کر لینا۔ یہ بات کئی دن پرانی ہوگئی۔ ایک دن میں نے باجی کے فون سے اُس نمبر پر کال کی تو اٹھانے والی خود آنٹی ہی تھی خیر خیریت کے بعد اُس نے مجھے پھر یاد دلایا اور ساتھ میں یہ بھی کہا کہ اگر تم خود آنا چاہو تو میں ان سے ایک ہزار زیادہ تنخواہ دوں گی۔

''نہیں آنٹی میں یہاں ٹھیک ہوں۔ ہاں اگر کوئی کام چھوڑنے کی نوبت آئی تو میں اپنی والدہ کو آپ کا نمبر دے دوں گی اور وہ آپ سے مل کر بات کر لے گی اور آپ کا گھر وغیرہ بھی دیکھ لے گی۔''

پھر سلسلہ کٹ گیا مگر میں کبھی کبھار جب باجی سو رہی ہوتی تو چپکے سے اُن کے موبائل سے آنٹی کو فون کھڑکا دیتی۔

ایک دن میں نے فون کیا تو فون اُٹھانے والا اس کا وہی بیٹا گلزار تھا جس سے میری ملاقات آنٹی سے پہلی ملاقات پر پنوں کی دوکان پر ہو چکی تھی۔ پتا نہیں اس کی باتوں میں کیا جادو تھا کہ میں اُس سے کافی دیر بات کرتی رہی اور وعدہ کر لیا کہ جب بھی موقع ملے گا میں کال کر لیا کروں گی۔ پھر ہماری چوری چھپے باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ باجی دوپہر کو سو جاتی تھی بس مجھے اُن کو دبانا ہوتا تھا۔ موبائل سائیڈ ٹیبل پر پڑا ہوتا تھا جو میں چپکے سے اٹھا کر برآمدے میں آجاتی اور میں بیل دیتی۔ آنٹی اگر اُٹھا لیتی تو میری آواز سنتے ہی گلزار کو آواز دے کر فون اس کو پکڑا دیتی۔ ماں بیٹے کی محبت کے جال میں میں مکمل پھنس چکی تھی۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میں اُڑ کر ان کے گھر پہنچ جاتی۔ میرے گھر والوں نے میری ملازمت سے قبل ہی دس ہزار روپے ایڈوانس لے رکھا تھا ان لوگوں سے جو ابھی تک میرے ذمہ چل رہا تھا۔ مگر میرا دل گلزار اور آنٹی کے ارد گرد گھومتا رہتا تھا۔ آنٹی کئی بار مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دے چکی تھی میں نے وعدہ بھی کر رکھا تھا کہ جس روز میں چھٹی کروں گی اُس روز آپ کا گھر دیکھ کر جاؤں گی۔''

باجی اور بھائی جان گاؤں جانے کے لیے تیاری کر رہے تھے۔ مجھے انہوں نے اپنے گھر جانے کا صبح ہی کہہ دیا تھا۔ میں نے اُن سے اجازت لی اور ان کی رہائش گاہ سے نکل کر اپنے گھر جانے کے لیے باہر سڑک پر آگئی۔ پی سی او سڑک کراس کر کے مارکیٹ میں تھا۔ جہاں آکر میں نے آنٹی کو فون کیا اور بتایا کہ میں مارکیٹ میں امتیاز پی۔سی۔او بینظیر روڈ پر کھڑی ہوں۔ انہوں نے کہا کہ تم رکو میں گلزار کو بھیجتی ہوں۔

تھوڑی دیر ہوئی تھی مجھے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ گلزار موٹر سائیکل پر سڑک کے دوسری جانب موجود تھا میں بغیر سوچے سمجھے سڑک کی پارٹیشن عبور کرتی اس کی موٹر سائیکل کے پیچھے آن بیٹھی۔ وہ کئی گلیوں کو پیچھے چھوڑتا حسین کالونی کے ایک بڑے سے کوٹھی نما گھر کے کھلے گیٹ کے اندر موٹر سائیکل لیتا چلا گیا۔ آنٹی بڑے تپاک سے ملی اور مجھے اندر ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ اتنے میں دو اور بھی لڑکیاں ڈرائنگ روم میں آگئیں جن سے آنٹی نے اپنی بیٹیاں سلمٰی اور نصرت کہہ کر میرا تعارف کروایا۔ گلزار بھی موٹر سائیکل کھڑی کر کے اندر ہی آ گیا۔

''بیٹی آپ گھر والوں کو بتا کر آئی ہو نا؟ آنٹی نے مجھ سے دریافت کیا۔ جواب میں میرے انکار پر وہ جیسے مطمئن ہو گئی پھر اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران نصرت شربت بنا لائی۔ میرے سمیت سب نے اپنے اپنے گلاس پکڑ لیے۔ شربت پینے کے دوران آنٹی مجھ سے چکنی چپڑی باتیں کر کے اپنا پیار مجھ پر نثار کرتی رہی۔ پھر مجھے گھر کے کمرے دکھانے کے لیے مختلف کمروں سے ہوتی ہوئی اوپر والی منزل دیکھنے کے لیے سیڑھیوں کی طرف لے آئی اوپر چڑھتے مجھے یوں لگا جیسے میرا سر چکرا

رہا ہو۔ بڑی مشکل سے میں ان کے ساتھ اوپر والے حصے میں آئی اوپر بھی کئی کمرے تھے۔ آخری کمرے میں بیڈ پر ایک آدمی بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میرا سر تو چکرا ہی رہا تھا۔ مگر آنکھیں بھی بھاری بھاری لگ رہی تھیں۔ وہ دونوں لڑکیاں اور گلزار کمرے سے باہر نکل گئے۔ مجھے آنٹی نے صوفے پر اپنے ساتھ بٹھاتے پوچھا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''پتا نہیں آنٹی کیا بات ہے، میرا سر گھوم رہا ہے۔'' میں نے بڑی مشکل سے اپنی آنکھیں کھولتے جواب دیا۔

''لاؤ میں تمہارا سر دبا دوں۔'' یہ کہتے ہوئے آنٹی نے میرا سر اپنی گود میں رکھتے سر دبانا شروع کر دیا۔ سر دبانے کے دوران آنٹی کی آواز جیسے مجھے بہت دور سے سنائی دے رہی تھی۔ پھر میں نیند میں ڈوبتی چلی گئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو مجھے پتا چلا کہ میں اپنا سب کچھ لٹا بیٹھی تھی۔ اُس کمرے کا دروازہ باہر سے لاک تھا۔ میں نے بہت شور مچایا مگر میری آواز کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس اُسی کمرے میں دفن ہو جاتی۔

باہر دن کی روشنی میں مجھے معلوم ہوا کہ میں تمام رات اُس کمرے میں بے ہوش پڑی رہی اور میری عزت وآبرو کی دھجیاں اُڑتی رہیں۔ میں چیخ چلا کر بے سدھ ہوگئی تو آنٹی نے باہر سے دروازہ کھولتے ہی اندر آتے میرے منہ پر تھپڑوں کی بارش شروع کر دی اور حکم دیا کہ اگر تمہاری آواز نکلی تو اِدھر ہی گلا دبا کر ختم کر دوں گی اور تمہاری لاش کا بھی پتا نہیں چلے گا۔ تمہیں تو پتا ہے ناکہ تمہارے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ تم میرے گھر پر ہو۔ بس چپ چاپ میری بات مانتی رہو تو سکھی رہو گی۔''

میں سہم کر صوفہ پر بیٹھ گئی۔ اپنے قتل کا سن کر میرے اوسان خطا ہوگئے تھے۔

''رونا دھونا بند کرو اور یہ لو سوٹ اور تیار ہو کر ناشتا کر و۔ اس نے ایک سوٹ شاید وہ دونوں لڑکیوں میں سے کسی ایک کا تھا میرے پاس صوفے پر رکھتے دروازہ پھر سے بند کر دیا۔ میں کافی دیر تک اپنے نصیب کو روتی رہی پھر اُٹھ کر میں کمرے کے اندر واش روم میں گئی۔ میرا سارا جسم مارے درد اور تھکاوٹ کے چور چور ہوا دُکھ رہا تھا۔ کافی دیر نہاتے رہنے کے بعد جب میں سنبھلی تو اس کا لایا سوٹ پہن کر کمرے میں آ گئی۔ میز پر ناشتا پڑا تھا جو شاید میرے نہاتے ہوئے کوئی کمرے میں رکھ گیا تھا۔ تھوڑا بہت زہر مار کیا اور اپنے گھر والوں کی یاد میں آنسو بہانے لگی۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے کہ میں کہاں منہ کالا کر گئی۔ اُنہیں کیا معلوم کہ میری بیوتوفی نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔ چائے پیتے ہی میرا سر پھر بھاری ہونے لگا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ مجھے پھر سے بے ہوشی کی دوا دے دی گئی ہے۔

☆ ..... ☆ ..... ☆

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو کسی نئی جگہ پایا۔ سب سے پہلے نظر آنے والی عورت شکل سے ہی کوئی اور طرح کی دکھائی پڑتی تھی۔

آج سے تمہارا نام روشی ہے اور میں نے تمہیں تین لاکھ میں خریدا ہے۔ کان کھول کر سن لو۔ یہاں آنے والے کسی بھی مرد سے کوئی بات کی یا اپنے بارے میں بتایا تو وہ تیرا آخری لمحہ ہوگا۔''

میں ایسے اڈے پر پہنچ گئی تھی جہاں میرے سمیت کئی اور بھی لڑکیاں موجود تھیں۔ کئی کمروں میں ہوس کا بد مست کاروبار جاری تھا۔ مجھے بھی اُس گھناؤنے اور مکروہ دھندے میں دھکیل دیا گیا۔ اس گھناؤنے اور گندے کاروبار میں مجھے کچھ بھی یاد نہ رہا۔ میرے بازو پر انجیکشن در انجیکشن لگتے رہے۔ مجھے یہاں آئے کتنے دن ہو گئے، مجھے اس بات کا ہوش بھی نہ رہا۔ پھر جب ہوش آیا تو میں پولیس کی گاڑی میں اپنے لوگوں کے ساتھ اپنے شہر اور اپنے گھر کی طرف جارہی تھی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں آزاد ہوگئی تھی بتاتے ہوئے اس کی آواز آنسوؤں میں دب گئی۔

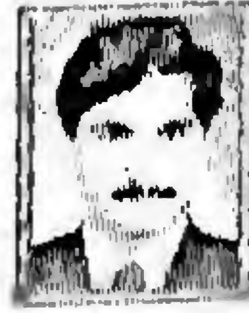
اُس مظلوم مگر عشق کے ہاتھوں دھوکہ کھانے والی معصوم لڑکی کی بپتا سن کر میرا برا حال ہے۔ لیکن مظلوم ہی ظالموں کے ہاتھ چڑھتا ہے۔

میری پڑھنے والوں سے گزارش ہے کہ بھروسہ..... اس دنیا میں ناپید ہو چکا ہے۔ آپ بھی کسی پر بھروسہ نہ کریں کیا پتا آپ کی گھات میں بھی کوئی مکروہ چہرہ اپنے جال پھیلائے بیٹھا ہو۔

☆☆..... ☆☆

یقین پر جنم لینے والی کہانیاں
جن میں سچائی اور طلب کی کشش بھی شامل ہے

لمحوں کی بھول



ممتاز احمد

ایک ایسی کہانی جس کا شکار آج بھی تمسخر کا نشانہ ہے





کہا یہ جاتا ہے کہ زندگی بڑے بڑے رنگ دکھاتی ہے۔ بڑی تکلیفیں دیتی ہے مگر نہیں زندگی وہی دکھاتی ہے جو رنگ ہم اس میں بھرتے ہیں۔ بعض اوقات کیا دھرا انسان کا اپنا ہی ہوتا ہے اور وہ اپنے ہی کیے کا خمیازہ بھگتتا ہے تو پھر الزام زندگی کو کیوں؟ میری کہانی پڑھنے کے بعد آپ بھی یقیناً میرے اس نکتۂ نظر سے متفق ہو جائیں گے۔

میرا نام سردار دلبر ہے۔ بچپن سے ہی گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ والد صاحب کی کئی چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں اور کارخانے تھے۔ پھر وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی فیکٹری بنا دی گئی۔ ہم دو بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ والدین نے اپنی حیات میں ہی ہم سب بہن بھائیوں کی شادیاں کر دی تھیں۔

میں اوائل جوانی سے ہی رنگین اور عاشق مزاج واقع ہوا تھا۔ کئی عشق لڑائے بلکہ یوں کہہ لیں فلرٹ کیے۔ عشق و محبت کے چکر میں کئی لڑکیوں اور عورتوں کی عزتوں سے کھیلا۔ اسی روٹین میں آگے بڑھتا رہا۔ پڑھائی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ بس واجبی سی تعلیم حاصل کی تھی۔ والد صاحب چونکہ خالص کاروباری انسان تھے تو اُن کی صحبت میں رہ کر تمام کاروباری اسرار و رموز سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔ پیسہ کمانے کا ڈھنگ مجھے خوب آتا تھا۔ شادی کے بعد بھی میری فلرٹ کرنے اور اِدھر اُدھر منہ مارنے والی عادتیں چلتی رہیں۔

وقت گزرتا رہا اور اولاد بھی ہو گئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے میری عمر ساٹھ سال ہو گئی۔ بچے جوان ہو گئے، اُن کی شادیاں کر دیں اور پھر آگے اُن کی بھی اولاد ہو گئی۔ بے فکری کی زندگی، عیش و آرام، اچھی خوراک سیر اور ورزش کے نتیجے میں میری عمر چالیس پینتالیس سال لگتی تھی۔ میں اپنی خوب ٹپ ٹاپ بھی رکھتا تھا۔ کوئی کسی قسم کی معمولی سی بیماری بھی نہ تھی جس کی وجہ سے میں ایک مکمل اور فٹ مرد تھا۔

ہماری ایک بہت بڑی فیکٹری تھی جسے ہم دونوں بھائی مل کر چلاتے تھے۔ ہماری اولادیں بھی شریک کاروبار تھیں۔ ہم دونوں بھائی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ ہمارے درمیان کسی قسم کا کوئی معمولی سا اختلاف بھی کبھی نہیں ہوا تھا۔ ہمارا مثالی پیار دیکھ کر ہماری اولادیں بھی آپس میں مل جل کر پیار سے رہتیں۔

☆......☆......☆

ایک دن دوپہر کو میں فیکٹری کے آفس میں اکیلا

بیٹھا تھا کہ میرے موبائل پر ایک نامعلوم نمبر سے کال آئی۔ جب میں نے کال اٹینڈ کی تو ایک لڑکی نے بڑی میٹھی اور سُریلی آواز میں 'ہیلو' کہا۔ جواب میں میں نے بھی 'ہیلو' کہا تو لڑکی نے مجھ سے پوچھا۔

''آپ کون بول رہے ہیں؟''

میں نے کہا کہ آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟'' تو لڑکی کہنے لگی۔

''اپنی ایک جاننے والی رابعہ سے بات کرنی ہے۔'' تو میں نے کہا۔

''سوری یہ کسی رابعہ کا نمبر نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے جان چھڑانی چاہی۔ اس پر لڑکی نے کہا۔

''اوہو لگتا ہے شاید نمبر غلط ڈائل ہو گیا ہے، سوری جی زحمت کی معافی چاہتی ہوں۔''

''کوئی بات نہیں ایسا ہو جاتا ہے۔''

لڑکی بولی۔ ''آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا نا؟''

میں نے ہنس کر کہا۔ ''اس میں مائنڈ کرنے والی تو کوئی بات نہیں ہے۔ چلیں اگر رانگ نمبر مل ہی گیا ہے تو تھوڑی دیر مجھ سے ہی بات کر لیں۔''

اس پر وہ لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی اُس کی ہنسی اور آواز اتنی دلکش تھی لگتا تھا جلترنگ بج اُٹھے ہیں۔ جب اُس کی ہنسی رُکی تو کہنے لگی۔

''ٹھیک ہے جی کر لیتے ہیں بات۔ میں فون بند کرتی ہوں مگر اب کال آپ کریں۔'' تو میں نے کہا۔ 'نو پرابلم' اور اُسے کال بیک کی تو کافی دیر ہماری بات چیت ہوتی رہی۔

کال کے ختم ہونے پر لڑکی نے مجھے دوستی کی آفر دی جسے میں نے فوراً قبول کر لیا اور ساتھ ہی اُسے بتا دیا کہ میں کوئی لڑکا یا نوجوان نہیں ہوں بلکہ ساٹھ سال کا مرد ہوں۔ تو لڑکی نے بڑی اپنائیت اور لگاؤ سے کہا۔

تو کیا ہوا جی دوستی تو بس دوستی ہوتی ہے اس کے بیچ عمر کا کیا تعلق؟ الغرض ہماری دوستی کی شروعات ہو گئی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ دن بھر فیکٹری کے معاملات میں مصروف رہتا۔ کافی لوگ جمع ہوتے تو اُس کے ساتھ سکون اور یکسوئی سے بات نہیں ہو سکتی تھی۔

گھر میں بیوی، بچے، بہوئیں، بیٹیاں ہوتیں تو گھر میں بھی یہ ناممکن تھا۔



میری شروع سے عادت تھی کہ رات کا کھانا کھانے کے بعد میں ٹہلنے کے لیے نکل جاتا تھا۔ گھر کے آس پاس کوئی پارک وغیرہ نہ تھا تو اِدھر اُدھر چکر لگا لیتا۔

ہماری بہت بڑی کوٹھی ریلوے اسٹیشن کے قریب تھی، چنانچہ میں اب حسبِ معمول رات کے کھانے کے بعد گھر سے نکل جاتا اور اِدھر اُدھر گھومنے کی بجائے ریلوے اسٹیشن کے لمبے پلیٹ فارم پر چلا جاتا اور اُس لڑکی جس نے اپنا نام سدرہ بتایا تھا کو کال کرتا اور پلیٹ فارم پر موبائل فون کان سے لگا کر باتیں کرتا اور چکر لگاتا رہتا۔

سدرہ نے بتایا کہ وہ شاہ پور میں رہتی ہے اور اُسے اب میری کال کا ہر روز شدت سے انتظار رہتا ہے۔ سدرہ کی آواز اتنی پیاری تھی کہ دل کرتا تھا وہ بولتی رہے اور میں اُس کی باتیں سنتا رہوں۔ میں سوچتا تھا کہ اُس کی آواز کانوں میں اتنا رس گھولتی ہے تو وہ خود کتنی خوبصورت ہوگی۔

کوئی پندرہ یا بیس دن گزرے تو سدرہ نے ملاقات پر زور دینا شروع کر دیا۔ سچ تو یہ ہے میں بھی سدرہ سے ملنے کے لیے بے تاب تھا۔ چنانچہ دو دن بعد ہماری ملاقات طے ہوگئی۔ میں نے اُسے دوپہر کے ٹھیک بارہ بجے کچہری بازار کے ایک مشہور ڈیپارٹمنٹل اسٹور پر ملنے کا کہا۔ اُس نے آنے سے پہلے اپنا حلیہ اور پہنے ہوئے کپڑوں کا رنگ اور ایک دو نشانیوں کا بتا دیا۔

☆......☆......☆

ملاقات والے دن میں خوب تیار ہو کر پورے بارہ بجے وہاں پہنچ گیا۔ تو چند منٹوں کے بعد سدرہ بھی وہاں آ گئی۔ اُس کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی تھی۔ سدرہ انتہائی خوبصورت، پُرکشش، گوری چٹی پچیس سال کی شوخ و چنچل لڑکی تھی۔ اس کا بھرا بھرا جسم، منہ میں پانی بھرتا تھا۔ سچ میں تو اسے دیکھ کر لگا کہ میں سولہ سالہ جوان ہو گیا ہوں۔ اُس کے نہ نہ کرنے کے باوجود اُسے پندرہ بیس ہزار کی شاپنگ کروائی پھر انہیں لے کر ایک مہنگے ریسٹوران میں گیا اور لنچ کروایا۔ دو گھنٹے ہماری ملاقات رہی میں اُس کے حسن و جمال میں کھو گیا جبکہ اُس نے مجھ سے اپنی بھرپور چاہت اور پسند کا اظہار کیا اور کہنے لگی۔

''دلبر جانی آپ تو ایک ینگ، بھرپور مرد ہیں۔ لگتا ہی نہیں کہ آپ ساٹھ سال کے ہیں۔ آپ جھوٹ بولتے ہیں۔''

''تو میں نے کہا کہ مجھے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی۔ میری اصل عمر ساٹھ سال ہی ہے۔''

قصہ مختصر ملاقات کے بعد وہ واپس چلی گئی۔

''رات کو جب ہماری فون پر بات ہوئی تو وہ بہت خوش تھی کہنے لگی کہ آپ جیسا خوبرو، وجیہہ مرد اور مضبوط و توانا زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے۔'' ایک جوان اور انتہائی خوبصورت لڑکی کے منہ سے اپنی تعریف سُن کر میں پھولے نہ سمایا۔

کوئی ایک ہفتے کے بعد سدرہ نے کہا کہ دلبر جانی یہ سچ ہے کہ آپ سے ملاقات کر کے خوشی تو بے پناہ ہوئی مگر مزہ نہیں آیا کیونکہ ایک تو اُس کی سہیلی ساتھ تھی دوسرا ہوٹل کا ریزرو ماحول تو کھل کر نہ تو باتیں ہو سکیں اور نہ ہی......'' اس نے آگے وہ ہنس پڑی۔ اس کی تعریف نے میری مردانگی کو پھر سے جوان کر دیا تھا۔

سدرہ نے بتایا کہ تین روز کے بعد سب گھر والوں نے شادی پر جانا ہے تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر نہیں جائے گی اور گھر میں اکیلی ہوگی تو آپ ہمارے گھر آ جانا۔ پھر ہم دو تین گھنٹے باتوں کے ساتھ خوب موج مستی بھی کریں گے۔''

یہ سُن کر میرے اندر ہلچل مچ گئی اور میں بھی تنہائی کی ملاقات کے لیے بے قرار ہو گیا۔

☆......☆......☆

تیسرے دن اُس نے فون پر بتایا کہ اُس کے گھر والے نکلنے والے ہیں۔ اُس نے سر درد اور طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنایا ہے اور وہ گھر میں اکیلی ہوگی تو آپ چلے آؤ۔''

شاہ پور ہمارے شہر سے تیس کلومیٹر دور ہے اور اپنی کار میں آدھا گھنٹہ لگتا ہے وہاں پہنچنے میں۔ اُس کی کال کے بعد میں نے بازار سے ایک بیس ہزار کا مہنگا موبائل فون، پرفیوم، ریڈی میڈ سوٹ اور سونے کا ایک لاکٹ خریدا ان سب چیزوں کا ایک گفٹ پیک بنوا کر خود بھی

اچھی طرح تیار ہو کر اپنی کار پر شاہ پور پہنچ گیا۔

ایک اسٹاپ پر گاڑی روک کر میں نے سدرہ کو بتایا کہ میں فلاں جگہ پر پہنچ چکا ہوں تو اُس نے فون پر مجھے اپنے گھر کا ایڈریس سمجھایا اور مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا میں اُس کے گھر پہنچ گیا۔

گلی کے آخر میں نیلے گیٹ والا اُس کا گھر تھا اور وہ گیٹ پر کھڑی تھی۔ اُس نے مسکرا کر میرا استقبال کیا۔ میں نے گاڑی سے گفٹ پیکٹ نکالا، گاڑی لاک کی اور گیٹ کے اندر داخل ہو گیا۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تھا اُس نے مین گیٹ بند کر کے کنڈی لگائی اور میرے پیچھے ڈرائنگ روم میں آ کر میرے گلے لگ گئی اور میرے آنے کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے اُسے گفٹ پیش کیا تو کہنے لگی۔

''اِس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟'' مجھے صوفے پر بٹھا کر وہ کچن سے کولڈ ڈرنک لے آئی اور میرے سامنے بیٹھ گئی۔ دس منٹ تک ہم باتیں کرتے رہے پھر وہ اُٹھی اور کہنے لگی۔

''آپ بیٹھیں بس میں پانچ منٹ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔ پھر ہم چائے پی کر بیڈ روم میں چلیں گے۔''

سدرہ نے چُست شوخ رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے بغیر دوپٹے کے کھلے بال، اُس کے انگ انگ سے شباب اور مستی چھلک رہی تھی۔ بیڈ روم کے تصور سے ہی میرے دل میں لڈو پھوٹنے لگے اور میں بے چینی اور بے تابی سے اُس کا انتظار کرنے لگا۔

کوئی دس یا پندرہ منٹ کے بعد وہ دو کپ چائے اور ساتھ میں کچھ لوازمات ایک ٹرے میں رکھ کر لے آئی۔ وہ میرے عین سامنے صوفے پر تھوڑی سی کروٹ لے کر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی اس کے ہر انداز سے مجھے شہوت آسمان کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ بڑی نشیلی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے چائے پینے لگی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ مچل رہی تھی۔ اور لب مچھلی کی طرح پھڑ پھڑاتے ہوئے دادِ عیش کے منتظر تھے۔ میں بھی جلدی جلدی چائے پینے لگا۔ تا کہ بیڈ روم کا جلد نظارہ کیا جا سکے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ چائے کا آخری گھونٹ پینے سے پہلے مجھے ایک زور کا چکر آیا، ہر چیز گھومتی نظر آئی اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا تھا۔

☆......☆......☆

پتا نہیں میں کتنے گھنٹے بے ہوش رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں پایا۔ میں ایک چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ مجھ پر انتہائی کمزوری، نقاہت اور بے چینی طاری تھی۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کہاں ہوں؟ میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟ کچھ دیر کے بعد آہستہ آہستہ جب میرے حواس بحال ہوئے تو مجھے سب کچھ یاد آ گیا اور مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میں اغواء ہو چکا ہوں۔

میری چارپائی کے ساتھ ہی ایک اسٹول پر سلور کا پانی سے بھرا جگ اور ایک گلاس پڑا تھا۔ مجھے بے حد پیاس اور تلخی محسوس ہو رہی تھی۔ چنانچہ میں نے چارپائی سے اُٹھ کر ایک گلاس پانی پیا۔

اب میں پوری طرح ہوش میں آ چکا تھا۔ درمیانے سائز کا کمرہ تھا۔ جس کی کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ ایک اونچا سا روشن دان تھا۔ جس کے آگے لوہے کی ایک گرل لگی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا تو پانچ منٹ کے بعد دروازہ کھلا اور انتہائی خوفناک شکلوں والے تین بندے اندر داخل ہوئے۔ اِن تینوں کے ہاتھوں میں جدید اسلحہ تھا۔ دو بندے دروازے پر کھڑے ہو گئے اور ایک نے میرے پاس آ کر کہا۔

''ہاں دلبر جانی ہوش آ گیا۔'' تو میں نے کہا کہ تم کون ہو اور مجھے یہاں کیوں لے کر آئے ہو۔ مجھے جانے دو۔''

تو وہ بولا۔ ''دلبر جانی تھوڑا صبر۔ جانے دیں گے تمہیں۔ اتنی بھی کیا جلدی ہے؟ موج مستی نہیں کرنی کیا؟'' یہ سُن کر میں خاموش ہو گیا۔ تو وہ آدمی بولا کہ اپنے گھر کے کسی ذمہ دار بندے کا فون نمبر دو۔''

''تو میں نے پوچھا وہ کس لیے؟''

کہنے لگا کہ دلبر جانی تم خود سمجھدار ہو۔ ہم اتنی محنت سے، اتنی دور یہاں لے کر آئے ہیں تو ایسے ہی

جانے دیں...... تمہاری قیمت وصول کریں گے تو تمہیں واپس بھیج دیں گے، ورنہ تمہاری لاش تمہارے گھر والوں کو مل جائے گی۔"

یہ سُن کر میرے ہوش اُڑ گئے۔ جب اُس نے دوبارہ نمبر مانگا تو میں نے اپنے بھائی کا نمبر بتایا پھر اُس نے کال ملائی اور بھائی سے کہنے لگا کہ گاڑی مل گئی ہے؟"

جب بھائی نے کہا ہاں مل گئی ہے تو وہ کہنے لگا کہ گاڑی والا ہمارے پاس ہے اور ہمارا مہمان ہے۔ لو اس سے بات کرو۔"

یہ کہہ کر اُس نے موبائل فون مجھے پکڑا دیا تو میں نے سخت گھبراہٹ میں بھائی سے بات کی کہ میں اُن کے قبضے میں ہوں۔ یہ بہت خوفناک بندے ہیں، پلیز مجھے یہاں سے جلدی رہائی دلاؤ۔"

پھر اُس بندے نے میرے ہاتھ سے موبائل چھین لیا اور بھائی سے بولا کہ اپنے بھائی کی بخیر وعافیت رہائی اور واپسی چاہتے ہو تو چھ کروڑ روپے دے دو۔ تمہارا بھائی سردار دلبر ہمارے قبضے میں ہے۔ ہم علاقہ غیر میں ہیں اور پانچ دن کی مہلت ہے۔ ہم تم سے خود رابطہ کرتے رہیں گے۔ بس تم رقم کا فوری بندوبست کرو۔ ہم تمہیں بعد میں بتائیں گے کہ رقم کیسے وصول کرنی ہے اور ہاں...... خبردار کوئی چالاکی، ہوشیاری نہ دکھانا اور نہ ہی پولیس کو اس معاملے میں انوالو کرنا، ورنہ بھائی کی لاش بھی نہیں ملے گی۔" یہ کہہ کر اُس نے فون بند کر دیا۔

پھر ایک گھنٹے کے بعد وہ میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے ایک گاڑی میں بٹھا کر چل پڑے اور تقریباً دو گھنٹے کے سفر کے بعد ایک اور دوسری جگہ لے جا کر ایک کمرے میں بند کر دیا۔

☆......☆......☆

میں دن کے گیارہ بجے فیکٹری سے بغیر کسی کو بتائے شاہ پور جانے کے لیے نکلا تھا۔ جب شام تک گھر نہ آیا تو سب کو میری فکر لاحق ہوئی۔ میرا موبائل نمبر ڈائل کرتے تو پاور آف ملتا۔ سب گھر والے بے حد پریشان اور فکر مند تھے۔ پھر رات آٹھ بجے کے قریب بھائی کو شاہ پور پولیس کی طرف سے فون آیا کہ انہیں ایک کار خوشاب دریا کے پُل کے قریب کھڑی ملی ہے اور کار کا نمبر بتایا تو بھائی نے کہا یہ تو میرے بڑے بھائی کی کار ہے۔ پھر پولیس کے بلانے پر بھائی فوراً شاہ پور پولیس اسٹیشن پہنچا اور کار کی شناخت کی۔ پولیس والوں نے بتایا کہ کئی گھنٹوں سے یہ کار سڑک کے ایک طرف دریا کے پُل کے قریب کھڑی تھی۔ ہمیں مشکوک لگی تو اسے کھول کر چیک کیا تو ڈیش بورڈ سے ایک ڈائری ملی جس پر آپ کا نمبر لکھا تھا تو آپ سے رابطہ کیا ہے۔ پھر انہوں نے میرا پوچھا تو بھائی نے بتایا کہ میں صبح گیارہ بجے کا غائب ہوں اور موبائل بھی مسلسل پاور آف مل رہا ہے۔ تو اس پر پولیس نے اندازہ لگایا کہ یقیناً مجھے اغواء کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ میری بازیابی تک یہ کار پولیس کے قبضے میں رہے گی۔ تھانے دار نے بھائی سے کہا اگر آپ کو بھائی کی کوئی اطلاع ملے یا کوئی کال وغیرہ رقم کی ڈیمانڈ کی آئے تو پولیس کو اطلاع دیں۔ پھر بھائی واپس گھر آ گیا۔ چونکہ مجھے کوئی گہری بے ہوشی کی دوا چائے میں ملا کر پلائی گئی تھی تو مجھے پورے اٹھارہ گھنٹے کے بعد ہوش آیا تھا۔

میرے ہوش میں آنے کے بعد میرے اغواء کاروں نے میرے سامنے میرے چھوٹے بھائی سے رابطہ کیا تھا۔ اس کے بعد تقریباً دس روز تک میرے اغواء کاروں کی اور بھائی کی بات چیت چلتی رہی اور سودے بازی ہوتی رہی اور بالآخر تین کروڑ پر معاملہ طے ہوا۔ اغواء کاروں نے بھائی سے کہا کہ تین کروڑ کی رقم میں صرف بڑے نوٹ ہوں۔ ایک تھیلے میں ڈال کر راولپنڈی پہنچ جاؤ۔ بھائی فوراً اپنی کار میں رقم کا تھیلا لے کر راولپنڈی پہنچ گیا۔

یہ سارا معاملہ پولیس کے علم میں تھا تو دوسری گاڑی میں پولیس کے بندے سول لباس میں بھائی کے پیچھے راولپنڈی پہنچے۔ بھائی کے راولپنڈی پہنچنے کے بعد اغواء کاروں نے اگلی ہدایت یہ دی کہ راولپنڈی سے شام کو فلاں ٹرین پشاور جانے کے لیے چلتی ہے تو اُس کے آخری ڈبے میں رقم والا تھیلا لے کر بیٹھ جاؤ۔ اور پھر جب ہم کہیں گے تو اُسی وقت چلتی ٹرین سے رقم والا تھیلا باہر پھینک دینا۔ چنانچہ بھائی رقم والے تھیلے سمیت ٹرین

کے آخری ڈبے میں بیٹھ گیا۔ پولیس والے بھی سادہ کپڑوں میں مسافروں کے روپ میں اُسی ڈبے میں بیٹھ گئے۔ جبکہ میرے دونوں بیٹے بھی راولپنڈی پہنچ گئے اور انہوں نے کار پر بائی روڈ ٹرین کے ساتھ ساتھ سول لباس میں ملبوس پولیس کے ہمراہ چلنا تھا۔

شام سات بجے ٹرین راولپنڈی سے چل پڑی۔ رات ساڑھے آٹھ یا نو بجے کے قریب گاڑی ایک اسٹیشن پر رُک کر چل پڑی اُس اسٹیشن سے آگے کوئی دریا یا بڑا نالہ تھا اور آگے ایک گھنا جنگل تھا۔ تو بھائی کو اغواء کاروں نے کال کی کہ اب تیار ہو جاؤ۔ وہ مقام آنے والا ہے جہاں رقم کا تھیلا پھینکنا ہے اور ساتھ ہی سختی سے ہدایت اور وارننگ دی کہ خبردار رقم کا تھیلا پھینکنے کے بعد اگر زنجیر کھینچ کر ٹرین رکوائی گئی اور کوئی ٹرین سے اُترا تو پھر سردار دلبر کی لاش ٹکڑوں میں ملے گی۔

یہ وہ مقام تھا جہاں سے گاڑی پوری تیز رفتاری سے گزر رہی تھی۔ سڑک یہاں سے ہٹ کر بہت دور تھی۔ گھنا جنگل تھا تو بھائی کو کال آئی کہ فوراً ٹرین کے دروازے سے دائیں طرف رقم والا تھیلا باہر پھینک دو۔ یہاں سے تھوڑا سا آگے جنگل ختم ہو جاتا تھا اور ٹرین بائیں جانب گھوم جاتی تھی۔ چنانچہ بھائی نے فوراً رقم والا تھیلا باہر پھینک دیا۔ پولیس والوں نے دوسری جانب سے چلتی ٹرین میں پیچھے دیکھا مگر وہاں سوائے گھپ اندھیرے کے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد بھائی کو فون آیا کہ رقم والا تھیلا مل گیا ہے۔ رقم پوری ہے اور نوٹ بھی اصلی ہیں۔ اب تم اگلے اسٹیشن پر اُتر جاؤ۔

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد ٹرین ایک اسٹیشن پر رُکی تو بھائی ٹرین سے اُتر گیا۔ ساتھ ہی بھائی کو فون آیا کہ اب واپس راولپنڈی جاؤ۔ وہاں تمہیں تمہارا بھائی مل جائے گا۔ کہاں ملے گا، کیسے ملے گا یہ تمہیں تب بتایا جائے گا۔ جب تم راولپنڈی پہنچو گے۔ چنانچہ بھائی نے میرے بیٹوں کو کال کر کے ساری صورتِ حال بتادی تھی۔ پھر میرا بھائی پولیس پارٹی اور میرے دونوں بیٹے بائی روڈ رات کے تقریباً بارہ بجے راولپنڈی پہنچ گئے۔ اغواء کاروں نے بھائی کو بتایا کہ راولپنڈی کے ریلوے اسٹیشن پر پلیٹ فارم نمبر 5 کے آخری بینچ پر تمہارا بھائی بیٹھا ہے۔

اغواء کاروں کے سخت رویے اور دھمکیوں سے میں بہت پریشان اور خوفزدہ رہتا تھا۔ میری بھوک اور نیند اُڑ گئی تھی۔ بلڈ پریشر ہائی ہو گیا، کچھ کھانے کو دل نہ کرتا تھا حالانکہ وہ مجھے تین ٹائم اچھا کھانا اور چائے وغیرہ دیتے تھے۔ میں تقریباً بارہ دن اُن کی قید میں رہا۔ اس دوران میرا وزن بہت کم ہو گیا۔ میری شیو بھی بڑھ گئی تھی۔

جس دن انہوں نے مجھے بھائی کے حوالے کرنا تھا۔ اُس سے ایک روز پہلے پانچ چھ بندوں کے جھرمٹ میں جو کہ اسلحہ سے لیس تھے کے ساتھ مجھے ایک پجارو میں بٹھایا اور وہاں سے چل پڑے۔ اب مجھے نہیں پتا وہ کون سا علاقہ تھا۔ مجھے پچھلی سیٹ پر دو بندوں کے درمیان بٹھا دیا گیا۔ پجارو کی کھڑکیوں کے شیشوں پر کپڑے کے پردے تھے جس سے باہر کا منظر نظر نہیں آرہا تھا اور بالکل بھی پتا نہیں چل رہا تھا کہ کہاں سے گزر رہے ہیں۔ کوئی پانچ یا چھ گھنٹے کی مسافت کے بعد مختلف سڑکوں، گلیوں کے موڑ کاٹنے کے بعد پجارو ایک گھر میں داخل ہوئی۔

گھر کا گیٹ لاک کر دیا گیا اور مجھے اُتار کر ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ وہاں پوری رات اور اگلا دن میں نے گزارا پھر رات کے آٹھ بجے انہوں نے مجھے ایک نیا سوٹ دیا اور غسل کروایا۔ پھر رات کے گیارہ بجے میرے سر پر پگڑی باندھ دی گئی اور میرے ٹانگ کی پنڈلی پر کوئی چیز باندھ کر اوپر ٹیپ لپیٹ دی پھر رات کے سوا گیارہ بجے مجھے ایک اور گاڑی میں بٹھا کر ایک ریلوے اسٹیشن پر لایا گیا۔ مجھے سختی سے تنبیہ کی گئی کہ خبردار کوئی حرکت یا اشارہ نہ کرنا۔ تمہاری پنڈلی کے ساتھ ریموٹ کنٹرول بم باندھا گیا ہے۔ خاموشی سے مسافر کی طرح چلو۔ کوئی مشکوک حرکت کی تو ریموٹ کنٹرول کے ذریعے تمہیں اُڑا دیا جائے گا، چنانچہ میں خوفزدہ ہو گیا۔

مجھے پلیٹ فارم کے ایک بینچ پر بٹھا دیا گیا۔ وہاں کچھ اور بھی مسافر بیٹھے تھے۔ مجھ سے کہا گیا کہ نارمل

طریقے سے اس طرح بیٹھو جیسے دوسرے مسافر گاڑی کے انتظار میں بیٹھے ہیں، تھوڑی دیر تک تمہارا بھائی تمہیں لینے کے لیے پہنچ جائے گا۔ وہ بندے مجھے بینچ پر بٹھا کر کہیں غائب ہو گئے۔

پھر آدھے گھنٹے کے بعد میرا بھائی، دونوں بیٹے اور پولیس پارٹی پلیٹ فارم پر آ گئے۔ میں نے اُن کو آواز دی اور وہ دوڑ کر میرے پاس آ گئے۔ میں اُٹھ کر بھائی کے گلے لگ کر رونے لگا۔ پھر بیٹوں سے ملا۔ انہوں نے مجھے تسلی دی اور مجھے ساتھ لے کر ریلوے اسٹیشن سے باہر آ گئے۔ میں نے پولیس والوں کو بتایا کہ میری پنڈلی پر بم باندھا گیا ہے۔ پہلے اس سے چھٹکارا دلائیں چنانچہ پولیس نے بڑی احتیاط سے کھولا اور جب دیکھا تو وہ کوئی بم نہیں بلکہ بچوں کے کھیلنے والا چھوٹا سا موبائل تھا۔ اصل میں اغواء کاروں نے مجھے نفسیاتی طور پر خوفزدہ کیا ہوا تھا کہ میں کوئی حرکت یا شور نہ مچاؤں۔

قصہ مختصر ہم سب اُسی وقت اپنے شہر آنے کے لیے وہاں سے چل پڑے اور صبح گھر پہنچ گئے۔ سب نے میری بخیریت واپسی پر شکرانے کے نوافل ادا کیے۔

☆......☆......☆

پولیس مستعدی سے میرے اغواء کے کیس کی تفتیش کر رہی تھی اور مجرموں کا سراغ لگانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔ اغواء کار تین مختلف نیٹ ورک کے موبائل نمبرز کے ذریعے بھائی سے رابطہ کرتے، جب ایک نمبر سے کال آتی تو پولیس اُس کا سراغ لگاتی تو لوکیشن سے پتا چلتا کہ وہ کال رحیم یار خان کے علاقہ سے کی گئی ہے۔

دوسرے نمبر کو ٹریس کیا جاتا تو پتا چلتا کہ سیالکوٹ کے علاقے سے کال کی گئی ہے، اسی طرح جب تیسرے نمبر سے کال آتی تو پتا چلتا کہ میانوالی کے علاقہ سے کال کی گئی۔ چنانچہ روزانہ مختلف شہروں اور علاقوں سے فون کالز کی جاتی تھیں۔ پولیس مکمل حرکت میں تھی اور مجرموں تک پہنچنے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھی مگر اغواء کاروں نے بُری طرح چکرا کر رکھا ہوا تھا۔ جب اُن نمبروں کا بائیو ڈیٹا نکلوایا گیا تو وہ سب سمیں جعلی ناموں سے وہ چل رہی تھیں، نتیجتاً پولیس اغواء کاروں تک پہنچنے میں ناکام رہی۔

چونکہ میرا اغواء شاہ پور سے ہوا تھا اور میری گاڑی بھی اُسی علاقے سے پولیس کو ملی تھی، لہٰذا یہ کیس شاہ پور پولیس اسٹیشن کا تھا۔

جب ہم گھر پہنچ گئے تو مجھے شاہ پور تھانے بلایا گیا۔ میں بھائی اور بیٹوں کے ساتھ شاہ پور تھانے پہنچ گیا۔ تھانے دار نے مجھ سے پوری تفصیل پوچھی اور کہا کہ کوئی بات نہ چھپاؤں اور سب کچھ کھل کر شروع سے آخر تک سچ بتاؤں تاکہ مجرموں کا سراغ لگایا جا سکے۔ چنانچہ میں نے پوری اور مکمل بات تھانے دار کو بتا دی۔ پھر پولیس نے مجھے ساتھ لیا اور جس گھر میں سدرہ سے ملنے آیا تھا تو وہاں گئے۔ نیلے گیٹ کو تالا لگا ہوا تھا۔ پولیس نے تالا توڑا اور اندر داخل ہو گئی مگر پورا گھر خالی تھا۔ سامان نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ آس پڑوس سے پوچھ گچھ کی گئی تو پتا چلا کہ دو ماہ پہلے یہ مکان کرائے پر لیا گیا تھا۔

پھر اُس مکان کے مالک سے رابطہ کر کے اُسے بلوایا گیا تو اُس نے کہا کہ یہ میرا مکان ہے اور دو ماہ پہلے سکندر نامی ایک شخص نے کرائے پر لیا تھا۔ اُس نے کرایہ نامہ اور سکندر کے شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی دکھائی۔ پولیس نے جب تحقیق کی تو وہ شناختی کارڈ جعلی نکلا۔ مالک مکان نے بتایا کہ سکندر نامی جس بندے نے یہ مکان کرائے پر لیا تھا اُس نے کہا تھا کہ وہ جھنگ کا رہنے والا ہے اور کسی سرکاری محکمے میں افسر ہے۔

اُس کا تبادلہ یہاں ہوا ہے تو اُس کو اپنی اور فیملی کی رہائش کے لیے مکان چاہیے۔ دو تین عورتیں جو کہ برقعے میں تھیں اور دو بچے بھی تھے جن کو سکندر نے اپنی فیملی ظاہر کیا تھا۔ اُس نے تین ماہ کا ایڈوانس کرایہ بھی دیا تھا اور ایک کاغذ پر مختصر کرایہ نامہ لکھا گیا تھا۔ چونکہ مالک مکان کو منہ مانگا کرایہ اور ایڈوانس مل گیا تھا۔ وہ ایک انتہائی سادہ لوح انسان تھا تو اُس نے سکندر کو سرکاری افسر سمجھتے ہوئے بغیر کوئی تحقیق یا ضمانت کے وہ گھر کرائے پر دے دیا تھا۔

الغرض پولیس نے ہر زاویے سے مجرموں کا سراغ

لگانے کی ہر ممکن اور سرتوڑ کوشش کی مگر کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ ضروری کارروائی کے بعد میری کار مجھے واپس دے دی گئی۔

میری رہائی کے عوض اغواء کاروں کو جو تین کروڑ روپے دیے گئے اُن کا انتظام بھائی نے کچھ اس طرح سے کیا۔ پچاس لاکھ روپے فیکٹری کے اکاؤنٹ میں تھے۔ پچاس لاکھ روپے گھر کی تمام خواتین کے زیورات فروخت کرکے، ایک کروڑ مختلف کاروباری پارٹیوں سے دوست احباب سے بطور قرض لیے گئے اور ایک کروڑ روپے بینک سے فیکٹری اور کوٹھی رہن کھوا کر قرض لیا گیا تو اس طرح بھائی نے دس بارہ روز میں تین کروڑ کا بندوبست کیا۔ چنانچہ یہ رقم اغواء کاروں کو دے کر میری خلاصی ہوئی۔ اب چونکہ دو کروڑ کا قرض ہم پر چڑھ گیا تھا۔ کاروبار پر بھی برا اثر پڑا اوپر سے بینک سے جو قرض لیا تھا اُس پر ماہانہ بھاری سود بھی دینا پڑتا تھا تو اس قرض سے نجات حاصل کرنے کے لیے جس کوٹھی میں رہائش تھی وہ فروخت کی، اپنی کاریں بیچ دیں، کچھ پلاٹ بچوں کے گھروں کے لیے خریدے ہوئے تھے وہ فروخت کرکے فوری طور پر قرضہ ادا کیا گیا اور کرائے کی کوٹھی میں رہائش رکھنا پڑی۔

کاروباری ساکھ بری طرح متاثر ہوئی۔ مجھے کئی بیماریوں نے گھیر لیا، ہائی بلڈ پریشر کے ساتھ شوگر اور معدے کا السر ہوگیا۔ بات یہ ہے کہ جو تین کروڑ روپے کا نقصان ہوا کوٹھی، پلاٹ، زیورات اور کاریں بک گئیں یہ نقصان تو شاید کبھی نہ کبھی پورا ہو ہی جائے گا مگر میری جو جگ ہنسائی ہوئی۔ بچوں کے سسرال والوں پر بُرا اثر پڑا۔ لوگ پیٹھ پیچھے میرا تمسخر اُڑاتے ہیں کہ بڈھے کی عمر دیکھو اور اُس کے کرتوت دیکھو۔ خاندان، برادری اور کاروباری طبقے میں میری جو بدنامی ہوئی۔ بیوی بچوں بہوؤں کے سامنا نہیں کرسکتا۔ بہت شرمسار ہوتا ہوں۔ روح زخمی ہوگئی ہے تو یہ خسارہ کیسے پورا ہوگا؟

قارئین کرام اب آپ بتائیں کہ میں نے ٹھیک کہا ہے نہ کہ زندگی میں رنگ ہم خود بھرتے ہیں کیونکہ میری لمحوں کی بھول نے مجھے مٹی میں ملا دیا ہے۔

☆☆......☆☆

سچی کہانیاں کا وہ سلسلہ
جس میں مرد ہی نہیں خواتین بھی مردوں کے اس معاشرے میں
اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات ہمارے پاس بھیج سکتی ہیں

تین مرد تین کہانیاں

چار مُہرے کا کھیل

شمع حفیظ

کراچی سے، ایک ایسے مرد کا قصہ، جس نے محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے کا مقولہ سچ کر دکھایا

گاڑی کے پورچ میں رُکتے ہی وہ صدر دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔ اس کا شوہر حارث اپنے دیرینہ دوست کو ایئرپورٹ سے گھر لے آیا تھا۔ یہ وہ دوست تھا جس کی تعریف میں حارث زمین و آسمان کے قلابے ملایا کرتا، اس کی دوستی، وفاداری اور خلوص کی اتنی تعریف کرتا کہ زیبا اندر ہی اندر جل بھن کر رہ جاتی۔ اسے اطہر کے ذکر سے وحشت ہوتی۔ وہ اپنے شوہر سے دوست کا غائبانہ تعارف اور اس کی دوستی کے مثالی تذکروں کا احوال سُن سُن کر اوب گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان دونوں کے گھر پہنچتے ہی وہ خود کو مرکزی دروازے پر لانے سے روک نہ سکی۔ آج وہ اس شخص کو دیکھنے کی تمنائی تھی جس پر اس کا شوہر فدا تھا۔

حارث نے گاڑی سے اُترتے ہی ہاتھ ہلا کر زیبا کو اپنے آنے کی نوید دی اور ساتھ ہی لپک کر دوسری سائیڈ کا دروازہ کھول دیا۔ اطہر مسکراتے چہرے کے ساتھ گاڑی سے اُتر آیا اور جونہی اس نے چہرہ زیبا کی طرف موڑا تو وہ دھک سے رہ گئی۔ وہ..... وہ تو نعمان تھا۔

آج کتنے برس بعد اس کا چہرہ نظروں کے سامنے تھا۔ مگر وہ چہرہ شادابی کے احساس کو کھو بیٹھا تھا۔ اب اس کے چہرے پر زردی کھنڈی تھی، آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے اور جبڑے کی ہڈی نمایاں تھی۔ آج وہ چہرہ کمزوری کے گہرے احساس کو واضح کر رہا تھا۔ یہ کیا ہو گیا تھا اسے؟ کبھی نعمان کا سراپا کسی تر و تازہ، سرسبز درخت کی مانند مضبوطی اور شادابی کا مظہر تھا مگر آج اس کا کھلتا رنگ و روپ بہار کی بجائے خزاں کا روپ دھارے ایک ٹنڈ منڈ درخت کی طرح زیبا کے دل کو بے کل سا کر گیا۔ وہ دنگ کھڑی تھی۔ اسے نعمان کو جانچنے کا کچھ زیادہ موقع نہ ملا۔ حارث برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر دوست کو ساتھ لیے اس کے قریب آ گیا تھا۔ نعمان کی بھٹکتی نظروں نے بھی زیبا کے وجود کو کھوج لیا تھا۔ اس کی دھندلائی آنکھوں میں شناسائی کا رنگ چمکا اور وہ بھی زیبا کی طرح حیرتوں میں گھر گیا۔ وہ لڑکی جو آج بھی اپنی یادوں اور باتوں سمیت اس کے دل میں زندہ تھی۔ نظروں کے سامنے تھی، جسے دیکھتے ہی وہ اپنے تاثر کو چھپا نہ سکا، ایک بے ساختگی سے بولا۔

”تم یہاں......؟“ زیبا نے گھبرا کر شوہر کی طرف دیکھا جو دوست کے چند لفظی استفہام پر حیرت و استعجاب میں گھر کر بے اختیار بولا۔

”کیا تم دونوں ایک دوسرے سے واقف ہو؟“

”ہاں...... یہ میری یونیورسٹی میں پڑھا کرتے تھے۔“ زیبا نے وقت کی مصلحت کے تحت محتاط انداز اختیار کیا۔

”اوہ..... واٹ اے گریٹ سرپرائز۔“ حارث نے

چونک کر اطہر کو دیکھا۔ ''یہ تو کمال ہو گیا یار۔''
''ہاں، واقعی کمال ہے۔ آج عرصے بعد انہیں یہاں دیکھ کر میں بھی سرپرائز ہو گیا ہوں۔ میں اور بھابی ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھے ہیں۔ انہوں نے آنرز کیا اور میں نے ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ یونیورسٹی فیلو ہونے کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔'' اطہر کی وضاحت حارث



کوخوشدلی عطا کرگئی۔ شوخی سے بولا۔

"چلو یہ اچھا ہوا تم دونوں پہلے سے واقف ہو اور شاید دوست بھی ہو، ورنہ مجھے تعارف کی فارمیلیٹی نبھانی پڑتی جو مجھے بالکل پسند نہیں۔"

"جانتا ہوں۔" اطہر کی مسکراہٹ رسمی تھی۔ "تم دراصل تکلف میں تکلیف محسوس کرتے ہو نا۔"

"ہاں بالکل!" حارث ہنس دیا۔

"لیکن میں زیبا کو یہ ضرور بتاؤں گا کہ وہ لڑکا جو اس کے ساتھ پڑھتا رہا ہے۔ میرا کتنا قریبی دوست ہے۔ ایک جان دو قالب کی طرح، میرا یارِ غار بلکہ کسی سگے بھائی کی طرح حد درجہ عزیز، سچ کہوں تو یہ مجھے عارف سے زیادہ پیارا ہے۔ اس کا خلوص اور محبت بے مثال ہے۔" زیبا شوہر کی جذباتیت پر مسکرادی۔

"میں آپ کے جذبات سے واقف ہوں حارث، لیکن ایک غلطی آپ نے بھی کی ہے۔ آپ نے نعمان صاحب کو ہمیشہ اطہر کہہ کر پکارا۔ اگر آپ ان کا پورا نام لیتے تو شاید میں پہچان لیتی۔"

"اوہ ...... پھر تو واقعی غلطی ہوگئی مجھ سے۔ سوآئی ایم سوری مگر جان لو اس کا پورا نام نعمان اطہر ہے۔" وہ ہنس دیا پھر اپنی ہی دھن میں بولا۔

"دراصل زیبا، اطہر کو میں بچپن ہی سے اسی نام سے پکارتا آیا ہوں۔ اس کی فیملی بھی اسے اطہر کہتی تھی۔ البتہ اسکول و کالج میں لڑکے نعمان کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ شاید اسی لیے تم بھی نعمان کہنے اور سننے کی عادی ہو۔"

"ہوسکتا ہے۔" زیبا نے سرہلایا تو نعمان نے تیزی سے ہاتھ اُٹھا کر اسے کچھ اور کہنے سے روکا۔

"پلیز بس کرو اب۔ میرے نام کا پوسٹ مارٹم بعد میں کرلینا فی الحال تمہاری بیوی سے کچھ حال احوال پوچھ لینے دو۔ ایسا نہ ہو وہ مجھے بدتہذیب جان کر لفٹ ہی نہ کرائیں۔"

"اوہ یس، یو آر رائٹ۔" حارث دوبارہ ہنس پڑا تب نعمان زیبا کی طرف گھوم گیا۔

"کہیے بھابی، کیسی ہیں آپ؟" اس کا انداز بے حد محتاط تھا، یوں جیسے مصنوعی تپاک کا اظہار کررہا ہو۔ اس سے پہلے کہ زیبا کوئی جواب دیتی حارث نے خفگی سے دوست کو گھورا۔

"یار یہ کیا؟" یہ بھابی وابی کیا شروع کردیا تم نے، اگر زیبا کو جانتے ہو تو پلیز اس کا نام لے کر بات کرو۔ بھئی دوست کو دوستی کے حوالے سے ہی یاد رکھنا چاہیے۔"

"سو تو ہے۔" نعمان مسکرایا۔

"میں محض تمہاری وجہ سے بھابی کہہ رہا ہوں۔"

"کیوں۔" اس نے تیوری چڑھائی۔

"کیونکہ میرا خیال ہے تم زیبا کو نام لے کر پکارنے پر برا مان جاؤ گے۔"

"اوہ شٹ اپ یار! یہ بے کار کی حجت ہم دوستوں میں اچھی نہیں لگتی۔ تم زیبا کو زیبا کہہ کر بات کرو مجھے اچھا لگے گا۔"

"تھینکس ...... مطلب یہ ہوا کہ تم بیوی کے معاملے میں خاصے براڈ مائنڈڈ ہو۔" اس کے لہجے میں طنز کی چبھن تھی۔ جسے بھانپ کر حارث نے حظ اٹھایا اور کھلکھلا کر بولا۔

"دیکھا زیبا تم نے ...... یہ ہے دوست کی محبت، موقع پاتے ہی چٹکی بھرنے سے باز نہیں آیا۔ بہرحال تم کچھ دیر اطہر کو کمپنی دو جب تک میں فریش ہوکر آتا ہوں۔"

"ارے فریش بعد میں، پہلے مانی کو لے آئیے۔ اسکول آف ہونے میں بس کچھ ہی دیر ہے۔" زیبا نے اسے فوری ٹوکا تو وہ جانے سے رُک گیا۔

"ارے ہاں یار! مانی اسکول کے گیٹ پر میرا منتظر ہوگا، مجھے جانا چاہیے۔"

"مانی کون؟" اطہر نے چونک کر حارث کو دیکھا۔

"تمہارا بھتیجا...... پانچ سال ہوگئے اسے دنیا میں آئے ہوئے اور تم آج پہلی بار ملوگے میرے بیٹے سے۔"

"اوہ!" اس نے حارث کو بغور دیکھا۔ "کون سی کلاس میں پڑھتا ہے ہمارا بھتیجا؟"

"ابھی فرسٹ اسٹینڈرڈ میں ہے لیکن بہت ذہین اور حاضر جواب بچہ ہے۔ ملوگے تو خوش ہوجاؤ گے۔"

"یقیناً ...... آخر بیٹا ہے تمہارا، کچھ بدمعاش تو ضرور ہوگا۔" اطہر نے مذاق اڑایا مگر حارث برامانے بغیر بولا۔

"کچھ نہیں ...... بہت بدمعاش ہے۔ ابھی سے لڑکیاں اٹریکٹ کرتی ہیں اسے۔ کہتا ہے مس ورلڈ سے شادی کروں گا۔"

"اوہ ہاؤ امیزنگ، پھر تو تم سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔

لے آؤ اُسے، ذرا ہم بھی درشن کرلیں ہونہار بیٹے کے۔''

اس نے اجازت دی تو حارث انہیں ہاتھ ہلا کر نکل گیا۔ اس کی گاڑی جب تک گیٹ سے باہر نہ نکل گئی۔ وہ دونوں بت بنے رہے۔ حارث کا اس وقت منظر سے ہٹنا زیبا کو جیسے پُرسکون کر گیا۔ اس کی غیر موجودگی کو غنیمت جان کر اب اسے نعمان سے کچھ کہنا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا شوہر دوست کی بے تکلفی پر کبھی بھی اس کی طرف سے شکوک وشبہات کا شکار ہو، لیکن حارث کے جاتے ہی نعمان کی گہری نظر نے زیبا کے پُربہار سراپے کو ازسرنو جانچا۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی آگئی تھی۔ چھ سال کی طویل مدت کے بعد وہ آج اس کے روبرو تھی، سبز سوٹ پر لمبا سا دوپٹہ کاندھے پر ڈالے کسی الھڑ مٹیار کی طرح آج بھی لاپروائی کا انداز لیے کھڑی تھی۔ چہرہ البتہ گھمبیر تاثر سے سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا، شاید وہ اس کے اچانک سامنے آنے کی وجہ سے اب تک تناؤ کا شکار تھی۔ اطہر کے لبوں پر مسکراہٹ نے رنگ بھر دیے وہ ایک جذب سے بولا۔

''کچھ زیادہ بدلاؤ نہیں آیا تم میں۔ اب بھی ویسی ہی ہو جیسا آخری ملاقات میں دیکھا تھا۔ نرم ونازک اور نوخیز سی، تمہارا سراپا آج بھی تازگی کا احساس دلا رہا ہے۔''

''نہیں نعمان!'' زیبا کی سنجیدگی میں تھوڑی ناگواری سی تھی۔ ''اب میں ویسی نہیں ہوں جیسا تم سوچ رہے ہو۔ اب بہت اہم بدلاؤ ہے مجھ میں، ایک بڑی تبدیلی۔ آج میں زیبا حسن کے بجائے زیبا حارث ہوں۔''

''ہاں!'' اس نے گہری سانس لی۔ ''تبدیلی واقعی زبردست ہے لیکن سچ مانو، آج پہلی بار مجھے تمہاری بے وفائی کی وجہ سمجھ میں آئی ہے۔ حارث جیسے اسمارٹ اور خوشحال شخص کے لیے کوئی بھی لڑکی مجھے آسانی سے ٹھکرا سکتی تھی۔ لیکن زیبا! حارث تم سے وہ محبت کبھی نہ کر سکے گا جو میں نے تم سے کی۔ میری دیوانگی اب بھی ویسی ہی ہے اور یہ میرا دعویٰ ہے۔''

''دعویٰ کرنے سے کیا ہوگا نعمان، وقت بہت آگے نکل گیا ہے۔ گزرتے وقت میں کس قدر مجبور وبے بس ہوگئی تھی میں...... کیسے بتاؤں تمہیں میں بھولنا نہیں چاہتی تھی لیکن پاپا کے ہارٹ اٹیک نے جیسے سبھی کچھ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان کا پہلا اٹیک ہی سیریس تھا۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔ وہ کچھ پل کے مہمان تھے، سو آخری لمحات میں انہوں نے میرے تحفظ کی خاطر مجھے اپنے بھانجے سے منسوب کر دیا۔ میں انہیں روک نہ سکی۔ ممی زندہ ہوتیں تو شاید حارث سے میرا نکاح اتنی عجلت میں نہ ہوتا لیکن پاپا کو اپنی موت کا احساس ہو گیا تھا سو انہوں نے اپنی آخری سانسوں کے ساتھ جو فیصلہ کیا وہ......''

''پلیز زیبا!'' نعمان نے تلملا کر اس کی بات قطع کی۔ ''بہتر ہوگا اگر یہ فلمی اسٹوری ٹائپ جذباتی کہانی مجھے نہ سناؤ، تمہاری خود ساختہ مجبوری کی یہ داستان میرے دل میں اتری تمہاری محبت کے کسی نقش کو مٹا نہ سکے گی۔ میں آج بھی تمہارے لیے جذباتی ہوں۔ دوری کے باوجود میرے دل میں محبت کی کسک آج بھی زندہ ہے۔ میں اب بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنا......''

''نہیں نعمان......'' زیبا دہل کر پیچھے ہوگئی۔ ''اب ایسا کچھ مت کہو۔ ہمارے درمیان ایسی باتیں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔''

''جانتا ہوں۔'' وہ اس کے نزدیک آ گیا۔ ''لیکن میرے لیے اب بھی ان باتوں کا مفہوم بہت اہم ہے زیبا، میں آج بھی دل اور روح کی گہرائی کے ساتھ تمہیں چاہتا ہوں۔''

''پلیز چپ ہو جاؤ نعمان۔ خدارا ایسی باتیں مت کرو۔ تم اپنے اظہار سے مجھے اس طرح زچ نہیں کر سکتے۔'' اس کی آواز لہرا سی گئی، گھبراہٹ کے باوجود وہ اس کا چہرہ دیکھنے پر مجبور تھی۔ اس کی آنکھوں کی لو دیتی لپٹیں زیبا کو حراساں کرنے لگی۔

''تمہیں میرے کہے پر اعتبار نہیں ہے زیبا؟'' نعمان کی بھاری آواز نے جیسے اس کے خوف کو توڑا۔ وہ بدحواس ہوگئی۔

''تم...... تمہیں یہ سب نہیں کہنا چاہیے۔ تم جانتے ہو تمہارا اظہار میری شادی شدہ زندگی کے لیے کتنا بڑا خطرہ بن سکتا ہے۔''

''جانتا ہوں لیکن میرا اظہار تجدید محبت نہیں ہے اور نہ ہی یہ تمہاری میرڈ لائف میں کوئی رخنہ ڈالے گا۔ تم میری چاہت کے اس اظہار کو اپنی اور حارث کی محبت میں رکاوٹ محسوس نہیں کروگی۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔''

''لیکن...... لیکن ان باتوں کا کیا فائدہ نعمان۔ اگر حارث جان گیا کہ گزرے وقت میں میرا تم سے کیا تعلق تھا

تو وہ ساری دوستی بھول جائے گا۔ مرد کے لیے اس کی بیوی کا ماضی بہت اہمیت رکھتا ہے نعمان۔ وہ خود سے وابستہ عورت کو بہت نیک اور پاکباز دیکھنا چاہتا ہے۔''

''کیا تم پاکباز نہیں ہو؟ کیا میری محبت نے اندھی ہو کر کسی مقام پر تمہیں آلودہ کرنے کی کوشش کی؟''

''نہیں...... نہیں...... لیکن ہمارے ماضی کا کوئی حوالہ حارث کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ پلیز نعمان تم پرانی محبت کے قصے کو سمیٹ دو۔ میں تمہارے کسی اظہار کو سننا نہیں چاہتی اور نہ ہی تمہاری یہ کوشش مجھے متاثر کرے گی۔''

''میں تمہیں متاثر کرنے کی کوشش نہیں کر رہا اور نہ ہی تمہیں کچھ جتانا چاہتا ہوں۔ زیبا کاش میں تمہیں بتا سکتا تمہاری محبت کی تڑپ میرے وجود کا حصہ بن گئی ہے۔ وہ تڑپ ایک خلش بن کر جان لیوا بیماری کی صورت مجھے دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔ وہ ناسور بن کر میرے لہو میں بہہ رہی ہے۔ میں پل پل زندگی سے دور ہوتا جا رہا ہوں۔''

''کک...... کیا مطلب......'' زیبا کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ خوفزدہ سی ہو کر اس کا چہرہ تکنے لگی جو بے حد سنجیدہ تھا۔

''مجھے...... مجھے بلڈ کینسر ہے زیبا...... میری زندگی ڈپازٹ پر ہے۔ میری روح کسی وقت بھی ہمت ہار جائے گی۔''

''یہ...... یہ کیا کہہ رہے ہو نعمان۔'' زیبا کا حلق خشک ہو گیا۔ وہ ہونق سی ہو کر اُسے گھورنے لگی۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ کوئی جھوٹ نہیں ہے اس بات میں۔ میں بلڈ کینسر میں مبتلا ہوں۔ اس مرض میں مریض بظاہر صحت مند دکھائی دیتا ہے لیکن فائنل اسٹیج پر اس کی ساری طاقت جواب دے جاتی ہے۔ میری بیماری ابھی لاسٹ اسٹیج سے دور ہے لیکن اپنی جانب بڑھتی موت کی چاپ میں بہت صاف سن سکتا ہوں۔''

''نن...... نہیں نعمان...... یہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

وہ بری طرح ڈر گئی اس کا وجود کپکپانے لگا، آنکھوں میں نمی اُتر آئی تھی۔ اس کی خوف سے پھیلی ڈبڈبائی آنکھیں نعمان کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر گئیں۔

''زیبا...... یہ کتنی خوبصورت بات ہے کہ تم میرے لیے رو رہی ہو۔ ان لمحات میں...... جب میں...... میں تمہارا کچھ نہیں ہوں...... کچھ بھی نہیں۔''

''نہیں نعمان۔'' وہ رو پڑی۔

''یہ نہیں ہو سکتا۔ تم جیسے خوبرو، جوان اور باوقار مرد کو ایسی گھناؤنی بیماری کیسے ہو سکتی ہے۔ ہائے میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تم میری جدائی کو اتنا محسوس کرو گے۔ یہ...... یہ کیوں ہو گیا؟''

''نعمان۔'' وہ اس کے قریب آ گئی۔

''یہ جھوٹ ہے نا...... پلیز کہو کہ یہ جھوٹ ہے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ نعمان کی آنکھیں جھلملانے لگیں، وہ ضبط کی کڑی منزل پر کھڑا تھا، اشک پی کر بولا۔

''یہ جھوٹ نہیں ہے زیبا، سچ سے منہ موڑنا بزدلی ہے اور پھر ایسے جھوٹ کا کیا فائدہ جو مجھے اور تمہیں اذیت سے دوچار کرے۔ خود کو سنبھالو پلیز۔''

''نہیں میرے خدا...... یہ سب کیا ہے۔ کیوں ہوا یہ سب۔'' اس کی سسکیاں اس کے اختیار سے باہر تھیں۔ نعمان کی بڑھتی اذیت اور دل توڑنے والی اندوہناک حقیقت کا خاردار احساس روح کو گھائل کیے دے رہا تھا۔ اسے نعمان کی آنکھوں کے سیاہ حلقے، چہرے کی زردی اور وجود کی کمزوری اب سمجھ میں آئی تھی۔ بیماری نے اسے کھوکھلا کر کے رکھ چھوڑا تھا۔

''مت رو زیبا۔'' نعمان کی آواز جیسے کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔ ''میں واقعی تمہاری جدائی کا دکھ سہہ نہ سکا اسی لیے خود کو سنبھالنے سے قاصر رہا۔ محبت میٹھا زہر بن کر میرے خون کو زہریلا کرتی رہی اور میں خاموش تماشائی بنا یہ عذاب سہتا جا رہا ہوں۔

بلڈ کینسر کی رپورٹ سے صرف حارث آگاہ ہے۔ اس بھری دنیا میں صرف وہی میرا ہمدرد دوست اور غم خوار ہے، مجھے علم ہوتا کہ وہ تمہارا شوہر ہے تو اسے بھی اس راز میں شامل نہ کرتا، لیکن حارث کو اپنا دکھ سنانا میری مجبوری تھی۔ میں کیا کرتا...... کیا کرتا زیبا۔''

وہ بے چارگی سے برآمدے کی سیڑھی پر بیٹھ گیا اس کا چہرہ بجھ رہا تھا۔ زیبا کو دیکھتے ہوئے وہ دوبارہ بولا۔

''گزرے وقت کی کون کون سی بات سناؤں زیبا، دراصل بابا کے گزرنے کے بعد میری دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ تم جانتی ہو میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ سو تنہائی کا عذاب میرے حصے آیا، چند ایک رشتے دار تھے مگر وہ بھی سفید خون کے مالک، پرائے اور اجنبی لوگوں کی طرح میری

ذات ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ بابا جان کی موت کے بعد ان کی وسیع جائیداد اور دولت میرے حصے آئی۔ میں ان کا واحد وارث تھا۔ اتنی بڑی جائیداد اور زمینوں کا معاملہ بیماری کی وجہ سے میرے لیے کسی وبال سے کم نہیں ہے۔ میں اس دولت کو سنبھالتے تھک گیا ہوں۔ یہ دولت...... یہ زمین جائیداد میں بانٹ دینا چاہتا ہوں مگر سمجھ نہیں آتا میں کیا کروں۔ کسے دوں یہ سب...... بابا کی محنتوں سے کمائی ہوئی یہ دولت میں لٹا نہیں سکتا نہ برباد کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ جائیداد میں نے بے گھر لوگوں کے نام کی ہے۔ کچھ زمینیں فلاحی اداروں کو دے ڈالیں مگر اب بھی بہت کچھ ہے میرے پاس۔۔ ایک بڑا بینک اکاؤنٹ اور شیئرز، آخر کس کے نام کروں۔ کچھ سمجھ نہیں آتا۔ حارث کو کہتا ہوں وہ لے لے مگر وہ کچھ سننا نہیں چاہتا، اسے لگتا ہے میرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔

لیکن میں سچ کہتا ہوں یہ دولت میرا امتحان بن گئی ہے۔ یہ جائیداد زمین اور پیسہ میری بیماری دور کر کے میری زندگی کو آسان نہیں بنا سکتے۔ جب یہ میرے کسی کام کے نہیں تو کیا کروں اسے لے کر۔ میرا کوئی نہیں ہے زیبا۔ جس کے نام میں یہ سب لکھ دوں۔ مرنے سے پہلے دولت کا یہ عذاب میں خود سے دور کرنا چاہتا ہوں تا کہ یہ میرے گلے کا طوق نہ بنے۔''

''یہ...... یہ کیسی باتیں کر رہے ہو نعمان۔'' زیبا بری طرح گھبرا گئی۔ ''ایسی مایوسی بھری سوچ کیوں ہے تمہاری؟'' پلیز خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کرو۔ کینسر لاعلاج نہیں رہا۔ جدید تحقیقات کے نتیجے میں اب امریکہ، انگلینڈ اور فرانس میں کینسر کے کئی کیسز ڈیل کیے جا چکے ہیں اور کئی لوگوں کو شفا ملی ہے۔ دیکھو اگر ابتدائی اسٹیج پر ہی کینسر تشخیص ہو جائے تو وہ قابل علاج ہے۔ تم نے ابھی کہا ہے نا تم لاسٹ اسٹیج سے دور ہو تو ایسا کرو تم...... تم امریکہ چلے جاؤ۔ پیسہ ہے تمہارے پاس، تم اپنا علاج کراؤ۔ تم نصیب والے ہو، اپنے دکھ کا مداوا کر سکتے ہو ورنہ سوچو یہ روپیہ جائیداد نہ ہوتی تو تم کیا کرتے۔''

''میں سکھ سے جیتا زیبا...... میں سکھ سے مر سکتا مگر اب یہ مال و دولت میرے لیے کسی بڑی آزمائش سے کم نہیں ہے اور سچ تو یہ ہے میں اتنی دور پرائی سرزمین پر جا کر مرنا بھی نہیں چاہتا۔'' اس نے افسردگی سے سر ہاتھوں پر ڈال لیا۔

''ایسا نہ کہو نعمان۔'' زیبا خود کو اس کے قریب جانے سے روک نہ پائی۔ اس کے کاندھے کو تھپک کر رندھی آواز سے بولی۔

''مرنے کی باتیں مت کرو پلیز! میرا دل بند ہو جائے گا۔ تم مجھ پر بھروسا کر سکتے ہو۔ دیکھو ابھی تم زندہ رہو گے۔ میرا دل کہتا ہے تم بہت سارا جیو گے۔ ٹرسٹ می نعمان...... میری باتوں پر یقین رکھو۔''

''کیسے رکھوں۔'' وہ یکدم چیخ پڑا۔

''بھول گئیں تم...... تمہارا دل مجھے بھی اپنا مانتا تھا۔ کبھی میں تمہاری چاہت تھا۔ تمہاری آتی جاتی سانس، تمہارا جیون تھا مگر اب کیا ہوا۔ تمہارا دل جھوٹا نکلا ناں، پھر کیسے بھروسا کروں۔ تمہاری جذباتیت کچھ نہیں تھی۔ وہ سب کہا سنا سطحی اور بکواس تھا۔ درحقیقت میں تمہارے لیے کچھ تھا ہی نہیں...... تم نے۔'' نعمان نے اچانک اس کی طرف انگلی اٹھائی تم نے میری محبت کو اتنا غیر اہم جانا کہ اپنے باپ کی مجبوری پر خاموشی سے سر جھکا دیا۔ یہ بھی نہ سوچا محبت زندگی میں بس ایک بار ہوتی ہے اگر واقعی وہ محبت ہی ہے تو۔'' نعمان کی آواز بری طرح رندھ گئی۔ وہ رونے لگا۔

''کیسے بتاؤں میں تمہیں؟ کیسے بتاؤں زیبا کہ تمہاری محبت آج بھی اس دل سے نکلنے پر آمادہ نہیں۔ اس نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ تمہاری رفاقت میں گزرا ہر لمحہ...... تمہاری کہی ہر بات میرے وجود میں اپنی بازگشت کی صورت کسی خودرو جھاڑی کی طرح دور تک پھیل گئی ہے۔ میں اس کی ایک جڑ بھی کاٹنا چاہوں تو وہاں مزید جڑیں پھوٹ پڑتی ہیں۔ تمہاری محبت کسی ناسور کی طرح مجھے اپنے شکنجے میں کس دیتی ہے۔ میں بے بس ہو گیا ہوں زیبا...... تمہاری محبت میں پڑ کر میں برباد ہو گیا ہوں۔''

وہ ضبط کا دامن چھوڑ بیٹھا، زیبا کا دل بری طرح پھڑپھڑایا ہزاروں ان دیکھے کانچ چھناکے سے ٹوٹ کر جیسے ریزہ ریزہ ہو گئے۔ اس کے ہاتھ بے اختیار نعمان کے کاندھوں پر ٹک گئے۔ اب وہ خود بھی زار و قطار رو رہی تھی۔ وہ اسے دلاسا دینا چاہتی تھی مگر زبان گویائی بھول بیٹھی۔ جذبات منجمد تھے لیکن دل رو رہا تھا۔ عجب سی صورت حال تھی۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش میں جیسے ہر بات بھول گئی تھی۔ نعمان کی بیماری نے اسے بری طرح توڑ پھوڑ ڈالا تھا۔

جب ہی حارث کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی نعمان اور زیبا کو اب تک برآمدے میں بیٹھا دیکھ کر وہ حیرت میں پڑ گیا۔ وہ کیوں اب تک وہیں بیٹھے تھے؟ اور کس قدر قریب بیٹھے تھے۔ کیوں...... آخر کیوں؟

حارث کا ماتھا ٹھنکا لیکن مانی کی موجودگی نے اسے کوئی سوال کرنے نہ دیا۔ وہ اس کا اسکول بیگ اٹھائے وہیں چلا آیا جبکہ مانی آتے ہی ماں سے لپٹ گیا وہ زیبا کو روتا دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔

''ممی...... ممی کیا ہوا؟'' اس کی باریک آواز پریشانی سے پُر تھی۔

''کیا بات ہے زیبا...... کیوں رو رہے ہو دونوں اس طرح۔'' حارث کی آواز بھی اس کے قابو سے باہر تھی۔ وہ نعمان کو منہ چھپائے اور زیبا کو بلکتا دیکھ کر متوحش انداز سے ان کے سر پر آ کھڑا ہوا تھا۔

زیبا نے اس کے سوال نظر انداز کر دیے۔ وہ ایک جھٹکے سے مڑی اور خود سے لپٹے مانی کا ہاتھ پکڑ کر بہتی آنکھوں سمیت اندر لے گئی۔ حارث کو دم گھٹتا محسوس ہوا وہ تیز قدموں سے نعمان کے قریب آ گیا۔

''کیا بات ہے اطہر یہ کیا ہو رہا ہے یار...... فار گاڈ سیک کچھ تو کہو۔'' نعمان سیڑھی سے اُٹھ کر حارث سے لپٹ گیا اور اشکوں کو ضبط کرتے ہوئے بولا۔

''میں بہت ایموشنل ہو گیا تھا حارث اپنے جذبات میں پڑ کر، میں نے زیبا کو اپنی بیماری کے بارے میں سب کچھ کہہ ڈالا۔ میں اس کے سامنے خود کو چھپا نہ سکا۔''

''اوہ!'' حارث کے بازوؤں کا حصار نعمان کے گرد کچھ ڈھیلا پڑ گیا۔ ''یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ زیبا بہت حساس عورت ہے۔ وہ اتنی بری خبر سن کر بھی طرح بکھر جائے گی اسے سنبھالنا میرے لیے مشکل ہو جائے گا یار۔''

''میں جانتا ہوں۔'' نعمان آنکھیں پونچھنے لگا۔

''پر جانے کیوں زیبا کو دیکھ کر مجھے اپنا بیتا وقت یاد آ گیا۔ وہ مجھے اپنی ہمدرد لگی اور میں نے جذباتی ہو کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیا۔ میں نے اسے سب کچھ کہہ ڈالا حارث۔''

''سب کچھ؟'' حارث کا سوالیہ لہجہ بے حد اضطرابی تھا۔

''کیا سب کچھ؟'' نعمان نے مڑ کر بھری آنکھوں سے دوست کو دیکھا پھر نظریں چرا کر ہولے سے کہا۔

''وہ سب کچھ جو آج تک میرے دل میں ایک گھٹن کی صورت قید تھا۔ مجھے دل ہلکا کرنا تھا حارث سو کر دیا۔''

''لیکن کیوں اطہر...... وہ عورت ذات ہے، تمہاری تکلیف اور اذیت سہہ نہیں پائے گی۔ پھر تم نے اسے سب کچھ کیوں سنایا۔ آئی تھنک زیبا سے تمہارے مراسم کچھ اور طرح کے ہیں، شاید وہ تمہاری قریبی دوست رہی ہے جب ہی دل کی گھٹن اور بوجھ کو دانستہ اس کے سامنے اُتار پھینکا ہے تم نے۔'' حارث کا انداز بدلا ہوا تھا۔ نعمان چونک کر اس کی صورت تکنے لگا۔

''نہیں حارث وہ کبھی میری قریبی دوست نہیں تھی۔ ہمارا ریلیشن واجبی سا تھا، تم خیال مت کرو، میں نے کہا ہے نا میں جذباتی ہو گیا تھا۔ مرنے والا کسی کی ہمدردی پا کر جذباتی ہو جایا کرتا ہے، سو فارگیٹ اِٹ یار۔''

''نہیں اطہر...... تم اتنی جلدی خود کو لوز نہیں کرتے۔ سچ کہو زیبا کو دیکھ کر تم نے ایسے ری ایکٹ کیوں کیا؟''

پلیز حارث...... شک میں مت پڑو یار، وہ ایک عورت ہے اور عورت میں ماما کا جذبہ مرد سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ زیبا عورت ہونے کے ناتے مجھے تم سے بہتر تسلی دے سکتی تھی۔ شاید اس کی ہمدردی پانے کے لیے میں نے بے سوچے سمجھے اصل کہانی کہہ سنائی۔ لیکن میں نے غلطی کی ہے۔ مجھے واقعی خود کو لوز کرنا نہیں چاہیے تھا۔'' اس نے فوراً اپنی خطا مان لی۔

''یہی تو...... میں بھی یہی کہہ رہا ہوں۔ وہ بری طرح رو رہی تھی اطہر، اس نے تسلی کے الفاظ کہاں کہے ہوں گے تم سے۔''

''ہاں...... وہ رو پڑی۔'' نعمان کی آنکھیں پھر سے بھر آئیں۔

''سب کچھ جان کر وہ بے چاری دکھی ہو گئی ہے لیکن میں خوش ہوں۔ میری موت پر اب تمہارے ساتھ وہ بھی رونے والوں میں شامل ہو گی۔''

''بکو مت۔'' حارث نے اسے دوبارہ گلے لگا لیا۔

''اتنی مایوسی کی باتیں کیوں کرتے ہو یار، مت بھولو جو بیماری دیتا ہے وہی شفا بھی عطا کرتا ہے۔ بس تم خود کو اللہ کے سپرد کر دو۔''

''اب تک یہی تو کیا ہے میں نے۔'' نعمان نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور حارث سے دور ہو گیا لیکن حارث

جانتا تھا وہ اب تک اپنے اشک پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ سو اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی اور اسے لے کر اندر کمرے کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

"بالکل پاگل ہو تم...... اب تک باہر کاریڈور میں کھڑے باتیں بھگار رہے ہو۔ چلو اندر آؤ اور مانی سے ملو۔ وہ بے چارہ آتے ہی ماں کے ساتھ ایک اجنبی کو روتا دیکھ کر پریشان ہو گیا ہے۔ پلیز اس کی خاطر تھوڑا سنبھل جاؤ۔"

سوری حارث...... میں اپنی جذباتیت پر معذرت چاہتا ہوں۔ بلاؤ اپنے صاحبزادے کو میں اُس کی پریشانی ابھی دور کیے دیتا ہوں۔ لیکن ٹھہرو۔" وہ چلتے سے رُک گیا اور شکوے سے بولا۔

"تم نے مجھے مانی کے بارے میں پہلے کبھی بتایا ہی نہیں۔ ہماری اتنی گہری دوستی میں یہ بات کہاں چھپی رہی۔ کیا تمہارا فرض نہیں تھا کہ تم مجھے چچا بننے کی خوشخبری دیتے۔"

"اوہ آئی ایم سوری۔" حارث سنجیدہ ہو گیا۔ "لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے اطہر ہم جب بھی ملے تمہاری بیماری کے دوران پریشانی میں ملے، اس طرف دھیان ہی نہیں گیا مگر اب بھی دیر نہیں ہوئی۔ تم آج اسے چچا بن کر مل لو، وہ خوش ہو جائے گا۔"

"لیکن یہ خوشی ادھوری رہے گی۔ میں کوئی گفٹ نہیں لایا اس کے لیے۔ اب خالی ہاتھوں سے اسے کیا وش کروں گا۔" نعمان نے شرمساری دکھائی تو حارث مسکرا دیا۔

"میرا بیٹا بہت سمجھدار ہے اطہر۔ وہ گفٹ سے زیادہ محبت پر بلیو کرتا ہے۔"

'اوہ پھر تو زیبا کا عکس ہوا جب ہی تو۔' وہ کہہ نہ سکا صرف مسکرا دیا۔

"تم بیٹھو، میں ان ماں بیٹے کو لے کر آتا ہوں۔" حارث نے صوفے کی طرف اشارہ کیا اور بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔ لیکن ملازم کی صدا نے اس کے اٹھتے قدموں کو روک دیا۔

"صاحب لنچ ریڈی ہے آپ ٹیبل پر آ جائیں۔ بیگم صاحبہ آپ کی منتظر ہیں۔ انہوں نے کہا ہے دوست کو بھی لے آئیں۔"

"او کے تم جاؤ ہم آتے ہیں۔" حارث الٹے پاؤں لوٹ آیا۔ نعمان ساری بات سن چکا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور حارث کے ہمراہ ڈائننگ روم میں چلا آیا۔ زیبا کھانا چن رہی تھی۔ ملازم اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ مانی البتہ کہیں نہیں تھا۔ وہ دونوں ہاتھ دھو کر اپنی کرسیوں پر آ بیٹھے۔ نعمان نے دیکھا زیبا کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ خاصی افسردہ سی تھی۔ اس کے دل کو تسکین کے گہرے احساس نے چھوا، محبت کبھی نہیں مرتی، یہ خیال بے حد نشاط پرور تھا۔ وہ آج بھی دل کی ڈور اپنے نازک جذبات سے توڑ نہیں پائی تھی۔ جب ہی تو اطہر کی اذیت پر اتنا ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ نعمان کو جیسے اطمینان سا ہوا۔

"مانی کدھر ہے؟" حارث نے بیٹھتے ہی سوال کیا۔ زیبا نے سر اٹھا کے اسے دیکھا۔

"وہ خفا ہے مجھ سے۔"

"کیوں؟" حارث کے ساتھ نعمان کا بھی یہی سوال تھا۔

"میں رو رہی تھی اس لیے۔" زیبا نے نظریں چرائیں۔

"آپ جانتے ہیں نا وہ مجھے روتا نہیں دیکھ سکتا۔"

"ہاں بھئی لاڈلا جو ہوا۔ ماں میں جان ہے اس کی۔" حارث ہنس دیا۔

"نہیں، ماں ہوتی ہی ایسی ہے یار، ہر بچہ اس کے دامن میں آ کر پناہ لیتا ہے پھر اس کی اُداسی کو کیسے سہہ پائے گا، تمہیں مانی کو پہلے منانا چاہیے تھا۔" نعمان نے زیبا سے کہا تو وہ دھیرے سے بولی۔

"آ جائے گا ابھی، وہ زیادہ دیر ناراض نہیں رہتا مجھ سے۔"

"گڈ، پھر تو بہت ڈیسنٹ بچہ ہے وہ۔"

"ہاں بھئی، میرا بیٹا ہے نا اس لیے۔" حارث نے دوست کی بات کچھ اور طرح رکھی تو وہ بھی ہنس دیا۔

"یُو نو بیٹے ماؤں کے ہوتے ہیں حارث۔ اب ایک بیٹی بھی پیدا کر لو اسے اپنا کہنا وہ محبت جتائے گی تم سے۔"

"شاید ٹھیک کہتے ہو تم، پر اس کے لیے پہلے زیبا کو منانا پڑے گا۔ وہ کم بچوں کی قائل ہے۔" حارث نے شوخی دکھائی۔ تو زیبا سرخ ہو گئی۔

"فضول مت بولیے اور کھانے پر دھیان دیجیے۔ دیکھیے ذرا نعمان کی پلیٹ اب تک خالی ہے، دوست کے کھانے پینے پر دھیان رکھیں آپ میزبان ہیں ان کے۔"

"ہاں بھئی اطہر، چلو فوراً شروع ہو جاؤ ورنہ ہماری مسز میزبانی کے اصولوں پر لیکچر دینے لگیں گی۔" حارث نے ہنس کر سالن کا ڈونگا نعمان کی طرف بڑھا دیا تو وہ کھانے کی طرف متوجہ ہوگیا۔ زیبا حارث کے پہلو میں آ بیٹھی۔ وہ سب خاموشی سے کھا رہے تھے جب ہی مانی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ وہ نعمان کو گھورتا ہوا اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ اس کی آنکھوں سے ناپسندیدگی جھلک رہی تھی۔ وہ واضح طور پر خفا تھا نعمان سے کیونکہ اس کی وجہ سے اس کی ماما کی آنکھوں سے اشک بہے تھے۔ ماما کو روتا دیکھنا مانی کے لیے سب سے بڑی اذیت تھی۔ اسے اپنی ماں سب سے زیادہ عزیز تھی۔ زیبا اور حارث بیٹے کے خفا سے تاثر پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ لیکن نعمان سنجیدگی سے اس بچے کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ حارث سے مشابہہ تھا مگر اس کی آنکھیں زیبا جیسی تھیں، اس کی خفگی کا اسٹائل بھی ماں کے انداز کا عکس تھا۔

"ہیلو مسٹر جونیئر!" نعمان نے پلیٹ پر چمچہ بجا کر اسے متوجہ کیا اس کی تیوری چڑھ گئی ناگواری سے بولا۔

"آئی ایم ناٹ مسٹر جونیئر...... میرا نام نعمان ہے...... نعمان حارث۔"

"نعمان!" چمچہ نعمان کے ہاتھ سے گر گیا۔ اس کی حیرت بھری نظر فوری طور پر زیبا کی طرف اٹھی۔ وہ نظریں چرا گئی مگر اس کے چہرے کا گھبرایا تاثر نعمان کے ہر سوال کا جواب تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ایک پل میں اسے اپنے اندر توانائی سی دوڑتی محسوس ہوئی۔

"اوہ...... گویا زیبا نے مجھے خود سے کبھی جدا نہیں کیا۔ اس نے بیٹے کو میرا نام دے دیا تاکہ زندگی بھر میرا نام اس کے لبوں پر مچلتا رہے۔ اوہ خدایا! کتنی گہری چاہت ہے اس لڑکی کی...... اس نے محبت کا حق بلاشبہ ادا کر دیا۔" وہ اپنی ہی سوچ پر مسرور تھا۔ وہ جو آج حارث کی بیوی تھی۔ کیا صرف بیوی تھی؟ اس کے دل پر آج بھی نعمان کا نام کندہ تھا۔ اس نے دھڑ دھڑ دھڑکتے دل کو بہ مشکل سنبھالا اور مانی کو دیکھ کر سنجیدگی سے بولا۔

"اِٹس اے نائس نیم، آئی لائیک اِٹ...... کس نے رکھا تمہارا یہ نام؟"

"میرے پاپا نے۔" مانی کا جواب غیر متوقع تھا۔ "یہ نام ان کے دوست کا ہے، جسے وہ بہت لائیک کرتے ہیں۔"

"اوہ...... واٹس گریٹ۔" نعمان کی دھڑکن مدھم پڑ گئی۔

"تم پر بہت سوٹ کر رہا ہے یہ نام۔"

"تھینکس اور آپ کا کیا نام ہے؟" وہ چمکتی آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔

"میرا نام۔" نعمان کو بے چینی نے آ گھیرا اس نے بہ غور اپنے سامنے بیٹھے بچے کو دیکھا پھر کھنکھار کر بولا۔

"میرا نام اطہر ہے...... اطہر وقار علی۔" اس نے اپنے باپ کے نام کو ساتھ جوڑ لیا، حارث زور سے ہنس پڑا۔

"اوہ...... یہ بھی اچھا نام ہے۔ آئی لائیک اِٹ۔" مانی نے اس کی نقل اتاری تو نعمان نے اٹھ کر اسے گود میں بھر لیا۔

"مجھ سے دوستی کرو گے؟"

"نہیں...... آپ نے میری ماما کو رُلایا ہے۔" مانی نے ہونٹ نکالے۔

"اب نہیں رُلاؤں گا، پرامس۔" اس نے اپنا ہاتھ مانی کی طرف بڑھایا۔

"اِٹس اے گاڈ پرامس۔" وہ بے یقین تھا۔

"ہوں...... گاڈ پرامس!" نعمان نے اقرار کیا تو مانی نے اپنی بانہیں اس کی گردن میں حمائل کر دیں، زیبا نے آنکھیں میچ لیں، جبکہ حارث بیٹے کی جذباتیت پر ہنس دیا۔ نعمان نے اسے سینے میں بھینچ لیا تھا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن حارث ناشتے پر نعمان کو بلانے اس کے کمرے میں آیا تو کمرہ خالی تھا۔ نعمان کا بیگ بھی اپنی جگہ پر نہیں تھا، البتہ ایک بند لفافہ اس کے بستر پر پڑا تھا۔ حارث نے لپک کر اسے اٹھایا نعمان کی غیر موجودگی سے اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اس نے تیزی سے لفافہ چاک کیا اور تہہ شدہ کاغذ کو باہر نکالا۔ یہ قانونی دستاویز بھی اور ساتھ ایک نوٹ بھی تھا۔ حارث کی نظریں نعمان کی لکھائی پر پھسلنے لگیں اس نے لکھا تھا۔

حارث!

میں جا رہا ہوں۔ جانے سے پہلے تمہارے بیٹے کو اپنی جائیداد اور دولت گفٹ کرنا چاہتا ہوں۔ تم لاکھ انکار کر دو یا برا مانو مگر اس بار میرا فیصلہ بدلے گا نہیں۔ میری ہر چیز پر

تمہارے بیٹے کا حق ہے۔ کیونکہ تم نے دوستی کے جذبے کی لاج رکھی ہے۔ تم نے مجھ سے اتنی محبت کی کہ اپنے بیٹے کو میرا نام دے دیا۔ یہ بہت بڑا احساس کیا ہے مجھ پر۔ تم نے میری جوان موت کو بیٹے کی صورت میں زندگی بخشی ہے۔ یہ زندگی ہر غم اور فکر سے دور ہو اور خوشی کے سائے میں پھلے پھولے، سو اسی لیے میں اپنی جملہ جائیداد نعمان حارث کے نام کرتا ہوں۔ یہ اس کے لیے اس کے چچا کا تحفہ ہے۔ میں اس کے لیے کچھ نہ لا سکا سو اب کسر پوری کر دینا چاہتا ہوں۔ میرا بینک بیلنس مانی کو بہترین تعلیم کے ساتھ ایک بہترین مستقبل بھی دے سکتا ہے۔ ترتیب تمہاری ہوگی اور خرچا میرا...... مجھے اپنی زندگی میں ایک اچھا کام کرنے کی خوشی مل رہی ہے پلیز چھیننا مت۔

میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں، خدا کرے زیبا اور مانی کے ساتھ زندگی کی ہر خوشی سمیٹو۔

تمہارا دوست ''اطہر''

حارث کا دل چاہا وہ اٹھ کر کمرے میں رقص کرنا شروع کر دے، دھمال ڈالے اور اتنا ادھم مچائے کہ من میں مچلتے خوشی کے جذبے کو قرار آ جائے۔ اس کی پلاننگ اتنی کامیابی سے ہمکنار ہوگی اور اتنی جلدی ہوگی ایسا تو اس نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔

اطہر اور زیبا کے افیئر کی خبر اسے شادی کے ابتدائی دنوں میں ہی ہوگئی تھی۔ اس نے ایک دن الماری میں پڑی زیبا کی ڈائری چوری چھپے پڑھ ڈالی تھی۔ رقابت کا احساس بے حد جان لیوا تھا۔ وہ فوری طور پر نعمان سے ملا مگر وہاں اس کے لیے ایک گڈ نیوز تھی۔ نعمان کینسر جیسے موذی مرض میں گرفتار ہو گیا تھا اور زندگی بچانے کی تگ ودو میں مبتلا تھا۔ اس کی موت یقینی تھی۔ یہی بات حارث کو پلان بنانے پر مجبور کر گئی۔

اطہر زیبا کا محبوب تھا۔ یہ سچائی اسے ہضم نہیں ہوئی تھی۔ سو اس نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ اس نے نعمان کو اپنے قریب کرنا شروع کر دیا۔ دوستی کے ایسے جلوے اور مظاہرے دکھائے کہ اطہر اس پر اندھا اعتبار کرنے پر مجبور ہوگیا۔ حارث نے سات سال یہ ڈراما رچائے رکھا۔ اس نے اطہر کو کانوں کان یہ خبر نہ ہونے دی کہ وہ اس کی محبوبہ کا شوہر ہے۔ اس نے ایسے حالات پیدا کیے کہ اطہر زیبا سے کبھی مل نہ سکا، موت دھیرے دھیرے اس کے وجود پر اپنے پنجے گاڑتی رہی۔

دوسری طرف حارث نے زیبا کو بھی محبت کی سزا دے ڈالی، اس کے یہاں پہلا بیٹا پیدا ہوا تو اس کا نام نعمان رکھ دیا۔ زیبا نے بہت مخالفت کی مگر حارث نے ایک نہ سنی۔ وہ چاہتا تھا یہ نام زیبا کا امتحان بن جائے۔ وہ جب بھی بیٹے کو پکارے ایک خلش میں مبتلا ہو جائے۔ وہ اس شخص کو نہ بھولے جسے اس نے بے حساب چاہا تھا۔ بیٹے کی صورت یہ اذیت اسے ملتی رہے۔ وہ حارث کی وفادار ہو کر بھی اپنے دل کا حال نہ کہہ سکے اور ایسی اذیت اسے عمر بھر بھگتنی تھی۔ حارث کے پھیلائے جال سے نکلنا اس کے بس سے باہر تھا۔

وقت کچھ اور بیتا تو نعمان موت سے بے بس ہو کر اپنی جائیداد بانٹنے پر مجبور ہوگیا۔ وہ ایک امیر باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ بے حساب جائیداد اور سونا اگلتی زمینوں کا مالک، اس کی تجوری نوٹوں سے بھری پڑی تھی۔ اس نے دوست کو حقِ دوستی کے تحت اس دولت سے نوازنا چاہا مگر حارث نے جھوٹی غیرت کا مظاہرہ کر کے اس کی دولت لینے سے صاف انکار کر دیا مگر اس کا پلان کچھ اور تھا۔ اس بار اس نے زیبا کے ساتھ اپنے بیٹے مانی کا استعمال بھی کیا۔ اور نعمان کو علاج کا لالچ دے کر اپنے گھر لے آیا۔ نعمان زیبا سے مل کر اپنی محبت کا ماتم کرتا رہا۔ مگر اسے جذباتی شکست تب ہوئی جب اس نے مانی کو دیکھا۔

''وہ نعمان حارث تھا، یہ بات نعمان اطہر سہہ نہیں پایا۔ دوست نے محبت اور دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔ ایسا وہ سوچ رہا تھا، سو اس سوچ کے تحت اس نے ایک شرمندگی سے اپنا سب کچھ مانی کے نام کر دیا اور خود ہمیشہ کے لیے حارث کی زندگی سے نکل گیا۔

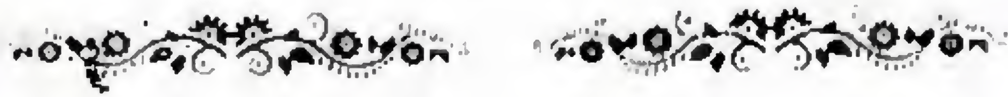
اور آج حارث بہتی گنگا میں نہا رہا ہے جیسا سوچا تھا، ویسا پایا تھا۔ زیبا کی محبت کو بیٹے کی صورت کیش کروانے میں اسے کوئی شرم نہیں آئی تھی۔ مرتے ہوئے دوست کی دولت پر صرف اس کا حق تھا، وہ کیسے جانے دیتا، سو آج پاور آف اٹارنی کا قانونی کاغذ حاصل کر کے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تھا۔ یہ کمینگی اور دوست سے بے وفائی کی حد تھی لیکن حارث کو کوئی افسوس نہ تھا۔ وہ چار مہرے کی بازی جیت چکا تھا۔

☆☆......☆☆

تُو کاری نہیں

حمیرا خان

ایک ایسے بھائی کا قصہ، پچھتاوے کی آگ نے جسے قبر کا مجاور بنا دیا تھا، مگر.....



سردی سے بے نیاز وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے ایک ہی انداز سے بیٹھا کوئی بے جان پتلا دکھائی دے رہا تھا، بھی دروازے پر ہونے والی دستک پر اس بے جان پتلے میں ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی مگر وہ چارپائی سے اٹھا نہیں، دروازے پر ایک بار پھر دستک دی گئی، اس بار دستک بہت زوردار انداز سے دی گئی تھی۔ ''آہ'' اس نے دروازہ کھولنے کے لیے اٹھنا چاہا تو جسم کے کئی حصوں میں درد کی لہریں دوڑ گئیں، اتنی دیر تک ایک ہی انداز میں بیٹھے بیٹھے جسم سردی اور تھکن سے اکڑ سا گیا تھا۔ اس نے اجنبی نظروں سے اپنے اردگرد نظر ڈالی، سورج نہ جانے کب اسے تکتے تکتے تھک کر آنکھیں موند گیا تھا۔

''کہاں تھے لالہ؟ میں کب سے دروازہ بجا رہا ہوں'' دروازہ کھولنے پر ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکا چہرے پر ناراضگی لیے شکوہ کرنے لگا۔ ''اچھا یہ میں تیرے لیے روٹی لایا ہوں کھالینا، تم نے دوپہر میں بھی کھانا نہیں کھایا تھا'' وہ بنا کوئی جواب دیے خالی خالی نظروں سے اس کا چہرہ تکتا رہا تو لڑکا اس کے ہاتھ میں کھانا پکڑا کر پلٹ گیا۔

وہ کتنے ہی لمحے خالی ذہن لیے دروازہ پر کھڑا باہر پھیلے اندھیرے پر نظریں جمائے رہا، پھر دروازہ بند کر کے کمرے کی طرف بڑھا، تب ہی اسے پہلی بار گھر میں چھائے اندھیرے اور سردی کا احساس ہوا۔

''لالہ کتنی بار کہا ہے مغرب سے پہلے ضرور گھر آجایا کرو، مجھے اندھیرے سے بہت ڈر لگتا ہے'' وہ روٹھے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ راحیل نے جلدی سے کمرے میں داخل ہو کر دیوار ٹٹولتے ہوئے بلب کا بٹن دبا دیا۔ کمرہ روشنی سے بھر گیا، مگر وہ روٹھنے والی اب وہاں کہیں نہیں تھی، خالی کمرہ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ دروازہ بند کر کے کھانا ٹیبل پر رکھ کر بستر کی طرف بڑھ گیا، اس کے اندر جیسے بھوک کا احساس ہی مٹ گیا تھا۔ بلب کی روشنی دیوار پر سائے بناتی اس کے چہرے کے نقوش کو اجاگر کرنے لگی، اس کا سرخ و سفید چہرہ زرد زرد تھا۔ حزن و ملال کے رنگ میں ڈوبی خوبصورت ساحر آنکھوں کا سحر کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ باہر کہیں ڈھولک کی تھاپ کی آواز تیز ہوتی محسوس ہونے لگی، اس نے لب بھینچ کر شاید کچھ آہوں کو اپنے اندر قید کرنا چاہا، مگر اب یہ اس کے بس میں نہیں تھا، بلکہ اس کے اختیار میں تو اب کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ اس نے بے چین ہوتے دل پر ہاتھ رکھا تو اس کی مٹھی میں دبا مڑا تڑا سا کاغذ اپنے ہونے کا احساس دلانے لگا۔ راحیل نے بے اختیار اس کاغذ کو دور فرش پر اچھال



دیا، جیسے اس نے انجانے میں اپنے ہاتھ میں کوئی زہریلا سانپ پکڑ رکھا ہو اس کی نگاہیں فرش سے ہوتی ہوئی اس کی نگاہیں دیوار کی طرف اٹھ گئیں۔ سامنے ہی دیوار پر نظر آتی تصویر میں ماہ رخ اپنی تمام تر خوبصورتی اور معصومیت سمیت مسکراتی آنکھوں میں شرارت کے رنگ لیے اپنے لالہ کو دیکھ رہی تھی۔ جس تصویر پر پچھلے پندرہ دن سے اس نے ایک نظر بھی ڈالنا گوارا نہیں کیا تھا، آج وہ بے اختیار ہی اس تصویر کو دیکھے گیا۔

''میری ماہی۔'' اس کے لبوں سے درد میں ڈوبی سرگوشی ابھری اور ساحر کی آنکھیں نمکین پانیوں میں ڈوب گئیں۔

☆......☆......☆



''تم ہر وقت روتی کیوں رہتی ہو؟'' گیارہ سالہ راحیل اپنے سے پانچ سال چھوٹی ماہ رخ سے پوچھ رہا تھا۔

''مجھے امی ابو یاد آتے ہیں'' وہ اپنے لالہ کے سوال پر حیران ہوتی بتانے لگی۔

''کوئی یاد آئے تو رونا ضروری ہے کیا؟'' وہ ناصحانہ انداز میں بولتا اس کے برابر آن بیٹھا۔

''اور کیا کروں؟'' راحیل نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، آنکھوں میں ڈھیروں آنسو لیے وہ بے بسی سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''تمہارے پاس میں بھی تو ہوں، تمہارا لالہ، تمہارا بھائی'' راحیل کو تسلی دینے کو کوئی الفاظ نہ ملے تو اپنے ہونے کا احساس دلا کر اس کی تنہائی کو کم کرنے لگا۔

''جس کا بھائی ہوتا ہے وہ نہیں روتی کیا؟؟''

''بالکل بھی نہیں روتی۔'' ماہ رخ کے دلچسپی سے پوچھنے پر راحیل نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''اچھا۔'' وہ اب بھی تذبذب میں تھی اور دروازے سے باہر کھڑی ان کی دادی ان دونوں کی باتیں سن کر نم آنکھوں سے مسکراتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ 'آخر ہے نا ثانیہ کا بیٹا...... ورنہ یہاں کون سا بھائی اپنی بہن کے یوں لاڈ اٹھاتا ہے اور اٹھائے بھی کیسے، جب اسے شروع سے ہی یہ سکھایا جاتا ہے کہ وہ مرد ہے، سخت دل رکھنے والا، زندگیوں کے فیصلے کرنے والا مرد، مگر یہ کوئی اور نہیں راحیل ہے، ثانیہ کا بیٹا راحیل' دادی

مسکراتے ہوئے سوچ رہی تھیں اور دوسرے کمرے میں راحیل باتوں میں لگا کر اپنی ماہی گڑیا کو ہنسانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

''لالہ مجھے پڑھنا ہے؟'' اگلے دن وہ نئی فرمائش لیے راحیل کے پاس آ پہنچی۔

''پڑھنا ہے، مگر کیوں؟ میرا مطلب ہے کیا کرو گی پڑھ کر؟'' ان کے علاقے میں لڑکوں کی پڑھائی کا بھی کوئی خاص رجحان نہیں تھا، ایک ٹوٹا پھوٹا سا پرائمری اسکول تھا اور وہاں بھی لڑکوں کی تعداد بہت کم ہوتی تھی، لڑکیوں کے لیے کوئی اسکول نہیں تھا اور نہ ہی لڑکیوں کے پڑھنے کو اچھا سمجھا جاتا تھا، اسی لیے راحیل کو اپنی بہن کی اس فرمائش پر تعجب ہوا تھا۔

''پڑھ کر ڈاکٹر بنوں گی'' ماہ رخ نے ثانیہ کا سکھایا سبق فٹافٹ دہرا دیا۔

''اچھا، ڈاکٹر بن کر کیا کرے گی میری ماہی؟'' راحیل اسے بولنے پر اکسانے لگا۔

''ہسپتال بناؤں گی لالہ، لوگوں کا علاج کروں گی، پھر کسی کی امی نہیں مرے گی'' بات ختم کرتے کرتے اس کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''ماہی!!'' اس کی اس بات پر راحیل کا دل تڑپ اٹھا، اس نے بے اختیار ماہ رخ کا ہاتھ پکڑ کر خود سے قریب کر لیا۔ وہ بھی شاید کسی کاندھے کی تلاش میں تھی، اس سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ بہت ضبط کے باوجود راحیل کی آنکھیں بھی برسنے لگیں۔ دونوں بہن بھائی اپنے مشترکہ دکھ اپنی محرومی پر آنسو بہانے لگے۔

''ارے یہ کیا، رو رہے ہو تم دونوں۔'' دادی کے آنے پر راحیل نے تیزی سے اپنی آنکھیں ہتھیلیوں سے رگڑ ڈالیں۔

''میں نہیں رو رہا دادی، یہ ماہی......''

''کیا ہوا ماہی کو'' دادی فکر مندی سے کہتیں ماہ رخ کے پاس بیٹھ کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''ماہی کہتی ہے کہ اسے پڑھنا ہے، ڈاکٹر بننا ہے۔'' راحیل نے ماہی کی بات دادی کے سامنے رکھ دی۔

''اور تم کیا کہتے ہو؟''

''میں......'' دادی نے فیصلہ اس کی مرضی پر رکھا تو وہ الجھ کر ماہی اور دادی کو دیکھنے لگا اور اس لمحے ماہی کے معصوم چہرے پر نظریں جمائے راحیل خان عمر کی جانے کتنی منزلیں لمحوں میں طے کر گیا تھا۔ امید کی روشنی سے جگمگاتی ماہی کی آنکھیں اپنے لالہ کے فیصلے کی منتظر تھیں اور راحیل کو احساس ہوا تھا کہ وہ ان آنکھوں میں جگمگاتی امید کی شمع کو بجھانے کی ہمت کبھی نہیں کر سکتا۔

''ہماری ماہی پڑھے گی دادی، ڈاکٹر بنے گی یہ'' وہ آج بڑا بھائی بن کر فیصلہ کر رہا تھا دادی اس کے فیصلے پر مسکرا دیں اور ماہی۔ اس کی تو جیسے عید ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

فرمان خان گاؤں کا سب سے بہادر اور کڑیل جوان تھا تو ثانیہ بھی خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھی، بہت چھوٹی تھی جب اس کا باپ کام کی تلاش میں کراچی چلا گیا تھا اور کچھ عرصے بعد اپنی بیوی اور دونوں بچوں ثانیہ اور شرجیل کو بھی اپنے پاس لے گیا، لیکن گاؤں سے اس کا رشتہ ٹوٹا نہیں تھا کہ آخر اس کی جڑیں تو اسی زمین میں تھیں۔ سال میں ایک دو بار ضرور ہی گاؤں آتا۔ شرجیل کم گو قسم کا لڑکا تھا تو ثانیہ شوخی میں کوئی ثانی نہ رکھتی تھی۔ شہر میں گزرے کچھ سالوں نے اسے اس دنیا سے روشناس کرایا تھا جو اس کے گاؤں کی دنیا سے بالکل مختلف تھی، اسکول کی پڑھائی نے اسے اعتماد بھی بخشا، مگر افسوس وہ پانچویں کلاس سے آگے نہ بڑھ سکی، وجہ اس کی بیمار ماں تھی جسے گھر پر اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا اور پھر گھر کے کام کاج کی ذمے داری بھی ثانیہ پر آ پڑی تھی۔ اس زندگی میں وہ ایسی مصروف ہوئی کہ پرائیویٹ پیپرز دینے کا ارمان بھی دل میں ہی رہ گیا۔ سال پر لگا کر اڑتے چلے گئے اور ایسے ہی ایک سال میں ایک دن ثانیہ کی ماں انہیں ہمیشہ کے لیے اس دنیا میں اکیلا چھوڑ گئی۔ بیوی کی بے وقت موت اور جوان بیٹی کی ذمے داری کے احساس نے ثانیہ کے باپ کو گاؤں لوٹنے پر مجبور کر دیا، جہاں اس کے اپنے اُس کے دکھ سکھ بانٹنے کو موجود تھے۔

☆......☆......☆

ثانیہ کو فرمان خان کی زندگی کا ساتھی بنا کر

رابعہ (فرمان کی بہن) کی شادی شرجیل سے کر دی گئی، اس طرح دوہرے رشتے نے ان دونوں گھروں کو ایک دوسرے کے بے حد قریب کر دیا۔ جہاں فرمان ثانیہ کا ساتھ پا کر بے انتہا خوش تھا۔ وہیں ثانیہ بھی اپنے ہمسفر کی محبتیں پا کر اپنی تقدیر پہ نازاں تھی۔ دوسری طرف رابعہ اور شرجیل بھی اپنی زندگی سے خوش تھے۔ ثانیہ اور روحیل کا باپ شاید اسی دن کے انتظار میں تھا۔ بچوں کو اپنے گھر کا کر کے وہ بھی راہِ عدم سدھارا، فرمان اور شرجیل آگے پیچھے دو دو بچوں کے باپ بن گئے۔ ثانیہ کے اپنی ساس کے ساتھ مثالی تعلقات تھے، وہ ساس بہو سے زیادہ ماں بیٹی لگتی تھیں۔ ثانیہ روشن ذہن رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنی سوچ کو الفاظ دینے کی جرأت بھی رکھتی تھی۔ اس نے اپنے دونوں بچوں راحیل اور ماہ رخ کے لیے بڑے حسین خواب سجائے تھے، مگر وہ سارے خواب اس کے ماحول، وہاں کی روایات سے میل نہ کھاتے تھے، پھر بھی وہ پُرعزم تھی۔ اس کی ساس ہر قدم اس کے ساتھ تھی، اور پھر فرمان کی محبت کا مان بھی تو اس کا حوصلہ بڑھاتا تھا۔

''یہ میں نے کیا سنا ہے؟'' اس رات جب فرمان اپنے کمرے میں آیا تو ثانیہ اسی کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔

''کیا سنا ہے تُو نے؟'' فرمان انجان بنا پوچھ رہا تھا۔

''تم کراچی جاؤ گے۔'' اس کے لہجے میں غصہ مگر آنکھوں میں آنسو تھے۔

''جانا پڑے گا، تمہیں سارے حالات کی خبر ہے۔ یہاں رہ کر میں کیا کر پاؤں گا تمہارے لیے بچوں کے لیے، ہم نے بچوں کے لیے جو خواب دیکھے ہیں وہ پورے کرنے کے لیے جا رہا ہوں ثانی۔'' بچوں کے ذکر پر خواب دیکھتی ممتا جاگ گئی اور ہجر کے عذاب سے پریشان ہوتی محبت کرنے والی بیوی کہیں پیچھے جا چھپی اور اس طرح فرمان اس کی آنکھوں کو ڈھیروں سپنے اور دل کو انتظار سونپ کر کراچی روانہ ہو گیا۔

کچھ عرصے بعد ہی فرمان کو کام مل گیا اور اس نے گھر پیسے بھیجنے شروع کر دیے، گھر میں خوشحالی تو آ گئی لیکن ثانیہ جانے کیوں بستر سے جا لگی دیکھنے میں کوئی خاص بیماری بھی نہ تھی لیکن وہ دن بہ دن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ ثانیہ کو اپنی بیماری سے زیادہ اس بات کی فکر کھائے جا رہی تھی کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر توجہ نہیں دے پا رہی۔ راحیل کا زیادہ وقت اپنی پھوپو اور ماموں کے گھر گزرنے لگا (ثانیہ کے بھائی شرجیل کے گھر) جبکہ ماہ رخ چھوٹی ہونے کی بناء پر ثانیہ کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ شرجیل اپنے علاقے کی روایات کو دل سے قبول کرنے والا انسان تھا۔ کراچی میں گزرے سال اور کچھ سالوں کی تعلیم نے اس کے اندر کے انسان پر کوئی بھی اثر نہ چھوڑا تھا۔ ثانیہ کی پریشانی کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا ایک روایتی سوچ رکھنے والا، روایتی مرد بنے۔ کچھ سال اسی طرح بیت گئے۔

ثانیہ کی بیماری نے فرمان کا کراچی کام کرنا اور بھی ضروری بنا دیا تھا، مگر وہ ثانیہ کی طرف سے لاپروا نہیں تھا۔ فرمان اسے کراچی کے ڈاکٹرز کو بھی دکھا لایا۔ فرمان کی ماں نے ثانیہ کا خیال رکھنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، اس کے باوجود ایک رات ثانیہ نے ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں موند لیں اور اپنے خوابوں کو اپنی پلکوں میں سمیٹے اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔

فرمان اس غم کا سامنا نہیں کر پا رہا تھا، اسے واقعی ثانیہ سے بہت محبت تھی۔ ثانیہ کی آخری رسومات سے فارغ ہوتے ہی اس نے بچوں کو اپنی ماں کے حوالے کیا اور خود کراچی کی راہ لی، مگر قسمت کو بھی شاید اس کی ثانیہ سے جدائی پسند نہیں آئی تھی تبھی کراچی جاتے ہوئے راستے میں ہی ایک ٹریفک حادثے کا شکار ہو کر وہ اپنی ثانیہ کے پاس چلا گیا۔

☆......☆......☆

''کیسی ہو تم؟''

''جی ٹھیک ہوں۔'' گل لالہ سے ملنے آئی ہوں گل کچن میں گئی تبھی روحیل وہاں آ گیا اور اب اپنے روایتی اکھڑ لہجے میں ماہ رخ سے حال پوچھتا، ماہ رخ کو گھبراہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔

''شہر سے کب آئی ہو؟'' آج وہ شاید بہت فرصت میں تھا، ورنہ اتنی بات تو ان کے درمیان بھی نہیں ہوئی تھی۔

''کل آئی تھی۔''

''ہوں، اور سب ٹھیک چل رہا ہے نا شہر میں؟'' اس کی کھوجتی نظریں جانے ماہ رخ کے چہرے پر کیا تلاش کر

رہی تھیں کہ تبھی گل لالہ کی آمد نے ماہ رخ کی مشکل آسان کردی۔

''آ گئے لالہ کھانا لاؤں تمہارے لیے؟''

''نہیں، بھوک نہیں ہے مجھے۔ تو اپنے مہمان سنبھال مجھے ابھی واپس جانا ہے'' ماہ رخ پر ٹھہری نظر ڈالتا وہ کمرے سے رخصت ہوا تو ماہ رخ کی جان میں جان آئی۔

''ویسے تو بڑا بولتی ہے لالہ کے سامنے کیا ہو جاتا ہے تجھے؟''

''کیا بتاؤں تمہیں کہ تمہارے بھائی کی شک کرتی چبھتی ہوئی نظروں کے سامنے میں بولنا کیوں بھول جاتی ہوں'' ماتھے پر آئے پسینے کو پونچھتی ماہ رخ کو دیکھ کر گل نے شرارت سے کہا تو وہ دل ہی دل میں اس کی بات کا جواب دیتی بڑی مشکل سے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لا پائی تھی۔

☆......☆......☆

''ہیلو...... میں آپ ہی سے مخاطب ہوں مس ماہ رخ'' بیگ میں سے پوائنٹر تلاش کرتی ماہ رخ نے اس آواز پر سر اٹھایا۔

''جی فرمایئے'' ریحان پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے کی بدلتی رنگت اور لہجے میں در آنے والی مصنوعی اجنبیت پر ریحان کے لبوں پر مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''کیا ہم کچھ دیر بات کر سکتے ہیں؟'' وہ پوچھنے کے ساتھ ہی اس کے قریب بینچ پر بیٹھ بھی گیا تو ماہ رخ ادھر اُدھر دیکھتی کرن کو تلاش کرنے لگی جسے کینٹین گئے ہوئے کافی دیر ہوگئی تھی۔ ''ضرور کسی سے باتوں میں لگ گئی ہوگی۔'' کرن کی عادت سے واقف ہونے کے باعث وہ اندازہ لگانے لگی۔

''آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟'' ریحان کے پوچھنے پر ماہ رخ کو احساس ہوا کہ وہ جھنجلاہٹ کی وجہ سے کرن کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار با آواز بلند کر بیٹھی تھی۔

''مجھے جانا ہے۔''

''بیٹھ جاؤ ماہ رخ'' وہ پرس کندھے پر ڈال کر کتابیں سنبھالتی جانے کو پر تولنے لگی، تبھی ریحان کی گھمبیر آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ جانے کیا تھا اس آواز میں کہ وہ کسی ٹرانس کے تحت بنا کچھ کہے دوبارہ اسی جگہ بیٹھ گئی جہاں کچھ دیر پہلے بیٹھی تھی۔

''کالج کے پہلے دن سے آج تک میں نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ تمہیں ڈسٹرب نہ کروں۔''

''لیکن تمہاری آنکھیں اور ان آنکھوں میں مچلتے جذبے پہلے دن سے آج تک مجھے ڈسٹرب ہی کرتے آئے ہیں۔'' وہ بہ زبان خاموشی شکوہ کر رہی تھی۔

''لیکن میں کبھی بھی تم سے تمہاری ذات سے جڑی کسی بات سے بے خبر ہرگز نہیں رہا، مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ دوسرے سمسٹر میں جب سر عثمان کے پیپر میں تم فرسٹ کی بجائے سیکنڈ آئی تھیں تو پچھلے گراؤنڈ کے دور کونے میں رکھے اس بینچ پر بیٹھ کر رو رہی تھیں'' وہ بتا رہا تھا اور ماہ رخ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''آپ کو یہ کیسے پتا چلا میں نے تو......''

''آپ نے تو کسی کو بھی نہیں بتایا، یہی کہنا چاہتی ہو نا؟'' ریحان نے اس کا فقرہ پورا کرتے ہوئے پوچھا، تو وہ بس گردن ہلا کر رہ گئی۔

''میڈم جو لوگ آپ سے پیار کرتے ہیں انہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی، مجھے تو یہ بھی پتا ہے جب ٹرپ پر......''

''پلیز مجھے نہیں سننا'' وہ جانے اور کون سے بھید کھولنے جا رہا تھا کہ ماہ رخ نے ٹوک دیا۔

''اوکے۔'' وہ مسکرا دیا، یہ سب تم سے کہنے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ تم یہ جان لو میں کبھی کسی لمحے تم سے بے خبر نہیں رہا۔ اپنے آپ سے بڑھ کر تمہارے دکھوں سکھوں سے باخبر رہا ہوں اسی سے تم میرے جذبات کی شدت کا اندازہ لگا سکتی ہو، مختصر یہ کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے تم بھی ایسا ہی چاہتی ہو'' وہ پُر یقین تھا۔

''میرے بارے میں سب کچھ جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں تو کیا یہ نہیں جانتے کہ میرا رشتہ بہت پہلے طے ہو چکا ہے'' وہ جانے کیوں تلخ ہوئی۔

''جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہیں اس رشتے میں کوئی دلچسپی نہیں، تم صرف مجھے سوچتی ہو اور صرف میرے ساتھ خوش رہ سکتی ہو'' وہ بڑے آرام سے اپنی

بات ختم کرتا منتظر نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''بہتر ہوگا کہ آپ اپنی خوش فہمیوں کی دنیا سے باہر نکل آئیں'' یکا یک ماہ رخ کے دل کا سارا غصہ عود کر آیا تھا، پتا نہیں کس بات کا غصہ تھا اسے۔ اپنے دل کی غداری پر یا ریحان کے اس کے دل کا راز پالینے پر، اس سے پہلے کہ ریحان مزید کچھ کہتا وہ تیزی سے وہاں سے چل دی۔

☆......☆......☆

راحیل کے گھر کے باہر کھڑی بڑی سی گاڑی آنے جانے والوں کے لیے دلچسپی کا باعث تھی، کیونکہ اس علاقے میں ایسی گاڑیاں صرف وڈیروں، سرداروں کے گھروں کے باہر ہی دکھائی دیتی تھیں۔ گھر کے اندر ایک کمرے میں روحیل کے سامنے ریحان کے ماں باپ بیٹھے ماہ رخ اور ریحان کی شادی کی بات کر رہے تھے اور راحیل کے لیے تحمل کا دامن تھامے رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

''دیکھیے اس سے پہلے کہ آپ بات کو آگے بڑھائیں میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ میری بہن کی منگنی اس کے بچپن میں ہی ہو چکی ہے اور اگر نہ بھی ہوئی ہوتی تب بھی ہمارے ہاں رشتے برادری میں ہی کیے جاتے ہیں، اس لیے آپ لوگ اس بات کو جانے دیں۔ آپ ہمارے مہمان ہیں اور ہم لوگ مہمانوں کی بڑی قدر کرتے ہیں آپ لوگ کھانا کھا کر جانا، میں ذرا انتظام کرنے کا بول دوں'' اپنی بات مکمل کرتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ریحان کے ماں باپ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

''بہت مہربانی اب ہم چلتے ہیں'' آخر ریحان کے پاپا نے بیوی کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

''آپ کی بات اپنی جگہ درست ہے، مگر اب دور بدل گیا ہے۔ بچپن کی منگنیوں کو اب کون مانتا ہے اور پھر بچوں کا رجحان بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ آپ ہماری بات پر سوچیے گا'' ریحان کے پاپا جاتے جاتے بھی کہنا نہیں بھولے تھے۔

''زمانہ کتنا بھی بدل گیا ہو منیر صاحب! ہماری روایات نہیں بدلیں، نہ ہی ہماری غیرت مری ہے، اللہ حافظ'' راحیل نے کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہ چھوڑی۔

ریحان کے مما پاپا بوجھل دل کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوئے تھے، کیونکہ دونوں ماہ رخ کے لیے اپنے بیٹے کے جذبات کو بخوبی سمجھتے تھے۔

☆......☆......☆

روحیل اور اس کے گھر والوں کو بھی ریحان کے ماں باپ کی آمد کے مقصد کی سن گن مل گئی تھی، روحیل بہت غصے میں تھا، بقول اس کے اس کی منگیتر کا رشتہ بھیج کر ریحان نے اس کی غیرت کو للکارا تھا۔ وہ ریحان کو اس کی سزا دینے کو بے تاب تھا۔ روحیل کے گھر والوں کے لیے اسے سمجھانا مشکل ہو رہا تھا، آخر یہ طے پایا کہ آگے اس قسم کی بدمزگی سے بچنے کے لیے جلد از جلد ان کی شادی کر دی جائے۔

''لالہ تم نے وعدہ کیا تھا کہ میری ہاؤس جاب مکمل ہونے تک کچھ نہیں ہوگا مگر اب......'' ماہ رخ اپنی شادی کا ذکر کرتے جھجک کر خاموش ہوگئی۔

''جو ہوگا تیرے حق میں اچھا ہوگا۔ کیا تجھے اپنے لالہ پر بھروسا نہیں رہا؟'' راحیل نے بات ہی ایسی کر دی کہ ماہ رخ کے لیے کہنے کو کچھ باقی نہ رہا، وہ احتجاج کرتے دل اور ماؤف ذہن کے ساتھ گھر میں ہوتی شادی کی تیاریوں کو دیکھتی رہی۔

☆......☆......☆

ان دنوں وہ ایف ایس سی کی طالبہ تھی جب شاعری اس کے دل کے تاروں کو چھیڑنے لگی۔ جب کبھی بھی فارغ ہوتی شاعری کی کتابیں لے کر پڑھتی رہتی اور الفاظ کی گہرائیوں میں اترتی اردگرد سے بے خبر ہو جاتی۔ انہی دنوں اس نے یہ نظم پڑھی نظم میں جھلکتے درد نے اس کی آنکھوں کو نم کر دیا، اس کا نازک دل انجانے خوف سے بے تحاشا دھڑکنے لگا تھا۔

''ماہی کہاں ہو تم؟'' راحیل کی آواز پر اس نے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ ''دیکھو! میں نے تمہارے لیے کیا بنوایا ہے'' وہ ہاتھوں میں سوٹ تھامے بہت خوش خوش اندر آیا تھا، اس نے یہ سوٹ ماہ رخ کے لیے خاص طور سے بنوایا تھا۔

''کیسا ہے؟''

''بہت پیارا ہے لالہ مگر یہ تو بہت مہنگا لگ رہا ہے، اتنا خرچہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''تم رو رہی تھیں، کیا ہوا ہے تمہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' ماہ رخ کا سرخ ہوتا چہرہ اور بھیگا لہجہ راحیل سے چھپا نہ رہ سکا تھا وہ سوٹ کو چارپائی پر ڈال کر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتا تشویش سے پوچھ رہا تھا۔

''کچھ نہیں ہوا بھائی وہ تو بس ایسے ہی...... وہ اصل میں ایک نظم پڑھ رہی تھی تو......'' راحیل کی پریشانی دور کرنے کو ماہ رخ نے نظم والا صفحہ اس کے سامنے کر دیا۔

''پگلی ہے تُو بھی، شاعری پر بھی رو پڑتی ہے'' نظم پڑھ کر راحیل ہنستے ہوئے ماہ رخ کا سر تھپکتا کہہ رہا تھا تب وہ بھی دھیرے سے مسکرا دی۔

آج بہت سالوں بعد اسے وہ دن یاد آیا'' کتنے اچھے دن تھے جب لالہ کو میرے کہے بنا سب سمجھ آجاتا تھا۔ میرے وہ آنسو بھی دکھائی دے جاتے تھے جو صرف میرے دل پر گرتے تھے۔''

بہت بچپن میں ہی ماہ رخ نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ زندگی میں سبھی کچھ نہیں ملا کرتا، تب سے اس نے اپنی زندگی کا مقصد اپنی ماں کے اس خواب کو بنا لیا تھا جو اس نے ماہ رخ کے ڈاکٹر بننے کے حوالے سے دیکھا تھا، اس کی ماں کا یہ خواب اس کی زندگی بن گیا۔ تھا اپنی آنکھوں پر خواب دیکھنے کی پابندی لگائے وہ ہمیشہ اپنے بھائی کا مان بنی رہی تھی' پھر اب لالہ کو میرا بے قصور ہونا کیوں نظر نہیں آرہا، وہ کیوں میرے خوابوں کو توڑنے بکھیرنے میں روحیل کا ساتھ دے رہے ہیں' روحیل کا نام ذہن میں آتے ہی اس کی بے چینی میں اضافہ ہوگیا، ہزار کوشش کے باوجود وہ کبھی روحیل کو اپنے جیون ساتھی کے طور پر نہ سوچ سکی تھی، اس میں زیادہ قصور روحیل کی شکی طبیعت اور مزاج کے اکھڑپن کا تھا اور وہ ماہ رخ کی پڑھائی کے بھی سخت خلاف تھا، مگر اس معاملے میں راحیل ماہ رخ کے لیے ڈٹ گیا تھا، مگر پھر بھی روحیل وقتاً فوقتاً ماہ رخ کے شہر جا کر پڑھنے پر اپنی ناپسندیدگی اور بیزاری کا اظہار کرتا رہا تھا اور اب تو اس کے ہاتھ بہت ہی اچھا بہانہ آگیا، ایک طرف تو ریحان جیسے انسان کے جذبات کی ناقدری کا دکھ تھا تو دوسری طرف روحیل کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے اپنی ماں کے دیکھے خواب کا مستقبل بھی کچھ اچھا دکھائی نہیں دے رہا تھا، تبھی آنسوؤں نے آنکھوں کے جام لبالب بھر دیے تھے۔ ماہ رخ کا دل چاہا آج ایک بار پھر اس کا لالہ اسے گلے لگا کر اس سے کہہ دے ''ماہی جن لڑکیوں کے بھائی ہوتے ہیں وہ رویا نہیں کرتیں'' اپنے دل میں آتی اس سوچ پر وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر شدت سے رو پڑی۔ اپنے انجام کا خیال اس کے جسم میں خوف کی لہر دوڑا گیا۔

☆......☆......☆

آج مہندی کی رات تھی، سوتے جاگتے ذہن کے ساتھ اس نے سب رسمیں ہوتی دیکھی تھیں۔ دل میں کوئی امنگ جاگی نہ آنکھوں میں کوئی خواب سجا، مگر یہ بھی سچ تھا کہ وہ کسی کی ہونے جا رہی تھی۔ رسومات سے فارغ ہو کر بہت سارے لوگ اپنے گھروں کو لوٹ گئے کچھ گھر میں ہی اِدھر اُدھر جگہ بنا کر لیٹ گئے۔ ماہ رخ اپنے کمرے میں بیٹھی اس گھر میں بیتے لمحوں کو اپنے ذہن میں دہرانی حالات سے فرار کی کوشش میں مصروف تھی، تبھی ریشم اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ ریشم ماہ رخ اور گل لالہ کی مشترکہ سہیلی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھتی وہ دبے قدموں ماہ رخ کی طرف بڑھی تو اس کے اس پُراسرار انداز نے ماہ رخ کو چونکا دیا۔

''کیا بات ہے ریشم؟ خیر تو ہے؟''

''شی ی ی'' اس کے پوچھنے پر ریشم نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس کے قریب آکر دھیرے سے بولی۔

''باہر وہ آیا ہے ماہی؟''

''کون آیا ہے؟''

''وہی شہر والا! جس نے تیرا رشتہ مانگا تھا۔'' ریشم کے بتانے پر ماہ رخ کا چہرہ زرد پڑ گیا، وہ بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تجھے کیسے پتا، کہاں ملا وہ تجھے؟''

''وہ تو تیرے لیے بالکل پاگل ہے ماہ رخ۔ سیدھا تیرے گھر آرہا تھا، تیرے بھائی سے بات کرنے۔ وہ تو اچھا ہوا راستے میں، میں نے اسے دیکھ لیا۔ اسے دیکھتے ہی میرا متھا (ماتھا) ٹھنکا کہ ہو نہ ہو یہ ماہی کا بابو ہے۔ سب سے چھپا کر پچھلے دروازے کی طرف کھڑا کیا ہے میں نے اسے۔ میرے کہنے سے واپس نہیں جا رہا،

کملا ہے وہ نہیں جانتا کہ وہ موت کے منہ میں چلا آیا ہے۔ تُو اسے واپس جانے کا کہہ دے ماہی شاید تیرے کہنے سے چلا جائے، ورنہ بے موت مارا جائے گا۔'' ریشم عادت کے مطابق بولتی چلی گئی، جبکہ یہ سب سن کر ماہ رخ کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔

''میں...... میں اسے کیسے ملوں۔ ریشم تُو جانتی ہے آج گھر میں کتنے مہمان ہیں۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو......''

''دیکھ ماہی سوچنے سمجھنے کا ٹیم (ٹائم) نہیں ہے۔ اگر اس کی زندگی بچانا چاہتی ہے تو تجھے جانا ہی ہوگا، ورنہ صبح ہونے تک تو......'' ماہ رخ نے بے اختیار ریشم کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے آگے بولنے سے روک دیا۔

جس وقت وہ اپنے کمرے سے نکلی سب مہمان تھک کر نیند کی آغوش میں پناہ لے چکے تھے، اندھیرے کی اوٹ میں دبے قدموں چلتیں وہ دونوں پچھلے دروازے کی طرف آئیں، باہر ریحان اس کا منتظر تھا، اسے دیکھتے ہی بے تابی سے اس کی طرف بڑھا۔ ابٹن کی خوشبو سے مہکتا دجود، مہندی سے سجے ہاتھ پیلے رنگ کے سوٹ میں وہ خود بھی زرد زرد مگر بہت پاکیزہ اور بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ وہ کتنے ہی لمحے پلکیں جھپکے بنا اسے دیکھے گیا۔

''کاش یہ پاکیزہ روپ میرا ہو جائے۔'' اس کے دل کی فریاد آہ بن کر اس کے لبوں سے نکلی تو ماہ رخ کے ساتھ ساتھ وہ بھی چونک گیا۔

''آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟ آپ کو پتا ہے یہاں......''

''جانتا ہوں یہاں میرے لیے بہت خطرہ ہے، مگر ماہی مجھے آنا پڑا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں جبکہ میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار چکا ہوں۔ میں یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کبھی بھی اپنے بھائی کا مان توڑ کر نئی زندگی کی خوشیوں کا استقبال کرنے میرے ساتھ نہیں آؤ گی پھر بھی...... پھر بھی ماہی میرے دل نے کہا کہ میں ایک بار تمہارے پاس آؤں شاید...... شاید میری محبت تمہارا فیصلہ بدلنے میں کامیاب ہو جائے۔ جانتا ہوں خود غرض ہو رہا ہوں مگر مجبور ہوں۔ نا تمہارے بنا رہ سکتا ہوں، نہ تمہیں کسی اور کا ہوتے دیکھ سکتا ہوں اور تم مانو یا نہ مانو مگر میں جانتا ہوں تمہارے دل کے آئینے میں صرف میری صورت دکھائی دیتی ہے، تمہاری آنکھیں صرف میرے سپنے سجانا چاہتی ہیں اور تمہارا دل صرف میرے لیے دھڑکنا چاہتا ہے۔ کہہ دو ماہی کہ میرا دل سچ کہتا ہے۔'' وہ جذبات کی شدت سے بھرائے لہجے میں ماہ رخ کا ہاتھ تھامے اقرار محبت کی التجا کر رہا تھا اور ماہ رخ خاموش کھڑی آنسوؤں کو روکنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی آج کا اس کا اعتراف محبت تمام عمر کے لیے ریحان کی زندگی کو روگ لگا دے گا۔

''ابھی تو شاید وہ اپنی محبت کو یکطرفہ کہہ کر اسے قسمت سمجھ کر قبول کر لے، مگر میرے اقرار کے بعد وہ کبھی نارسائی اور ہجر کے عذاب سے چھٹکارا نہ پا سکے گا، اپنی محبت کی ناقدری کو نہیں بھول سکے گا'' پتا نہیں وہ صحیح سوچ رہی تھی یا غلط مگر وہ اسے نامراد واپس لوٹانے کا فیصلہ کر بیٹھی تھی تبھی اچانک جانے کیا ہوا، ماہ رخ نے اپنے ارد گرد بہت سے لوگوں کو جمع ہوتے دیکھا۔

''مار ڈالو، مت چھوڑو'' جیسی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرا کر اس کے ہوش چھیننے لگی۔ تبھی اس کی نظر روحیل پر پڑی جو کلہاڑی اٹھائے ریحان پر وار کرنے جا رہا تھا۔

''نہیں...... اسے مت مارو، یہ بے قصور ہے مت مارو'' وہ بے تحاشا چیختی ہوئی ریحان کو بچانے کے لیے آگے بڑھی تھی، مگر ریحان تک پہنچنے سے پہلے ہی اس پر بھی کسی نے وار کیا تھا۔ اس کے کاندھے سے درد کی تیز لہر ابھری، آنکھوں کے آگے چھاتے اندھیرے سے لڑتی وہ پھر آگے بڑھی مگر دوسرے وار نے اسے آگے بڑھنے کا موقع نہ دیا، دوسری طرف ریحان بھی لوگوں کے گھیرے میں زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا، تبھی ایک آخری وار نے اسے زندگی کی قید سے آزاد کر دیا۔ لوگوں کا شور سن کر راحیل بھی ادھر آ پہنچا تھا اور اب ساکت نظروں سے سامنے کا منظر دیکھ رہا تھا۔

''یہ کاری ہے، اس نے میری غیرت کو للکارا ہے میری عزت پر بٹا لگایا ہے۔'' روحیل نے چیخ کر راحیل سے کہا تھا۔ راحیل کی آنکھوں میں حیرت، غصہ، دکھ، بے غزتی کا احساس جانے کیا کچھ تھا، ماہ رخ کا دل چاہا وہ لپک کر اپنے لالہ کی مضبوط بازوؤں میں چھپ جائے مگر تبھی راحیل کے چہرے کے تاثرات

بدلے تھے۔ ماہی نے بند ہوتی آنکھوں سے دیکھا۔ راحیل کے چہرے پر صرف اور صرف نفرت دکھائی دے رہی تھی۔ روحیل نے خون آلود کلہاڑی راحیل کے ہاتھ میں تھما دی۔

''آگے بڑھو راحیل خان! کیا بہن کی محبت نے تمہاری غیرت کو تم سے چھین لیا ہے۔'' سرخ ہوتی آنکھوں میں نفرت لیے روحیل چیخ چیخ کر راحیل کو غیرت دلا رہا تھا۔

''سب ختم ہو گیا'' اس نے سوچا اور آنکھیں موند لیں اب اس کے لیے دیکھنے کو کچھ نہ بچا تھا۔ راحیل کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا تھا اور کئی بار ہوا تھا بس اس کے بعد راحیل کو کچھ یاد نہ رہا۔

☆......☆......☆

ریحان کے والدین نے قتل کا مقدمہ دائر کر دیا تھا، مگر وہاں فیصلے عدالتوں میں نہیں پنچایتوں میں ہوا کرتے تھے اور پنچائیت پوری طرح راحیل کے حق میں تھی کہ اس نے غیرت مند مرد ہونے کا ثبوت دے کر پوری برادری کا سر فخر سے اونچا کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

وہ ماہ رخ کی تصویر پر نظریں جمائے اپنا ماضی یاد کر رہا تھا اور چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ زمین پر پڑے کاغذ پر نظر پڑی تو وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور اسے بستر پر رکھتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اس کی سلوٹیں دور کرنے لگا۔ وہاں بنا کسی کو مخاطب کیے شکستہ تحریر میں کچھ جملے لکھے تھے۔ آنسوؤں کی دھندلاہٹ میں بھی اسے وہ فقرے صاف صاف دکھائی دے رہے تھے۔

''میں نے ہمیشہ صرف اور صرف تمہیں چاہا، تمہارا ساتھ پانا میرے لیے خوش قسمتی تھی، مگر اب اسی ساتھ کا سوچ کر مجھے خوف آنے لگا ہے۔ میں جانتی ہوں ،میرے گھر والے اب اور بھی زیادہ فخر سے تمہیں اپنا داماد بنائیں گے، مگر میں کیا کروں کہ غیرت کے نام پر اندھے ہونے والے، پاکیزہ محبت کے منہ پر بدنامی کی کالک ملنے والے اور ایک بھائی کی محبت میں پاگل بہن کے قاتل کا ساتھ مجھے ہرگز ہرگز قبول نہیں''۔

اس سے آگے بھی کچھ لکھا تھا مگر راحیل کی ہمت ختم ہو چکی تھی۔ وہ خط ایک آئینے کی صورت اس کے سامنے رکھا تھا اور وہ اپنے آپ سے نظریں چرا رہا تھا'' ماہ رخ...... میری ماہی'' وہ اچانک ہی چلانے لگا، آنکھوں میں وحشت اتر آئی اور وہ اسی طرح چلاتے ہوئے قبرستان میں بنی ایک تازہ قبر پر پہنچ کر رک گیا۔

''مجھے معاف کر دے ماہی اپنے لالہ کو معاف کر دے'' وہ قبر پر سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

☆......☆......☆

نیم کے درخت کے تلے ایک شخص بیٹھا تھا۔ چہرے پر داڑھی بڑھی ہوئی تھی، سر کے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے، لباس پرانا تھا اور اس پر جگہ جگہ مٹی کے نشانات تھے۔ وہ اپنے اردگرد سے بے نیاز آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک قبر تھی جس پر کوئی کتبہ، کوئی تحریر نہ تھی، مگر سب جانتے تھے کہ وہ ماہ رخ کی قبر ہے اور قبر کے سرہانے نیم کے درخت کے تلے بیٹھا وہ درویش نظر آتا شخص اس قبر کا مجاور کوئی اور نہیں بلکہ راحیل خان ہے۔

''اماں تُو اس پاگل کو روز کھانا دینے کیوں آتی ہے؟'' ریشم کا ہاتھ تھام کے قبرستان کی طرف آتا اس کا آٹھ سالہ بیٹا اس سے پوچھ رہا تھا مگر وہ جواب دینے سے قاصر تھی۔

''بتاؤ ناماں، چاہے بارش ہو کہ طوفان تُو اسے روٹی دینا کیوں نہیں بھولتی؟''

''میں اسے روٹی دینے نہیں آتی پتر، میں تو یہ دیکھنے آتی ہوں کہ محبت بھرے دل اگر پتھر بن بھی جائیں تو بہت جلد بھربھری مٹی کی طرح بکھر جاتے ہیں۔'' بچہ اس کے جواب پر آنکھوں میں سوال اور الجھن لیے اپنی ماں کو دیکھنے لگا، مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتا ریشم اس سے دو قدم آگے بڑھ کر راحیل خان کے سامنے پہنچ گئی۔ کچھ لمحے اس کے سامنے کھڑی سالوں پہلے کے واقعات کو یاد کرتی رہی پھر اس کے آگے کھانا رکھ کر پلٹ گئی۔

اس کی واپسی کا یقین ہونے پر راحیل خان نے آنکھیں کھولیں، اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں اور قبر پر سر ٹکائے وہ ایک بار پھر اپنے آپ سے بیگانہ ہو کر چلانے لگا تھا اور یہی اُس کا مقدر تھا۔

☆☆......☆☆

تیسری مرد کہانی

کوا اور سویرا

اُم عادل

اُس مرد کا قصہ، جو اپنی کامیابی پر خود ہی نازاں تھا مگر

شہر کے ایک معروف علاقے میں علیم الدین اور اس کی بیوی صابرہ رہتے تھے۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی نسیم کی شادی کرنے کے بعد پچھلے دو سال سے تنہا زندگی بسر کر رہے تھے۔ علیم الدین ایک چلتے ہوئے ہوٹل کے مالک بھی تھے۔ علیم الدین کے ہوٹل کا نام لذت دین تھا اور اس کے چلنے کی وجہ وہاں ملنے والے لذیذ پکوان تھے جو علیم الدین کی بیوی صابرہ تیار کرتی تھی۔ وہ ہر طرح کے پکوان بنانے میں ماہر تھی۔ خدا نے اس کے ہاتھ میں ذائقہ بھی خوب ہی دے رکھا تھا۔

ان کی بیٹی کا سسرال اسی شہر میں مگر ان کے علاقے سے کافی دور تھا۔ بیچاری صابرہ کو ہوٹل کے پکوان تیار کرنے سے ایک لمحہ بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ وہ تو نماز کے لیے بھی مشکل سے وقت نکال پاتی۔ بیٹی سے کتنی ہی اداس ہوتی مگر اس سے ملنے جانے کا وقت ہی نہ ہوتا۔ جب نسیم کی شادی نہ ہوئی تھی تو وہ کافی حد تک ماں کا ہاتھ بٹا دیا کرتی تھی مگر اب تو تمام کام صابرہ بیگم کو تنہا ہی کرنے پڑتے تھے۔

بیٹی مہینے ڈیڑھ مہینے کے بعد ملنے چلی آتی اور اپنی ماں کی مصروفیات جانتے ہوئے کبھی اس سے گھر نہ آنے کا شکوہ نہ کرتی حالانکہ اس کی ماں ان دو سالوں میں صرف اور صرف ایک بار یعنی شادی کے دوسرے دن دولہن کا ناشتہ لے کر جانے کے موقعے پر اپنی بیٹی کے گھر گئی تھی پھر اس کے بعد اپنی نان اسٹاپ مصروفیات کی وجہ سے بیٹی کے گھر دوبارہ نہ جا سکی تھی، ہاں نسیم کا باپ علیم الدین چند ماہ بعد بیٹی کو دیکھنے چلا جاتا اور ماں فقط بیٹی کی صورت تب ہی دیکھ پاتی جب وہ خود والدین کے گھر آتی۔

علیم الدین طبعاً کنجوس آدمی تھا۔ وہ دن رات محنت کر کے اس ہوٹل کو چلانے والی بیوی کی ضروریات کا بالکل خیال نہ رکھتا جبکہ عید تہوار پر بھی اپنے لیے نئے جوڑے کا کپڑا خرید کر بہت پہلے سے درزی کو دے دیتا۔ اس کا خیال تھا کہ چونکہ مجھے باہر لوگوں سے ملنا ہوتا ہے۔ میرے کپڑے نئے اور صاف ستھرے ہونے چاہئیں جبکہ بیوی کے لیے عید پر بھی نئے کپڑے بنوانا ضروری نہیں سمجھتا تھا جب صابرہ بیگم نئے کپڑوں کا تقاضا کرتی اور اسے باور کراتی کہ ”تمہارا یہ ہوٹل میرے دم سے اور میری محنت سے چل رہا ہے اور مجھے ہی سال میں ایک نیا جوڑا نصیب نہیں۔“ علیم الدین یہ سچائی سن کر بھڑک اٹھتا اور کہتا۔ ”تمہیں نئے کپڑوں پر

پیسے برباد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔تم نے تمام وقت چولہوں کے آگے گزارنا ہے۔اور یہ اپنے دم سے ہوٹل چلنے کا طعنہ نہ دیا کرو۔تم سمجھتی کیا ہو اپنے آپ کو مت پکا کر دیا کرو۔ میں خود سنبھال لوں گا ''ہوں کوا نہ ہوگا تو سویرا نہ ہوگا۔''

اور بے چاری صابرہ بیگم اسم مسمی شوہر کا غصہ برداشت کرتے ہوئے پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتی۔دو روز قبل صابرہ کو بیٹی کا فون آیا۔

''اماں میرے ساس سسر بنگلہ دیش اپنے عزیزوں سے ملنے گئے ہوئے ہیں۔میری طبیعت ناساز ہے۔شوہر صبح کا گیا شام گھر آتا ہے۔آپ دو تین روز کے لیے میرے گھر آجاؤ۔''بیٹی کی بیماری کا سن کر ماں کا دل اسے دیکھنے کو مچل اٹھا اس نے شوہر سے بیٹی کے گھر جانے کی اجازت چاہی تو علیم الدین کھانا نہ پکنے کی وجہ سے ہوٹل بند ہو جانے کا سوچ کر بھڑک اٹھا۔

''تم اپنی ذمہ داریوں سے فرار ہونا چاہتی ہو۔ اندازہ ہے نہ پکوان نہیں بنے گا، تو ہوٹل بند رہے گا۔مگر ایسا نہیں ہوگا تمہیں جانا ہے شوق سے جاؤ۔ میں خود دیکھ لوں گا۔تم اپنے آپ کو بہت اہم سمجھنے لگی ہو۔'' پھر اس نے اپنا پسندیدہ جملہ دہرایا ''ہوں کوا نہ ہوگا تو سویرا نہ ہوگا''

حالانکہ علیم الدین جانتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے بالکل ایسا ہی ہے۔خود اس کو کھانا پکانے کی عادت بھی نہیں تھی اس لیے بیوی کو بیٹی کے گھر جانے سے باز رکھنے کے لیے ڈانٹ ڈپٹ کر غصے سے باہر نکل گیا۔

حسب معمول صابرہ بیگم صبر کر کے پکوانوں کی تیاری میں لگ گئی اور فون کر کے بیٹی کو تین دن کے لیے اپنے گھر بلا لیا۔اب صابرہ بیگم کی مصروفیات بیٹی کی تیمارداری کے ساتھ اور بڑھ گئیں۔ چند روز بعد بیٹی شفایاب ہو کر اپنے گھر واپس چلی گئی۔

گزشتہ چند روز سے صابرہ بیگم کی طبیعت کچھ سست اور بے زاری تھی اس کی وجہ کام کا بوجھ اور تھکاوٹ تھی۔ سسرال میں مصروفیات کی وجہ سے نسیم والدین کے گھر نہ آسکی۔ صابرہ بیگم نے ڈرتے ڈرتے علیم الدین سے بیٹی سے ملنے کی اجازت چاہی مگر بیوی کو انسان نہ سمجھنے والا شوہر فوراً ہی بھڑک اٹھا۔''یہ تم وقتاً فوقتاً بیٹی کے گھر جانے کی فرمائش اس لیے کرتی ہو کہ ذمہ داریوں سے فرار حاصل کر سکو۔ جن کی بیٹیاں پردیس میں بستی ہیں وہ بھی تو سالوں بعد ملتے ہیں۔تم ضرور جاؤ، مجھے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ میں کچھ اور بندوبست کرا لوں گا۔تمہارے بھی دماغ سے اپنی اہمیت کا بھوت نکل جانا چاہیے۔'' اور پھر اپنا پسندیدہ جملہ ''ہوں کوا نہ ہوگا تو سویرا نہ ہوگا



اگر دل مان جائے تو

مقدر آزما لینا اگر دل مان جائے تو
محبت تم بھی کرلینا اگر دل مان جائے تو
دکھوں کی درد میں لپٹے ہوئے یہ آشنا چہرے
انھیں بھی اک نظر دینا اگر دل مان جائے تو
محبت جانچنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا
مجھے بس آزما لینا اگر دل مان جائے تو
کبھی غم کا کوئی جھونکا نہ تیرے پاس سے گزرے
مجھے بھی یہ دعا دینا اگر دل مان جائے تو
نہیں مطلوب وہ دنیا نہ جس میں ساتھ تیرا ہو
یقیں تم مجھ پہ کرلینا اگر دل مان جائے تو

شاعرہ: صائمہ بشیر۔ سرگودھا

'' دہرا کر گھر سے نکل گیا۔

شوہر کی سنگ دلی پر صابرہ بیگم کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ وہ پکوان کی تیاری میں مصروفیات کے ساتھ ساتھ دیر تک روتی رہیں۔ سہ پہر تک جب سب پکوان تیار ہو گئے اور صابرہ بیگم نے عصر کی نماز کے لیے وضو کیا تو اسے حرارت کے ساتھ سردی محسوس ہونے لگی۔ نماز سے فارغ ہوئی تو سردی سے بری طرح کپکپا رہی تھی۔ وہ دو کمبل ایک ساتھ اوڑھ کر لیٹ گئی مگر سردی اب بھی کم نہ ہوئی، تھوڑی دیر میں علیم الدین اور اس کا مددگار آئے اور پکوان اٹھا کر ہوٹل چلے گئے۔ علیم الدین نے بیوی کی خبر تک نہ لی۔

اتفاقاً ان کی بیٹی مغرب سے کچھ دیر پہلے اپنے شوہر کے ہمراہ والدین کے گھر چلی آئی۔ گھر میں خاموشی پا کر جب وہ ماں کو آوازیں دے کر کمرے میں پہنچی تو صابرہ بیگم سردی سے لرز رہی تھیں۔ اس نے اپنے شوہر سے کہہ کر ڈاکٹر کو گھر بلایا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ملیریا ہے۔ ڈاکٹر دوائیں دے کر واپس چلا گیا۔

داماد کے بلانے پر علیم الدین گھر آیا تو بیٹی نے کہا ''امی جان کی طبیعت ناساز ہے انہیں تیمارداری کی ضرورت ہے۔ میں یہاں رک نہیں سکتی لہٰذا ہم انھیں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔''

بیٹی اور داماد کے سامنے علیم الدین چپ رہا مگر ہوٹل بند ہو جانے کا سوچ سوچ کر ہول رہا تھا۔ کہنے لگا یہ تو صبح سے ہی تمہارے گھر جانے کو پر تول رہی تھی۔ اب تو بہانا مل گیا لے جاؤ دیکھا جائے گا۔ بھلا کوا نہ ہوگا تو سویرا نہ ہوگا۔''

باپ کی باتوں کو نظر انداز کر کے بیٹی ماں کو اپنے گھر لے آئی۔ یہاں ڈاکٹر نے انکشاف کیا کے ملیریے کے بعد انہیں ٹائیفائڈ ہو گیا ہے۔ بیٹی نسیم دن رات ماں کی دوا اور خوراک کا خیال رکھ رہی تھی۔ پورے ایک ماہ بعد صابرہ بیگم صحت یاب ہوئیں مگر نقاہت اور کمزوری بہت تھی۔ اس دوران علیم الدین بیوی کی تیمارداری کے لیے بیٹی کے گھر آتا رہا۔

صابرہ کی غیر موجودگی میں اس کا ہوٹل مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ مگر صابرہ کے بغیر خالی گھر بھی اسے کاٹ کھانے کو آتا تھا۔ اس کے پاس جمع شدہ رقم بیوی کے علاج، اپنے کھانے پینے اور آنے جانے پر تیزی سے خرچ ہو رہی تھی، جس پر علیم الدین بہت ہراساں تھا۔ اب صحیح معنوں میں اسے صابرہ کی خدمات کا احساس ہو رہا تھا۔ اس دوران اُس نے ہوٹل کے لیے کئی کھانے پکانے والے لوگوں سے بات کی مگر ان کی تنخواہ کی ڈیمانڈ اس کی بچت سے بھی زیادہ تھی، جبکہ بیوی کی ذات پر وہ ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرتا تھا۔ ان حالات سے گزر کر علیم الدین کو اپنی زیادتی کا احساس شدت سے ہوا اس نے آئندہ بیوی کا خیال رکھنے اور اس کی ضروریات پوری کرنے کا دل میں عہد کر لیا۔ تقریباً ایک ماہ بعد صابرہ صحت مند ہو کر گھر لوٹی اور اگلے ہی دن اس نے زیادہ نہیں دو تین پکوان بنا کر علیم الدین کے حوالے کر دیے دیے شام کو جب مہینے بعد علیم الدین کی خالی جیب میں پیسے آئے تو اس نے دل میں سوچا۔ سچ تو یہ ہے بھلے کوے کے بغیر سویرا ہو جائے مگر صابرہ کے بغیر ہوٹل نہیں چل سکتا۔

☆☆......☆☆

ناول

کاشی چوہان

زہرِ عشق

خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور، عشق کی ایک ایسی ناقابلِ یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

اسرار کی نئی دنیا میں لے جانے والے، پُراسرار سلسلے کی چوتھی قسط

اس کے علاوہ کوئی راستا نہیں تھا کہ سلمان جلدی سے بیڈ کے نیچے سرک گیا اور آناً فاناً اسی کالے بلے کے روپ میں جا اترا جس سے صنوبر کو یا گھر کے کسی فرد کو ڈر نہیں لگتا تھا، البتہ اب اس کالے بلے کا ایک دشمن ضرور اس گھر میں پیدا ہو چکا تھا۔ اور وہ تھا صنوبر کا بھائی سلمان جسے بلے نے درشہوار، صنوبر کی ماں سے بدتمیزی کرنے کی پاداش میں زخمی کر کے ہوسپٹل پہنچا دیا تھا۔ سلمان بلے کا دشمن بن چکا تھا اور درشہوار کو اسی دن سے جب اس نے سلمان کو اس کی کمینگی اور ماں سے خراب رویے کی سزا دی تھی، وہ بلے کو پہلے سے زیادہ عزیز رکھنے لگی تھی۔

صنوبر نے جب یہ دیکھا کہ وہ نوجوان جو اس کی سانسوں سے بھی قریب اس پر جھکا ہوا تھا اور اس کے یک لخت آنکھیں کھولنے اور بیدار ہونے سے اچھل کر دور چلا گیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک اس کے سامنے کھڑا رہا اور پھر صنوبر کو مسلسل چیختا ہوا دیکھ کر اسی کے بیڈ کے نیچے چھپ گیا ہے تو وہ مارے ڈر کے اور زور زور سے چیخنے لگی لیکن پتا نہیں شعور کی کس بات کو مانتے ہوئے وہ بیڈ سے نیچے اترنے اور اتر کے بیڈ کے نیچے دیکھنے کو تیار نہیں ہوئی۔ اسی طرح بیٹھی چیختی رہی تا کہ اس کے ماں باپ، درشہوار اور آصف اس کے کمرے میں نہ پہنچ گئے۔

''کیا ہوا بیٹے صنوبر کیا ہوا ہے....؟ کیوں چیخ رہی ہو؟'' درشہوار نے صنوبر کے پاس بیٹھتے ہوئے اسے ممتا کے جذبے سے اپنے گلے لگاتے ہوئے پوچھا۔ آصف صنوبر کا حسین ترین باپ بھی بیٹی کو محبت سے دیکھتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گیا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

''یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ یہ ضرور خواب میں ڈر گئی ہے'' صنوبر ماں کے سینے سے لگنے کے بعد اپنے منتشر اوسان کو کسی قدر بحال کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

''نہیں پاپا وہ یہاں تھا۔ ابھی ابھی وہ بیڈ کے نیچے چھپ گیا ہے!'' صنوبر کی بات سنتے ہی آصف نے جلدی سے بیڈ کے نیچے جھانکنے سے پہلے کمرے میں تیز روشنی کر دی اور ساری لائٹس جلانے کے بعد بیڈ کے نیچے تھوڑا ڈرتے ہوئے دیکھا مگر وہاں تو کوئی نہیں تھا حتیٰ کہ وہ کالا بلا بھی نہیں تھا جس کے اندر سلمان پناہ لیتا ہے۔

''یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔؟'' آصف نے بدستور بیڈ کے پاس نیچے بیٹھے بیٹھے گردن اٹھا کر کہا تو صنوبر کو یہ سن کر بڑی حیرانی ہوئی اور وہ بولی۔



''قسم سے پاپا وہ یہیں تھا میرے سامنے اور میرے سامنے بیڈ کے نیچے چھپا تھا'' آصف نے درشہوار کو صنوبر سے الگ گیا نادر بہت نرمی سے اسے اپنے ساتھ بیڈ کے نیچے جھانکنے کو کہا۔ صنوبر نے ڈری ہوئی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا تو درشہوار نے اس کے ساتھ ہی بیڈ کے نیچے جھانکا اور جب صنوبر کو بیڈ کے نیچے کچھ دکھائی نہیں دیا تو وہ شرمندہ ہونے کے بجائے اپنی اس بات پر اصرار کرتی رہی کہ وہ ایک لڑکا تھا اس نے سفید اور کالے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اور وہ میرے اتنا قریب تھا کہ میں اس کی سانسوں کو بھی محسوس کر سکتی تھی۔''

آصف نے حتمی طور پر صنوبر کے خواب میں ڈر جانے کا یقین کر لیا اور بیٹی کو مقدور بھر تسلی اور تشفی دے کر کمرے سے چلا گیا کہ صنوبر خواب میں ڈر گئی ہے۔ لیکن یہ بات بھی آصف کے لیے اطمینان کا باعث نہیں تھی کہ صنوبر خواب میں اتنی بے طرح کیسے ڈر گئی اس سے پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اسی قسم کی باتیں سوچتا ہوا وہ چلا گیا اور کمرے میں صنوبر اور درشہوار رہ گئے۔

''ماما میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ وہ یہاں تھا میرے سامنے۔'' صنوبر نے ایک مرتبہ پھر اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کی کوشش کی تو صنوبر نے اس کی پیٹھ پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''مائی بے بی! آخر تم اس واقعے کو ایک ڈراؤنا خواب کیوں نہیں مان لیتیں۔ اس میں کیا مسئلہ ہے؟'' صنوبر اس سوال کے جواب میں کچھ دیر چپ رہی تو درشہوار نے پھر کہا۔

''اس طرح تو تم ہمیشہ ڈرتی رہو گی۔ یہاں کوئی ہوتا تو وہ کہاں چلا جاتا اور تم تو خود مان رہی ہو کہ وہ تمہارے سامنے تھا، کسی کھڑکی یا دروازے سے باہر نہیں گیا۔ بیڈ کے نیچے تو تم خود بھی دیکھ چکی ہو، میں نے بھی دیکھا ہے وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ تو پھر مان لو وہ کوئی خواب تھا اور تم اسے حقیقت سمجھ رہی ہو۔ خواب بالکل حقیقت کی طرح لگتے ہیں۔ بعض خواب ایسے ہوتے ہیں جو دیر تک ہمیں اپنے اثر میں جکڑے رہتے ہیں اور ہمیں بہت دیر بعد یقین آتا ہے کہ ہم نے دراصل کوئی خواب دیکھا تھا۔ تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ صبح تک مجھے یقین ہے تم اس خواب کو بھول جاؤ گی اور سب کچھ نارمل ہو جائے گا۔''

یہ سب کہنے کے بعد جب صنوبر نے کوئی جواب نہیں دیا نہ ہی کوئی مخالف ردعمل ظاہر کیا تو درشہوار کو لگا اس کی بیٹی نے اس کی باتوں کو تسلیم کر لیا ہے اور اب وہ انھیں ماننے کے لیے ان پر غور کر رہی ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی صنوبر کو اس واقعے کو خواب ماننا ہی تھا اور اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتی تھی وہ کسی طرح بھی یہ ثابت نہیں کر سکتی تھی کہ کوئی نوجوان اس کے کمرے میں تھا اور وہ اس کے اتنا نزدیک تھا کہ اس کی سانسوں کی گرمی تک اسے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھی۔ صنوبر خود کو سمجھاتی رہی اور سوچتی رہی کہ اگر واقعی کوئی یہاں میرے کمرے میں تھا تو وہ یوں اچانک چلا کہاں گیا؟ اس قسم کی باتوں کو سوچتے ہوئے اسے بڑی حد تک یقین آ گیا کہ وہ کوئی خواب ہی رہا ہو گا اور اس کی ماں ٹھیک کہتی ہے۔

''ٹینو کہاں ہے۔ اسے تو یہاں ہونا چاہیے تھا؟'' اچانک درشہوار کو بلے کا خیال آیا تو سلمان نے جلدی سے خود کو واش روم سے برآمد کیا اور میاؤں میاؤں کہتا ہوا باہر نکل آیا۔ اس وقت سوچنے والی بات یہ تھی کہ واش روم کا اتنا بھاری دروازہ ایک بلا کیسے کھول سکتا ہے۔ جبکہ صنوبر کے گھر کے ہی کیا سب ہی گھروں میں واش روم کے ڈور بند ہی ہوتے ہیں۔ لیکن اس وقت یہ بات سوچنے کا دونوں ماں بیٹیوں کو خیال تک نہیں آیا۔

''ارے یہ تو واش روم میں گھسا ہوا تھا اسی لیے نظر نہیں آیا۔'' درشہوار نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میری چیخیں سن کر تو یہ باہر نہیں آیا اور اب آپ کے پوچھنے پر آ گیا۔ یہ آپ کو پہچاننے لگا ہے ماما۔'' صنوبر جیسے کچھ دیر پہلے والے واقعے کو بھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''جانور اصل میں صرف وہ ہی کرتے اور سنتے ہیں جسے وہ اپنے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ تمہاری چیخوں کو اس نے تمہارا پرسنل میٹر سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہو گا۔'' درشہوار نے مسکراتے ہوئے کہا تو صنوبر نے بھی ہلکی سی مسکراہٹ

سے انھیں جواب دیا۔
''اسے ابھی کچھ دن یہیں رہنا ہوگا تمہارے کمرے میں'' درشہوار نے تاسف کا اظہار کیا۔
''لیکن ماما سلمان کو تو یہ جب بھی نظر آئے گا وہ اس پر اپنا غصہ ضرور نکالے گا۔ آپ سلمان کو اچھی طرح جانتی ہیں۔'' صنوبر جیسے اپنا ڈر اور درد جو کچھ ہوا اسے پوری طرح بھول کر اب بلے کے بارے میں دلچسپی لینے لگی تھی۔
''ٹھیک کہتی ہو تم.... لیکن اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے سلمان پوری طرح ٹھیک ہو جائے تو میں اس



سے بات کروں گی ہوسکتا ہے وہ میری بات مان جائے اور ٹینو کو اپنے غصے کا نشانہ بنانے سے باز رہے۔'' امید در شہوار کے لہجے میں چھلکی پڑ رہی تھی۔

''اچھا اب میں چلوں'' جیسے ہی در شہوار نے یہ کہا صنوبر کو ایک مرتبہ پھر ڈر نے آ دبوچا۔

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا ماما آپ یہاں میرے کمرے میں ہی سو جائیں'' صنوبر نے دھیمے سے کہا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں ہمیشہ ایسا کرسکتی ہوں۔ لیکن میں ایسا ہمیشہ کرنا نہیں چاہوں گی کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی کے دل میں خوف اس طرح بیٹھ جائے کہ اسے نکالا نہ جاسکتا ہو۔ تمہیں اپنے ڈر اور اپنے خوابوں کا مقابلہ کرنا ہوگا اور وہ بھی خود۔ ماں باپ کا فرض ہوتا ہے وہ اپنے بچوں کے مسائل اس طرح حل کریں کہ ان کی زندگی اور ان کا مستقبل ہر قسم کے خطرات سے پاک ہو اور اگر کوئی خطرہ موجود ہو تو بچوں کو اس سے نمٹنے کے لیے ان کا حوصلہ بڑھائیں۔ یہ اتنی لمبی تقریر میں نے اس لیے نہیں کی کہ میں تمہارے ساتھ اس کمرے میں رہنا نہیں چاہتی۔ جب تک تم خود یہ نہیں کہو گی کہ مجھے تمہارے کمرے سے چلے جانا چاہیے۔ تب تک میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ لیکن اپنے ڈر سے تمہیں خود لڑنا ہوگا۔ میں صرف تمہاری مدد کرسکتی ہوں۔ یہی حقیقت ہے اور یہی تمہارے ساتھ روا رکھا گیا بہترین سلوک ہے۔''

اس کے بعد بھی دونوں پتا نہیں کتنی دیر تک باتیں کرتی رہیں اور پھر باری باری دونوں نیند کی وادی میں جا سوئیں۔

☆......☆......☆

آصف کریم کو اپنے بچوں سے بہت محبت تھی اور یہ بات در شہوار بھی جانتی تھی لیکن محبت کے اظہار میں وہ ہمیشہ سے کنجوس تھا یا اناڑی یہ بات در شہوار نے اس طرح سے محسوس نہیں کی تھی ورنہ شاید اسے اپنے شوہر سے کبھی کوئی شکایت نہ ہوتی۔ اس نے آصف کے لیے دیے اور جھجک آمیز رویے کو ہمیشہ اس کی حد سے بڑھی ہوئی ایگو اور غیر معمولی مردانہ حسن پر تکبر پر محمول کیا تھا۔ صبح جاگنے کے بعد بھی اس کی آنکھوں سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ رات کو اطمینان سے نہیں سو سکا تھا اور جیسے رات دیر تک جاگتا رہا ہو۔ یہ بات تھی بھی حقیقت میں اسے صنوبر کا اس طرح خواب میں ڈر جانا پریشان کرتا رہا۔ وہ اپنے طور پر بہت سی باتیں سوچتا رہا لیکن اصل بات تک پہنچنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہیں اس کی بیٹی کسی قسم کے عدم تحفظ کا شکار تو نہیں ہے۔ لیکن وہ عدم تحفظ کیا ہوسکتا ہے۔ کیا اسے کسی سے کوئی خطرہ ہے؟ مگر کس سے؟ وہ صنوبر کو اچھی طرح جانتا تھا۔ سلمان اس کے اپنے بیٹے کے مقابلے میں اس کی بیٹی قطعی مختلف تھی؟ وہ ہر بات کو سہنا اور سہہ کر برداشت کرنا جانتی تھی۔ اسے کسی بھی معاملے میں برزور شکایت کرنے کی عادت نہیں تھی۔ بڑی صابر وشاکر انسان تھی اس کی بیٹی۔ اگر کسی نے اس کا دل دکھایا ہے یا کسی نے اس کے ساتھ کسی بھی طرح کی بدتمیزی کی ہے تب بھی صنوبر کے اس طرح خواب میں ڈرنے کی وجہ سامنے نہیں آتی کیونکہ وہ تو کسی بھی بات پر ایسا ردعمل ہی ظاہر نہیں کرتی جو اس کے لیے کسی کے دل میں نفرت یا دشمنی پیدا کردے۔ پھر اس کا خواب میں اس طرح بے طرح ڈر جانا کیا ثابت کرتا ہے۔ دیر تک سوچوں کے گھوڑے دوڑانے کے بعد وہ اس ایک بات پر کسی حد تک مطمئن ہوکر سو گیا کہ اس واقعے کا ذکر کسی ماہر نفسیاتی ڈاکٹر سے کرے گا اور اس کی رائے لے گا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی بیٹی ٹھیک ہو جائے گی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ محض ایک ہی واقعہ ہو سب سے زیادہ اسے سکون یہی بات سوچ کر ملا تھا۔

☆......☆......☆

در شہوار رات کو کمرے میں واپس نہیں آئی تھی اور اس وقت بھی وہ کمرے میں موجود نہیں تھی۔ اس کا مطلب ہے وہ رات بھر صنوبر کے ساتھ اس کے کمرے میں رہی ہے۔ یہ سوچ کر پہلی بار آصف کریم کو در شہوار کے بارے میں کوئی مثبت خیال آیا ورنہ وہ سمجھتا تھا کہ در شہوار اور سب معاملوں کی طرح بچوں کے بارے میں بھی غیر ذمہ دار

اور لاپرواقسم کی عورت ہے اور سلمان کی خودسری اور اس کی غیر ضروری متکبرانہ حرکتوں کی ذمہ دار بھی کسی نہ کسی حد تک درشہوار ہی تھی۔ جب ناشتے پر بھی دونوں ماں بیٹیاں نہیں آئیں اور آصف کو پتا چلا کہ انھوں نے کمرے میں ہی ناشتا کیا ہے تو آصف کو ایک مرتبہ پھر سے تشویش ہوئی کہ ایسا کیا ہے کیا صنوبر ابھی تک رات والے واقعے کے اثر میں ہے اور ڈر رہی ہے؟ اس نے جلدی جلدی آدھا ادھورا ناشتا کیا اور صنوبر کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ صنوبر کے کمرے میں جاتے ہوئے سلمان کا کمرا پہلے پڑتا تھا۔ وہ جب سلمان کے کمرے کے قریب سے گزرا تو اس کے پاؤں یکایک ٹھٹھک کر رک گئے۔ اس کے ذہن میں سرعت سے ایک خیال کوندا کہیں صنوبر کے اس رات والے واقعے کا تعلق سلمان کے اس زخمی ہونے والے واقعے۔ نہیں سے کہیں یہ دونوں واقعات ایک دوسرے سے پیوستہ تو نہیں ہیں؟ اس خیال نے اس کے بڑھتے ہوئے پاؤں جکڑ لیے اور وہ صنوبر کے کمرے میں جانے کے بجائے سلمان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ ہلکے سے دھکے سے اندر کی طرف کھل گیا اس نے اندر جا کے دیکھا تو سلمان بے خبر سو رہا تھا۔ اور اس کے چہرے پر جو زخم آئے تھے وہ کافی حد تک ٹھیک ہو چکے تھے۔ آصف کچھ دیر تک وہیں بیٹھا رہا اور سلمان کے جاگنے کا انتظار کرتا رہا لیکن جب سلمان دیر تک بیدار نہیں ہوا تو وہ آہستگی سے اٹھا اور دروازہ اسی طرح بے آواز انداز میں بند کر کے صنوبر کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ بہت سی باتوں نے آصف کے ذہن میں نسم قسم کی باتوں کا طوفان اٹھایا ہوا تھا۔ اس لیے اسے جب صنوبر کے کمرے سے دونوں ماں بیٹیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آئیں تو وہ دبے پاؤں کچھ اس طرح صنوبر کے کمرے کے دروازے کے پاس رک کر ان کی باتیں سننے لگا کہ شاید ان باتوں میں کچھ ایسا ہو جو اسے معاملے کی اصل تہہ تک پہنچا سکتا ہو۔ لیکن کچھ دیر کھڑے رہ کر سنتے رہنے کے بعد اس نے اندازہ لگایا کہ دونوں ماں بیٹیاں اپنی خالہ اور دیگر رشتے داروں کی باتیں کر رہی تھیں جو ظاہر ہے محض وقت گزاری سے زیادہ کچھ نہیں تھیں۔

''ارے ہماری بیٹی آج کالج نہیں جائے گی کیا؟'' آصف نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ صنوبر اور درشہوار صوفے پر ایک دوسرے کے برابر بیٹھی ہوئی تھیں اور درشہوار بیٹی کی کمر پر مسلسل محبت سے ہاتھ پھیر رہی تھی۔

''نہیں ڈیڈی آج میں نے چھٹی کر لی ہے، کل سے جاؤں گی'' صنوبر نے اپنائیت سے کہا۔ آصف بھی اسی صوفے پر بیٹی کے برابر میں بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا۔

''اچھی بات ہے آج تم آرام کرلو'' .... کچھ دیر کو توقف کیا اور پھر بولا ''دیکھو بیٹا صنوبر! اگر کوئی ایسی بات ہو جس نے تمہیں کسی بھی وجہ سے ڈسٹرب کیا ہوا ہے تو مجھ سے یا اپنی ممی سے ضرور کہنا ایسی کوئی بات نہیں ہو سکتی جسے اپنے ماں باپ سے چھپایا جائے۔ ہمیشہ کسی سے شیئر کرنے سے مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل آتا ہے۔ سمجھ گئی نا میری بیٹی۔'' آصف نے اس کا ہاتھ دبایا۔

پہلی بار درشہوار کو لگا کہ آصف چاہے اس کے لیے برف کا بنا ہوا آدمی ہے لیکن باپ کی محبت سے اس کا دل لبالب بھرا ہوا ہے۔ وہ آصف کی بات سن کر یہ بھی سمجھ گئی کہ آصف رات کو دیر تک صنوبر کے بارے میں سوچتا رہا ہے۔ یہ سب سوچ کر اسے اچھا لگا حالانکہ پہلے اسے اس بات کی پروا بھی نہیں ہوتی تھی لیکن اب چونکہ اسے خود اپنے دل میں اپنے بچوں کی محبت اور ان کا خیال جاگ چکا تھا۔ وہ سچ مچ ایک اچھی ماں بننے کی شعوری اور لاشعوری کوشش کر رہی تھی تو اسے آصف کا اس طرح سے صنوبر سے پوچھنا بہت ہی اچھا لگا۔ کم سے کم اس لمحے میں اسے آصف سے جتنی بھی شکایات تھیں ان میں سے آدھی دور ہو چکی تھیں۔

''جی پاپا کوئی بات ہو گی تو میں آپ کو یا ماما کو ضرور بتاؤں گی .... لیکن میرا یقین کیجیے ایسی کوئی بات میری زندگی میں نہیں ہے، جو مجھے اس طرح خواب میں آکر ڈرا سکتی ہو۔'' صنوبر نے پُر یقین انداز میں کہا اور باپ کے سینے پر سر رکھ دیا۔ آصف نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کوئی اور بات کہنا چاہی لیکن درمیان میں درشہوار بول اٹھی۔

''تم نے ناشتا کرلیا آصف! اگر نہیں تو میں ناشتا لگواتی ہوں۔ سوری مجھے تمہاری بیٹی نے اپنے پاس سے ہلنے کی اجازت ہی نہیں دی۔''

''اچھا کیا میری بیٹی کو تمہاری مجھ سے زیادہ ضرورت ہے۔ ویسے میں ناشتا کرچکا ہوں۔ تم نے ناشتا کیا؟'' اس نے اپنا روئے سخن پھر سے صنوبر کی طرف موڑ دیا۔

''جی پاپا میں نے ماما کے ساتھ کرلیا ہے'' صنوبر نے جواب دیا۔

''ایک بات پوچھوں.... سچ سچ بتانا؟'' آصف کے اچانک اس طرح کی بات کرنے سے درشہوار بھی چونکے بنا نہیں رہ سکی۔

''جی پاپا ضرور پوچھیں۔ میں ہمیشہ سچ ہی بولتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے صنوبر نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

''تو پھر بالکل سچ سچ بتاؤ تم کہیں سلمان کی وجہ سے تو خوف زدہ نہیں تو ہو میرا مطلب ہے سلمان نے کہیں ایسا کوئی جھگڑا تو نہیں کیا جس کو لے کر تم پریشان ہو اور اندر ہی اندر ڈر رہی ہو؟''

''ارے نہیں پاپا میں تو سلمان کے ساتھ کہیں نہیں گئی اور جس قسم کے دوست اس نے پال رکھے ہیں، ان سے میں دور دور ہی رہتی ہوں'' صنوبر نے اپنے پاپا کو مطمئن کرنے کے لیے زور دے کر اس طرح کہا جیسے وہ اپنے باپ کو یقین دلانا چاہتی ہے کہ وہ غلط نہیں کہہ رہی۔ اپنی دانست میں تو وہ صحیح کہہ رہی تھی مگر بلا جو اسی کمرے میں خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا وہ اچھی طرح یہ بات جانتا تھا کہ دونوں واقعات کا تعلق ایک دوسرے سے اس قدر گہرا اور ایک دوسرے میں پیوست ہے کہ ان دونوں واقعات کا ذمہ دار وہ ہی ہے، سلمان کو اسی نے زخمی کیا تھا اور صنوبر کو بھی اسی نے ڈرایا تھا۔ مگر وہ تو صنوبر سے اپنی محبت کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ اسے ڈرانا اس کا مقصد ہرگز نہیں تھا لیکن خدا کو پتا نہیں کیا منظور ہے جو صنوبر نے اسے دیکھ کر اس طرح مسلسل چیخنا شروع کردیا۔ اگر وہ ایک بار صرف ایک بار اس کی بات سن لیتی تو شاید اتنا سب نہیں ہوتا۔ ٹینو نے سوچا۔ آصف کریم بیٹی کو تسلی اور تشفی دے کر چلا گیا اور صنوبر اپنے کمرے میں اس وقت اکیلی ہوگئی جب درشہوار بھی یہ کہہ کر چلی گئی کہ وہ ذرا سلمان کو دیکھ آئے۔''

کمرے میں وہ اور ٹینو تھے اور ٹینو معمول کے مقابلے میں آج کافی اداس تھا۔ اسی لیے کچھ چپ چپ اور سست نظر آرہا تھا۔ ''تمہیں کیا ہوا ہے ٹینو! تم کیوں اتنے سست ہو رہے ہو؟'' صنوبر نے قدرے شوخ انداز سے پوچھا۔ ٹینو کا شدت سے دل چاہا کہ وہ اس کی بات کا جواب دے دے لیکن ایک دم ہی اس نے خود کو روک لیا۔ اس نے سوچا ابھی رات کا ڈر بڑی مشکل سے صنوبر کے دل سے نکلا ہے اگر اس نے ایک بلے کو انسانوں کی طرح باتیں کرتے دیکھ لیا تو کہیں ڈر کے مارے اس کا دم ہی نہ نکل جائے اس لیے وہ چپ رہا۔ ایک ہلکی سی میاؤں بھی نہیں کرسکا۔

''میں جانتی ہوں تم اداس ہو.... کاش اس وقت تم کمرے میں ہوتے یا واش روم سے نکل ہی آتے اور دیکھتے کہ میں کیوں چیخ رہی ہوں۔ کم سے کم تم تو میری سچائی کے گواہ بن ہی سکتے تھے۔ مجھے اب بھی یہی لگتا ہے کہ وہ کوئی خواب نہیں بلکہ حقیقت تھی مگر میں جانتی ہوں اس قسم کی باتوں پر کوئی بھی یقین نہیں کرے گا۔ اس لیے میں اب اس واقعے کو ایک خواب سمجھ کر بھول جانا چاہتی ہوں۔''

صنوبر کی بات سن کر ٹینو کو اور بھی افسردگی نے پکڑ لیا اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس معصوم اور حد سے زیادہ پیاری لڑکی کو کیسے بتائے کہ یہ سب واقعی حقیقت ہے اور وہ اس کی محبت کا اسیر ہو کر اس کی خاطر ایک انسان سے ایک بلے میں کنورٹ ہوا ہے۔ اور وہ اس کی محبت کو سمجھنے کے بجائے اس سے ڈر رہی ہے۔ وہ اگر اس کی موجودگی سے اسی طرح ڈرتی اور خوف کھاتی رہی تو وہ کس طرح اسے بتا سکے گا کہ وہ صنوبر سے محبت کرتا ہے۔

''مت اداس ہو اب میں ٹھیک ہوں اور مزید خود کو ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہی ہوں'' یہ کہہ کر جیسے وہ کسی گہری سوچ میں چلی گئی اور آپ ہی آپ ایسے بولنے لگی جیسے سوچتے ہوئے بول رہی ہو.... ''اگر وہ کوئی خواب تھا تو کیا وہ

اب مجھے دوبارہ سے نظر نہیں آئے گا اور اگر وہ خواب نہیں تھا تب بھی کیا وہ نوجوان اب پھر سے نہیں آئے گا۔ دونوں ہی صورتوں میں وہ اسی طرح اس رات والے مسئلے میں گھری ہوئی تھی۔ اور پھر سے رات ہونے کا سوچ کر ایک انجانا سا ڈر اس کے اندر ہی اندر کہیں لہریں لے رہا تھا۔

ٹینو نے اسے سوچتے ہوئے دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے وہ ضرور اسی کے بارے میں سوچ رہی ہے کہ وہ نوجوان کون تھا اور کہاں سے اور کیوں آیا تھا۔ آیا تھا تو چلا کہاں گیا۔ نہ اس کے آنے کا پتا چل سکا اور نہ ہی اس کے چلے جانے کی کچھ بھی خبر ہوئی کھڑکی دروازے اگر اندر سے بند تھے تو وہ کہاں سے آیا تھا اور کہاں سے چلا گیا..... یہ ایک بات اب صنوبر کا سکون غارت کر چکی تھی اور ٹینو چاہتے ہوئے بھی اس کا سکون اسے واپس نہیں لوٹا سکتا تھا۔

☆......☆......☆

درشہوار سلمان کے کمرے میں پہنچی تو اس نے نخوت سے ماں کی طرف دیکھا اور دوسری طرف کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ درشہوار کو پہلے ہی اندازہ تھا کہ اس کا تکبر سے بھرا ہوا بیٹا اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ وہ سلمان کے پہلو میں آہستگی سے بیٹھتے ہوئے بولی۔

''میرا بیٹا اب تک ناراض ہے مجھ سے؟'' سلمان نے کوئی جواب نہیں دیا وہ بدستور منہ بڑائے رہا۔ ''حالانکہ ناراض تو مجھے ہونا چاہیے'' یہ سنتے ہی اس نے درشہوار کی طرف اپنی گردن میکانکی انداز میں گھماتے ہوئے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''کیوں آپ کو کیوں ناراض ہونا چاہیے؟''

''میں ماں ہوں تمہاری اور جو سلوک تم میرے ساتھ کر رہے تھے، اس کے بعد کیا میرا حق نہیں بنتا کہ میں تم سے کم سے کم ناراض ہی ہو رہوں'' درشہوار کا لہجہ بدستور نرمی لیے ہوئے تھا۔ لیکن اسے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی جب سلمان نے جواب میں ایک مضحکہ خیز قہقہہ لگایا اور بولا۔

''ماما آپ کو یہ بات کس نے بتائی کہ آپ میری ماں ہیں؟'' درشہوار ایک لمحے میں والی پوزیشن پر چلی گئی۔

''کیوں یہ بات مجھے کون بتائے گا۔ کیا میں ماں نہیں ہوں تمہاری اور صنوبر کی؟''

''آپ نے ہمیں صرف پیدا کیا ہے اس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ کوئی میری ماں تھی، جس نے کبھی مجھے یہ احساس دلایا ہو کہ وہ میری ماں ہے'' سلمان کا لہجہ زہر میں بجھا ہوا تھا۔ درشہوار کو اس لہجے سے زہر جیسی بو تو آئی پر وہ اپنے مقام پر ڈٹی رہی۔

''میں مانتی ہوں ایسا ہے میرے بیٹے لیکن میں اپنی الجھنوں میں اس طرح پھنسی ہوئی تھی کہ یہ بھول ہی گئی کہ میرے دو بچے بھی ہیں لیکن اب اگر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے تو کیا تم مجھے میری غلطی سدھارنے کا موقع نہیں دو گے؟''

سلمان ایک لمحے کو چپ رہا پھر بولا۔

''اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ پورے بیس سال گزر چکے ہیں۔ آپ اگر میرے بیس سال واپس لوٹا سکتی ہیں تو میں آپ کو ضرور موقع دے سکتا ہوں بولیے کیا آپ لوٹا سکتی ہیں اگر نہیں تو پھر میں آپ کو یہ موقع نہیں دے سکتا چلی جائیں آپ یہاں سے.... اور ایک بات مت بھولیے گا۔ جیسے ہی میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ اس جنگلی کالے بلے کو شوٹ کر دوں گا۔ اسے اس کی اس گندی حرکت کی سزا ضرور ملے گی۔ سمجھ گئیں آپ!'' سلمان کی آواز مارے غصے کے تیز ہو گئی اور یہ غصہ اسے ٹینو پر ہی آیا تھا۔ اس کی غیرت اور مردانگی یہ سوچ کر کچلی جا رہی تھی کہ ایک معمولی بلے نے اسے زیر کر دیا تھا۔ اتنا کہ اسے اس کی وجہ سے ہوسپٹل جانا پڑا۔

''اور تمہیں تمہاری بے عزتی کی سزا کون دے گا۔ کیا تم نے اپنی ماں کے ساتھ جو کچھ کیا وہ سزا کے لائق نہیں

تھا؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی درشہوار کی آواز کچھ بلند ہو ہی گئی۔

''آپ کچھ بھی کہیں، میں اس منحوس بلّے کو کسی بھی قیمت پر معاف نہیں کروں گا، کل یا زیادہ سے زیادہ پرسوں اسے موت کا مزا چکھنا ہی ہوگا'' سلمان کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور ایک لحظے کے لیے درشہوار بھی اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر ڈر گئی۔ ''شکر کریں ابھی میں نے پاپا کو نہیں بتایا'' وہ پھر پھنکارا'' ورنہ یہ منحوس بلا آپ کو رکھنے کی اجازت نہیں دیں گے وہ۔''

''لیکن بیٹے وہ ایک چھوٹا سا تم سے بہت کم طاقت والا جانور ہے۔ تم انسان ہو، اسے معاف کر دو اس کی طرف سے میں معافی مانگتی ہو پلیز سلمان اتنے سنگ دل مت بنو پلیز۔'' درشہوار جیسے رونے والی ہوگئی۔

''آخری بات اگر آپ میری ماں ہیں اور آپ کو میری پروا ہے تو پھر مجھے اس بلّے کو ختم کرنے دیجیے۔ میں جب تک اسے جان سے نہیں مار دیتا مجھے چین نہیں ملے گا۔''

''مگر بیٹے.....'' سلمان نے درشہوار کو بات پوری نہیں کرنے دی اور درمیان سے چیخا۔

''اگر آپ کو یہ منظور نہیں ہے تو پھر چلی جائیں یہاں سے۔ مجھے نہیں سننا آپ کی کوئی بھی بات۔ جائیں.... چلی جائیں....'' اور یہ کہہ کر اس نے درشہوار کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ کچھ دیر تک درشہوار وہیں بیٹھی رہی اور پھر چپ چاپ اٹھی اور اس طرح سلمان کے کمرے سے نکلی جیسے کوئی ہارا ہوا جواری جوا خانے سے نکلتا ہے۔

وہ رو رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اس کا بیٹا کس قدر سخت دل اور وحشی بن چکا ہے۔ اسے یہ احساس تک نہیں ہے کہ اس نے اپنی ماں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ کیسے میری زندگی لینے کے درپہ تھا۔ اگر ٹینو نہ ہوتا تو وہ ظالم مجھے جان سے مار ڈالتا لیکن اب وہ ٹینو کی جان کا دشمن بن چکا ہے اور اسے جان سے مارے بنا اسے چین نہیں ملنے والا۔ کیا ہو گیا ہے اسے۔ اس کے اندر انسان سے زیادہ کسی جنگلی جانور کی روح شور مچا رہی ہے۔ وہ میری، اپنی ماں کی کوئی بات سننے اور سن کر ماننے کو تیار نہیں ہے۔ میں نے واقعی اپنے سلمان کو کھو دیا ہے میں نے اپنے بیٹے کو کھو دیا ہے۔ وہ یہ سب سوچتے ہوئے صنوبر کے کمرے میں پہنچ گئی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے پھسل پھسل کر اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے اور وہ ایسے رو رہی تھی جیسے اب رونا ہی اس کا مقدر ہے۔ صنوبر نے جو اسے اس طرح دیکھا تو ایک دم اس کی جان ہی نکل گئی۔ ایک مدت ہوئی جب سے اس نے اپنی ماں کو کبھی روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ جیسے پوری طرح پریشان ہوگئی۔

''کیا بات ہے مما! کیا سلمان نے پھر کچھ.....'' وہ اپنی بات پوری نہیں کر سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ صنوبر کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ ماں کو اس طرح روتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے اور وہ جیسے کچھ بھی پوچھ نہیں سکی۔

''وہ اسے نہیں چھوڑے گا!'' درشہوار نے روتے ہوئے مختصراً کہا۔

''کسے نہیں چھوڑے گا، ٹینو کو؟'' صنوبر کے لہجے میں حیرت سے زیادہ دکھ گھلا ہوا تھا۔

''ہاں...!'' درشہوار سے جیسے بولا نہیں جا رہا تھا۔ اسے ٹینو کی زندگی اور اپنی بے عزتی کا شدید دکھ پہنچا تھا۔

''اچھا آپ اتنا مت روئیں ماما ہم ٹینو کو کہیں اور بھجوا دیں گے۔ پھر وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا'' صنوبر نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں صاف کرنے کے بعد درشہوار کے گالوں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو بھی صاف کرتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر تک دونوں خاموش رہیں۔ کمرے میں وحشت ناک سکوت طاری تھا۔ ٹینو نے دونوں ماں بیٹیوں کو محبت سے دیکھا اور سوچنے لگا کاش مجھے صنوبر کو دیکھنے کی عجلت میں اس طرح بلا نہ بننا پڑتا تو شاید آج حالات مختلف ہوتے۔ وہ دونوں نہیں جانتی تھیں کہ سلمان اگر اب بھی چاہتا تھا تو شیطان صفت سلمان اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ ایک لمحے کو اس نے یہ بھی سوچا کہ اگر وہ انسانی روپ میں آکر سلمان آصف کو اسی طرح ڈرا دے جیسے اسے دیکھ کر

صنوبر نے چیخیں ماری تھیں تو سلمان آصف کی مجال نہیں کہ اس کا کچھ بھی بگاڑ سکے۔ مگر اس وقت سلمان ابراہیم کو پریشانی یہ لاحق تھی کہ جس طرح اسے دیکھ کر صنوبر ڈر جاتی ہے اور ڈر کے چیخیں مارنے لگتی ہے۔ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کبھی بھی اپنی محبت صنوبر کے سامنے انسانی روپ میں نہیں آسکے گا۔ یہی سوچ اسے کل سے پریشان کیے ہوئے تھی اور وہ مسلسل سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ پہلے اس نے یہی سوچا تھا کہ اسے سب سے پہلے خود کو بلے کے وجود سے آزاد کرانا ہوگا مگر یہ کس طرح ممکن ہے جب کہ صنوبر کی ماں اب اسے بہت عزیز رکھتی تھی اور اس کا یوں خود بخود اور اچانک غائب ہو جانا اس کے پیچھے کئی سوالوں کو جنم دے سکتا تھا اور اگر ایسا ہوا تو اس کی اس گھر میں واپسی ممکن نہیں نہ ہوگی۔ اس لیے اس نے خود سے یہاں سے چلے جانے کا اب تک بھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ پہلے جب وہ مدرسے کی وجہ سے یہاں سے چپ چاپ چلا گیا تھا تو ورشہوار نے اس کے بارے میں عجیب عجیب باتیں کر کے اس کی حیثیت کو مشکوک بنانے کی بہت کوشش کی تھی۔ صنوبر کی دلیلوں کے سامنے وہ پسپا ہوگئی تھی۔ ورنہ پتا نہیں اس کے بارے میں کون کون سی توہمات پھیلا کر اسے گھر سے نکالنے کی کوششیں کرتی اور وہ چونکہ گھر کی مالکن اور بچوں کی ماں تھی اس لیے کسی نہ کسی حد تک وہ اپنی بات منوانے میں کامیاب بھی ہو ہی جاتی اور اس وقت سلمان ابراہیم کے لیے اس گھر میں رہنا۔ اپنی صنوبر کے سامنے اسے دیکھتے رہنا ہی سب سے بڑا مسئلہ تھا لیکن اب ایک نئے مسئلے نے اس کے دل میں جگہ بنائی تھی اور اس کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی کہ اگر صنوبر نے اسے انسان کے روپ میں قبول نہیں کیا تو اس کا اس طرح بلا بنے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ صنوبر کی خاطر تو اس نے اپنی جن برادری کے بہت سے اصولوں کو تاراج کر دیا تھا۔ ایک طرف وہ ایک لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو چکا تھا، جس کی اسے سختی سے ممانعت کی گئی تھی اور دوسری طرف اس نے اپنا ایک ہم شکل بنا کر مدرسے بھیج دیا تھا۔ یہ دونوں باتیں ایسی تھیں جن کے بارے میں اگر اس کے باپ ابراہیم کو پتا چلتا تو وہ اسے کسی بھی صورت میں معافی نہیں دیتا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس کی مشقیں کس کے اسے یہاں سے لے جایا جاتا اور سردار کی عدالت میں پیش کر کے اس پر فردِ جرم عائد کی جاتی اور اسے جان سے مارنے کی سزا سنا دی جاتی۔

اتنے بہت سے خطرات اس نے جس لڑکی کی خاطر اٹھائے تھے۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر چلا جائے وہ بھی اس طرح کہ اس کا واپسی پر راستا بند ہو جائے۔

اسی ادھیڑ بن میں وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے لگا ہوا تھا۔ اب جو ورشہوار نے سلمان اپنے بیٹے کے شیطانی ارادوں کے بارے میں بتایا اور ورشہوار نے اس کی جان بچانے کی خاطر اسے کہیں اور بھیج دینے کا عندیہ ظاہر کیا تو اسے جیسے اپنے مسئلے کا حل مل گیا تھا۔ اب وہ یہاں سے چلا جاتا تو اس کے غائب ہو جانے پر دونوں ماں بیٹیاں تشویش ناک سمجھنے کے بجائے خدا کا شکر ادا کریں گی کہ وہ خود بخود چلا گیا کیونکہ ان دونوں کا اس وقت بس ایک ہی مقصد تھا کہ کسی طرح اپنے ٹینو کی جان بچائی جائے۔ یہ سب سوچ کر جب اس نے عجیب سی سرشاری میں میاؤں کی تو دونوں نے اس کی طرف توجہ دی۔

''ماما لگتا ہے یہ ہماری باتیں سمجھ رہا ہے۔'' صنوبر نے کسی قدر مسرت سے کہا۔

''ہاں لیکن ذرا یہ تو سوچو ہم اسے رکھیں گے کہاں۔ جس کے بھی پاس بھیجیں گے، اس کے بہت سے سوالوں کا جواب دینا ہوگا اور میں سوچ رہی ہوں کہ جسے سن کر کوئی بھی اطمینان سے اسے اپنے پاس رکھنے پر تیار ہو جائے گا۔ اول تو ہمارے دوست احباب میں بہت سے ایسے ہیں جو جانور رکھتے ہی نہیں ہیں اور کچھ تو ضرور ایسے بھی ہوں گے جو بلے اور بلیوں سے متنفر ہوں گے تو پھر کون ہو سکتا ہے جس کے پاس ہم اسے رکھ سکتے ہیں۔''

دونوں ماں بیٹیاں سوچ میں پڑ گئیں اور دیر تک سوچنے کے بعد بھی انھیں ایسا کوئی دوست، رشتے دار نہیں ملا جس کے پاس ٹینو کو بطور امانت رکھوایا جا سکتا۔ دونوں کے چہروں سے مایوسی اور ناکامی ہویدا تھی۔ تب ہی ان دونوں نے دیکھا کہ ٹینو اپنی جگہ سے خاموشی سے اٹھا اور کمرے سے باہر جانے لگا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی

طرف دیکھا اور جو سب سے پہلا خیال ان کے دل و دماغ میں آیا وہ یہی تھا کہ ٹینو شاید سلمان کے کمرے کی طرف جا رہا ہے۔ دونوں نے اسے روکا آوازیں دیں لیکن ٹینو نہیں رکا۔ وہ اس کے پیچھے چلنے لگیں اور جب ٹینو سلمان کے کمرے کے قریب سے گزر گیا اور کمرے میں نہیں گیا تو ان دونوں کو حیرت ہوئی اور وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چلنے لگیں۔ ٹینو چلتا ہوا اسی بالکونی میں پہنچا جہاں وہ پہلی بار صنوبر کی خاطر ظاہر ہوا تھا۔

بالکونی میں پہنچ کر ٹینو نے کچھ دیر رک کر صنوبر کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں حیرت اور دکھ ہلکورے لے رہا تھا۔ درشہوار کی تو جیسے سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن صنوبر کو ایک عجیب سے ملال نے اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ وہ یکا یک اداس ہوگئی تھی اور اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے ٹینو اس گھر کو چھوڑ کر جا رہا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ خیال بھی شاید آ رہا تھا کہ کیا ٹینو اب اس گھر میں کبھی واپس نہیں آئے گا۔

پہلی بار اسے یہ احساس بھی ہوا تھا کہ اسے ٹینو سے ایک عجیب سی انسیت ہوگئی تھی اور اس کا اس طرح چلے جانا اسے تکلیف پہنچا رہا تھا۔ درشہوار کو تو اس سے باقاعدہ محبت ہو چکی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اگر ٹینو اس کی زندگی میں نہ رہا تو کہیں وہ پھر اسی طرح تنہا تو نہیں ہو جائے گی لیکن سب باتیں ایک طرف، اس وقت ٹینو کا یہاں سے چلے جانا ہی اس کے حق میں بہتر تھا اور جب ٹینو نے بالکونی کی دیوار پہ چڑھ کر ایک ہلکی سی میاؤں کی اور دوسری طرف اتر گیا تو دونوں لپک کر دیوار کے قریب جا کر پہنچیں اور اس وقت تک اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہیں جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ اس کے غائب ہوتے ہی درشہوار باقاعدہ بلک بلک کر رونے لگی، صنوبر نے اسے چپ کراتے ہوئے کہا۔

''ماما خود کو سنبھالیں پلیز.... اس کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ یہاں سے چلا جائے۔ میں تو اس کی ذہانت پر حیران ہو رہی ہوں کہ اسے کیسے پتا چلا کہ ہم اسی کے بارے میں پریشان ہیں؟'' وہ مزید سوچتے ہوئے بولی۔

''کیا وہ ہماری سب باتیں سن رہا تھا اور صرف سن ہی نہیں رہا تھا بلکہ سمجھ بھی رہا تھا۔'' ماں کا رونا بھول کر وہ اس الجھن میں پڑ گئی کہ یہ بلا اتنا سمجھدار کیسے تھا اور ابھی تو اسے اس گھر میں رہتے ہوئے چند دن ہی ہوئے تھے۔ اسی سوچ کے ساتھ اب اس کے ذہن میں یہ خیال بھی آ دھمکا کہ کس طرح اس بلے نے ماما کی سلمان کے ہاتھوں ہونے والی توہین پر اپنے غصے کا اظہار کرتے ہوئے سلمان کو زخمی کر دیا تھا۔ یہ سارا واقعہ عجیب اور حیرت ناک تھا اور اس پہلو پر انھیں سوچنے کی فرصت تک نہیں ملی تھی کیونکہ اس کے فوراً بعد صنوبر کا خواب میں ڈرنے والا واقعہ سامنے آ گیا۔

''خواب.....!'' صنوبر نے ہونٹوں سے دھیمے سے نکلا۔ کیا وہ واقعی خواب تھا؟ اس نے سوچا۔

درشہوار رو رو کر خود ہی خاموش ہو چکی تھی اور اسی طرح کھڑی ہوئی ویران گلی میں دیکھ رہی تھی۔ صنوبر کی سوچوں نے اس کے ذہن میں اس سے زیادہ کوئی تصور قائم نہیں کیا تھا کہ وہ بلا کوئی عام بلا نہیں تھا۔ وہ ضرور کوئی غیر معمولی بلا تھا جو انسانوں کی زبان اور ان کی باتیں سمجھ لیتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ کسی واقعے میں کون غلط ہے اور کون صحیح ہے، تب ہی تو اس نے سلمان کو سزا دی تھی۔ ورنہ ایک جانور کو اور وہ بھی بلے کو اس طرح کا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ کتے اور گھوڑے کے بارے میں اس قسم کے واقعات سننے میں آتے رہے ہیں مگر کسی بلی یا بلے نے کبھی اپنے مالک کو بچانے کے لیے مخالف کو زخمی کر دیا ہو...... ایسا کم سے کم صنوبر نے کبھی نہیں سنا تھا۔ دونوں جیسے اپنے اپنے خیالوں میں گم گھر کے اندر واپس آ گئیں۔

☆......☆......☆

ٹینو کو یہ معلوم تھا کہ بالکونی میں دونوں خواتین کھڑی ہوئی اسی کی طرف دیکھ رہی ہیں اس لیے وہ دیوار کے سہارے سہارے چلتا ہوا کونے پر کچھ لمحے کو رکا اور پھر اوجھل ہو گیا۔ ایک ویران گوشے میں جا کر اس نے ہوشیاری سے چاروں طرف دیکھا اور خود کو سلمان ابراہیم کے انسانی بھیس میں بدل لیا۔ اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس کے سامنے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ اسے فوری طور پر اپنے ہم شکل کو پھر اس کی اسی دنیا میں واپس بھیجنا تھا

جہاں سے وہ آیا تھا اور اس کی جگہ اصل سلمان کو لینا تھی تا کہ اس کے رہنے کھانے اور سونے کا بندوبست ہو سکے۔

صنوبر سے دوری اختیار کرنے کی اس کے پاس ایک مضبوط وجہ موجود تھی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ایک انسان کو دوسرے انسان سے اگر محبت ہو جائے تو اسے کیا کرنا پڑتا ہے۔ وہ کیسے صنوبر کے دل میں دھڑکن بن کے دھڑک سکتا ہے اور یہ بات اسے کوئی انسان ہی بتا سکتا تھا، اسی لیے اس نے پھر سے انسان بننے کا فیصلہ کیا تھا۔

رات کو سونے کے لیے وہ ایک پارک میں اس کی گیلی گیلی گھانس پر لیٹ گیا اور اپنے بیتے ہوئے واقعات کو یاد کرنے لگا۔ اسے صنوبر سے یہ کس قسم کی محبت تھی۔ وہ یہ جاننے کو بھی بے چین تھا کہ ایک جن کو اگر کسی لڑکی سے محبت ہو جائے تو کیا وہ اسے حاصل کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے اس سوال کا جواب اسے کہیں سے بھی ہاں میں نہیں مل سکتا تھا۔ اگر وہ جن ذات کے کسی فرد سے اس سلسلے میں کوئی مشورہ کرتا تو اول تو یہ بات خطرے سے خالی نہ ہوتی دوسرے اسے کسی جن سے وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا جو سلمان ابراہیم جاننا چاہتا تھا۔ تو پھر کس سے اور کیسے پتا کرے؟

دیر تک وہ اسی قسم کی باتیں سوچتا رہا اور رات ہو گئی۔ اب اسے سب سے پہلے مدرسے جا کر اپنے ہم شکل کو واپس بھیجنا تھا اور اس کی جگہ خود لینا تھی۔ پتا نہیں کتنا وقت اسے اپنے اس مقصد کو پانے میں لگے گا اور کتنے عرصے تک وہ صنوبر سے دور رہے گا۔ اس کی افسردگی تو یہ سوچ کر بھی بڑھ جاتی تھی کہ اتنے عرصے میں وہ صنوبر کے دل کا حال اور اس کی اس اداسی کی وجہ تک نہیں جان سکا تھا، جس میں مبتلا وہ اسے پہلے روز سے نظر آئی، حتیٰ کہ اس کے آرٹ اسکول جا کے بھی وہ دیکھ چکا تھا مگر کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔

☆......☆......☆

رات کو اس نے اپنے روحانی رابطے سے ہم شکل کو کمرے سے باہر بلوایا۔ یہ مدرسے کے وسیع رقبے پر پھیلا ہوا ایک میدان تھا جہاں کئی قسم کے درختوں نے ایک ایسا جھنڈ سا بنا رکھا تھا اگر کوئی اس جھنڈ کے نیچے کھڑا، بیٹھا یا لیٹا ہو تو دور سے دیکھنے پر کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ اس جگہ دن میں بھی سورج کی روشنی پوری طرح نہیں پہنچتی تھی، رات میں تو سمجھو جیسے بالکل ہی اندھیرا ہو جاتا تھا۔

''اب تمہیں جانا ہوگا!'' سلمان نے ہم شکل سے حتمی انداز میں کہا۔ اس نے محسوس کیا ہم شکل کو اس کی بات سن کر کچھ خوشی نہیں ہوئی تھی۔ وہ شاید یہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔

''کیوں! دل لگ گیا ہے تمہارا یہاں؟'' سلمان نے سخت لہجے میں کہا۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ دل لگ بھی جائے تو کیا! مجھے تو آپ کا حکم ماننا ہی ہوگا'' ہم شکل نے مؤدبانہ عرض کیا۔

''بس تو پھر اب جاؤ۔ ہو سکتا ہے بلکہ یقیناً ایسا ہی ہوگا میں تمہیں بار بار بلاتا رہوں گا۔ ویسے بھی اب تمہیں آنے جانے میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی'' یہ سن کر ہم شکل کو کچھ خوشی ہوئی اور وہ سلمان کے کہنے سے خاموشی سے اوجھل ہونے پر آمادہ ہو گیا۔

''رکو....'' سلمان کو کچھ خیال آیا۔ ''یہاں کسی سے ایسی کوئی بات تو نہیں کی جو مجھے مشکل میں ڈال سکتی ہو؟'' سلمان نے اسے ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں ایسا کچھ نہیں کیا البتہ...'' ہم شکل بولتے بولتے رک گیا۔

''کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔ رک کیوں گئے؟'' سلمان نے قدرے درشتگی سے کہا۔

''وہ ریحان عظیم نے مجھ سے یہ پوچھا تھا کہ مجھے کسی سے عشق وغیرہ تو نہیں ہوا؟'' ہم شکل نے بمشکل کہا۔

''تو کیا جواب دیا تم نے؟'' سلمان کو ریحان عظیم کی مخفی صلاحیتوں پر حیرانی ہوئی۔

''میں کیا کہہ سکتا تھا۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں مجھے عشق ومحبت ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ میرے پاس محسوس کرنے والی صلاحیت ہی نہیں ہے'' ہم شکل نے اپنی کمی کا رونا رویا۔

''پھر بھی کچھ تو کہا ہوگا وہ بتاؤ'' سلمان کو ہم شکل پر غصہ آنے لگا۔

''میں نے بس اتنا کہا تھا کہ نہیں استاد جی! مجھے کسی سے کوئی عشق نہیں ہے۔'' ہم شکل نے اس طرح کہا جیسے اس نے کوئی جرم کیا ہو۔ سلمان نے اس کی پروانہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ سن کرانہوں نے کیا جواب دیا۔

''انھوں نے مجھے سمجھایا کہ جب میری عمر میں عشق ہوتا ہے تو کیا کیفیت ہوتی ہے۔ سب کچھ بہت اچھا لگنے لگتا ہے۔ فطرت کے نظاروں سے عجیب سی انسیت اور قربت محسوس ہونے لگتی ہے۔ چاند، ستارے اور ہوا اور درخت اور پھول اور خوشبو سب میں ایک اور ہی طرح کا نشہ سا بھر جاتا ہے۔ کچھ اسی قسم کی باتیں وہ کرتے رہے اور بولے کہ اگر ایسا کچھ ہو تو مجھے ضرور بتانا۔ میں کوشش کروں گا تمہاری کوئی مناسب مدد کروں ورنہ اس مدرسے میں اس قسم کا عشق اور محبت کرنا معیوب ہے اور اس کی سخت سزا دی جاتی ہے۔ ممکن ہے تمہیں مدرسے سے خارج کر دیا جائے۔'' اب ہم شکل یاد کر کر کے پوری بات بتا رہا تھا۔ سلمان نے یہ سب سنا اور اس کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔ وہ سوچنے لگا اسے کیا استاد ریحان کو اپنی حالت کے بارے میں بتا دینا چاہیے یا نہیں؟ وہ مددگار ثابت ہوں گے یا مخالف؟۔

''ٹھیک ہے اب تم جاؤ'' سلمان نے اسے حکم دیا۔ ''ایک اور بات بتانی تھی۔'' ہم شکل نے کہا۔

''کہو جلدی سے کہو'' سلمان کو ہم شکل کے دیر کرنے پر اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

''وہ روم میٹ ہے نا عمران! اس سے بھی میں نے اسی قسم کی باتیں کی تھیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے اب تم جاؤ'' سلمان جھنجلانے لگا۔ ہم شکل نے ایک نظر سلمان کی طرف دیکھا اور جلدی سے سلمان سے بغل گیر ہو گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ سلمان کے اندر سے نکلا تھا اور اسی کے اندر واپس چلا گیا۔

سلمان نے اس کے غائب ہونے کے بعد ایک جھرجھری سی لی اور اپنے بلاک کی طرف چل دیا۔ بدقسمتی سے وہ اس وقت یہ بھول گیا کہ اسے خود کو ظاہر نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ کوئی بھی طالب علم اپنے بلاک یا کمرے سے باہر ہو وہ بھی اس ایریا میں جو طالب علموں کے ہوسٹل سے کافی دور تھا۔ اسی لیے چوکیدار نے اسے دیکھ کر زور سے پکارا۔

''ہے.... رکو.... کون ہو تم؟'' سلمان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن پھر فوراً ہی اس نے دوبارہ یہ غلطی نہیں دوہرائی چوکیدار کے خبردار کرنے پر رکنے اور رک کر اسے جواب دینے کا مطلب تھا کہ اس کا بھید بس کھل ہی تو گیا وہ چشم زدن میں غائب ہو گیا اور پھر وہیں کھڑے رہ کر دیکھنے لگا کہ چوکیدار کیا کرتا ہے۔

چوکیدار قریب آیا اور یہ دیکھ کر مارے حیرت کے اس کی آنکھیں پھیل گئیں کہ اس نے جس لڑکے کو دیکھا تھا وہ اتنی جلدی کہاں چلا گیا۔ یہ ایسا کھلا علاقہ تھا جہاں چھپنے کی بھی کوئی جگہ نہیں تھی تو پھر کوئی بھی کہاں جا سکتا ہے۔ چوکیدار کی پریشانی سوا ہونے لگی اور وہ اِدھر اُدھر بار بار گھوم گھوم کر دیکھتا اور بولنے لگتا۔

''ابھی تو اِدھر ہی تھا۔ ابھی ابھی میں کہاں چلا گیا۔'' پھر اس نے اپنے سر پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''یہ ہمارا وہم ہے۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔'' گرچہ وہ اس بات سے خود مطمئن نہیں کر سکا مگر اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ چوکیدار واپس چلا گیا تو سلمان کو اپنی اس حرکت پر کافی شرمندگی ہوئی وہ خود کو لعنت ملامت کرنے لگا کہ اس نے اپنے باپ ابراہیم سے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ اپنی اس صلاحیت سے اس وقت تک کوئی کام نہیں لے گا جب تک انسانوں کی اس دنیا میں کوئی اس کی جان کے درپہ نہ ہو۔ لیکن جب سے اسے صنوبر سے عشق ہوا تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے وہ اکثر بہت سی باتیں یاد نہیں رکھ پاتا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ کئی بار اس کے منہ سے درشہوار اور صنوبر کی باتیں سن کر جواب یا کچھ بھی نکلنے والا ہوتا تھا اور عین زبان کے آخری سرے تک آتے آتے اسے یاد آ جاتا تھا کہ وہ تو ایک بلا ہے اور بلے انسانوں کی طرح نہ بولتے ہیں اور نہ باتیں کرتے ہیں۔ یہ سب

سوچنے سے اس کا موڈ کافی مضمحل سا ہو گیا تھا۔ وہ خود پر کیوں قابو نہیں رکھ پاتا۔
اسے کیوں وہ سب باتیں یاد نہیں رہتیں جن کا یاد رکھنا بہت ضروری ہے۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ دنیا میں ایسی کوئی مخلوق نہیں ہے جسے اپنے آپ پر ہر قسم کے حالات میں اختیار ہو۔ ایسا ہوتا تو خدا کی موجودگی کا کبھی پتا نہیں چلتا۔ یہ وہی ہے جو اس قسم کے بے اختیار مواقع پیدا کرتا ہے اور پھر اپنی مخلوقات کی مدد کرتا ہے تا کہ اس کے بندوں کو ہمیشہ یہ یاد رہے کہ کوئی ہے جو ان کی ہر حرکت و عمل پر نظر رکھے ہوئے ہے اور اس سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔ کیا ظاہر اور کیا باطن وہ سب جانتا ہے۔
حسب توقع ہم شکل کمرے سے اُسی طرح نکلا تھا جیسے اسے نکلنا چاہیے تھا یعنی بنا دروازہ کھولے۔ اتنی رات میں اگر وہ اپنے روم میٹ عمران کو جگا کر یہ کہتا کہ وہ اندر سے دروازہ لگالے تو اسے کیونکہ وہ باہر جا رہا ہے تو اسے عمران کو یہ بتانا پڑتا کہ وہ کہاں جا رہا ہے، وہ بھی اتنی رات میں۔ سوائے قریبی بنے ہوئے واش رومز کے جہاں رفع حاجات کے لیے جانے کی اجازت تھی اور کہیں جانے کی رات کے اس وقت میں منائی تھی وہ اگر عمران کو یہ بتاتا کہ وہ واش روم جا رہا ہے تو عمران زیادہ سے زیادہ اس کا انتظار پندرہ بیس منٹ تک کرتا پھر وہ اسے دیکھنے باہر نکل پڑتا اور اس کے بعد جو ہوتا اسے سنبھالنا ناممکن تھا۔ اس لیے ہم شکل نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔
ہم شکل ہو یا سلمان دونوں کو اپنی صلاحیتوں کے استعمال اور اپنے بارے میں اختیار و اظہار کی قدرت حاصل تھی لیکن دوسرے کس وقت کیا کرتے ہیں انھیں اس پر کوئی قدرت نہیں تھی۔ اسی لیے سلمان کے ساتھ وہ ہوا جو اس نے نہیں سوچا تھا۔
جیسے وہ دروازے سے بنا دروازہ استعمال کیے اندر کمرے میں داخل ہونے لگا تو اس کی ہوشیار کر دینے والی رگ پھڑکی اور وہ یہ دیکھ کر ایک لمحے کو لرز کر رہ گیا کہ دروازے کی کنڈی باہر سے لگی ہوئی تھی اس کا صاف مطلب تھا کہ عمران واش روم گیا ہے۔ اور اس نے نیند سے بیدار ہوتے وقت ضرور یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ وہ یعنی سلمان اپنے بستر پر موجود نہیں ہے۔ اور جب اس نے یہ دیکھا ہوگا تو اس وقت اس کی حیرانی کی انتہا نہ رہی ہوگی کہ دروازہ اندر سے بند تھا اور سلمان غائب تھا۔ ایسے میں تو اس کا پیشاب اور باقی سب چیزیں رفو چکر ہو گئی ہوں گی۔ اور وہ مارے حیرت اور خوف کے ضرور نگراں یا کم سے کم چوکیدار کو تو بتانے ہی اور بلانے گیا ہوگا۔
''اب کیا کروں؟'' سلمان نے سوچا اور کافی سوچ بچار کے بعد اس نے بنا دروازے کے ہی اندر جانا ٹھیک سمجھا اور جا کے اپنے بستر میں اس طرح گھس گیا جیسے وہ سو رہا ہو۔ کچھ دیر بعد عمران آیا اور اسے دروازہ پہلے باہر سے اور پھر اندر سے بند کرنے کی آوازیں آئیں۔ اس کی روح خوف سے کانپ رہی تھی کہ اب ضرور کچھ ہونے والا ہے اور وہ ضرور آج پھنس جائے گا۔ وہ لیٹے لیٹے ایسی باتیں سوچتا رہا کہ کوئی اس سے پوچھے گا ایسا کیسے ہوا کہ دروازہ اندر سے بند تھا اور تم غائب تھے تو وہ کیا جواب دے گا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ کہہ دے گا وہ تو اپنے بستر میں ہی تھا کہیں گیا ہی نہیں اور یہ کہ یہ سب عمران کا وہم ہے وغیرہ۔ وغیرہ اسی قسم کی باتیں وہ سوچتا رہا لیکن خوف اس کے رگ و پے میں دوڑ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ آج وہ ضرور پھنس جائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو اس کی زندگی برباد ہو سکتی ہے۔ جب تک وہ صنوبر سے اپنی محبت کا اقرار نہیں کروالیتا تب تک تو اسے لازمی مدرسے میں ہی رہنا ہوگا۔ یہ تو آگے کی بات ہے کہ جب بھی وہ مدرسہ چھوڑے گا تو اپنے ماں باپ سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق اپنے گھر جائے گا یا صنوبر کی خاطر یہیں، اسی انسانی دنیا میں رہے گا۔ انسانوں کے درمیان۔
اس وقت تو اسے عمران کے آنے کی فکر لگی ہوئی تھی اور عمران کے ساتھ کون آنے والا تھا۔ مدرس، نگراں یا چوکیدار وہ نہیں جانتا تھا۔
دروازہ کھلا تب اس کا دم حلق میں آ گیا لیکن جب دروازہ بنا کسی بھی شور شرابے کے بند ہو گیا تو اس کی حیرانی اور بڑھ گئی کچھ دیر تک وہ چادر میں منہ چھپائے خاموش پڑا رہا۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ عمران اپنے بستر پر آ کے بیٹھ

چکا ہے اور شاید لیٹنے کی تیاری کر رہا ہے۔
ایسا کیسے ہوا۔
یہ کیا ماجرا ہے۔

کیوں عمران کسی کو اپنے ساتھ نہیں لایا۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے ہمت کر کے چہرے سے چادر ہٹائی تو سامنے ہی عمران اپنے بستر پر بیٹھا ہوا اسے گھور رہا تھا۔ قبل اس کہ وہ کوئی بات کرتا عمران بولا۔

''معاف کرنا میں نے شاید دروازہ زور سے بند کر دیا تھا تمہاری آنکھ کھل گئی۔'' عمران کی بات سن کر اسے اتنا تو معلوم ہو گیا کہ اس کے ساتھ کوئی نہیں ہے اور عمران معمول کے مطابق رفع حاجت سے فارغ ہو کر سونے کی تیاری کر رہا ہے۔ فوراً سے پیشتر اس نے اندازہ لگا لیا کہ جس وقت عمران کمرے سے باہر گیا ہو گا تو اسے اتنے زور کا پیشاب لگا ہو گا کہ اس نے سلمان کے بستر کی طرف دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی ہو گی اور جلدی سے دروازہ باہر سے بند کر کے چلا گیا ہو گا اور اب جب واپس آیا ہے تو وہ نہیں جانتا کہ اس کمرے میں کتنی بڑی تبدیلی واقع ہو چکی ہے۔ ایک سلمان یہاں سے جا چکا ہے اور دوسرا سلمان یہاں آ چکا ہے۔

''نہیں کوئی بات نہیں۔ میری نیند اس لمحے میں کمزور پڑ گئی ہو گی، اس لیے آنکھ کھل گئی۔'' سلمان نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ جان بچی سو لاکھوں پائے۔ ویسے بھی کمرے میں اندھیرا ہوتا ہے، صرف چاند کی چاندنی کی کچھ کرنیں کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہو جاتی ہیں وہ بھی ان دنوں میں جب چاند پورا ہو یا پورے سے کم یا قریب ہو۔ اتنی کم روشنی میں، وہ بھی ایسی سچویشن میں عمران کا اسے نہ دیکھنا ممکن تھا۔''

''اچھا چلو اب سو جاؤ!'' سلمان نے کہا۔ ''صبح سویرے اٹھنا ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کا پھر سے شکر ادا کیا اور چہرے پر چادر تان لی۔

حسب معمول آذان سے پہلے ہی انہیں اٹھنا ہوتا تھا۔ ہر کمرے پر جگانے والا ایک آدمی مامور تھا اور گھڑی یا الارم پر مدرسے میں بھروسا کرنے کی روایت نہیں تھی اسی لیے جگانے والے کمروں پر دستکیں دیتے اور جب تک اندر سے جواب نہ مل جاتا دستک دیتے رہتے۔ عمران اور سلمان دونوں کو مقررہ وقت پر جاگنے کی عادت ہو چکی تھی اس لیے وہ جگانے والے کے آنے سے چند لمحے پہلے ہی اٹھ جایا کرتے تھے اور جگانے والے کو ان کے کمرے سے ہمیشہ پہلی ہی دستک میں جواب مل جایا کرتا تھا۔ لیکن آج کچھ مختلف ہوا۔

جس وقت عمران جاگا تو وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ سلمان اب تک گھوڑے بیچ کے سو رہا تھا۔ اس نے سلمان کو آوازیں دیں مگر وہ اتنی دھیمی آوازوں سے اٹھنے والا نہیں تھا اس لیے سوتا رہا۔ اسے اتنے بہت سارے دنوں میں مدرسے والی عادات تقریباً بھول گئی تھیں اور اس طرح کی عادات اس میں گھر کر چکی تھیں جیسی صنوبر کے گھر والوں کو لاحق تھیں۔

عمران نے یہ سوچ کر زیادہ آوازیں نہیں دیں کہ ابھی کچھ دیر میں جگانے والا آئے گا تو سلمان خود بخود جاگ جائے گا۔ جگانے والے کی پہلی دستک پر سلمان نہیں جاگا تو عمران کو تشویش ہوئی اور اس نے دوسری دستک کے بعد اندر سے جواب دے دیا اور خود اپنے بستر سے اٹھ کر سلمان کا ماتھا چیک کرنے لگا کہ کہیں اسے کوئی بخار تو نہیں ہے۔ یا اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ جیسے ہی عمران نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو سلمان ایک دم ہڑبڑا کے اٹھ گیا۔

''کیا ہوا کیا کر رہے تھے؟'' سلمان نے مشکوک نظروں سے عمران کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''میں نے کیا کرنا ہے یار تم آج پتا نہیں کیوں تم اب تک سوئے پڑے ہو۔ دستک والا بھی آ کے جا چکا ہے اور تم ہو کہ سوئے جا رہے ہو۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا۔ ہمیشہ تم دستک والے سے پہلے بیدار ہو جاتے ہو بلکہ تم ہی مجھے بھی جگاتے ہو پر آج.....'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اصل میں کافی دن بعد اس طرح سے سویا ہوں نا تو....'' سلمان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے بھی جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''کافی دن بعد کیا مطلب ہے میں کچھ سمجھا نہیں؟'' عمران کا ردعمل یہی ہونا تھا اس لیے سلمان نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

''ارے یار میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ کافی دن بعد اس طرح کی نیند آئی کہ دستک والے کے آنے اور جانے کا پتا نہیں چلا۔ خیر چلو اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' کمرے کا بلب عمران نے پہلے ہی روشن کر دیا تھا۔ سلمان جب اپنے بستر اور چادر میں سے نکلا تو عمران اسے حیرانی سے دیکھنے لگا۔

''اب اس طرح کیا دیکھ رہے ہو چلو مسجد چلتے ہیں سب انتظار کرتے ہوں گے اور ریحان عظیم تو اس تاخیر پر ناراض بھی ہو سکتے ہیں۔

''میں دیکھ رہا ہوں کہ رات کو جب تم بستر میں لیٹے تھے تو تمہارے کپڑے نیلے رنگ کے تھے مگر اب سفید ہیں؟'' سلمان کو عمران کی اس بات پر ایک دم ہنسی آ گئی۔

''ابے تم میرے کپڑوں کا اتنا دھیان رکھتے ہو۔ چلو پھر آئندہ جب میں رات کو اٹھ کر کپڑے چینج کیا کروں گا تو تمہیں سوتے سے اٹھا کے بتا دیا کروں گا کہ میں کپڑے چینج کر رہا ہوں۔'' عمران خفیف سا ہو گیا جیسے سلمان نے اس پر چوٹ کی ہو۔

مدرسوں میں لڑکیاں تو ہوتی نہیں ہیں اس لیے کئی لڑکے لڑکوں سے ایسے پیش آنے لگتے ہیں جیسے انھیں ان سے محبت ہو گئی ہو۔ تاہم اس معاملے میں یہ بات وثوق سے کہنا ٹھیک نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے یہ محض ایک اتفاق ہو کہ عمران نے سلمان کے کل رات کے لباس پر نظر رکھی ہو۔ یا اسے بلاوجہ اس کے لباس کا رنگ یاد رہ گیا ہو۔ سلمان نے عمران کے گلے میں ہاتھ ڈالا اور بولا۔ ''اب چلو بھی یا کھڑے شرمندہ ہوتے رہو گے۔'' عمران بنا کوئی جواب دیے چل پڑا۔ اسے سلمان کا اپنے گلے میں ہاتھ ڈالنا بھی عجیب لگا تھا، ورنہ سارے مدرسے میں یہ بات مشہور تھی کہ سلمان اپنے جسم کو کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیتا تھا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے سلمان کے جسم میں کوئی ہڈی نہیں تھی اور یہ بات وہ کسی کو بتانا نہیں چاہتا تھا۔

عام انسان اس بات پر ذرا مشکل سے ہی یقین کر سکتا ہے کہ بنا ہڈی کے تو کوئی کھڑا ہو سکتا ہے اور نہ ہی چل پھر سکتا ہے مگر جنات کے لیے یہ ممکن ہے بالکل اسی طرح جس طرح ان کے لیے وہ سب کچھ ممکن ہے۔ جس کا انسان سوچ بھی نہیں سکتے۔

مسجد میں پہنچ کر سلمان نے سب سے ہاتھ ملایا۔ یہ مدرسے کی سخت پابندیوں میں شامل تھا ورنہ سلمان کا بس چلتا تو وہ یہ بھی نہ کرتا۔ ریحان عظیم نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ ہمیشہ ہی ایسا کرتے تھے اور پھر نماز شروع ہو گئی۔

☆......☆......☆

صنوبر کا دل پہلے سے زیادہ اداس تھا اور وہ رات بھر سو نہیں سکی تھی۔ اپنے کمرے سے نکل کر وہ بالکونی میں آ گئی اور اپنے انھی خیالوں میں گم ہو گئی جو ان دنوں اس کے دل دماغ میں ہلچل مچایا کرتے تھے۔ رات کو دیر تک وہ اپنی ماں درشہوار سے باتیں کرتی رہی تھی اور وہ دونوں صرف اس ایک موضوع پر باتیں کرتی رہیں کہ صحت مند ہونے کے بعد جب سلمان آصف اس بلے کو گھر میں تلاش کرے گا اور اسے بلا کہیں نہیں ملے گا تو اس کا کیا ردعمل ہو گا۔ لیکن رات گئی، بات گئی کے مصداق اس وقت جب صبح کی سپیدی نمودار ہونا شروع ہو چکی تھی تو صنوبر کو بلا یاد بھی نہیں تھا۔ وہ تو کچھ اور ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔

اس کے برعکس درشہوار کو ٹینو کی یاد مسلسل ستاتی رہی اور رات کو سوتے ہوئے کتنی ہی بار درشہوار کی آنکھ کھل کھل جاتی تو اسے صرف ایک ہی بات اپنے دل دماغ میں گونجتی محسوس ہوتی کہ پتا نہیں ٹینو اب کہاں ہو گا۔ وہ کبھی واپس

بھی آئے گا یا نہیں...

صنوبر کو ایک لمحے کو اس وقت اپنے آپ سے چونکنا پڑا جب اسے اس رات والے نوجوان کی یاد آئی۔ کوئی بھی اس کی یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہوا کہ وہ خواب نہیں حقیقت تھی کہ اس نے اپنے کمرے میں ایک نوجوان کو دیکھا تھا جو اس کے بہت قریب تھا اور اس کے ڈرنے اور چیخنے سے دور ہٹ کے کھڑا ہو گیا تھا۔

ان گزرے دو دنوں میں اس نے اس طرح سے نہیں سوچا تھا کہ اسے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ وہ نوجوان غیر معمولی طور پر حسین اور وجیہہ تھا۔ اس آنکھیں کس قدر شربتی اور گہری تھیں اور ان میں صدیوں پرانی کہانیاں رقص کناں تھیں۔ اس کے ہاتھ بہت ہی سڈول اور پیشانی چمکتی ہوئی تھی۔ وہ سفید رنگ کے قریب بالکل ایسا کوئی انسان تھا جیسے برف کے دیسوں سے آیا ہو۔ صنوبر کو یاد آیا اس کی آنکھوں میں ایسی ناقابلِ بیان روشنی کی چمک تھی جو انسانوں کی آنکھوں میں کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔

''تو کیا وہ انسان نہیں تھا؟'' صنوبر جیسے جیسے اس مسئلے پر سوچتی تھی نئی حیرت اس کی آنکھوں میں بھرتی جاتی تھی۔ اسے یقین ہونے لگا کہ وہ ضرور اس کا کوئی خواب ہی تھا ورنہ ایسے انسان کہاں ہوتے ہیں اور اگر ہوتے بھی ہیں تو وہ اس کے کمرے میں اس کے پاس کیوں آئے گا۔ پہلی بار اسے یہ خیال بھی آیا کہ کاش وہ نہ چیختی اور اس کی بات سن لیتی تو شاید یہ بھید آج طشت از بام ہو جاتا کہ وہ سب کچھ خواب تھا یا حقیقت... لیکن اب کیا ہو سکتا ہے اس کے بعد ایک اور رات گزر چکی تھی مگر اسے وہ خواب پھر سے نظر نہیں آیا۔ اگر حقیقت تھی تو وہ پھر اس کے سامنے ظاہر نہیں ہوئی شاید اب ایسا کبھی نہ ہو۔

خیالوں کی وادیوں میں بے تکان وہ جانے کب تک دوڑتی رہی اور اس وقت چونکی جب اس کی ماما نے اسے وہاں آ کے مخاطب کیا۔

''صنوبر... تم یہاں ہو... میں تمہیں تمہارے کمرے میں دیکھنے گئی تھی۔'' صنوبر نے ایک نظر بھر کے ماں کی طرف دیکھا اور بولی۔

''آپ بھی رات کو ٹھیک سے سو نہیں سکیں؟'' در شہوار نے پاس ہی رکھی ہوئی چیئر پر بیٹھتے ہوئے دور سنسان گلی میں کسی چوکیدار کو جاتے ہوئے دیکھ کر فوری جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر کے توقف کے بعد بولی۔

''ساری رات مجھے ٹینو کی یاد آتی رہی۔''

''وہ تھا ہی اتنا سمجھدار کہ اسے یاد کیا جائے اور آپ سے تو بہت قریب ہو گیا تھا'' صنوبر نے ماں کے قریب بیٹھتے ہوئے ان کے گلے میں ہاتھ حمائل کر دیا۔

''بیٹے مجھے لگتا ہے وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔'' ایسا کہتے ہوئے در شہوار کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔

''اچھا ہے ماما کہ وہ واپس نہ آئے۔ بلاوجہ اس کے واپس آنے سے سلمان کو غصہ چڑھے گا اور گھر میں ہنگامہ ہو گا پاپا کو پتا چلا تو وہ اسے ویسے بھی رکھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ وہ نہیں ہے تو شاید سلمان صبر کر کے بیٹھا رہے اور پاپا کو بھی کچھ پتا نہ چلے۔''

''پتا نہیں وہ کہاں ہو گا کوئی اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔'' در شہوار کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو گرنے لگے۔

''کیوں اپنے آپ کو پریشان کر رہی ہیں ماما پلیز اسے بھول جائیں وہ ایک جانور ہی تو تھا آپ کا بیٹا تو نہیں تھا۔ آپ کا بیٹا تو سلمان ہے اس پر توجہ دیجیے تاکہ وہ آپ کا فرمانبردار بن سکے اور آپ کے ساتھ اپنا رویہ اچھا کر لے۔'' صنوبر کی بات میں اتنا وزن تو تھا کہ در شہوار فی الفور چپ ہو گئی اور اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔

''مگر بیٹا وہ تو میری صورت سے بیزار ہے اور اس روز کے واقعے کے بعد تو وہ مجھے اپنا دشمن سمجھنے لگا ہے۔ اس کا

رو یہ میرے ساتھ کیسے ٹھیک ہوگا؟'' درشہوار کے لہجے کی مایوسی کو محسوس کر کے صنوبر کو دکھ ہوا اور اسے لگا اس کی ماں ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ سلمان جیسے اڑیل گھوڑے پر کوئی اس وقت تک سواری نہیں کر سکتا جب تک وہ خود ایسا نہ چاہے۔

''میں پاپا سے بات کروں گی۔ وہ اسے سمجھائیں گے تو وہ ضرور سمجھ جائے گا۔ پاپا کی بات وہ نہیں ٹال سکتا۔'' صنوبر نے پریقین انداز میں ماں کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

''اور جیسے اپنے پاپا کو تم جانتی نہیں ہو۔ وہ اسے بھی کچھ نہیں کہیں گے الٹا میری سو خرابیاں گنوا کے کہیں گے جو کیا اس کے جواب میں ایسا تو ہونا ہی تھا۔'' درشہوار کو جیسے صنوبر کی بات پر بالکل یقین نہیں آیا تھا۔ ابھی یہ بات چیت اور کچھ دیر جاری رہ سکتی تھی کہ سلمیٰ دونوں کو ناشتے پر بلانے آ گئی۔

وہ دونوں اندر پہنچیں تو آصف کریم پہلے سے ناشتے کی ٹیبل پر موجود تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ بولا۔

''سلمان نے ناشتا کر لیا؟''

''ابھی تو وہ سو کر بھی نہیں اٹھا ہوگا پاپا!'' صنوبر نے اپنی مخصوص کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے بے خیالی سے کہا۔

''نہیں بی بی صاحبہ سلمان بابا جاگ چکے ہیں اور ناشتا مانگ رہے تھے۔ میں نے کہہ دیا ہے ابھی لاتی ہوں۔ آپ لوگ ناشتا کر لو تو میں انہیں بھی دے آؤں گی۔'' سلمیٰ نے بیچ میں سے بات اچک کر اپنی بات مکمل کی۔

''اچھا تو پھر ایسا کرو تم سلمان کا ناشتا مجھے دے دو، میں لے کر جاتی ہوں'' صنوبر کی بات سن کر آصف کریم نے درشہوار کی طرف دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں اور جیسے غصے سے ناشتا کرتا رہا۔ صنوبر اپنا ناشتا چھوڑ کر اپنے بھائی کا ناشتا لے کر چلی گئی۔

''یہ کام صنوبر سے زیادہ تمہارے کرنے کا تھا۔ بیٹا ہے وہ تمہارا۔'' آصف کریم سے جیسے رہا نہیں گیا اور وہ بول ہی پڑا۔

''جانتی ہوں بیٹا ہے وہ میرا لیکن وہ مجھے اپنی ماں نہیں سمجھتا۔ میری تو وہ شکل دیکھنے سے بھی بیزار ہے۔'' درشہوار کے منہ سے جذبات کی رو میں وہ بات نکل ہی گئی جسے وہ گزشتہ کتنے ہی دنوں سے چھپاتی رہی تھیں۔

''ابھی کل تک تو ایسا نہیں تھا۔ ٹھیک ہے بچے تمہیں اچھی ماں نہیں سمجھتے۔ جو تم ہو بھی نہیں۔ لیکن تمہاری شکل سے بیزار ہو جائیں...... ایسا کب ہوا؟'' آصف کریم کے لہجے میں چھپے طنز کو درشہوار نے صاف طور پر محسوس کر لیا اور اب اس کا جواب نہ دینا اس کے دین کے خلاف تھا۔ وہ اس سے بھی زیادہ تیز لہجے میں بولی۔

''یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔ تم چاہتے تھے کہ میرے بچے مجھ سے دور ہو جائیں۔ نفرت کریں مجھ سے۔''

''میں ایسا کچھ نہیں چاہتا تھا۔ یہ سب تمہارے اس احساسِ کمتری کا نتیجہ ہے جس سے تم آج تک نکل نہیں سکیں۔'' آصف کو جیسے معلوم تھا کہ اسے اونچی آواز میں جواب دے کر اپنے بلڈ پریشر کو ہوا دینے کی ضرورت نہیں تھی اور جب نیچی پرواز سے کام چل رہا ہو تو ضرورت بھی کیا ہے آسمان کو چھونے کی۔ درشہوار حسب دستور جذبات کی حدوں سے باہر نکل گئی اور اس کی برداشت جواب دینے لگی تو وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

صنوبر واپس آئی اور ماں کو اپنی نشست پر نہ دیکھا تو سمجھ گئی کہ کیا ہوا ہے۔

☆......☆......☆

''ایسا ہونا مانا کہ عین فطری ہے لیکن فطرت کی بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کی اجازت یہ مدرسہ نہیں دیتا۔'' ریحان عظیم کے سامنے بیٹھا ہوا سلمان ان کی باتیں دھیان لگا کر سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی بیدار مغزی ہی اس کی پہچان تھی۔

''کیوں استاد جی...کہا تو یہ جاتا ہے انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے اور مجبور انسان کو سزا کیوں کر دی جائے؟'' سلمان کا سوال سن کر ریحان نے اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تم ہم سے یہ سوال کرتے کہ اور کون کون سی ایسی فطری باتیں ہیں جن کی مدرسے کے

لیکن اس کا نتیجہ تو اور بھی خراب نکلا صنوبر نے اسے دیکھ کر ایسے چیخیں ماریں جیسے وہ کوئی چور ڈاکو یا اس کی جان کا دشمن ہے اور سلمان کریم کے ساتھ ہونے والی جھڑپ کے بعد اس کا اس گھر میں بلا بن کے رہنا بھی دشوار ہو گیا۔ ہر چند کہ وہ چاہتا تو رہ بھی سکتا تھا، وہ بھی اس طرح کہ سلمان کریم اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا تھا لیکن اسے تو اپنے عشق کی منزل کو پانے کی لگن جلائے جا رہی تھی۔ سلمان کریم سے اسے کوئی دشمنی نہیں تھی بلکہ کسی سے بھی نہیں تھی۔ اسے تو بس صنوبر سے پیار تھا اور وہ اپنے اس پیار کو پانا چاہتا تھا لیکن بہت سوچنے کے بعد بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اپنے پیار کو کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ صنوبر کو وہ کیسے یقین دلا سکتا ہے کہ وہ اس سے بے پناہ محبت کر سکتا ہے۔ یہی سوچ کر وہ مدرسے واپس آیا تھا کہ شاید انسان بنے رہنے سے اسے کوئی راستا مل جائے اور وہ جان لے کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ مگر ریحان عظیم جو اسے سب سے زیادہ اہمیت دیا کرتے تھے، وہ اس کا واحد سہارا تھے لیکن جب انھوں نے اسے مدرسے کے سخت قوانین سے ڈرانا شروع کیا تو وہ سمجھ گیا کہ اس مدرسے میں تو اسے ایک بھی ایسا انسان نہیں مل سکتا جو عشقِ مجازی کی حلاوتوں اور لطافتوں کو ایک آنچ بھی سمجھ سکتا ہو۔

یہاں پاکیزہ انسان بنائے جاتے ہیں اور انھیں ایسے جینا سکھایا جاتا ہے جیسے اللہ کے بنائے ہوئے فرشتے، نظریں نیچے کر کے جیتے ہیں۔

یہ لوگ نہیں جانتے کہ خالق کا مقصد اگر انسان کو بھی فرشتہ ہی بنانا ہوتا تو پھر اسے انسان بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ انسان کا انسان ہونا ہی ضروری ہے اور جو انسان ہے اس پر یہ لازم ہے کہ وہ عشقِ مجازی کی کٹھنائیوں سے بھی ضرور گزرے۔ اب اس راستے میں دکھ ہیں یا سکھ، چڑھتے ہوئے پانیوں کے دریا ہیں یا پُرسکون سمندروں میں بہتی لہروں کی روانی...... جو بھی ہے اسے تو عشق ہو چکا اور جو عشق کرتا ہے وہ پھر پروا نہیں کرتا۔

میں تو یوں بھی جن سے انسان بنا ہوں تو مجھے تو انسان اور جن دونوں کی قوتوں کا سہارا ہے۔ بس پھر مجھے بغاوت کرنی ہو گی۔ اس مدرسے سے اور جن جاتی کے اصولوں اور اس خوف سے جو مجھے آگے بڑھنے نہیں دے رہا۔

یہ سب سوچ کر ایک نئے عزم سے سلمان نے خود کو تیار کیا اور رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

☆......☆......☆

رات کے تیسرے پہر وہ اپنے بند کمرے سے نکلا اور کسی کو دکھائی نہ دینے والی قوتوں کے زور پر چشم زدن میں صنوبر کے کمرے میں جا پہنچا۔ وہ جو کچھ رہا تھا یہ سب اصولوں کی خلاف ورزی تھا اور اس کے لیے ممنوع تھا۔ اس نے جو فیصلہ کیا تھا یہ اس کے لیے تباہ کن تھا اور جن جاتی کے خدائی فرمان کے مطابق یہ شیطانی فعل تھا لیکن اس وقت عشق کی جو آگ اس کے اندر باہر جل رہی تھی اس میں اسے صحیح اور غلط، اچھائی یا برائی کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا، جیسے بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق......

اس نے سوئی ہوئی صنوبر کو غور سے دیکھا اور اسے اس کی معصومیت پر بے پناہ پیار آیا اور اسے لگا کہ صنوبر بس اسی کے لیے دنیا میں بھیجی گئی ہے اور اس وقت اسے پانے کا اس کے علاوہ کوئی اور راستا نہیں ہے۔

ایک لمحے کو خوف نے اس کے پاؤں روکنے اور اسے جکڑنے کی کوشش کی مگر کچھ ہی دیر میں وہ خوف سے نجات پانے میں کامیاب ہو گیا اور ایک زور کی جھرجھری لے کر اس نے اپنے آپ کو جیسے سارے خوفوں اور ڈروں سے آزاد کرا لیا اور پھر وہ ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ جس کے نتائج تباہ کن ہو سکتے تھے۔ جس کے لیے اسے بھاری قیمت ادا کرنی پڑ سکتی تھی پر عشق میں ایسے مقام آتے ہی ہیں جب سوچنے سمجھنے کی سب صلاحیتیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ اور سلمان ابراہیم بھی اس وقت ایسی ہی حالت میں تھا۔ وہ صنوبر کے بیڈ کے قریب اور قریب ہوتا چلا گیا اور پھر سانپ کی طرح صنوبر کے جسم میں تیر کر حلول کر گیا۔ صنوبر کی ایک جھٹکے سے آنکھ کھلی اور جیسے ابل ہی پڑی اسے زور کی ابکائی آئی اور وہ ہچکی سی لے کر ایک دم بے سدھ ہو گئی......!!!

(اسرار بھری دنیا کے باقی واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے)

احاطے میں رہتے ہوئے اجازت نہیں ہے... لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج تمہاری طبیعت باغیانہ روشوں پر دوڑ رہی ہے اور تم ایسے سوالات کر رہے ہو جو نظام کو تنقید کا نشانہ بنانے کے لیے ہیں۔ اور جب کوئی اس طرح سے سوچنے لگتا ہے تو ہمیں خبر ہو جاتی ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔'' وہ رکے، انھوں نے تیر کی طرح اندر تک اتر جانے والی نظروں سے سلمان کے اندر جھانکا اور بولے۔

''کیا بات ہے کل تک تمہارا کہنا یہ تھا کہ تم ایسا کچھ محسوس نہیں کرتے اور تمہیں عشق محبت سے کوئی واسطہ نہیں ہے لیکن آج تمہارا ذہنی اور فکری رویہ بدلا ہوا ہے!'' سلمان کو لگا کہ اب اسے اپنے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور ریحان عظیم کو بتا دینا ہی ہوگا ورنہ وہ ہر روز اسی طرح اس سے بے کار اور بور کر دینے والی باتیں کرتے رہیں گے جنھیں سن کر اب اسے نیند آنے لگتی تھی کیونکہ فلسفے میں گوندھی ہوئی خشک باتیں جن میں پند و نصائح کے علاوہ کچھ اور نہیں ہوتا اس کی دلچسپی کا محور اب نہیں رہی تھیں...

''لیکن استاد جی انسان تو کسی بھی لمحے بدل سکتا ہے اور عشق و محبت کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ یہ کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔ اصل میں استاد جی فطرت ہوتی ہی وہ ہے جو اعلان کر کے انسان پر حملہ آور نہیں ہوتی۔ وہ تو اس طرح انسان کو اپنی گرفت میں لیتی ہے کہ اسے پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ کب فطرت کا شکار ہو چکا ہے'' ہر چند کہ سلمان نے اپنی بات کو دوسرے لفظوں میں ملفوف کر کے استاد جی تک پہنچانے کی کوشش کی تھی لیکن جب انھوں نے براہِ راست سوال کیا تو سلمان کے پاس ان کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''تو صاف صاف کہو نا تمہیں عشق کا بھوت چمٹ گیا ہے اور اب تم اس کی گرفت میں ہو۔ کب ہوا یہ حادثہ؟''

''جی... جی وہ...'' اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ ''میرا وہ مطلب نہیں تھا میں تو جاننے کے لیے ایسے سوالات کر رہا ہوں'' سلمان نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''ہم سے مت چھپاؤ بچے... ہم سب جانتے ہیں'' ریحان عظیم کے لبوں پر باریک سی مسکراہٹ دھیرے دھیرے گہری ہوتی جا رہی تھی۔

''سب جانتے ہیں... میں کچھ سمجھا نہیں استاد جی... آپ کیا... جانتے ہیں؟'' سلمان نے اب بھی ہوش و خرد کا دامن پوری طرح نہ چھوڑنے کا فیصلہ کیے رکھا۔

''یہی کہ تمہیں عشق ہو گیا ہے جسے تم ہم سے اور شاید اپنے آپ سے بھی چھپانا چاہتے ہو!'' ریحان عظیم کے لہجے کی نرمی اس بات کی غماز تھی کہ وہ سلمان کے دل کا بھید لینا چاہتے ہیں۔ مگر سلمان کو اب بھی اس بات کا یقین نہیں تھا کہ اس نے اگر پورا سچ ریحان عظیم کو بتا دیا تو وہ واقعی اس کی مدد کریں گے۔ اگر انھوں نے مدرسہ کی سمجھو سلمان کی زندگی کی یہ سب سے بڑی غلطی ہوگی۔ اسی لیے وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

''مجھے واش روم جانا ہے استاد جی! کیا میں جاؤں؟'' ریحان عظیم نے نہایت پراسرار سے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور اشارے سے اسے جانے کو کہا۔ سلمان دھیرے سے اٹھا اور جلدی جلدی چلتا ہوا ان کے حجرے سے نکل گیا باہر راہداری کو جلدی سے عبور کر کے وہ ایک ستون کے سائے میں کھڑا ہو کر اپنی سانسیں درست کرنے لگا اور اسے لگا کہ اس نے جیسے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی ہے۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب کیا کرے۔ اپنے دل کی حالت کا بیان کس سے کرے۔ اس مدرسے میں رہ کر تو وہ کبھی بھی اپنے مقصد کو پا نہیں سکے گا اور مدرسے کے علاوہ اس کا کوئی ٹھکانہ بھی نہیں تھا۔ وہ انسانوں میں سے کسی ہمدرد انسان سے یہ جاننا چاہتا تھا کہ اسے ان حالات میں کیا کرنا چاہیے، جب اسے عشق ہو چکا ہو اور لڑکی کو اس کے دل کی حالت کا کچھ پتا نہ ہو۔

شروع شروع میں وہ صنوبر کو دیکھتے رہنے کی خاطر اس کے لیے بلا بن کے اس کے گھر میں رہتا رہا لیکن دل میں سلگتی ہوئی آگ دن بدن اور تیز اور تیز بھڑکتی رہی تو اس نے خود کو صنوبر پر اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ظاہر کر دیا

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ نتیجے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ 300/= روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو کُن منی 300/= روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)......مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)......منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)......اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

II 88-C ۔فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل ۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

بچو! اللہ تم سب کو اپنی امان میں رکھے۔ تمام مسلمانوں کو ایمان کی دولت سے مالا مال فرمائے۔ جو پریشان ہیں، ان کی پریشانی دور فرمائے۔ جو بیمار ہیں اللہ انہیں صحت عطا فرمائے۔ تمام بچیاں اپنے گھروں میں خوش اور آباد رہیں...... یا اللہ! ہمارے وطن کے طول و عرض میں امن ہو جائے، کسی کی آنکھ میں آنسو نہ ہو، سب مطمئن زندگی گزار سکیں۔ یہ وہ دعائیں ہیں جو میں ہمیشہ مانگا کرتا ہوں اور اپنے تمام بچوں کو بھی نصیحت کروں گا کہ مکمل خضوع و خشوع کے ساتھ اللہ سے خیر اور سلامتی مانگیں۔ رجب کا بابرکت ماہ اختتام پذیر ہوا اور اب شعبان پھر رمضان کی آمد آمد ہے۔ یہ تین مہینے عبادت اور اللہ کی راہ میں دینے کے ہیں۔ میں اپنے تمام بچوں سے درخواست کروں گا کہ جائز ضرورت مندوں کی امداد میں میرا ساتھ دیں۔ یاد رکھیں جائز ضرورت مند کبھی دنیا کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا اور اللہ کی راہ میں دینے کا بھی ایسے ہی حکم ہے کہ اس طرح دو کہ دوسرے ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو۔ عزت نفس مجروح کیے بنا دینا ہی اللہ کی راہ میں مقبول ہوتا ہے۔ آنے والے دنوں میں سورۃ یٰسین، سورۃ رحمٰن، سورۃ احزاب اور سورۃ بقرہ کا پڑھنا بہت مبارک ہے۔ قرآن کو ترجمے کے ساتھ پڑھنا اور سمجھنا نہایت افضل ہے۔ اللہ سے پورے یقین سے مانگنا ہی کامیابی عطا کرتا ہے۔ چلتے پھرتے استغفار کی تسبیح کرنا بہت اچھا ہے۔ سرورِ کونین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر کثرت سے درود و سلام بھیجیں، اللہ ضرور اپنا کرم نازل فرمائے گا۔ آمین۔ ثم آمین۔

☐ صائمہ۔ کراچی

○ بیٹی صائمہ! اللہ تمہیں اپنے گھر میں خوش اور آباد رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو، میں تمہاری تمام ضروریات کو سمجھ سکتا ہوں اور تمہارے شوہر کو اللہ کے سامنے اپنی ہر زیادتی کے لیے جواب دہ ہونا ہوگا۔ بیٹی میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ رات میں جب نیند نہ آئے تب وضو کر کے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو جایا کرو۔ جس دن تم نے اللہ کا قرب پا لیا، تمہیں دنیا میں کسی کی ضرورت نہیں رہے گی اور تمہارے معاملات بھی درست ہوتے چلے جائیں گے۔ نیند کی گولیاں کھانا فوراً ترک کر دو۔ تم سے کوئی اولاد نہیں چھین سکتا سوائے ان نیند کی گولیوں کے۔ اپنا سارا وقت بچوں کو دو، اپنے آپ کو دو، تم اپنی پروا نہیں کرو گی تو کوئی اور بھی نہیں کرے گا۔ محبت وہ اچھی ہوتی ہے جو انسان کو پھلنے پھولنے دیتی ہے جس محبت کے کرنے سے انسان اپنی صحت، شکل کھو دے وہ محبت نہیں ضد ہے۔ تمہیں شوہر سے محبت ہے بہت اچھی بات ہے۔ ثابت کرو کہ تم سچی محبت کرتی ہو اس کی اولاد کو بہترین خطوط پر پالو۔ بدلے میں وہ بھی تمہیں محبت اور عزت دے گا۔ جلد بازی مت کرو اور سب سے پہلے نیند کی گولیاں کھانا ترک کر دو۔ روزانہ بعد نماز عشاء ایک بار سورۃ یٰسین ضرور پڑھو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

☐ عروسہ۔ کراچی

○ محترم بابا جی! میں نے سچی کہانیاں میں آپ کا کالم پڑھا، بہت پُر امید ہوئی آپ لوگوں کی بہت رہنمائی اور مدد کرتے ہیں۔ اُن کی پریشانی کو سمجھ کر اُن

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: 88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی۔

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 35893122 - 021-35893121

کی پریشانی دور کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے۔ آپ ہمیشہ خوش رہیں (آمین) بس یہی پڑھ کر میں نے بھی لکھا ہے۔ بابا جی میرا خط طویل ہے۔ لیکن پلیز نظرانداز مت کیجیے گا۔ بہت امید سمجھیں کہ یہ آخری امید ہے۔ آپ برائے مہربانی جواب ضرور دیجیے گا۔ پہلی بار اپنی زندگی کے بارے میں لکھ رہی ہوں۔ سمجھ نہیں آتا کیا لکھوں لیکن مجبور ہوگئی، اس لیے لکھ رہی ہوں۔ برائے مہربانی جواب ضرور دیجیے گا۔ بابا جی یہ زندگی بھی نجانے کیسے کیسے دن دکھاتی ہے۔ میں بہت عبادت کرتی تھی۔ ہر وقت وظائف پڑھنا یہاں تک کہ تہجد پڑھتی تھی۔ بابا جی کہتے ہیں کہ جو جوانی میں عبادت کرتا ہے وہ مقبول ہوتی ہے لیکن میرے ساتھ تو ہمیشہ اُلٹا ہوتا ہے۔ لگتا ہے جیسے اللہ پاک بہت نفرت کرتا ہے مجھ سے۔ لیکن کہتے ہیں وہ ستر ماؤں سے زیادہ چاہتا ہے۔ تو پھر کیوں میرے ساتھ ایسا بابا جی...... میں جانتی ہوں میں بہت گنہگار ہوں لیکن میں معافی بھی بہت مانگتی ہوں۔ لیکن بابا جی کہتے ہیں اگر کوئی اللہ کی طرف ایک قدم بڑھائے تو وہ دو قدم بڑھاتا ہے۔ تو کیوں بابا جی میرے ساتھ ایسا ہوتا ہے نہ میری دعائیں قبول ہوتی ہیں نہ توبہ قبول ہوتی ہے۔ اب تو نماز پڑھنے کا بھی دل نہیں کرتا میرا۔ اللہ پاک نے جیسے زبردستی کی زندگی دے رکھی ہے۔ بالکل فالتو ہوں میں اور نہ تو میری شکل اتنی خاص، نہ بال نہ آنکھیں کیونکہ آنکھوں کی روشنی بہت کم ہے۔ چشمہ لگاتی ہوں، نہ ذہن اچھا ہے اور اگر میں کچھ کرتی بھی ہوں تو مجھ پر اثر نہیں ہوتا ہے جیسے کہ زنگ لگ گیا ہے مجھ پر۔ برائے مہربانی بابا جی کچھ بتائیں کہ میں اچھی ہو جاؤں۔ میری آنکھیں اچھی ہو جائیں۔ بنا چشمہ کے بھی دیکھ سکوں سب مجھے پسند کریں۔ میری دعائیں قبول ہوں۔ میں جو ٹوٹکے کروں اُس کا اثر ہو مجھ پر اور بابا جی اللہ پاک نے شکل وصورت نہیں دی تو کم از کم نصیب ہی اچھا کر دیتا۔ میرا بابا جی 16 کی تھی میری شادی کروی گئی۔ والد کی وفات ہوگئی تھی تو سارے خاندان والوں نے مل کر شادی کر دی اور شادی والی رات اُسی آدمی نے 30'35 سال کا تھا۔ اُس نے قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر قسم دلوائی کہ کسی کو نہیں بتانا کہ میں نامرد ہوں۔ بابا جی کچھ مہینے بعد میری امی کو شک ہوا تو میں نے سب بتا دیا پھر طلاق ہوگئی۔ یوں زندگی اور اجیرن ہوگئی۔ ابھی تک ایسی ہی ہوں کتنا صبر کروں۔ اب صبر نہیں ہوتا اس لیے آپ کو بہت اُمید سے لکھا ہے کہ میری مدد فرمائیں۔ میری زندگی پُرسکون اور اچھی گزرے اور ایک بات میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی ہوں کیونکہ مجھ سے دو بڑی بہنیں جن کی عمر بہت ہوگئی ہے لیکن اب کوئی اچھا رشتہ نہیں آتا اُن کا میرے آتے ہیں۔ میری امی ہر وقت اُن دونوں کے بارے میں سوچ سوچ کر اپنی طبیعت خراب کر رہی ہیں۔ برائے مہربانی ان کے رشتے کے لیے بھی بتا دیں بابا جی میری بہن اسماء اس کی شادی ہوئی تھی اور اُس کے سسرال والے بہت تیز تھے اور اس کی طلاق ہوگئی۔ جب سے اس کو مرگی کے دورے پڑتے ہیں اور دوسری بہن حسنہ اس کی عمر 24، 25 سال ہے۔ اس کے لیے بھی کوئی بہتر جیسے میری بہن چاہتی ہیں۔ ویسا ہم سفر ملے، پیار کرنے والا محبت کرے ہمیشہ۔ ساتھ دے سسرال والے بھی اچھے ہوں اب دھوکہ نہ ملے، اس سال دونوں کی شادی ہو جائے بابا جی۔ اور دونوں بہت خوش وخرم رہیں گھر میں اور شادی کے انتظامات کا بندوبست بھی ہو جائے بنا کسی تکلیف کے ساتھ۔ بس بابا جی آخری بات یہ ہے کہ والد کی وفات کے بعد امی جاب کرتی ہیں لیکن گزارا بہت مشکل سے ہوتا ہے۔ بھائی ابھی جاب پر لگا ہے لیکن وہ اپنی پڑھائی کے اخراجات اور گھر کا کرایہ دیتا ہے۔ گھر کے اخراجات بہت مشکل سے ہوتے ہیں۔ بابا جی گھر کے لیے خیر و برکت اور رزق میں کشادگی ہو جائے۔ ہمارے گھر میں اور آپس میں پیار اور محبت رہے۔ پلیز بابا جی میرے مسئلے اور میری بہنوں اور گھر کے مسائل کے لیے بتا دیں، بہت پریشان ہیں ہم۔ بس جیسے ہم سب زبردستی کی زندگی جی رہے ہیں۔ بہت امید کے ساتھ آپ کو یہ خط لکھا ہے کہ میری پریشانی آپ سمجھیں گے اور میری بڑی بہن کے رشتے کے لیے کچھ ایسا بتائیں کہ کوئی ایسا مل جائے جو اُس کی بیماری کے ساتھ اُسے قبول کرلے اور اسی سال اُس کی شادی ہو جائے۔

خوشیاں ہی خوشیاں ہوں ہمارے گھر میں۔ بہت مہربانی ہوگی آپ مجھ پر احسان کردیں۔

☆ بیٹی عروسہ! تمہارا خط بہت تکلیف دہ ہے۔ یقیناً تم سب لوگ بہت مشکل وقت سے گزر رہے ہوں۔ مگر بیٹی تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت نہیں کرتا وہ تو اپنے بندوں سے صرف محبت ہی کرتا ہے۔ ہماری زندگیوں کو تلخ ہمارے اپنے غلط فیصلے کرتے ہیں مگر ان غلط فیصلوں کی بدولت ہونے والے نقصان سے رب العزت ہی بچاتا ہے۔ بیٹی اپنی والدہ کو تسلی دو۔ وہ اکیلی کہاں ہیں، ان کے ساتھ ان کی اولاد ہے۔ تم لوگ اپنی ماں کا ہاتھ بٹاؤ۔ چاہے کپڑے سیو، بچوں کو ٹیوشن دو یا کوئی اور کام، آجکل تو لڑکیاں لڑکوں سے زیادہ کام کرتی ہیں۔ زندگی میں اکثر ایسے حالات پیدا ہوجاتے ہیں جو باعثِ دکھ ہوتے ہیں۔ مگر بیٹی زندگی اتنی ارزاں نہیں کہ پریشانیوں اور دکھوں سے ختم ہوجائے۔ زندگی نام ہے مسلسل چلتے رہنے کا۔ مسلسل جدوجہد کا۔ تم اگر ابھی سے تھک گئیں تو آنے والے دنوں میں کیا کروگی۔ پختہ ایمان اور مستقل مزاجی تمہیں کامیابی کے قریب لے آئے گی۔ نماز کی پابندی رکھو۔ درود شریف بہت پڑھو۔ بعد نماز عشاء ایک بار سورۃ کہف ترجمے کے ساتھ ضرور پڑھو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ ریحانہ۔ کراچی

○ محترم بابا جی اسلام علیکم! 'سچی کہانیاں' میں کافی عرصے سے آپ کا کالم پڑھ رہی ہوں۔ آپ کی رہنمائی سے لاکھوں افراد کے مسائل حل ہوئے ہیں۔ میں بہت اُمید لے کر آپ کے آگے اپنا مسئلہ پیش کررہی ہوں۔ آپ میری رہنمائی فرماتے ہوئے حل بتائیں آپ کا احسان جب تک میری زندگی ہے۔ نہیں بھولوں گی آپ کی صحت تندرستی کے لیے آپ کی بیٹی دعا گو ہے۔

بابا جی! میں شادی شدہ ہوں۔ دو بچے ہیں۔ بیٹی 13 سال جب کہ بیٹا 11 سال کا ہے۔ میرے شوہر نہیں ہیں، جس کی وجہ سے میں اپنے بڑے بھائی کے پاس رہتی ہوں۔ میرے چار بھائی ہیں۔ ان میں سے تیسرے نمبر کا بھائی میرے بچوں کی پڑھائی کا خرچہ اٹھاتا ہے۔ باقی بڑے دو بھائی کبھی پوچھتے بھی نہیں ہیں۔ نہ چھوٹا بھائی کبھی پوچھتا ہے، اپنے بیوی بچوں پر بے تحاشا خرچہ کرتے ہیں، جس کی وجہ سے میرے بچے احساسِ کمتری کا شکار ہورہے ہیں کہ فلاں کے ابو اُن کو سب چیزیں دیتے ہیں، ہمیں آپ نہیں دیتیں۔ آپ یقین کریں میرا اتنا دل دُکھتا ہے بچوں کو کیسے سمجھاؤں۔ بھائی مجھ سے سیدھے مُنہ بات نہیں کرتے کہ کچھ مانگ نہ لوں۔ بچے بیمار ہوں تب بھی جھوٹے مُنہ بھی نہیں پوچھتے کہ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے۔ بچوں کا ساتھ ہے۔ میں گھر سے نکل کر ملازمت کرنا چاہتی ہوں تاکہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہوکر اپنے بچوں کی کفالت کرسکوں۔ آپ نے پچھلے سال کے کالم میں کسی کو 7 تسبیحات' جو روزانہ ہفتہ میں پڑھنی تھیں۔ وہ عمل بتایا تھا۔ کیا میں آپ کی اجازت سے وہ عمل کرسکتی ہوں۔ یا کوئی اور پڑھائی بتائیں کہ اللہ میری غیب سے مدد فرمائیں۔ میں نماز بھی پابندی سے پڑھتی ہوں۔ بابا جی میں ہروقت پریشان رہتی ہوں۔ ہروقت پریشان رہنے سے سر میں مستقل درد رہنے لگا ہے۔ بیٹی آج 13 سال کی ہے 4 سال میں شادی کی عمر کو پہنچ جائے گی، اور میرے ہاتھ خالی ہیں۔ کوئی آسرا نہیں ہے۔ اللہ سے اچھی امید ہے، اُسی پر بھروسہ ہے پر کیا کروں۔ دُور دُور تک کوئی ساتھ دینے والا نہیں ہے۔ اپنے ماں جائے بھائیوں پر بہت رونا آتا ہے۔ ایسا کرتے ہیں جیسے میں ان کی بہن نہیں ہوں۔ میں ان کو نظر نہیں آتی۔ خدا کے لیے میری بات کو تھوڑا نہ جانیے گا۔ میری مدد فرمائیں۔

☆ بیٹی ریحانہ! اللہ تمہارے بھائیوں کو عقلِ سلیم عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ پریشان مت ہو۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ وہ اپنے بندوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ بیٹی اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کردو۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تمہاری مدد کے لیے ضرور اپنے کسی نیک بندے کے دل میں رحم ڈالے گا۔ معصوم بچوں کی کفالت کرنے والے کا تو ویسے بھی بہت بڑا درجہ ہے۔ ہر نماز کے بعد 3 تسبیح ''یاحجۃ القائم'' ضرور پڑھا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ اختری بیگم۔ گجرات۔

○ بابا جی! میرے میاں ایک ادارے میں معمولی سی نوکری کرتے ہیں۔ تنخواہ بہت کم ہے۔ بچوں کا ساتھ ہے۔ مہنگائی نے تو کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ پارٹ ٹائم جاب کے بعد بھی مہینے کی 15 تاریخ تک ایک ایک روپیا خرچ ہو جاتا ہے پھر ادھار لینا پڑتا ہے۔ بابا جی! ہمارے جاننے والے بھی ہمارے جیسے ہی ہیں لہٰذا مانگتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ روز روز کی پریشانی نے مجھے حد سے زیادہ چڑچڑا بنا دیا ہے اور میرے شوہر بے تحاشہ کام کرنے کی وجہ سے بہت کمزور ہوگئے ہیں۔ بابا جی! میں بے صبری نہیں مگر امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی' کیا ہوگا؟ کیسے ہوگا؟ بچے بھی سہمے سہمے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو میں خود کو اتنا بے بس محسوس کرتی ہوں کہ رونے بیٹھ جاتی ہوں۔ بتایئے' کیا کروں؟

☆ بیٹی اختری! اللہ تمہیں ہمت دے۔ تم نے جو کچھ لکھا' وہ سب درست ہے۔ انسان کی زندگی انسان نے ہی تنگ کر دی ہے۔ بیٹی! اللہ سے ہمت اور صبر مانگو۔ یہ وہ دولت ہے جو ہر کسی کو نصیب نہیں۔ بہت پیسا' بہت آسائشیں رکھ کر بھی لوگ بے سکون ہیں مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ایک وقت کھاتے ہیں تو دوسرے وقت کی خبر نہیں ہوتی مگر اللہ ان کا بندوبست کرتا ہے لہٰذا معاملات اللہ کے سپرد کردو۔ نماز ادا کیا کرو اور ہر نماز کے بعد 3 تسبیح پڑھو۔

سورۃ الکوثر کی آیت پڑھو اول و آخر درود شریف 3-3 بار پھر حاجت بیان کرو۔ مدت 2 ماہ ہے۔ مجھ سے رابطے میں رہو۔

(پچھلے ماہ بیٹی م۔ کلر سیداں کے مسئلے کے جواب میں کمپوزنگ کی غلطی کی وجہ سے سورہ یٰسین کی جگہ سورہ مبین لکھ دیا گیا۔ اس نادانستہ سہو کے لیے ادارہ اپنے قارئین سے معذرت خواہ ہے، اور اللہ ربّ العزت کی بارگاہ میں معافی کا خواستگار ہے۔ بیٹی م۔ کلر سیداں کے مسئلے کا جواب دوبارہ شائع کیا جارہا ہے۔)

□ م۔ کلر سیداں

☆ بیٹی! اللہ تمہاری بہن کو اپنے گھر میں آباد رکھے۔ اس سے کہو سورۃ انبیاء آیت 89 ہر نماز کے بعد ایک تسبیح پڑھے اور دعا کرے۔ انشاء اللہ جلد کرم ہوگا۔ بیٹی میں جانتا ہوں یہ وقت بہت کڑا ہے۔ تم پاک ذات پر یقین رکھو۔ گڑگڑا کر دعا مانگو۔ وہ اپنے بندوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔ بروز جمعہ ایک بار سورۃ یٰسین ضرور پڑھو، کرم ہوگا۔

□ نائلہ۔ دہاڑی۔

○ بابا سائیں! میرا مسئلہ بہت عام سا ہے۔ وہی عمر کی زیادتی اور شادی نہ ہونا۔ میرا تعلق درمیانے طبقے سے ہے جہاں والدین اولاد کو اچھی تعلیم و تربیت تو دیتے ہیں مگر جہیز کے نام پر دینے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ لوگ آتے ہیں' کہتے ہیں' ہمیں پڑھی لکھی اور سگھڑ لڑکی چاہیے مگر یہ اندازہ کرنے کے بعد کہ جہیز کے نام پر ان کے ہاتھ کچھ نہ لگے گا' پلٹ جاتے ہیں۔ بابا سائیں! ایسے منافق لوگ بہت دکھ دیتے ہیں۔ میں پابندی سے نماز اور قرآن پڑھتی ہوں۔ جانتی ہوں کہ صرف اللہ سے ہی مانگنا چاہیے۔ آپ کو خط لکھنے کا مقصد صرف اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا ہے۔ میں جانتی ہوں' آپ پڑھے لکھے اور بہت سمجھدار انسان ہیں جو لوگوں کے جذبات کو سمجھتے ہیں۔ اللہ آپ کو صحت اور تندرستی عطا فرمائے۔

☆ بیٹی نائلہ! خوش رہو۔ تمہاری خوبیاں وہی محسوس کرے گا جو خود مکمل ہوگا۔ دکھی مت ہو' اچھے لوگوں کو اچھے لوگ ہی ملتے ہیں۔ بے شک معاشرتی رویے اب دل دکھانے لگے ہیں مگر بیٹی! یقین رکھو' اچھے لوگ بھی بہت ہیں۔ برے لوگ کم ہوتے ہیں مگر دکھ دیتے ہیں اس لیے بہت لگتے ہیں۔ تم اللہ سے دعا کرتی رہو۔ بہت جلد کرم ہوگا۔ بکثرت ''یَا اللّٰہُ'' کا ورد کیا کرو۔

□ ناصر۔ گھوٹکی۔

○ بابا جی! اللہ آپ کو صحت اور زندگی دے۔ میں اپنی بیوی کی بیماری کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ یہاں لاڑکانہ میں اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھا چکا ہوں' دو بار کراچی آغا خان اسپتال بھی لے کر گیا۔ سب کہتے ہیں کہ کچھ نہیں' بس ٹینشن ہے مگر بابا جی! وہ روز بہ روز سوکھتی جا رہی ہے۔ بستر سے اٹھ نہیں پاتی۔ ہم سب گھر والے بہت پریشان ہیں' وہ خود کہتی ہے۔ ''مجھے کوئی

پریشانی نہیں سوائے اس کے کہ میں صحت مند لوگوں کی طرح کیوں چل پھر نہیں سکتی؟'' پہلے وہ بالکل ٹھیک تھی۔ عرصہ 3 سال سے اس پریشانی کا شکار ہے۔ بابا جی! ہماری چھوٹی سی بیٹی ہے۔ ماں کے پاس جانے کو مچلتی ہے۔ ماں بھی راتوں کو روتی ہے کہ میں اپنی اولاد کو پال نہیں پا رہی۔ بابا جی! میں نے آپ کا بہت نام سنا ہے۔ آپ رہنمائی فرمائیں کہ کیا مسئلہ ہے اور اس کا حل کیا ہے؟ یقین کریں، ہم سب آپ کو ساری زندگی دُعا دیں گے حالانکہ آپ کو ہماری دُعاؤں کی کوئی ضرورت نہیں۔

☆ بیٹے ناصر! اللہ تمہاری بیوی کو مکمل شفا عطا فرمائے۔ تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ مجھے دُعاؤں کی ضرورت نہیں؟ بیٹے! ہر انسان کو دُعاؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ پتا نہیں کب کس کی دُعا لگ جائے اور بخشش کا راستہ سہل ہو جائے۔ ڈاکٹروں کے پاس تمہاری بیوی کا علاج نہیں۔ سب سے پہلے تو تم مجھ سے تعویذ منگوالو۔ طریقۂ کار ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے دفتر فون کر کے معلوم کرو۔ تعویذ لینے کے بعد گھر کا کوئی بھی فرد لگاتار 7 دن عصر کے وقت سورۃ جن پڑھے اور پانی پر دَم کرے۔ بیوی سے کہو، یہ دَم کیا ہوا پانی اپنے سرہانے رکھے اور گھونٹ گھونٹ پیتی رہے، باقی اتنا ہو کہ دوسرے دن عصر تک وہ پی سکے۔ 7 دن مکمل ہونے کے بعد کچھ رقم بیوی پر سے خیرات کردو۔ بیوی سے کہو، وہ خود سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات وِرد میں رکھے۔ انشاء اللہ ساتویں دن وہ اپنے بستر سے اٹھ کھڑی ہوگی۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھنا۔ بچی پر بھی آیت الکرسی پڑھ کر دن میں دو بار ضرور دَم کرو۔

□ عذرا۔ سکھر۔

○ بابا جی! میں آپ سے ہمیشہ رابطے میں رہتی ہوں۔ یہ میری مجبوری ہے کہ براہِ راست خط نہیں لکھ سکتی لہٰذا فرضی نام سے خط شائع کریں۔ بابا جی! میرے شوہر ویسے تو بہت اچھے ہیں مگر بہت بدزبان ہیں اور ماں کے کہنے میں آ کر اکثر بہت زیادتی کر جاتے ہیں۔ جب تک بچے چھوٹے تھے، میں سہہ جاتی تھی مگر اب وہ سمجھدار ہیں۔ بیٹا تو کبھی کبھی ویسے ہی زبان چلاتا ہے جیسے اس کے باپ یا دادی کی چلتی ہے۔ میری 2 بہنیں اور ہیں، وہ اپنے گھر میں خوش ہیں۔ خوش میں بھی ہوں، بس اس ایک مسئلے نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ مجھے ایسا جلالی عمل دیجیے جس کے کرتے ہی یہ مسئلہ حل ہو جائے۔

☆ بیٹی عذرا! اللہ تمہیں اپنے گھر میں خوش رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! یقیناً زبان کے گھاؤ کی بہت تکلیف ہوتی ہے۔ تمہیں صرف یہی نصیحت کروں گا کہ اس معاملے میں شوہر سے کچھ کہنا سننا بے کار ہے۔ اپنے بچوں پر توجہ دو۔ بیٹے کو بہت نرمی اور محبت سے سمجھاؤ۔ احادیث کا حوالہ دو۔ اس کو بتاؤ، ہم جس نبیؐ کے اُمتی ہیں، وہ بہت نرم خو اور خوش گفتار تھے۔ بچوں پر الحمد شریف اور چاروں قل پڑھ کر ضرور دَم کیا کرو۔ بیٹی! یاد رکھو، ماحول کا بچوں پر بے شک بہت اثر پڑتا ہے مگر ماں کی گود درحقیقت پہلی تربیت گاہ ہے۔ اپنی پوری توجہ اپنی تربیت پر رکھو۔ اللہ ضرور تمہیں اس کا صلہ اچھی اولاد کی صورت میں دے گا۔

□ شاہین۔ راولپنڈی۔

○ بابا صاحب! میں اکثر آپ سے اپنے مسئلوں کے سلسلے میں رابطے میں رہتی ہوں۔ دو ماہ قبل میرا بیٹا اور بہو اسٹوڈنٹ ویزے پر کینیڈا گئے حالانکہ بیٹے نے یہاں نوکری کے لیے بہت کوشش کی مگر کامیابی نہ ملی، تھک ہار کر دونوں میاں بیوی کینیڈا چلے گئے۔ بہت کوشش کے باوجود اب تک کوئی ڈھنگ کی جاب نہیں ملی۔ بہت پریشانی ہے۔ آپ مجھے پڑھنے کے لیے کچھ بتا دیں تاکہ بچے مشکل سے نکل آئیں۔

☆ بیٹی شاہین! اللہ تمہارے بچوں کو کامیابی عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ عشاء کے بعد ایک بار سورۃ کہف پڑھو اور دُعا کرو۔ کوشش کرو کہ ہر جمعرات کو کچھ نہ کچھ رقم ضرور خیرات کر دیا کرو۔ وظیفے کی مدت 41 دن ہے۔

□ ا ب ج۔ فیصل آباد۔

○ بابا جی! اللہ آپ کو خوش رکھے۔ یہ میری مجبوری ہے کہ میں اپنا اصل نام شائع نہیں کروا سکتی کیونکہ آپ کا کالم میرے سسرال میں بہت شوق سے پڑھا جاتا ہے مگر بابا جی! افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان لوگوں کے قول

وعمل میں بہت تضاد ہے۔ مجھے یہی بہتر لگا کہ میں آپ سے ان کی شکایت کروں۔ بیٹیوں کے لیے اصول الگ ہیں اور میں بہو ہوں تو میرے لیے ہر چیز بالکل جدا۔ میری ساس آپ سے پوچھے بنا کوئی کام نہیں کرتیں۔ میری شادی بھی آپ سے استخارہ نکلوانے کے بعد ہوئی۔ رشتہ کرنا ہو یا کاروبار' گھر بدلنا ہو یا کوئی بھی کام' وہ آپ کو خط لکھتی ہیں اور آپ جو کہتے ہیں' وہ کرتی ہیں۔ آپ کے جواب پڑھ کر مجھے بھی ہمت ہوئی کہ آپ سے بات کروں۔ بابا جی! میری ساس مجھے بہت پریشان کرتی ہیں۔ میرے شوہر بہت اچھے ہیں مگر ان کو بھی میرے ساتھ زیادتی کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ بابا جی! پلیز' آپ میرے بزرگ ہیں۔ آپ کا ایک جملہ میری زندگی بدل دے گا۔ میرے والد حیات نہیں۔ میں آپ کو اپنا باپ سمجھ کر درخواست کررہی ہوں اس بھروسے کے ساتھ کہ آپ میرا پردہ رکھیں گے۔

☆ بیٹی! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ تمہارا تفصیلی خط شائع کرنا ممکن نہیں مگر کچھ حصہ شائع کررہا ہوں۔ بیٹی! میں جو کچھ بھی بتاتا ہوں' وہ کلامِ الٰہی کے توسط سے بتاتا ہوں۔ ہم دینِ اسلام کے ماننے والے کبھی کسی پر ظلم نہیں کرسکتے' خود تو تکلیف سہہ سکتے ہیں مگر کسی اور انسان کو زبان سے بھی دکھ نہیں دیتے۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ میرے رابطے میں رہنے والے اپنے گھر میں موجود ایک یتیم بچی کو دکھ دے رہے ہیں جو ان کے گھر کی عزت ہے۔ بیٹی! تم پریشان مت ہو۔ مجھے خط لکھ کر تم نے بہت اچھا کیا۔ اطمینان رکھو' یہ بات صرف تمہارے اور میرے درمیان رہے گی اور آئندہ آنے والے دنوں میں تمہاری ساس اور دیگر افراد کو اپنی کوتاہیوں کا بھی احساس ہوجائے گا۔ تم نماز پابندی سے پڑھو اور یَاحَیُّ یَاقیومُ بِرحَمتِکَ اَستغیثُ کی تسبیح بہت پڑھا کرو۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔

□ شمیم بانو۔ پھول نگر۔

o بابا سائیں! اللہ آپ کو جیتا رکھے۔ میں آپ کی بہت بدنصیب بیٹی ہوں۔ اللہ نے دنیا کی ہر نعمت دی مگر شوہر کے گھر کا سکھ نہیں دیا۔ میں دو بچوں کی ماں ہوں اور مجھے صرف اس لیے طلاق دی گئی کیونکہ میرے بھائی نے اپنی بیوی کو طلاق دی۔ ہماری وٹے سٹے کی شادی تھی۔ میری بھاوج میری نند بھی تھی۔ ان دونوں کی شروع دن سے ہی نہ بنی' بس بڑوں کی ضد کے آگے دونوں مجبور ہوگئے تھے۔ میرے بھائی کی شادی صرف ڈیڑھ سال چلی جس میں 8 مہینے سے میری نند اپنے گھر بیٹھی تھی مگر اس ڈیڑھ سالہ شادی نے میری 12 سال کی شادی کو مٹی میں ملا دیا۔ میرے شوہر سے زبردستی طلاق کے کاغذات مجھے بھجوائے گئے۔ زبردستی ان سے یہ منحوس الفاظ فون پر کہلوائے گئے۔ بابا سائیں! آپ یقین کریں' میں یہ الفاظ سنتے ہی کھڑے قد سے گرگئی تھی۔ 3 دن کومہ میں رہی' بس زندگی تھی اس لیے آج تک زندہ ہوں۔ دونوں بیٹے مجھ سے چھین لیے گئے۔ میں ان کی شکلوں کو ترس گئی ہوں۔ بچوں کو میرے گھر والے بھی رکھنے کو تیار نہ تھے۔ بابا سائیں! بتایئے' ان سب میں میرا کیا قصور؟ میرے بچوں کا کیا قصور؟ آج چھ مہینے ہوگئے' میں نے اپنے بچوں کو نہیں دیکھا جنہیں میں نے دس سال اور چھ سال پالا' آج انہیں دیکھنے کو ترس رہی ہوں۔ بابا جان! آپ اللہ کے نیک بندے ہیں' پلیز' میرے حال پر رحم کیجیے۔ میرے ماں باپ نے تو رحم نہیں کیا' آپ ہی مدد کریں۔ مجھے صرف اپنے بچے چاہئیں اور کچھ نہیں چاہتی۔ اپنی بیٹی سمجھ کر میری مدد کردیں۔

☆ بیٹی شمیم! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے اور جلد تمہیں تمہاری اولاد سے ملوائے۔ تمہارا خط انتہائی تکلیف دہ ہے۔ میری بیٹی! میں تمہارے لیے صرف دُعا کرسکتا ہوں' یہ بھی دُعا کروں گا کہ اللہ انسانوں کے دلوں میں سے سختی ختم کردے۔ ماں سے اولاد کو دور کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ بیٹی! تم صبر کرو' روزانہ عصر کی نماز سے قبل ایک بار سورۃ یٰسین پڑھو اور دُعا کرو۔ کسی سے کوئی شکوہ مت کرو۔ صرف اپنے رب سے گڑگڑا کر دُعا مانگو۔ وہ تمہاری ضرور سنے گا۔ مجھ سے رابطے میں رہو۔ اللہ حامی وناصر ہو

□ صالحہ۔ حیدرآباد۔

o بابا جی! میری عمر 16 سال ہے اور مجھے گلے میں شدید تکلیف رہتی ہے۔ آپ گلے کی جو دوا دیتے ہیں' وہ

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔ مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آئیے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

مجھے بھی ارسال کردیں' بڑی مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹی صالحہ! اللہ تمہیں مکمل شفا دے۔ تھوڑی سی تفصیل درکار ہے۔ تمہیں گلے میں کب سے تکلیف ہے؟ کسی خاص موسم میں ہوتی ہے؟ تفصیل سے خط لکھو تاکہ جواب دیا جاسکے۔

☐ کفیل احمد۔ چیچہ وطنی۔

☆ بیٹے کفیل! خوش رہو۔ ہر نماز کے بعد سُبحان اَللّٰہ کی تین تسبیح پڑھو اور دُعا کرو۔ کوشش کرو کہ ہر وقت باوضو رہو۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

☐ صبیحہ۔ کراچی۔

o باباجان! میں اکثر آپ سے رابطے میں رہتی ہوں۔ اللہ نے بہت کچھ عطا کیا۔ جتنا بھی شکر اُدا کروں' کم ہے۔ بس ایک پریشانی ہے' دکھ ہے' میرا سب سے چھوٹا بیٹا ماشاء اللہ' 24 سال کا ہے' اسی سال MBA مکمل کیا ہے مگر بہت غیرذمے دار ہے۔ نہ تو نوکری کرنا چاہتا ہے اور نہ باپ کے کاروبار میں ہاتھ بٹاتا ہے۔ دو ہی شوق ہیں' ساری رات فلمیں دیکھنا یا پھر موبائل پر باتیں کرنا۔ ڈانٹ ڈپٹ کرو تو اٹھ کر کمپیوٹر پر بیٹھ جاتا ہے۔ باباجان! ہم لوگ ساری زندگی تو اس کے نخرے اٹھانے کے لیے نہیں بیٹھے رہیں گے۔ بچیاں اپنے گھروں میں مگن ہیں۔ بڑا بیٹا ماشاء اللہ' ڈاکٹر ہے بس یہی کچھ نہیں کرتا۔ محبت سے بھی سمجھایا اور سختی کرکے بھی دیکھ لیا' کچھ اثر نہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ اس پر کوئی آسیب ہے اسی لیے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بالکل ختم ہوگئی ہے۔ باباجی! اللہ کے واسطے میری مدد کریں۔ شاید آپ کو میرا مسئلہ اتنا بڑا نہ لگے مگر میرے لیے یہ بہت تکلیف دہ صورتِ حال ہے۔

☆ بیٹی صبیحہ! سب سے پہلے بیٹے پر سے حسبِ استطاعت صدقہ خیرات نکالو اور ہر ماہ نکالا کرو۔ مناسب ہوگا' مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ لڑکے بہت جلدی بدنظر کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اصل میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم لوگ اللہ کی راہ میں دینے سے بہت کتراتے ہیں۔ جانتے بوجھتے ٹھگوں' جعلی پیروں فقیروں کو تو دیتے ہیں مگر جہاں اصل میں دینا چاہیے' وہاں نہیں دیتے۔ اللہ نے اتنی سمجھ ہر شخص کو عطا کی ہے کہ وہ سچ اور جھوٹ میں تمیز کرسکے۔ لفاظی کرنے والوں کے پاس عورتوں کا مجمع لگا رہتا ہے۔ وہ یہ بھی بھول جاتی ہیں کہ اس عمل سے وہ گناہ کی مرتکب ہورہی ہیں' نامحرم کے سامنے بیٹھ کر اپنی بہت ذاتی باتیں بتانا سخت معیوب ہے۔ بہرحال اپنی حیثیت کے مطابق صدقہ خیرات کیا کرو' بلائیں ٹلیں گی۔

☐ روبانہ صدیقی۔ U.S.A.-

o باباجان! میں آپ سے برسوں سے واقف ہوں مگر خط لکھنے کا اتفاق پہلا ہے۔ میری والدہ ہمیشہ آپ سے مشورہ طلب کرتی تھیں۔ آج آپ کو خط لکھتے ہوئے مجھے بالکل وہی احساس ہورہا ہے جو ہمیشہ اپنے گھر خط لکھتے ہوئے ہوتا تھا۔ والدین کے دنیا سے جانے کے بعد میکہ تو ختم ہی ہوگیا۔ بہن بھائی بھی اب مخلص نہیں لگتے' شاید خرابی ہم میں ہی ہو۔ بہرحال باباجان! ایک مشورہ طلب کرنا تھا۔ میرے شوہر عرصہ 15 سال سے امریکا میں مقیم ہیں' سوفٹ ویئر انجینئر ہیں اور ایک بہت بڑی فرم سے وابستہ ہیں۔ اب چاہتے ہیں' نوکری کی بجائے اپنا کاروبار کریں۔ آپ بتایئے کہ کیا کاروبار کرنا ہمارے حق میں بہتر ہے کیونکہ ہم بہت آسودہ زندگی گزار رہے ہیں۔ ذرا سی غلطی یہاں آسمان سے زمین پر پھینک دیتی ہے پھر زیرو سے شروع کرنا پڑتا ہے۔ بچوں کا ساتھ ہے اس لیے ڈرتی ہوں۔ آپ میرے لیے استخارہ کردیجیے۔

☆ بیٹی روبانہ! اللہ تمہیں اپنے گھر میں ہنستا بولتا رکھے۔ تمہارا یہ جملہ مجھے بہت اچھا لگا کہ ''آپ کو خط لکھتے ہوئے بالکل وہی احساس ہورہا ہے جو اپنے والدین کو خط لکھتے ہوئے ہوتا تھا۔'' اللہ تمہارے والدین کی مغفرت فرمائے۔ یقیناً والدین کا نہ ہونا بہت بڑا نقصان ہے۔ ان کے لیے خوب دُعائیں کیا کرو۔ یہ اس دور کا المیہ ہے کہ رشتے ناتوں میں محبت اور خلوص باقی نہیں ہے۔ لوگ ضرورت کے تحت ایک دوسرے سے رشتے رکھتے ہیں۔ بہرحال تم اچھی رہو۔ تمہارے خدشے بے جا ہیں۔ شوہر کو کاروبار کر لینے دو' انشاء اللہ' فائدہ ہی ہوگا۔

□ جاذب احمد۔ واہ کینٹ۔

o بابا جی! مجھے کوئی بہت مجرب وظیفہ دیجیے تاکہ مجھے جلد از جلد نوکری مل جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب اپنے والد کا سہارا بن جاؤں۔ وہ بہت ضعیف ہیں اور بڑے بھائیوں کے رویے نے ان کو بہت دکھ دیا ہے۔ وہ سب سے خفا رہتے ہیں۔ بات بھی نہیں کرتے۔ میں انہیں خوش رکھنا چاہتا ہوں۔

☆ بیٹے جاذب! تمہاری خواہش اللہ ضرور پوری کرے گا کیونکہ تمہاری نیت بہت اچھی ہے۔ بیٹے! نماز کی پابندی رکھو اور جس قدر ممکن ہو' یَا مَالِکَ الْمُلْکُ' کا وِرد کیا کرو۔ بعد نمازِ فجر ایک بار سورۃ رحمٰن ضرور پڑھو۔ انشاءاللہ' ضرور کرم ہوگا۔

□ عبدالعلی۔ سوات۔

o بابا جی! اللہ آپ کو صحت دے۔ میں بہت عرصے سے آپ کو خط لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر ہمت نہیں ہوتی تھی۔ آج بہت ہمت کر کے اپنی مجبوری آپ کو بتا رہا ہوں۔ بابا جی! میں پڑھا لکھا انسان ہوں۔ دس سال سے جس جگہ نوکری کر رہا تھا' ان لوگوں نے بنا وجہ بتائے بہت سارے لوگوں کو فارغ کیا جن میں' میں بھی تھا۔ آج دو سال ہو رہے ہیں' باوجود کوشش کے کہیں کام نہیں ملتا۔ بیوی بچوں سے نظریں ملانا مشکل ہوگیا ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے میں بھی ہمت کھو رہا ہوں۔ بابا جی! مہنگائی نے تو پہلے ہی کمر توڑ دی تھی' اب بے روزگاری نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ بابا جی! لگتا ہے' چاروں طرف گہرا اندھیرا ہے۔ میں بہت مایوس ہوگیا ہوں۔ برائے مہربانی میری مدد کریں۔

☆ بیٹے علی! تمہارا خط کوئی پہلا خط نہیں جو میرے پاس آیا ہو۔ آج کل ہر دوسرا شخص انہی مسائل کا شکار ہے۔ ہمارا معاشرہ جس بری طرح زوال پذیر ہے' لگتا ہے' آنے والی نسلوں کے لیے ہمارے پاس کچھ نہ ہوگا۔ بہرحال بیٹے! مایوس مت ہو۔ اللہ سے اچھی امید رکھو۔ بے شک وہ نہایت مہربان آقا ہے۔ ہم اپنی زندگی کو اگر سہل کر لیں تو بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے۔ بیٹے! نماز کی پابندی کرو۔ درود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 9-9 تسبیح پڑھو۔ 'یا سمیع' 'یا رازق'۔ اول و آخر درود شریف پھر حاجت بیان کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ فضیلہ۔ فیصل آباد۔

o بابا جی! میں B.Sc کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے تک سب ٹھیک تھا مگر اب مجھے پڑھنے میں بہت دشواری ہو رہی ہے۔ جو یاد کرتی ہوں' بھول جاتی ہوں۔ ذہن ہر وقت سویا سویا سا رہتا ہے۔ کسی کام میں دلچسپی نہیں۔ ٹی وی بھی اگر دیکھنے بیٹھوں تو چینل بدلتی رہتی ہوں۔ بابا جی! میری ان عادتوں کو اب سب محسوس کرنے لگے ہیں۔ بھائی تو اکثر سب کے سامنے کہہ دیتے ہیں کہ تمہارا دماغ کہاں رہتا ہے؟ سچ' بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔ پلیز' میری مدد کریں۔

☆ بیٹی فضیلہ! تم بہت اچھی بچی ہو۔ بہتر ہوگا' دل میں جو بات ہے' وہ ماں سے کہہ ڈالو۔ کچھ مت چھپاؤ۔ ہوسکتا ہے جس بات کو تم بہت بڑا سمجھ رہی ہو' وہ اتنی بڑی نہ ہو۔ اچھی لڑکیاں اپنے والدین سے کچھ نہیں چھپاتیں۔ چلتے پھرتے یَا بَصِیرُ کا وِرد کیا کرو اور اطمینان رکھو' سب ٹھیک ہے۔

□ حسنین۔ ریاض۔

o بابا سائیں! میں ساری زندگی بھی آپ کا شکریہ ادا کروں تو حق ادا نہ ہوگا۔ آپ کو خط لکھنے کے بعد میں نے دوبارہ اپنے ٹیسٹ کرائے تو وہ سب کلیئر ہو گئے ہیں۔ میں بال بال بچا ہوں۔ یہ سب یقیناً آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ میں آپ سے ملنے کا خواہاں ہوں' مجھے موقع عنایت کیجیے۔

☆ بیٹے حسنین! اللہ تمہیں ہمیشہ اچھا رکھے۔ اللہ نے تمہیں ایک اور موقع دیا ہے لہٰذا صرف اس پاک ذات کا شکر ادا کرو اور اپنے وعدے پر قائم رہو۔ بری چیزوں سے بچو اور اپنی حق حلال کی کمائی اپنے بیوی بچوں پر خرچ کرو۔ اللہ بہت وافر رزق دے گا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم نے مجھے مطلع کیا۔ خوش رہو اور نماز قضا مت ہونے دینا۔ زندگی دوسرا موقع بہت کم لوگوں کو دیتی ہے۔

□ حمیدہ۔چھم جوڑیاں۔

○ بابا جان! کچھ عرصہ قبل کسی نے ماہنامہ 'سچی کہانیاں' دیا جس میں' میں نے آپ کا سلسلہ دیکھا۔ مجھے بہت اچھا لگا۔اب تک کئی وظائف سے فائدہ اٹھا چکی ہوں۔ آج اپنا ایک بہت اہم مسئلہ آپ کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ بس آپ میرا مسئلہ حل کر دیں۔آپ جو کہیں گے' میں وہ کروں گی بلکہ ہر ماہ آپ کے ادارے کے لیے خطیر رقم بھی ارسال کروں گی۔ بابا جی! مجھے ایک شخص سے شدید محبت ہو گئی ہے۔وہ بھی مجھے چاہتا ہے۔مسئلہ یہ ہے کہ وہ شادی شدہ ہے اور دو بچوں کا باپ ہے۔بابا جی! مجھے بچوں سے کوئی پریشانی نہیں مگر میں چاہتی ہوں کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ بابا جی! وہ بہت مجبور ہے' اس کی بیوی بہت لڑاکا ہے اس لیے وہ کوئی فیصلہ کرتے ہوئے ڈرتا ہے۔بس بابا جان! میں چاہتی ہوں کہ آپ کوئی ایسا جلالی عمل کریں کہ وہ صرف میرا ہو جائے۔میں آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گی۔

☆ بیٹی حمیدہ! جو شخص اپنی بیوی اور بچوں کا نہ ہوا' وہ تمہارا کیا ہوگا؟ یہ مردوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اکثر دوستوں میں بیٹھ کر بیویوں کی برائی کرتے ہیں۔ اکثر شوہر ہمدردی حاصل کرنے کے لیے بھی ایسا کرتے ہیں۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ کسی کا گھر تباہ کر کے اپنا گھر بسانے کی کوشش مت کرو۔ بہت دکھ اٹھاؤ گی۔تم مجھ سے مدد مانگ رہی ہو اسی لیے یہ نصیحت کر رہا ہوں۔ تمہیں ایسے لوگ بہت مل جائیں گے جو تمہاری مدد کا وعدہ کریں گے' 'محبوب تمہارے قدموں میں۔' کی یقین دہانی کرائیں گے مگر بیٹی! یہ سب غلط اور اپنے آپ کو دھوکہ دینے والی باتیں ہیں۔ یاد رکھو' کر برا' ہو برا' کر بھلا' ہو بھلا' بس اگر یہ بات سمجھ گئیں تو زندگی بہت اچھی گزرے گی۔ نماز پابندی سے پڑھو اور ہر نماز کے بعد ایک بار سورۃ التوبہ ضرور پڑھو۔ مدت 3 ماہ ہے۔

☆☆......☆☆

ہائیڈ پارک

ڈی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

ماں کے بغیر

سات جاندار ہیں جو ماں کے بغیر پیدا ہوئے۔
1) حضرت آدم علیہ اسلام۔
2) بی بی حوا۔
3) حضرت محمد ﷺ کو معراج پر لے جانے والا براق۔
4) حضرت صالح علیہ اسلام کی اونٹنی۔
5) حضرت یونس علیہ اسلام کو پیٹ میں رکھنے والی مچھلی۔
6) حضرت موسیٰ علیہ اسلام کے عصا مبارک سے بننے والا اژدھا۔
7) حضرت اسماعیل علیہ اسلام کی قربانی کے وقت جنت سے آنے والا دنبہ۔

مرسلہ: یاسمین اقبال۔ سنگھ پورہ لاہور

ہائیڈ پارک

آپ کو نہیں لگتا زندگی خوبصورت ہے۔ جیسے مشرق سے ابھرتا سورج۔ جیسے سورج کے چاروں اور پھیل جانے والی کرنیں۔ جیسے ہوا میں چہچہاتے، اللہ کی حمد سناتے پرندے۔ جیسے درختوں کے جھومتے پتے، جو ہواؤں کی سنگت میں گاتے ہیں۔ جیسے پھولوں پہ رقص کرتی تتلیاں۔ جیسے ہواؤں میں بسی خوشبو سی ہے۔ زندگی جیسے ڈھلتے سورج کی زرد شعاؤں سی ہے۔ زندگی جیسے ڈوبتے سورج کے ساتھ ڈوبتے دن کے بعد حسین شام جو رات میں بدل جائے۔ کچھ ایسی ہی تو ہے زندگی۔ جیسے دن کے ڈھل جانے کے بعد رات کی خاموشیاں۔ تاروں کی مُندی مُندی روشنیوں جیسی ہے زندگی۔ تنہا آسمان پر روشنیوں کا ایک بڑے ہالے 'چاند' جیسی ہے۔ زندگی سناٹوں کو توڑتی چیختی چلاتی ٹرین کی آواز سی ہے زندگی۔ آسمان پہ اچانک سے بادل چھا کر ہر طرف جل تھل کر دینے والی بارش سی ہے زندگی، نیلے آسمانوں پر بکھرے سفید روئی کے گالوں جیسی ہے پیاری زندگی...... تو یہ سب تمہارے لیے ہی تو ہے۔ پھر مایوسی کیوں؟ زندگی سے پیار کرو۔

حسنِ خیال: عظمیٰ شکور۔ اسلام آباد

غزل

بہت یاد آتے ہو
ذرا ملنے چلے آؤ
مجھے کچھ تم سے کہنا ہے
زیادہ وقت نہیں لوں گا
ذرا سی بات کرنی ہے
نا دکھ اپنے سنانے ہیں
نا کچھ فریاد کرنی ہے
نا یہ معلوم کرنا ہے کہ

اب حالات کیسے ہیں
تمہارے ہم سفر تھے جو!
تمہارے ساتھ کیسے ہیں
نہ یہ معلوم کرنا ہے!!
تیرے دن رات کیسے ہیں
مجھے بس اتنا کہنا ہے
مجھے تم یاد آتی ہو
بہت یاد آتی ہو
قسم سے یاد آتی ہو

شاعر: مقصود احمد بلوچ۔ حیدر آباد

ترقی کا راز

ترقی کی راہوں میں کوئی ایسا مقام نہیں آتا جس کو 'منزل' کہا جا سکے اور نہ کوئی ایسا 'آج' آتا ہے جسے فکرِ فردا سے آزاد کیا جا سکے۔ افراد ہوں، ادارے ہوں، یا قومیں...... ! بہتری کی خواہش سب کو سعیِ پیہم پر آمادہ رکھتی ہے اور خوش آئند مستقبل کے لیے ہم ہمیشہ تگ و دو کرتے رہتے ہیں۔

یہ قانونِ فطرت ہے جو امروز پر مطمئن ہو گیا وہ ترقی کی صف سے نکل گیا اور اسے زمانے نے جلد بھلا دیا۔ اگر روشن مستقبل درکار ہے تو قدرت کے اس اٹل قانون کی اطاعت کرنی ہو گی۔

مرسلہ: بسمہ اشتیاق۔ کراچی

ذہانت شرط ہے

ایک شخص گھڑیوں کی دکان پر پہنچ کر بولا۔

''مجھے وہ گھڑیاں دکھایئے جو اشتہار کے مطابق آپ قیمتِ خرید سے بھی کم قیمت پر فروخت کر رہے ہیں۔''

دکاندار نے ایسی ساری گھڑیاں دکھا دیں تو گاہک نے پوچھا۔

''اگر آپ واقعی یہ گھڑیاں قیمت خرید سے بھی کم قیمت پر فروخت کر رہے ہیں تو آپ منافع کس طرح حاصل کرتے ہیں؟''

''ہم اپنا منافع ان گھڑیوں کی مرمت سے حاصل کر لیتے ہیں۔''

مرسلہ: عبد الرافع۔ ملتان

مقابلہ ، احترام

بھارت میں منعقد ہونے والے ایک ہند و پاک مشاعرے میں پاکستان سے شرکت کرنے والے شاعروں میں سب سے آخر میں حفیظ جالندھری کو اپنا کلام سنانا تھا۔ ان کے بعد رسا کو پی ناتھ امن کو بحیثیت صدر پڑھنا تھا لیکن وہ احتراماً حفیظ صاحب سے پہلے پڑھنا چاہتے تھے، اس لیے اٹھ کھڑے ہوئے مگر ان سے پہلے حفیظ جالندھری بن بلائے اسٹیج پہنچ گئے۔

امن نے کہا۔ ''پہلے میں پڑھوں گا۔''

حفیظ صاحب نے جواب دیا۔ ''یہ خلاف ضابطہ ہے، پہلے میں پڑھوں گا۔''

یہ کہہ کر انہوں نے جیب سے پرچہ نکال لیا۔

ادھر امن صاحب نے بھی پرچہ نکال لیا اور سامعین سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''حضرات! اب دوگانا ہو گا۔''

حفیظ جالندھری یہ سن کر مسکرائے اور پرچہ جیب میں رکھ کر کہنے لگے۔

''بھائی! میں ہار گیا۔''

حسنِ انتخاب: مرزا مبشر بیگ۔ کراچی

مقدر

اک تڑپ، اک کسک سی
مرے دل میں ہے
کہ کاش وہ بھی
مرے مقدر میں
اسی طرح لکھ دیا جائے
جس طرح
زندگی کے مقدر میں
موت لکھی ہے۔

شاعرہ: سدرہ انور علی۔ جھنگ صدر

دوسری شمع

ایک صاحب نے اپنی بیوی کے انتقال کے بعد اس کی قبر پر لکھوایا۔ ''میری روشنی بجھ گئی۔''
کچھ عرصے بعد ان صاحب نے دوسری شادی کر لی تو ان کے دوست نے کہا۔
''اب تم اپنی پہلی بیوی کی قبر سے وہ تحریر صاف کرا دو۔''
ان صاحب نے جواب دیا۔
''نہیں اس کی ضرورت نہیں، بس اس تحریر کے نیچے لکھوا دوں گا کہ میں نے دوسری شمع روشن کر لی ہے۔''
مرسلہ: نازش کنول۔ ٹنڈو آدم

SMS کے فائدے

SMS کرنے کے پانچ فائدے ہیں۔
رشتے کمزور نہیں ہوتے۔
سب رابطے میں رہتے ہیں۔
اپنوں سے دل کی بات کہہ سکتے ہیں۔
کہاں کہاں بجلی نہیں ہے، معلوم ہو جاتا ہے۔
اور......!
کون کون کنجوس ہے یہ بھی پتا چل جاتا ہے۔
مرسلہ: آصفہ۔ نواب شاہ

موت

میں جتنا بھی طاقتور بن جاؤں، لیکن ہر رات میری زندگی کا ایک دن کم کر دیتی ہے۔ میں چاہ کر بھی اسے روک نہیں سکتا۔ اور اللہ اتنا رحیم ہے کہ مجھے پھر سے نئی صبح دے کر توبہ کرنے کا موقع دیتا ہے کہ میرا بندہ اب سنبھل جائے۔
(مرسلہ: یاسر دکی۔ صالحوال)

ذرا مسکرائیے

☆ میاں خوش شکل تھا اور بیوی بے حد بدصورت۔ ایک روز شوہر نے کہا۔ ''ہم دونوں جنتی ہیں۔''
وہ کیسے؟ بیوی نے حیرت سے پوچھا۔
''وہ ایسے کہ تم مجھے دیکھ کر شکر ادا کرتی ہو اور میں تمہیں دیکھ کر صبر کرتا ہوں اور خداوند کریم کا فرمان ہے کہ شاکر اور صابر دونوں جنتی ہوتے ہیں۔''
☆ گھر میں کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا تو شوہر نے بیوی سے کہا۔ ''یہ تم نے توڑا ہے تم ہی نیا شیشہ لگواؤ۔''
بیوی نے کہا۔ ''یہ تمہاری غلطی کی وجہ سے ٹوٹا ہے۔ میں نے سینڈل تمہیں ماری تھی اور تم آگے سے ہٹ گئے۔ ورنہ یہ شیشہ نہ ٹوٹتا۔''
☆ مطالعے کے شوقین ایک شوہر کی بیوی نے کہا۔ ''کاش میں ایک آفتاب ہی ہوتی۔ ہر وقت تمہاری نظروں کے سامنے تو رہا کرتی۔''
''کتاب نا بننا...... بننا ہے تو جنتری بننا۔ تاکہ ہر سال نئی خرید لیا کروں۔''
مرسلہ: عبدالقیوم خاں۔ میرپور خاص

ہم رہیں یا نہ رہیں

ہم رہیں یا نہ رہیں دنیا آباد رہے گی
تم ملو یا نہ ملو امید باقی رہے گی
تمہیں ہم سے محبت ہو یا نہ ہو
ہمیں تم سے محبت رہے گی
تم الجھے ہو دنیا کی الجھنوں میں
ہم الجھے ہیں تمہاری جستجو میں
تمہیں پکارتے ہیں ہر منزل پر ہر موڑ پر
تمہیں ہماری کچھ بھی نہیں فکر
خدارا ہماری دھڑکنوں کو سن لو
خدارا ہماری صداؤں کو سن لو
ہم رہیں یا نہ رہیں دنیا آباد رہے گی۔
شاعرہ: مسز نکہت غفار۔ کراچی

آنسو

یہ گیلے موتی جو تمہاری آنکھوں میں ہیں
چُن کے دے دو مجھے تم یا چُن لوں میں یہ سب
کہ زیست کے راز جو میرے اور تمہارے ہیں
یونہی یہ آنسو بھی میرے اور تمہارے ہیں
(شاعرہ: لیلیٰ مروہ اقبال۔ سیالکوٹ)

اندازِ بیاں اور......!

آپ نے ریل میں چھوٹے بچوں کو مطبوعہ کارڈ تقسیم کرتے دیکھا ہوگا جو وہ ہر مسافر کی جھولی میں ڈالتے جاتے ہیں اور اس کے بعد کارڈ کے ساتھ بھیک مانگتے ہیں۔ مضمون کچھ اس قسم کا ہوتا ہے۔ ''یہ لڑکا گونگا ہے' اس کی ماں گونگی ہے۔ اس کا باپ ریلوے میں تھا جو مر گیا ہے۔ لہٰذا ریلوے نے اس کا کرایہ معاف کر رکھا ہے۔ مسلمان بھائی اس کی مدد کریں اور یہ کارڈ ملاحظہ کر کے واپس کر دیں۔''

اِس دنیا میں ہر طرح کے اتفاقات ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ عجیب اتفاق ہے ان سب لڑکوں کے باپ ریلوے میں ملازم تھے۔ کوئی ڈاک خانہ یا چنگی مین نہ تھا۔ غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ کسی مخیر نے اِس مضمون کے کارڈ چھپوا رکھے ہیں جس کا جی چاہے پانچ روپے سیکڑا کے حساب سے مانگ لے اور اپنا نام بھر کے استعمال کرے۔ ایک بار ہم نے بھی رحم کھا کر ایسے لڑکے کو چونّی دی اور دلاسہ دے کر پوچھا۔

''بیٹے گونگے ہی ہو یا کوئی اور خرابی بھی ہے؟''

وہ جھٹ بولا۔ ''جی بہرہ بھی ہوں۔''

(ابنِ انشاء کی تحریر سے تحسین جونیجو۔ بورڑی شریف کا انتخاب)

اُلّو!

صحافی نے سیاست دان سے پوچھا۔ ''پچھلے سالوں میں آپ نے کیا تعمیری کام کیا؟''

''آپ میرے سالوں کو درمیان میں مت لائیں اور جہاں تک تعلق ہے تعمیری کاموں کا۔ تو میں اپنی کوٹھی تعمیر کروا رہا ہوں۔''

''لیکن ہمارا خیال ہے کہ آپ کوٹھیاں نہیں، اُلّو بنا رہے ہیں۔'' صحافی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ویسے اُلّو بنانا اتنا آسان کام بھی نہیں ڈرائنگ ماسٹر مجھے ہمیشہ کہتے ''اُلّو بناؤ'' مگر مجھ سے نہ بنتا تو غصے سے کہتے ''کبھی اُلّو دیکھا ہے۔'' اور میں شرم سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا تو کہتے ''اِدھر اُدھر کیا دیکھ رہے ہو۔ میری طرف دیکھو۔''

مرسلہ: عمیر ولی۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ

گوہرآبدار

☆ بہت سارے سوالات سے نکل کر انسان جب ایک سوال میں داخل ہوتا ہے تو اس کا سفر واضح ہو جاتا ہے۔

☆ اچھے عمل کی یاد کو ایک بڑا لفظ ہمیشہ کے لیے تباہ کر سکتا ہے۔

☆ رشتے ناتے بھی کچے دھاگے کی طرح ہوتے ہیں ٹوٹ جائیں تو نہیں جوڑا جا سکتا ہے لیکن گرہ ضرور لگ جاتی ہے۔

☆ مخلص کی تعریف یہ ہے کہ وہ آپ کے ساتھ اپنے آپ سے زیادہ مہربان ہو۔

☆ خود شناس نہ ہو تو خدا شناسی کا عمل ممکن نہیں ہوتا۔

مرسلہ: پارس جونیجو۔ بورڑی شریف

عینک اور بندر

بڑھاپے میں ایک بندر کی نظر کمزور ہوگئی۔ اس نے انسانوں کی زبان سے سنا تھا کہ یہ کوئی اتنی بھی بدقسمتی کی بات نہیں۔ بس اتنا ہے کہ عینک لگا لینا چاہیے۔ چنانچہ اس نے کہیں سے درجن بھر عینکیں حاصل کیں۔ کبھی سر پر رکھا' کبھی دم پر باندھنے کی کوشش کی، کبھی سونگھا' کسی کو چاٹا' پھر بھی کسی عینک نے اس کی بینائی میں اضافہ نہ کیا۔

''واہیات!'' اس نے کہا۔ ''احمق ہیں وہ جو آدمیوں کی بکواس سنتے رہتے ہیں۔ اب یہی عینک کے بارے میں انہوں نے بالکل زٹل ہانک دی ہے ان کا تو ذرا بھی فائدہ نہیں۔''

عجیب بات تو یہ ہے کہ آدمی بھی کبھی کبھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ کوئی چیز کتنی ہی مفید کیوں نہ ہو۔ ناواقف آدمی جو اس کی قدر نہیں جانتا ہمیشہ اس کی برائی کرتا ہے اور اگر تھوڑا بہت اختیار رکھتا ہو تو اس کو ختم کرنے کے درپے ہو جاتا ہے۔

محمد یونس بٹ کی کتاب ''خندہ پیشانیاں'' سے جمیلہ بشیر۔ کراچی کا اقتباس



قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمایئے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں
نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

یاسر وکی .... دیپالپور
یہ سفر جو گزرا تیرے ساتھ اے دوست
تیری قسم ہر رات رلاتا ہے مجھے

شاہد رفیق سہو .... کبیر والا
شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

ایم یعقوب .... ڈیرہ غازی خان
دوست کبھی اس سے ملاقات ہو تو صرف اتنا کہنا
اتنے گزرے برس بعد بھی قسم سے پہلے کی طرح دل میں ہو

سدرہ انور علی .... جھنگ صدر
صبح کے تخت نشیں شام کو مجرم ٹھہرے
میں نے پل بھر میں نصیبوں کو بدلتے دیکھا

سلیمان شبیر .... تلہ گنگ
اک عمر تھی جسے کاٹ چلے نجانے کیسا جینا تھا
کچھ اپنوں کی، کچھ غیروں کی بس چوٹیں کھاتے بیت گئی

عظمیٰ شکور .... اسلام آباد
جو مر چکے ہیں تمہیں ان کی فکر ہے لیکن
جو مر رہے ہیں تمہیں اِن کا کچھ ملال نہیں

مجید احمد جائی .... ملتان
اب تو زہر بھی خالص نہیں ملتا فراز
لوگ پھرتے ہیں آدھے مرے ہوئے

مور شاہد حسین .... قمبر، شہداد کوٹ
ابھی ابھی وہ ملا تھا ہزار باتیں کی
ابھی ابھی وہ گیا ہے مگر زمانہ ہوا

منشی محمد عزیز مگسی .... لڈن وہاڑی
دل ٹوٹ بھی جائے مگر ہنستی ہی رہیں گی
کتنی منافق ہوتی ہیں یہ مشرق کی لڑکیاں

عارف تبسم .... ساہیوال
دیکھو تو آسماں پہ ستاروں کے درمیاں
اک اور روشنی کا اشارہ الگ سے ہے

تنویر فاطمہ .... کراچی
پورا کر جاتے ہیں انسان کی قسمت کا لکھا
وقت کی کوکھ میں جیتے ہوئے مرتے ہوئے دل
آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے میری جانب
زینۂ عمرِ گریزاں سے اترتے ہوئے دل

نور العین .... اسلام آباد
ٹوٹا تو یہ کھلا ہے کہ اک آئینہ تھا میں
کیا سوچ کر چٹان کی صورت کھڑا تھا میں
یوں ہی نہیں ہے دشت نوردی کا سلسلہ
بچپن میں ننگے پاؤں بہت بھاگتا تھا میں

شازیہ رضوی .... کراچی
ہوا کے ہاتھ میں جلتا دیا تھا
جسے لے کر وہ میرے گھر گئی ہے

شان علی .... گوجرانوالہ
خیال و خواب کا منظر بکھر نا جائے کہیں
ترا جمال بھی دل سے اتر نا جائے کہیں
محبتوں کا مقدر ہے بد گمانی بھی
کہ تیرے ساتھ رہوں اور ڈر نا جائے کہیں

کنول .... حیدر آباد
ہجرتوں کی بارش میں بھیگتی ہوئی شب تھی
جس میں تیری یادیں تھیں اور خوش گمانی بھی

حنا اصغر .... ملتان
محبت کی اسیری سے رہائی مانگتے رہنا
بہت آساں نہیں ہوتا جدائی مانگتے رہنا

شاہ بانو.........میلسی
محبت کا اشارا چاہیے تھا
سفر کا استعارا چاہیے تھا
مجھے تو شام کی تنہائیوں میں
بس اک چہرہ تمہارا چاہیے تھا

محمد ابو ہریرہ بلوچ.........بہاول نگر
ملاقاتیں عروج پر تھیں تو جواب اذاں بھی نہ دیتے تھے
آج صنم جو روٹھا ہے تو مؤذن بنا پھرتا ہوں

راحیلہ بانو.........راول پنڈی
شعر کہنے کی ضرورت بھی گئی
اس مشقت میں محبت بھی گئی

فرح عالم.........اسلام آباد
بیٹیاں باپ کی آنکھوں میں چھپے درد کو پہچانتی ہیں
گر کوئی دوسرا پڑھ لے تو برا مانتی ہیں

کاشف مغل.........دبئی
زمیں پہ ہم تو زمیں کا نصیب لائے تھے
ہمیں ستارے تمہارے قریب لائے تھے
'لگاؤ' لوک کہانی کا استعارہ تھا
اسے وجود میں ہم کم نصیب لائے تھے

اسامہ خان.........کراچی
دوستوں کے کام آ اور کام آ کر بھول جا
ہر مشقت ایک اجرت ہے' کوئی خواہش نہ کر
حسرتوں کا دکھ بجھا دے گا چراغ خدوخال
تو بہت ہی خوبصورت ہے' کوئی خواہش نہ کر

کرن اظہر.........کراچی
ہم نے بس ایک بار پر کھولے
آسماں آج تک اڑان میں ہے

عریشہ قمر.........گجرات
تُو اگرچہ ملا نہیں ہے مجھے
جانے خدشہ ہے کیوں جدائی کا؟

افضال حسین بابر.........کراچی
ہم دور نکل جائیں گے ہر خواب دخبر سے
تم دیکھتے رہ جاؤ گے پرواز ہماری

نبیلہ نازش راؤ.........اوکاڑہ
محبت روح میں اترا ہوا موسم ہے جانِ جاں
تعلق ختم کرنے سے محبت کم نہیں ہوتی

سید اویس شاہ.........کراچی
قفس میں کوئی اذیت نہیں مجھے صیاد
بس ایک حشر بپا بال و پر میں رہتا ہے

شاہدہ سعید.........گوجرانوالہ
اے غمِ ہجرِ یار' یہ تو بتا
کیا تجھے کوئی کام کاج نہیں؟

کاشف علی.........پسرور
جہاں کوئی بچھڑ جائے' وہیں پر اس کی منزل ہے
کسی کے ساتھ چلنے سے مسافت کم نہیں ہوتی

محمد آصف.........ٹنڈو الہ یار
دشت کی دھوپ میں پیاسے کو سہارا دینے
کوئی دریا نہیں آتا ہے' سراب آتا ہے

سمیرا بانو.........ملتان
یہ داغ داغ اجالا' یہ شب گزیدہ سحر
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو تھی ہمیں
فروغ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

☆......☆......☆

کوپن برائے
تیرنیم کش
جون 2015ء

میرا یہ پسندیدہ شعر "سچی کہانیاں" کی نذر ہے

نام:
پتا: